دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
نومبر 2017
نگران اعلیٰ
معراج رسول
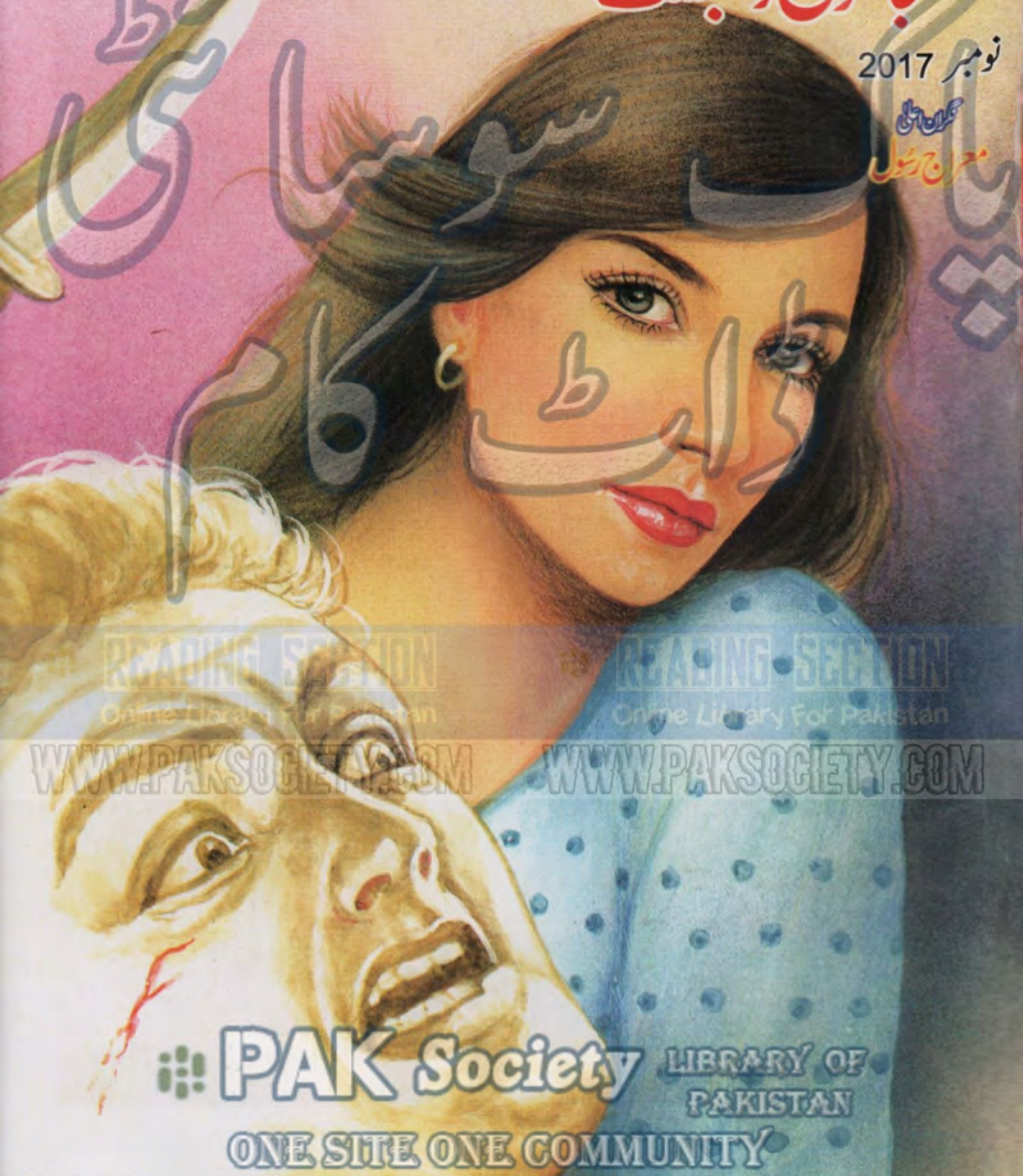
جاسوسی ڈائجسٹ

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 47 • شمارہ 11 • نومبر 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail: jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

نومبر آگیا، سردی ابھی تک نہیں آئی مگر شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ کرۂ ارض پر خونِ مسلم کی ارزانی اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ مسلم کش پالیسیوں کے سرغنہ، امریکا کے لیے شمالی کوریا گلے کی ہڈی بنا ہوا ہے۔ دھمکیاں کام آ رہی ہیں نہ پابندیاں خاطر خواہ نتائج دے رہی ہیں۔ دوسری طرف وہ ایران سے سیاسی اور معاشی زور آزمائی کر رہا ہے جس میں تاحال اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ عراق اور افغانستان میں اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ویت نام کی جنگ میں دندان شکن شکست کے بعد امریکا کو کہیں بھی کوئی فوجی سرخ روئی نصیب نہیں ہو سکی۔ معیشت کے میدان میں یورپی یونین ڈالر سے چھٹکارے کی تجاویز سوچ رہی ہے اور دوسری طرف چینی مصنوعات نے امریکی بازاروں اور بڑے بڑے اسٹورز میں اپنا سکہ جما لیا ہے۔ آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ امریکا، چین کی فوجی اور معاشی قوت سے خوف زدہ ہے اور اسی خوف کے زیرِ اثر حال ہی میں سی پیک کے خلاف ہذیان بکا گیا ہے۔ امریکا اس وقت کھسیانی بلی کی مثال بنا ہوا ہے اور کھمبا نوچنے پر مائل نظر آ رہا ہے۔ سرحد کے اس پار، افغانستان میں اس کے لشکر اور ہر قسم کا سامانِ حرب بھاری تعداد و مقدار میں موجود ہے۔ ہمیں اپنے اس کینہ پرور دوست سے ہر لمحے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ نہ جانے وہ کہاں اور کیا چال چلنے والا ہے۔ پچھلے دنوں سابق وزیر داخلہ چوہدری نثار نے ملک پر منڈلاتے ہوئے جن سنگین خطرات کا ذکر کیا، کہیں وہ اسی سمت میں تو اشارہ نہیں کر رہے تھے۔ چلیے کارزارِ سیاست سے نکل کر دیکھتے ہیں کہ ہماری محفل میں کون، کیا اشارے کر رہا ہے۔

کراچی سے توصیف علی کی اعلیٰ کارکردگی ”چھبیس تاریخ کو آفس سے واپسی پہ ایک اخبار والے سے جاسوسی خریدا۔ سرورق کی نازنین متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ ماسک والے شخص کو دیکھ کے اندازہ ہو گیا کہ اس بار سرورق کے رنگوں میں کوئی اغوا ضرور ہوگا۔ ہمارا اندازہ درست نکلا اور سرورق کے دونوں مصنفین نے اپنی تحریروں میں بچے اغوا کرائے۔ فہرست کا ڈیزائن متاثر کن تھا۔ تمام کہانیوں اور مصنفین کے نام پڑھنے کے بعد نظرِ انتخاب امجد رئیس کی آبلہ پا پر پڑی۔ لی چائلڈ کا نام کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ فلم تو متاثر کن تھی مگر ناول اس سے زیادہ متاثر کن رہا۔ ابتدائی تین سین پڑھ کے ہی ناول کے دلچسپ ہونے کا اندازہ ہو گیا۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے درست ہوتا گیا۔ لیکن پہلے سین کی آخر تک وضاحت نہ ہو سکی، وہ دو مرد اور ایک لڑکا کس عورت کی ریکی کر رہے تھے؟ انسانوں کا شکار ایک ایسے ملک میں جہاں جانوروں کے حقوق کا بھی بڑا پرچار کیا جاتا ہے، افسوسناک تھا لیکن یہی تلخ حقیقت ہے کہ امریکنز کے نزدیک حقوق بس امریکنز کے ہی ہوتے ہیں چاہے وہ انسان ہوں یا جانور، دیگر دنیا خاص طور پر غریب ممالک کے لوگ تو ان کے نزدیک کیڑے مکوڑوں سے بھی کمتر ہیں۔ اولین صفحات کا حق خوب ادا کیا اس ناول نے۔ اس کے بعد ہم نے کبیر عباسی کے انتخاب کا انتخاب کیا۔ آغاز سے اس تحریر کی بنت بھی آبلہ پا سے ملتی جلتی لگی۔ لیکن آگے جا کے پہلے چند سین سے جو ہمارے ذہن میں کہانی کا خاکہ بنا تھا، کہانی اس سے بالکل مختلف نکلی اور اسی خاصیت نے اس کہانی کو ناقابلِ فراموش بنا دیا۔ خاص طور پر کہانی کو جس خوبی سے کلائمکس تک پہنچایا گیا اس کی نظیر غیر ملکی جاسوسی ادب میں بھی کم کم ملتی ہے۔ ماشاءاللہ سے ہمارے مقامی مصنفین بھی کسی طرح غیر ملکی مصنفین سے صلاحیتوں میں کم نہیں، حالانکہ انہیں مغربی مصنفین کی نسبت محنت کا معاوضہ نہ ہونے کے برابر ملتا ہے۔ اس کہانی کو اگر معاشرتی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بہت اچھی معاشرتی کہانیوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ پہلے رنگ میں فاروق انجم نے اپنے قلم سے رنگ بھرنے کی کوشش کی لیکن معذرت کے ساتھ یہ رنگ قدرے پھیکے رہے۔ ان کا اندازِ تحریر اچھی خاصی بہتری مانگتا ہے۔ البتہ کہانی پیش کرنے کا انداز یہ بخوبی جانتے ہیں۔ یاسر اعوان کی لہو کی تاثیر پڑھتے ہوئے ایسا لگا جیسے نواب محی الدین صاحب کی کوئی تحریر پڑھ رہے ہوں۔ ان کی چند مزید تحریریں بھی پڑھنے کو مل چکی ہیں لیکن ان میں ان کا اندازِ تحریر کافی مختلف تھا پھر یکدم سے نواب صاحب والا اندازِ تحریر؟ بہرحال کہانی کا پلاٹ تو کافی گھسا پٹا تھا لیکن مصنف نے کہانی کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا، ایک بات محسوس ہوئی کہ اس کہانی کا پلاٹ طویل تحریر کے لیے زیادہ موزوں تھا۔“ (یقیناً)

کراچی سے ایم سہیل کا مطالبہ ”نکتہ چینی کی محفل میں موجود تمام ممبران کی خدمت میں آداب پیش ہے۔ (وعلیکم آداب) آتے ہیں تبصروں پر، بلکہ ایک منٹ، آج میری پہلی پیشی ہے جاسوسی کے ایوان میں اس لیے آج میں کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کروں گا (وہ کیوں؟) وہ کیا ہے کہ جاسوسی سے رشتہ تو آٹھ سال پرانا ہے مگر نکتہ چینی میں جسارت پہلی مرتبہ کر رہا ہوں، دیر سے آنے کی گستاخی کا احساس تو ہے مگر...... (لو، آپ کا جرم ناقابلِ معافی ہے، اس قدر تاخیر!) مجھے پتا ہے کہ قارئین اور ادارہ یہ والے شامی اور تیمور کے دادا جان جیسے سخت گیر طبیعت کے مالک تو ہیں نہیں کہ مجھے اس جرم کی پاداش میں کوئی سخت سزا سنا دیں، ویسے بھی میں بزدل ہوں اور سزا سے ڈرتا ہوں، یہ الگ بات ہے کہ جلیل کی طرح مصلحت پسند ہوں (چلیں کیا یاد کریں گے ہم نے بزدل کو معاف کر کے دلیر کیا) آج سے چند سال قبل جاسوسی ڈائجسٹ میں ایک سلسلہ شائع ہوا تھا جس کا نام تھا مستقبل شناس جو کہ ایچ اقبال صاحب کی تحریر تھی، میری درخواست ہے کہ وہ کہانی کتابی شکل میں شائع کی جائے۔ جس طرح دیوتا، اناڑی وغیرہ کی طرح کئی سلسلے ہماری ذاتی لائبریریوں کی

زینت بنے ہوئے ہیں۔‘‘ (یقیناً یہ بھی اس درجے پر فائز ہوگی)

ناظم آباد کراچی سے ادریس احمد خان کی ذرہ نوازی ’’اکتوبر کا جاسوسی ڈائجسٹ خوب صورت سرورق کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ ذاکر صاحب نے خوب صورت اور دیدہ زیب رنگوں سے سجایا ہوا تھا۔ اندر چینی نکتہ چینی میں وارد ہوئے۔ سرفہرست اے آر جٹ تھے۔ دیگر نئے پرانے دوست بھی محفل میں نظر آرہے تھے۔ پہلی کہانی آبلہ پا نے اچھا تاثر دیا۔ دوسرے نمبر پر خام خیالی تھی۔ چالاک سے چالاک مجرم کہیں نہ کہیں غلطی کرتا ہے جو ذہین اور زیرک پولیس کے لوگوں کو نظر آجاتی ہے اور مجرم پابندِ سلاسل ہوجاتے ہیں۔ دوسرا جرم بھی بہتر انداز میں پیش کی گئی کہانی تھی۔ اس کے بعد انگارے پڑھی جو انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیزی لیے ہوئے ہے۔ لہو کی تاثیر نے بھی متاثر کیا سچ ہے خون ضرور اثر دکھاتا ہے۔ آتش زن بھی اچھی لگی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد بھی کامیاب ہے اور دلچسپی سے پڑھی جارہی ہے۔ ناکام کامیابی میں گراہم اور جارڈن کو اپنی کامیابی ناکامی میں صاف نظر آرہی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس کی قسمت عروج پر ہو تو اسے زوال نہیں آسکتا یہ اٹل اللہ کا نظام ہے۔ بندہ اس میں کوئی ردوبدل نہیں کرسکتا، آخری صفحات کی فاروق انجم کی کہانی بہت اچھی لگی اور انتخاب میں کبیر عباسی کی لکھی ہوئی خوب صورت کہانی تھی۔ مختصر مختصر بلیک میلر بھی اچھی تھی۔ کارٹون اور کترنیں بھی اپنی جگہ اچھی تھیں، مجموعی طور پر جاسوسی ڈائجسٹ اچھا تھا۔‘‘ (شکریہ پسندیدگی کا)

سینٹرل جیل میانوالی بیرک نمبر 18 سے سجاد خان آف موچھ کی شکایتیں ’’اکتوبر 2017ء کا شمارہ جیسے ہی ہاتھ میں آیا بے چین دل کو قرار آیا۔ ہمیشہ کی طرح بے مثال سرورق کے ساتھ خوب صورت حسینہ کسی سوچ میں گم اور ساتھ نظر آتا مرد پتا نہیں کس سے منہ چھپاتا پھر رہا ہے۔ آدمی ایسی حرکتیں ہی نہ کرے کہ پھر منہ چھپاتا پھرے۔ اب محفل میں چلتے ہیں۔ ہاں یاد آیا ویسے میں ناراض ہوں وہ اس وجہ سے کہ جاسوسی ڈائجسٹ سے تقریباً 22 سال کی دوستی ہے اور جاسوسی ڈائجسٹ سے دوستی نبھانے کے جرم میں پانچ بار والد صاحب سے مار کھائی جو کہ لگتا ہے کہ یہ اعزاز صرف میرے پاس ہے۔ اب مجھے نہیں پتا کہ میرے خط محفل میں کیوں نہیں پہنچ پاتے، یا تو ردی کی ٹوکری ان کا مقدر بنتی ہے یا میانوالی اور کراچی کے درمیان کہیں رستے میں معلق ہوجاتے ہیں یا جنات کی کارستانی ہے، ہوسکتا ہے غائب کردیتے ہیں۔ (ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ کس کی کارستانی ہے پر ہماری نہیں ہے) خیر پھر بھی جاسوسی سے مجھے کوئی جدا نہیں کرسکتا۔ دوستوں کی محفل میں سبھی دوستوں کے تبصرے پسند آئے۔ پرانے دوست کم کم نظر آتے ہیں۔ محمد صفدر معاویہ کیسے ہو بھائی، عبدالجبار رومی انصاری بھائی آدمی کبھی بھول کر ہی یاد کرلیتا ہے۔ بلقیس خان یاد کرنے کا شکریہ۔ کچھ لوگ اپنی عادتوں کی وجہ سے رسوا اور ذلیل ہوتے ہیں لیکن دوستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے معصوم بن جاتے ہیں۔ محفل میں حاضر ہونے کو دل تو کرتا ہے لیکن بارہا کوشش کے باوجود غیر حاضر رہے۔ کہانیوں میں انگارے بیسٹ رہی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی اچھی تحریر ہے۔ دوسرے نمبر پر آوارہ گرد اچھی جارہی ہے۔ کبیر عباسی اور فاروق انجم کی کہانیاں پسند آئیں باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ اب دوستوں کی نذر ایک شعر۔

الجھے ہوئے ہیں زوالِ زندگی میں اے دوست
ورنہ تمہاری یاد سے بے خبر تو نہیں۔‘‘

اسلام آباد سے یوسف زئی کی یادآوری ’’سب سے پہلے چینی نکتہ چینی کی رنگ برنگی محفل کی طرف۔ نصیر چوہدری، طلعت مسعود، صفدر معاویہ، نعمان نیاز، اشفاق شاہین صاحبان کا مجھے یاد رکھنے کا شکریہ۔ اس شمارے کی ترجمہ شدہ مغربی کہانی آبلہ پا بہت اچھی تھی۔ بہتر ہوتا کہ اسے دو یا تین اقساط میں مکمل شائع کیا جاتا۔ سرورق کی دونوں کہانیاں فرار اور انتخاب اس بار بہتر تھیں۔ یاسر اعوان کی یوم دفاع کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی لہو کی تاثیر ایک اچھوتی تحریر تھی۔ شاید تاخیر سے ملنے کی وجہ سے ستمبر کے شمارے میں جگہ نہ پاسکی۔ (بجا فرمایا) منظر امام کی مختصر کہانی بامحاورہ بھی اچھی تھی۔ قسط وار کہانی انگارے شاہ زیب، تاجور اور ساتھیوں کی پاکستان واپسی پر تو اختتام پذیر ہوجانی چاہیے تھی مگر شاید ابھی مزید جاری رکھنے کی وجہ سے ٹیکساری گروپ کے ڈیتھ اسکواڈ کا حملہ کرادیا گیا ہے۔ داؤد بھاؤ نے فی الوقت تو شاہ زیب وغیرہ کو بچالیا ہے۔ اب دیکھیں آئندہ کیسے ان سے جان چھڑائی جاتی ہے۔ دوسری سلسلہ وار کہانی آوارہ گرد میں کبیل دادا اور شکیلہ دوسروں کے پاسپورٹ پر امریکا روانہ ہوچکے ہیں اور اب شہزی بھی تھائی لینڈ روانگی کے لیے پر تول چکا ہے اور طیارے میں ایک شخص اسے پہچان چکا ہے۔ کترنیں اس بار دلچسپ تھیں۔‘‘

ٹیکسلا سے دل نشین کی دل جلی شکایات ’’آفٹر لونگ ٹائم محفل میں حاضری لگوا رہی ہوں۔ کبھی ایسا دور تھا کہ ہر ماہ میرا محبت نامہ خطوط کے ستاروں میں چاند بن کے دمک رہا ہوتا تھا مگر پھر ایسا ہوا کہ ایک تسلسل سے میرا خط بلیک لسٹ کی نذر ہونے لگا۔ ٹائم پر بھاگ دوڑ کر کے رسالہ حاصل کیا جاتا، بڑی محبت اور چاہ سے سب سے الگ تھلگ بیٹھ کے لیٹر لکھا جاتا، بڑے اہتمام سے پوسٹ کیا جاتا اور پھر نظریں ٹھہر جاتیں بک سینٹر پر۔ خدا خدا کر کے دن پورے ہوتے، ڈائجسٹ شاپ کی زینت بنتا اور میں بھاگم بھاگ خرید کر خطوط کی محفل میں جھانکتی تو وہی بات کہ خط بلیک لسٹ یا سرے سے غائب تو جب اتنی محبت اور چاہت کو آپ نے یوں روندا تو دل بہت دکھی ہوا (ہماری طرف سے ایسا بہت کم ہوا ہے) پہلے تو میں نے ڈائجسٹ سے ہی ناتا توڑ لیا پھر لیتی رہی، سب دوستوں کے خطوط بھی پڑھتی رہی مگر دل کی کلی پھر نہ کھلی، دل یوں مرجھایا کہ بس! ہاں جہاں تک ادارے سے شکایت تھی، وہ اپنی جگہ مگر دل ٹوٹنے کا ایک سبب سب دوستوں کا آنکھیں پھیرنا بھی تھا کہ کسی نے کبھی جھوٹے منہ بھی ذکر نہ کیا، یاد نہ کیا اتنی خودغرضی؟ مجھے تو آپ سب یاد ہیں کسی کو نہیں بھولی۔ کل ڈائجسٹ لیا، دل چاہا کہ خط لکھوں ابھی پورا پڑھ تو نہیں پائی۔ ٹائٹل کی لڑکی سادہ اور باوقار لگی خاص کر ہیئر اسٹائل مجھے بہت پسند آیا۔ خوب صورت آنکھیں اور کھڑی ناک بہت اچھی لگ رہی ہے۔ ساتھ میں جو شخصیت ہیں،

انہوں نے ماسک لگا کر فیس ہی چھپا لیا۔ فہرست دیکھی، بڑے اور پیارے رائٹرز سے سجی تھی۔ خوب صورت لوگ خوب صورت نام، امجد رئیس، جمال دستی، شاکر لطیف، سلیم انور غرض سب بڑے بڑے نام مگر ان سب میں ہر دلعزیز اور محبوب قلم کار طاہر جاوید مغل صاحب جلوہ افروز ہیں انگارے کے ساتھ۔ چینی نکتہ چینی میں اے آر جٹ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ نصیر احمد چوہدری، سید ذیشان کاظمی، طلعت مسعود، نعمان خان نیازی، اشفاق شاہین، محمد اقبال طویل ترین تبصرے لے کر آئے، بہت اچھا لکھا سب نے اور میرے پڑوسی اسلام آباد سے انور یوسف زئی، آپ کی اہلیہ کے انتقال کا بہت افسوس ہوا، اللہ پاک جنت میں اعلیٰ مقام نصیب کرے، آمین۔“

لاہور سے اشفاق شاہین کی آمد ”لاہور سے گھر جاتے ہوئے جاسوسی کا ساتھ نصیب ہوا۔ خوفناک اور حسینہ بہر حال حسینہ کہلانے کے قابل ٹھہری۔ چینی نکتہ چینی پر پہنچے، اے آر جٹ پہلی انٹری کے ساتھ ہی پہلے تبصرے پر براجمان ہوئے، خوش آمدید جناب۔ نصیر احمد، نعمان خان، خوش آمدید جناب۔ باقی دوستوں کے خطوط بھی بہترین تھے خصوصاً نعمان خان، محمد اقبال اور طلعت کا تبصرہ، زبردست۔ چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے انگارے ایک ہی نشست میں پڑھی۔ فل ایکشن کے ساتھ کہانی میں تیزی آ گئی ہے۔ زبردست۔ آوارہ گرد پر پہنچے۔ یہ قسط بھی شاندار رہی۔ مختصر کہانیوں میں اس بار باماحورہ ہی اچھی لگی بس، مزاح بھی اور سسپنس بھی اور انجام بھی شاندار۔ سرورق کا پہلا رنگ فرار، محمد فاروق انجم نے خوب لکھا۔ بہت پسند آیا۔ جمیل، ضرغام، نگہت سب ہی کردار اچھے تھے، منصور کا کردار فیصلہ کن تھا۔ انجام بھی عمدہ رہا۔ اور اس ماہ کی سب سے خاص کہانی کبیر عباسی کی انتخاب ٹھہری، بہت زبردست۔ سسپنس سے بھرپور اور موضوع بھی بہت عمدہ، پیسے سے محبت، اف یہ اولاد پر بھی حاوی آ سکتی ہے۔ پڑھ کر جھرجھری آنے لگتی۔ بہر حال سکندر جیسے لوگوں کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا اور سب سے بہترین کردار رومانہ، آخر تک اندازہ نہ ہوا کہ اس سب کے پیچھے کون ہے۔ ویل ڈن کبیر عباسی۔ اس بار کترنیں بھی بہت خوب رہیں۔“

فیصل آباد سے منحہ رمشہ کا سوال ”جاسوسی کا شمارہ 5 اکتوبر کو مل گیا۔ ٹائٹل پر ماسک پہنے گراہم اور جارڈن میں سے کوئی ایک تھا جبکہ ساتھ حسینہ نہ جانے کون تھی؟ آپ کا اداریہ پڑھا۔ ہندوؤں کا مسلمانوں پر بہانہ تشدد کر کے ہلاک کرنا بہت غصہ دلا گیا۔ اگر ہم مسلمان مل کر ایک ہو جائیں تو پھر انڈیا اور امریکا کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ لیکن ہم نے خود کو کمزور خود ہی کیا ہے۔ جاسوسی کے پہلے صفحات پر غیر ملکی ناول تھا۔ جیک ریچر کا کردار بہت عمدہ تھا۔ معصوم ایلی پر بھی ترس آیا۔ کارمن کے لیے جذبات ملے جلے رہے۔ پہلے وہ مظلوم ہی لگی لیکن ایلس کے آنے کے بعد مجرم بھی لگی۔ ریچر اور ایلس کا کپل بھی اچھا لگا۔ بہت امیزنگ اسٹوری تھی اور سب سے بڑھ کر سسپنس بہت تھا کہانی میں۔ شاکر لطیف کی ناکام کامیابی بہت پُرلطف رہی۔ گراہم اور جارڈن کے پکڑے جانے پر بہت دھچکا لگا تھا لیکن وہ دونوں ناکام ہو کر بھی کامیاب رہے۔ آخری صفحات پر بہت زیادہ سسپنس رہا۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ارمغان کا اغوا فلک نے کس طریقے سے کروایا تھا کیونکہ وہ خود تو اس وقت سکندر کے ساتھ ہی موجود تھا؟ سرورق کی پہلی کہانی محمد فاروق انجم کی فرار بھی عمدہ رہی۔ ضرغام کا کردار مجرم کے طور پر ابھارا جبکہ انسپکٹر منصور نے اپنی ذہانت سے ضرغام جیسے چالاک مجرم کو اریسٹ کر ہی لیا۔ تنویر ریاض کی دوسرا اجرم کافی اچھی رہی۔ طاہر جاوید مغل کی انگارے، بہت اچھی جا رہی ہے۔ شکر ہے شاہ زیب، تاجور کولے کر واپس پاکستان آ گیا ہے۔ عکس فاطمہ کی بلیک میلر پڑھ کر ہمیشہ کی طرح سراغ رساں شرمین کی ذہانت پر دماغ اش اش کر اٹھا۔ منظر امام کی باماحورہ کھلکھلاتی کہانی پسند آئی۔“

نارووال سے سید ذیشان حیدر کاظمی کا استفسار ”اکتوبر کا شمارہ یوم عاشورہ سے پہلے ہی مل گیا تھا۔ اب میں ٹائٹل پر بنی کڑیوں کو دیکھتا ہوں نہیں اس لیے ذرا بھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے لینس لگا کر بال جوڑے میں باندھ رکھے ہیں اور سائڈ پر کھڑے انکل اپنے ماسک کے پیچھے سے اسے دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ نکتہ چینی میں ادارے کی وارننگ دیکھ کر دل نے کہا بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ سبھی دوستوں کے تبصرے بڑے اچھے تھے۔ کہانیوں میں پہلے امجد رئیس کی آبلہ پا پڑھی۔ بھاگ دوڑ، تجسس، تھرل پورے بارہ مصالحوں کی چاٹ تھی۔ چکھ کر مزہ آ گیا۔ میں نے سنا ہے امجد رئیس صاحب وفات پا چکے ہیں اور ان کے نام سے ڈاکٹر بھٹی لکھتے ہیں۔ (آپ نے غلط سنا ہے الحمدللہ امجد رئیس حیات ہیں اور بہت ذمے داری اور خلوصِ نیت سے قلم نگاری کرتے ہیں...... ڈاکٹر بھٹی کا ان سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں...... یہ غلط خبریں پھیلاتا کون ہے؟) انگارے نے تو اس بار دھوم مچا دی۔ اتنی خونخوار قسط۔ مزہ کیسے نہ آتا۔ یاسرا عوان کی لہو کی تاثیر بھی اچھی تھی لیکن کچھ باتیں ہضم نہیں ہوئیں۔ منظر امام کی باماحورہ نے بھی متاثر کیا۔ پہلا رنگ فاروق انجم کے قلم سے نکلا۔ پلاٹ اچھا تھا لیکن رائٹر انصاف نہ کر سکے۔ اتفاقات کی بھرمار تھی۔ بیانیہ بھی کافی کمزور تھا۔ فاروق صاحب کے قلم کو وٹامن کے انجکشنز کی ضرورت ہے آج کل۔ دوسرا رنگ کبیر عباسی لائے۔ انتخاب نے آغاز میں ہی دلچسپی پیدا کر دی۔ فلک کے کردار پر شک تو پکا تھا بس مقصد جاننے کے لیے ایک ہی نشست میں کہانی ختم کر دی۔ اچھی کوشش تھی۔“

اسلام آباد سے منیر راجہ کی پہلی کوشش ”عرصہ پچیس سال سے جاسوسی و سسپنس کا قاری ہوں لیکن چینی نکتہ چینی میں پہلی بار شرکت کی جسارت کر رہا ہوں امید ہے شرفِ اشاعت بخش کے ممنون و مشکور ہونے کا موقع عنایت کیا جائے گا۔ (خوش آمدید) ذاکر صاحب کو داد دینے کو جی چاہتا ہے جو ایک طویل عرصے سے بے شمار شماروں کے سرورق کو نت نئے رنگوں سے سجا رہے ہیں۔ ان کے برش سے تخلیق کیے گئے تمام شماروں کے ٹائٹلز سب سے منفرد جاسوسی کے سرورق ہوتے ہیں۔ اس بار بھی ذاکر صاحب نے کمال کا سرورق تخلیق کیا۔ چینی نکتہ چینی میں مدیرِ اعلیٰ نے حسبِ معمول ملکی مسائل پر بات کی۔ تبصرے اب بھی دلچسپ ہوتے ہیں لیکن وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔ پہلے مرد و خواتین میں جو دلچسپ نوک جھونک ہوتی تھی وہ چینی نکتہ چینی اور آپ کے خط کو ایک منفرد روپ دیتی تھی۔ تحریروں میں امجد رئیس کی ترجمہ شدہ آبلہ پا سب سے پہلے نظرِ مطالعہ ہوئی۔ تحریر تمام جاسوسی کے رنگ لیے ہوئے تھی۔ شاندار ترین کاوش۔ یہ ان تحاریر میں سے ایک تحریر تھی جن کی بدولت آج تک میں جاسوسی سے جڑا ہوا ہوں۔ بچی کا کردار اور مکالمے انتہائی

متاثر کن تھے۔ نارمن کا سات پردوں میں چھپا کردار تجسس کا باعث بنا رہا۔ وکیل خاتون اور جیک ریچر کے مابین کیمسٹری دلچسپ تھی۔ سرورق کے رنگوں میں فاروق انجم نے پہلا رنگ فرار کے نام سے تحریر کیا لیکن بدقسمتی سے وہ رنگ جمانے میں بری طرح سے ناکام رہے۔ ایسے کمزور رنگ جاسوسی کے معیار کو تیزی سے گرا رہے ہیں۔ کبیر عباسی عرف شہزاد کو ہسار کے دوسرے رنگ کے شوخ رنگوں نے خوب متاثر کیا۔ ایک وقت تھا میں ان کے تبصرے بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا اور اب ان کی تحاریر اس سے زیادہ شوق سے پڑھتا ہوں۔ بہت تیزی سے انہوں نے جاسوسی میں اپنی جگہ بنائی۔ انتخاب کا تانا بانا اس انداز میں بُنا گیا کہ آخری سطر تک دلچسپی رہی۔ یوم حساب کے تناظر میں یہ ایک دلچسپ اور سبق آموز سین نکلا۔ مختصر تحریروں میں اپنے پسندیدہ مصنف منظر امام کی تحریر بامحاورہ بھی دل کو چھوگئی۔ مختصر سی تحریر اختتام پر چونکانے میں کامیاب رہی۔ جمال دستی کی یک صفحی تحریر خام خیالی میں اچھی چیز یہی لگی کہ یہ صرف ایک صفحے کی تھی۔ میرے خیال میں پہلی کوشش میں اتنا ہی کافی ہے۔"

شفقت محمود کی کھیوڑہ سے ستائش "28 تاریخ کی شام جاسوسی کھیوڑہ میں دستیاب ہوا تو پہلی فرصت میں ہاتھوں ہاتھ لیا، ٹائٹل میں ٹھنڈے رنگ دیکھنے کو ملے۔ زردی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ سرورق حسینہ ہالی وڈ کی ہیروئن معلوم ہو رہی تھی اور نیچے امریش پوری ٹائپ انکل شاید کسی تخریبی کارروائی کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ چٹنی نکتہ چینی میں اداریہ مسلم ممالک کی حالتِ زار پر اور دیگر مسلم ممالک کی بے حسی کے ساتھ لہو برسا رہا تھا۔ خطوط اوپر سے پھلانگتے ہوئے سرورق کی کہانی پر پہنچے۔ امجد رئیس نے اس بار بھی کمال کرتے ہوئے دھوم مچائی۔ لی چائلڈ کے ناولوں میں سے آبلہ پا شاندار کہانی رہی۔ اس کے بعد محبتوں کے سفیر مغل صاحب کی انگارے پڑھی۔ انگارے کی یہ قسط بہت ہی سنگین رہی۔ جاپان میں جنگی حالات اختتام پذیر ہوئے اور شاہی اینڈ کمپنی کی وطن واپسی ہوئی۔ انتہائی رقت آمیز مناظر دیکھنے کو ملے۔ شاہی اور قسطینا کی نوراکشتی فلم بند کی گئی اس کے ساتھ ساتھ خورسنہ اور سجاول کی دوری بہت کھلی۔ آخری وقت تک سجاول کی امید نہ ٹوٹی لیکن آخر دوری ہی مقدر ٹھہری، تاجور کے والد کا شاہی کے ساتھ ناروا سلوک بہت دردناک رہا۔ اور سیف کے گھر یا ترا بھی دکھی کر گیا۔ انگارے کی یہ قسط بہت ہی زیادہ سنگین رہی۔ بالکل ایسے ہی جیسے للکار کی آخری کچھ اقساط میں جاوا کے ساتھ گزری ہوئی قسطیں لہو رنگ ثابت ہوئیں۔ آوارہ گرد میں شہزی نے مخالفین کو دھول چٹادی ہے، اب آخر میں عابدہ کی رہائی والا معما باقی ہے یہ دیکھتے ہیں شہزی کیا کرتا ہے۔ عارفہ تو ساری کشتیاں جلا کر بے دام لوٹ کر بیٹھ گئی ہے۔ سانچے والے نے جوڈر امار جایا تھا اس کا ڈراپ سین اس کی گرفتاری پر تمام ہوا۔ نوشابہ بھی کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی پر گامزن نظر آئی لیکن حزیمت اس کا مقدر ٹھہری۔ شہزی اینڈ کمپنی کی امریکا یاترا کس قسم کے گل کھلاتی ہے اس کے لیے اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے لیکن اس سے پہلے شہزی کے ساتھ کون سی مہان ہستی جہاز میں بیٹھی ہے، اس نے چونکا دیا ہے۔ منظر امام صاحب کی بامحاورہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔ ایک اچھوتی تحریر تھی۔ پہلا رنگ جناب فاروق انجم صاحب کا بہت ہی روح فرسا اور دہشت ناک ٹھہرا، جمیل اور نگہت کا مصیبت میں گرفتار ہونا اور ضرغام جیسے ڈاکو کا ملک سے فرار کے طریقے بہت ہی دہشت ناک تھے۔ منصور کی حاضر دماغی اور جرأت نے کمالِ مہارت سے ضرغام اور اس کے گرگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ کبیر عباسی کا دوسرا رنگ انتخاب ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

راولپنڈی سے تنویر اختر کا گلہ "بک اسٹال سے ڈائجسٹ لے کے ادھر ہی کھول لیا۔ چٹنی نکتہ چینی کے سارے خطوط چھان مارے لیکن تبصرہ تو تبصرہ اپنا نام تک کہیں نظر نہیں آیا، ایسا کیوں ہوا، میں نے تو بروقت میل کر دی تھی؟ (معذرت چاہتے ہیں نہ جانے کیا ہوا؟) اے آر جٹ شاندار تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ایمانے زارا اور طلعت مسعود کے تبصرے بھی دلچسپ رہے۔ دوستوں سے ملاقات کے بعد کہانیوں کی طرف بڑھے۔ انگارے میں اس بار ہماری خواہش پوری ہوگئی، آخر کار شاہ زیب پاکستان آ ہی گیا۔ سنسنی سے بھرپور قسط نے بہت مزہ دیا۔ آوارہ گرد کی قسط بھی پسند آئی۔ رنگوں میں فاروق انجم کا فرار بس ٹھیک ہی رہا۔ جمیل بہت برا پھنسا۔ لیکن توقع کے مطابق بہ آسانی نکل بھی گیا۔ ضرغام وقت ضائع کرنے کے بجائے منصور کی بہن کو یرغمال بنا کے نکل جاتا تو اس کے حق میں زیادہ بہتر ہوتا۔ منصور کی بیٹی کے اغوا کا رسک غیر ضروری لگا۔ فاروق انجم کا انداز بیان بھی غیر متاثر کن ہے۔ کچھ جملے تو زیادہ ہی بچکانا سے لگتے ہیں۔ دوسرا رنگ انتخاب ایک شاہکار تھا۔ کافی عرصے بعد رنگوں میں ایسی تحریر پڑھنے کو ملی جس نے پہلی سطر سے آخری سطر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ سکندر کے کردار ہمارے اردگرد پھیلے ہیں۔ وہ اسی انجام کا مستحق تھا لیکن اس کے باوجود اس کے انجام نے دکھی کر دیا۔ امجد رئیس کی آبلہ پا بھی ایک شاہکار تحریر تھی، پڑھ کر مزہ آ گیا۔ بیچ بیچ میں چند جگہوں پر الجھن بھی ہوئی لیکن مجموعی طور پر کہانی شاندار رہی۔ جیک ریچر کا کردار پسند آیا۔ منظر امام کی بامحاورہ دلچسپ تحریر رہی۔ یاسر اعوان کی لہو کی تاثیر بھی شاندار تحریر تھی۔ کافی عرصے بعد کشمیر کے موضوع پر تحریر پڑھنے کو ملی۔ ابھی اتنا ہی رسالہ پڑھ سکا ہوں۔"

گوجر خان سے حفصہ طارق کا حملہ "یہ دائیں طرف آخر ہے کیا جس کی طرف سرورق کی حسینہ گھورے جا رہی ہے اور ماسک پہنے ایک بھوت بھی۔ یہ سوال ذہن میں اٹھتے ہی ہم نے دائیں طرف نگاہ دوڑائی تو ان دونوں کی طرح ہم بھی سکتہ زدہ رہ گئے۔ دائیں طرف ایک خوب صورت حسینہ طمطراق سے بیٹھی ہمیں گھور رہی تھی۔ ہماری نظریں پھسلتی ہوئی اس کے ہاتھوں تک گئیں تو ہم اچھل پڑے، اس حسینہ نے بھی جاسوسی اکتوبر کا تازہ شمارہ ہی اٹھایا ہوا تھا۔ آنکھیں سکیڑ کے بغور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ حسینہ جو ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں محوِ استراحت ہیں دراصل ما بدولت خود ہی ہیں۔ اب سرورق کی حسینہ اور ماسک والے انکل کی گردنوں کا خودبخود ادھر مڑ جانا تو بنتا ہی تھا۔ ہم انہیں نظرانداز کرتے ہوئے شانِ بے نیازی سے فہرست کی طرف ہو لیے۔ فہرست کا آغاز و اختتام دونوں ہمارے فیورٹ رائٹرز کے نام پر ہوا۔ فہرست سے مطمئن انداز میں رخصت ہوتے ہوئے چٹنی نکتہ چینی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا تو آگے اداریہ تھا۔ اداریے میں میرے خیال میں ڈائجسٹ کے متعلق بات چیت ہونی

چاہیے۔ یہ مسائل کارونا تو ہر جگہ ہی سنتے رہتے ہیں۔ کیا خیال ہے۔ اے آر جٹ نے پہلی بار ہی جاسوسی خریدا، پہلی بار ہی تبصرہ لکھ مارا، وہ پہلے نمبر پر بھی آ گیا۔ یا حیرت۔ اتنا اچھا تبصرہ کوئی پہلی بار ہی ڈائجسٹ خرید کے کیسے لکھ سکتا ہے۔ لگتا ہے جناب نے گپ ہی چھوڑی ہے لیکن یہاں بھی اپنا کوئی ذکر نہیں۔ ٹوٹے دل کے ٹکڑے پھر سے سنبھالے اور طلعت مسعود کا تبصرہ پڑھنا شروع کیا، آخر کار وہ پہلا تبصرہ آ ہی گیا جس میں مابدولت کا ذکر موجود تھا۔ شکریہ طلعت، گھر والوں کو ہم رعب دکھاتے ہی رہتے ہیں یہ اور بات کہ وہ ہمارے رعب میں آتے نہیں۔ کوثر اسلام کی ایک بات سے متفق ہوں کہ جے ڈی پی والے ایک فیملی کے مانند ہیں۔ ایک ماہ بعد تبصروں کی شکل میں ملاقات عجب سرور طاری کر دیتی ہے۔ انور یوسف زئی کو ہمارا تبصرہ اچھوتا رنگ لیے لگا یہ جان کر ہمیں بھی اچھا لگا۔ باقی جن لوگوں نے ہمارا ذکر کیا اچھا کیا اور جنہوں نے نہیں کیا انہیں آخری وارننگ دی جاتی ہے۔ کہانیوں میں ابتدا انگارے سے کی۔ سنسنی وقتل وغارت گری سے بھرپور قسط اس حوالے سے زیادہ اہم رہی کہ جاماجی کی گلیوں میں دہکتے انگارے اس بار لاہور کی سڑکوں تک آ گئے۔ بیچھے ٹیکساری گینگ کی آمد نے کہانی کو ایک دم سے مزید دلچسپ کر دیا۔ انگارے کے بعد آوارہ گرد پڑھنے کا سوچا لیکن دل نہ مانا تو آبلہ پا کی طرف بڑھ آئے۔ تجسس سے بھرپور ناول نے بہت مزہ دیا۔ جیک ریچر کا کردار ایسا لگا جیسے کسی سیریز کا کردار ہوتا ہے۔ امید ہے اس کردار پر ہمیں مزید ناولز بھی پڑھنے کو ملیں گے۔ رنگوں میں پہلا رنگ فرار پڑھ کے مایوسی ہوئی۔ دوسرے رنگ نے متاثر کیا۔ کہانی کا تھیم، پیشکش، واقعات کا تسلسل، سب بہت اعلیٰ رہا۔ آخری چند صفحات نے گرد و پیش سے یکسر ہی بیگانہ کر دیا۔ اتنا شاندار اینڈ بہت کم ہی کسی تحریر میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہانی کا آخری پیرا پڑھ کے میں کافی دیر گم صم رہی۔ واقعی ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کا انتخاب یہ کاغذ کے نوٹ ہی ہیں۔ ان کے لیے ہم ہر ناجائز کام کر گزرتے ہیں۔ ایسی کہانیاں برسوں میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ یاسر اعوان کی لہو کی تاثیر شروع میں کچھ پڑھی پڑھی سی لگی۔ چند ماہ پہلے ایک کہانی میں بھی ایک پاکستانی فوجی دوران جنگ سرحد پار کر گیا تھا جہاں ایک لڑکی نے اس کی مدد کی تھی اور ہیرو نے اس سے شادی کر لی تھی (جی ہاں کاشف زبیر کی تھی) گو کہ وہ منگنی شدہ تھا لیکن آگے جا کے کہانی نے تھوڑی مختلف کروٹ لی۔‘‘ (آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں سے آپ کی میل بلاک نہیں کی گئی۔ ہمیں آپ کی میل کا انتظار رہے گا آئندہ بھی)

بھکر سے نعمان خان نیازی کی کہانی ’’ماہ اکتوبر کا پرچہ بذریعہ ڈاک 28 ستمبر کو ملا۔ جلدی جلدی لفافے سے نکال کر سرورق پر ہلکی سی نظر دوڑائی۔ سرورق پر حسینہ کو دیکھا شاید کسی بندھن میں بندھنے جارہی تھی یا سالگرہ منا رہی تھی۔ ساتھ میں ایک جناب بھی موجود تھے اپنا منہ چھپائے شاید ڈر تھا کسی کا۔ خیر دل میں دعا کرتے ہوئے کہ اے اللہ ہمارا پہلا خط بھی محفل میں شامل ہو نکتہ چینی میں آ گئے۔ محفل میں دسویں نمبر پر اپنا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا اور دل سے بہت سی دعائیں نکلیں جاسوسی ادارے کے لیے۔ میری چھوٹی سی کوشش کو اللہ پاک نے سرخرو کیا میں بہت شکر گزار ہوں۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا جس میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم اور تشدد کو اجاگر کیا گیا تھا۔ پوری دنیا میں جہاں بھی مسلمان ہیں ان پر ظلم ہو رہا ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ محفل میں ابتدائی تبصرے پر شوخیاں کرتے اے آر جٹ فیصل آباد سے براجمان تھے اپنے شاندار تبصرے کے ساتھ پسند آیا۔ اس کے بعد نصیر احمد، سید ذیشان حیدر کاظمی، سیدہ ایمانے زارا شاہ، پردیسی بھائی طلعت مسعود، کوثر اسلام، محمد صفدر معاویہ، محمد ادریس خان، منحہ رمشا، انور یوسف زئی، انجم فاروق ساحلی، اشفاق شاہین اور محمد اقبال کے تبصرے پڑھنے کو ملے، پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ جاندار اور شاندار تبصرے تھے سب کے۔ سب تبصرہ نگاروں سے درخواست ہے اسی طرح اچھا اچھا لکھتے رہیے گا۔ کوثر اسلام بھائی سچی بات تو یہ ہے کہ قدیر شاہ کی طرح میں نے بھی آپ کو دوشیزہ ہی سمجھا تھا مگر آپ تو شہزادہ نکلے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی سلسلے وار کہانی انگارے پڑھی۔ ایکشن اور تھرل سے بھرپور اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی۔ زینب کو آئی سی یو میں لے جایا گیا جس کی وجہ سے ابراہیم کی جان میں جان آئی اور وہ بالکل فٹ ہو کر اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ شاہ زیب جاماجی کی سرزمین پر اپنے نام کے جھنڈے گاڑ کر پاکستان میں آ چکے ہیں۔ سجاول اور خورسنہ قریب آتے آتے پھر ایک دوسرے سے دور چلے گئے۔ اس کے بعد دوسری سلسلے وار کہانی عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد پڑھی۔ ایکشن سے بھرپور۔ دبنگ ہیرو شہزی نے موچھیل راٹھور نوید سا نچے والا اور اس کے کارندوں کی دھلائی کر کے پنکی، دانی اور ان کی ماں عارفہ کو بحفاظت اپنے گھر پہنچا دیا ہے۔ شہزی نے محب وطن ہونے کا ثبوت دیا اور نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیا۔ اگلی کڑی کا شدت سے انتظار ہے۔ اس کے بعد امجد رئیس کے قلم کا شاہکار آبلہ پا پڑھی۔ زبردست تحریر تھی۔ ریچر نے بڑی خوب صورتی سے سارے مسئلے کو حل کیا اور کارمن کو جیل سے آزادی دلوائی۔ ویلڈن! اس کے بعد چھوٹی تحریر جمال دستی کی خام خیالی پڑھی، زبردست تحریر تھی۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے کیونکہ بابرکت مہینا محرم الحرام بھی ہے جس میں مصروفیت ہوتی ہے۔‘‘

اسلام آباد سے سیدہ ایمانے زارا شاہ کی تنقیدی نظر ’’اسٹڈی روم سے برآمد ہوا۔ سرورق دیکھنے کی میں قائل نہیں ہوں اس لیے سرورق بلیک اینڈ وائٹ بھی ہو تو کوئی مسئلہ نہیں، تفرقے میں پڑی امت کو اپنا خون تو نظر آتا ہے مگر اپنے جیسے باقی مسلمانوں کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ نکتہ چینی میں جٹ کو پہلی پوزیشن پر مبارکباد۔ آپ کا تبصرہ معصومانہ سے لگا ہے۔ طلعت آپ بوریت اور دو دو تبصرے لکھنے کی خواہش ایک میرے لیے تبصرہ لکھ کر پوری کر لینا۔ منحہ رمشہ اتنی دعائیں؟ یقیناً ایگزامز کے بعد رزلٹ کے لیے آپ پورا 40 دن کا چلہ کاٹتی ہوں گی۔ نکتہ چینی میں اس مرتبہ اپنا نام دیکھ کر جتنی خوشی ہوئی اتنی تو مجھے پہلی دفعہ بھی نہیں ہوئی تھی۔ انگارے میں جان ڈیرک کے ڈیتھ اسکواڈ نے آمد کے ساتھ ہی ہلچل مچا دی اب آئے گا مزہ۔ ایکشن اور ہنگاموں سے بھرپور قسط پڑھ کر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اسکرین پر چلتی ہوئی فلم دیکھ رہی ہوں، گریٹ! ویری ویلڈن سر۔ انتخاب کے فلک شیر کے لالچ نے اس کے اپنے بچوں کی جان لی کیونکہ دنیا میں ابھی تک غربت اور بھوک کے علاوہ ایسی کوئی طاقت نہیں ہے جو ماں باپ کو لالچ دے کر

ان کی اولاد کا سودا کرلے، نہ ہی سکندر نے گن پوائنٹ پر فلک کو روکا تھا سو آدھا قصور تو فلک کا خود تھا۔ کہانی بہت جاندار تھی کیونکہ ایسی معاشرتی کہانیاں اکثر ہمارے شعور کی گہرائیوں کو ہٹ کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ مائیکرو ٹینشن کے تڑکے نے ہمیں آخر تک جکڑے رکھا لیکن ایک پوائنٹ جس کی مجھے شدت سے کمی محسوس ہوئی، وہ فلک کے کچھ مکالمے اور تاثرات تھے جہاں سے شک کا دائرہ اس کے اور اس کی بیوی کی طرف ہوا لیکن مکمل طور پر نہیں۔ دوسرا مجھے اینڈ پر اعتراض ہے کم از کم آخر میں تو سکندر کو ذرا عقل دے دیتے۔ اس کا انجام دیکھ کر افسوس ہوا۔ بہرحال یہی زندگانی ہے۔ لہو کی تاثیر کا اختتام اچھا تھا باقی کہانی تقریباً ایک فینٹسی تھی حقیقت سے کافی دور۔ جب بھی کوئی رائٹر کسی فوجی کو اس کے مشن سے ہٹا کر کسی دشمن ملک کی آفیسر سے محبت اور شادی میں مبتلا دکھاتے ہیں تو ایسی کہانی کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اگر غور کیا جائے تو ایک کرنل پاکستانی فوجی کو پہچان تک نہیں سکا۔ پھر سریندر تو عقل سے پیدل تھا یا ہم قارئین ہیں جب میجر عثمانی خود کو دلیر سنگھ بتاتا ہے اور ساتھ میں یہ انکشاف کہ سیتا مسلمان ہو چکی ہے۔ سکھ سے شادی کرنے کے لیے مسلمان؟ امجد رئیس کی آبلہ پا فینٹاسٹک تھی۔ ریچر کی ذہانت اور معاملہ فہمی کو داد دینی پڑے گی۔ فاروق انجم کی فرار مزاحیہ ڈرامائی کہانی تھی۔ ضرغام کے کسی ایک ایکشن اور مکالمے سے بھی نہیں لگ رہا تھا وہ کوئی گینگسٹر ہے سوائے ایک اکلوتے قتل کے جو خانہ پُری تھی۔ کافی بچکانا تاثر لیے ہوئے تھی۔ ناکام کامیابی اور بامحاورہ نسبتاً اچھی تحاریر تھیں۔"

ہری پور سے شاہد ذوالفقار کی کوشش "اس بار کا ٹائٹل بہت پیارا لگا۔ ٹائٹل گرل کے بالوں کا جوڑا، لمبی صراحی دار گردن، گہری آنکھیں سب کچھ دل میں کھب جانے والا تھا۔ ماسک والا بندہ بھی دیکھ کے لگ رہا تھا کہ یہ جاسوسی کا ہی ٹائٹل ہے۔ محرم کی چھٹیوں میں اس بار ڈائجسٹ پڑھا اور کافی زیادہ پڑھ لیا۔ اے آر جٹ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ نصیر احمد نے بھی اچھا لکھا۔ ایمانے زارا، تین مہینوں میں دوبار میں نے پراٹھوں والا محاورہ استعمال کیا تو آپ بور ہو گئیں۔ افسوس ہوا جان کے۔ طلعت مسعود، ثانیہ مہر، نعمان، اشفاق شاہین، اقبال اور کوثر اسلام کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آخری کہانی انتخاب پڑھی۔ کبیر عباسی کا نام دیکھ کے ہی پتا چل جاتا ہے کہ کہانی بہت اعلیٰ ہوگی۔ کہانی کا پہلا پیراگراف پڑھ کے ہی تجسس پیدا ہو گیا۔ کہانی آگے بڑھتی گئی۔ دلچسپی اور تجسس بھی اور بڑھتا گیا اور اینڈ تک پہنچتے پہنچتے دلچسپی اور تجسس عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اینڈ اتنا مزے کا ہوا کہ میں کافی دیر تک کہانی کے نشے میں کھویا رہا۔ میں کیا بتاؤں کہ یہ کہانی پڑھ کے مجھے کتنا مزہ آیا، میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں۔ میں خود سکندر جیسے ہی ایک شخص کے ظلم کا ستایا ہوا ہوں۔ اس کے انجام سے مجھے بہت سکون ملا۔ میں اس کہانی کو کبھی بھول نہیں سکوں گا۔ پہلا رنگ فرار بھی مزے کا تھا۔ ایسی کہانیاں اکثر پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ یہ دو کہانیاں پڑھ کے فیس بک پر پوسٹ لگائی کہ اور کون سی کہانی مزے کی ہے تو کسی نے بتایا کہ لہو کی تاثیر بھی مزے کی ہے، میں نے وہی پڑھنا شروع کر دی۔ واقعی پڑھ کے مزہ آ گیا۔ اچھی تحریر تھی۔ پہلی کہانی آبلہ پا پڑھنا شروع کی لیکن بڑی مشکل سے چند صفحے ہی پڑھ سکا۔ مجھے اس کی سمجھ ہی نہیں آرہی تھی۔ مجبوراً بیچ میں چھوڑنا پڑی۔ منظر امام کی بامحاورہ پڑھ کے بھی مزہ آیا۔ چھٹیوں میں اتنا ہی ڈائجسٹ پڑھ سکا۔ اس کے بعد موقع ہی نہیں ملا۔ اگلی بار کوشش کروں گا کہ زیادہ کہانیوں پر تبصرہ کروں۔"

فیصل آباد سے اے آر جٹ کے انداز "اکتوبر کا شمارہ اٹھائیس تاریخ کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل جاسوسی کے لحاظ سے پرفیکٹ تھا۔ ایک خوبصورت حسینہ اور ایک بھیانک نقاب پوش قاتل۔ جہاں حسینہ کی آنکھ نہایت خوبصورت تھی وہیں نقاب پوش کے نقاب کے پیچھے آنکھیں عجیب لگ رہی تھیں، سب سے پہلے نکتہ چینی میں اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی وہ بھی صدارتی کرسی پر، بہت بہت شکریہ، ادارے کا میرا مان رکھنے کے لیے۔ نصیر احمد اور طلعت کا تبصرہ بہترین تھا۔ ایمانے نے بھی خوب لکھا جبکہ کوثر صاحب کا تبصرہ تھوڑا مختصر تھا۔ باقی سب کی شرکت بھی بھرپور رہی۔ سب سے پہلے انتخاب کا انتخاب کیا اور پڑھنے کے بعد اپنے انتخاب پر رشک ہوا۔ ایک لازوال تحریر۔ جس میں سسپنس بھی تھا اور ایک سبق بھی۔ جاسوسی تحریر کی سب سے بڑی خوبی اس کی شروعات ہوتی ہے۔ شروعات ہی یہ طے کرتی ہے کہ آپ کا ریڈر ایک ہی نشست میں کہانی ختم کرتا ہے یا زیادہ نشستوں میں اور انتخاب کی شروعات بہت جاندار تھی۔ دوسری بات ہے رائٹر کا اپنے ریڈر کو الجھائے رکھنا تاکہ وہ آخر تک نہ جان پائے کہ اس سب کے پیچھے ہاتھ کس کا تھا۔ ابتدائی صفحات پہ آبلہ پا شروع میں لگا ٹام کروز کی مشہور فلم کا ترجمہ ہے اس لیے چھوڑ دی دوبارہ شروع کی تو معلوم ہوا کہ ایک شاندار تحریر تھی۔ کہانی کے کردار بہت اعلیٰ تھے اور جو دوسری چیز تھی، وہ تھا تسلسل۔ ہر سین کا دوسرے سین کے ساتھ کنکشن بہت اچھے سے تھا۔ فرار، فاروق سر کے قلم سے نکلی تحریر۔ آسان سی سادہ سی تحریر۔ شروعات سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ ایسا محسوس ہوا کہ ایک طویل سی کہانی میں سے ایک سین لے کر اسی پر پوری تحری لکھ دی ہو۔ لہو کی تاثیر 1965ء کے پس منظر میں لکھی گئی اچھی تحریر تھی۔ گو کہ بہت زیادہ سسپنس نہیں تھا لیکن اس کہانی میں روانی تھی تسلسل تھا جس کی وجہ سے ایک ہی نشست میں ختم کر دی۔ انگارے کا کیا کہوں میں...... مغل اعظم کی کسی تحریر کے بارے میں لکھنا بھی ایک مشکل کام ہی ہے شاید آپ حق ادا نہ کر سکیں۔ شروعات سے یہ کہانی نہیں پڑھی اس لیے زیادہ نہیں لکھ سکتا لیکن ایک تیز رفتار ایکشن سے بھرپور کہانی کے کچھ سینز تو بہت ہی کمال کے تھے۔ بامحاورہ ایک کھلکھلاتی ہوئی تحریر لیکن زیادہ امپریس نہ کر سکی۔ آتش زن اور بلیک میلر دونوں کہانیوں کا سسپنس خوب تھا لیکن کرداروں کے اتنے مشکل نام پڑھ کے مجھے الجھن سی ہونے لگتی ہے۔ خام خیالی بھی ایک اچھی تحریر تھی جبکہ بھونک اور دوسرا جرم بھی زیادہ متاثر نہ کر سکیں۔ اوور آل اس ماہ کا ڈائجسٹ کافی بہتر رہا۔ اور ہاں ایک بات کی سمجھ نہیں آئی بیک ٹائٹل پہ اتنی زیادہ لڑکیوں کے ہونٹ اور لپ اسٹک کس لیے؟"

صوابی سے کوثر اسلام کا خلوص "جاسوسی اس بار بروقت مل گیا۔ سرورق پچھلے شماروں کی نسبت منفرد اور دیدہ زیب تھا۔ سفید ماسک پہنے

اغوا کار کو اونی ٹوپی پہنانا آپ بھول گئے۔ سب سے پہلے درد سے لبریز اداریہ پڑھا۔ واقعی مسلم امہ کی حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے...... فرقہ فرستی اور لسانی و گروہی اختلافات نے ہماری بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اتفاق و یکجہتی کی کوئی سبیل دور دور تک نظر نہیں آتی۔ محفل چینی نکتہ چینی میں قدم رکھا تو اوے آرجٹ کو مسندِ صدارت پر براجمان پایا۔ خوش آمدید اوے آرجٹ بھائی۔ ہم ہر بار آپ کی شوخیوں کا انتظار کریں گے۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے چوہدری نصیر کے ساتھ ذیشان حیدر اور ایمانے زارا شاہ کے تبصرے دلچسپ تھے۔ جنٹلمین طلعت مسعود کی نپی تلی باتیں دل کو بھاتی ہیں۔ تمام دوستوں کی مہکتی ہوئی باتوں نے محفل کو چار چاند لگا دیے۔ سرورق کی پہلی کہانی فرار دلچسپ کہانی تھی۔ ہمت، عزم اور بلند حوصلے کی بدولت انسپکٹر منصور نے ضرغام جیسے سفاک مجرم کو قابو کیا۔ کہانی میں جہاں جہدِ مسلسل اور بلند ہمتی کا سبق تھا وہاں ہمارے پولیس سسٹم میں موجود سقم اور نقص کو بھی عیاں کیا گیا۔ قانون کے رکھوالے جب چند ٹکوں کے عوض اپنا ضمیر بیچ کے مجرموں کے آلۂ کار بن جائیں تو پھر ملک اور سسٹم کا اللہ ہی حافظ ہے۔ ضرغام کا انسپکٹر منصور کی بہن کے گھر جانے کا اتفاق زیادہ متاثر کن نہیں تھا۔ آخر میں ضرغام کو پولیس نے کیسے قابو کیا جبکہ اس کے پاس کول تھی اور اس پر اس نے ریوالور تانا ہوا تھا۔ کہانی آخر میں عجلت کے ساتھ سمیٹی گئی۔ سرورق کی دوسری کہانی انتخاب، بہت زبردست اور کمال کی کہانی تھی۔ تجسس آخر تک برقرار رہا۔ منظر نگاری بھی بہت عمدہ تھی۔ طاقت کے نشے میں انسان بھول جاتا ہے کہ اس کے اوپر بھی ایک طاقتور ذات ہے جس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اور جب اس کے انصاف کا تازیانہ مجرم کی پیٹھ پر پڑتا ہے تو وہ حاکم سے محکوم، طاقتور سے کمزور اور خاص سے عام بن جاتا ہے...... اور بقول مصنف حاکم سے محکوم بن جانے کا یہ سفر کسی کے لیے بھی قابلِ برداشت نہیں ہوتا۔ کہانی میں سکندر کو مظلوم دکھایا گیا ہے جس کے ساتھ ابتدا میں تھوڑی بہت ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ کہانی میں کچھ جملے بہت پسند آئے جیسے ''ایک اور سکندر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو گیا'' کہانی نے اس حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا کہ اس مشینی دور میں ہر شخص کی پہلی ترجیح یہی کاغذی نوٹ ہی ہیں۔ کہانی نے دل و دماغ پر اپنی چھاپ چھوڑ دی۔ بھونک بہت عمدہ کہانی تھی۔ مارتھا نے اپنی ذہانت اور بصیرت کے بل بوتے پر لاینحل کیس حل کر دیا جسے حل کرنا شیرف جیسے شخص کے لیے ناممکن تھا۔ جاسوسی مزاج افراد کے لیے اس کہانی میں بہت کچھ تھا۔ بلیک میلر اچھی کہانی تھی مگر اختصار کے باعث سمجھنے میں دشواری پیش آئی۔ آتش زن ایک سبق آموز کہانی تھی۔ بعض لوگ معمولی باتوں کا بڑا خوفناک انتقام لے لیتے ہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں سے محتاط رہنا چاہیے بلکہ زندگی میں عادت ڈالنی چاہیے کہ ہماری زبان اور ہاتھ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ کیا پتا ایک معمولی بات ہمارے لیے زندگی بھر کا پچھتاوا بن جائے۔ خام خیالی ایک خوبصورت مختصر کہانی تھی۔ جرم چاہے جتنی بھی ہوشیاری اور سات پردوں میں کیا جائے وہ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ ایلکس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لہو کی تاثیر نے بہت متاثر کیا۔ سکھوں سے اتنی ہمدردی کی امید نہیں تھی۔ ایک میجر ہوتے ہوئے بھی میجر عثمانی نے کتنی آسانی سے سیتا کے سامنے سچ اگل دیا۔ عورت اپنی محبت کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی ہے اس کی مثال کہانی میں بخوبی مل گئی۔ اکتوبر کا شمارہ مجموعی طور پر شاندار تھا۔''

سیف خان کی کوئٹہ سے کھری کھری باتیں ''سیف خان نے نیٹ پر رسائل کے غیر قانونی اجراء کے حوالے سے بہت دردمندانہ میل بھیجی ہے جس میں کاپی رائٹ کی PIRACY اور سائبر کرائم کے حوالے سے تجاویز بھی دی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایسے بلا اختیار اقدامات اس ادارے اور رسائل کے لیے بہت نقصان دہ ہیں۔ ادارہ فوری طور پر اس سلسلے میں کارروائی کرے گا۔ کہانیوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں انتخاب آپ کی جانب سے رنگوں میں ایک بہترین انتخاب تھا جس نے دل خوش کر دیا اور اس کی بھول بھلیوں میں کھو کر ذہنی کوفت سے نجات ملی۔ انگارے اس بار سو پر سے بھی اوپر تھی۔ قسطینا سے جدائی ہمارے دل میں دراڑ ڈال رہی تھی اور یہ ٹیکساری گینگ کیا بلا ہے؟ میرے تو پڑھتے پڑھتے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بہترین سلسلہ ہے اس کو مزید کوئی دس سال جاری رہنا چاہیے اور پلیز احمد اقبال یا اقلیم علیم کا کوئی سنسنی خیز قسط وار سلسلہ شامل کریں۔ اگلی بار بھرپور تبصرے کے ساتھ شامل ہونے کی کوشش کروں گا بشرطے کہ شمارہ وقت پر دستیاب ہو جائے۔ جو کچھ بھی کہا ادارے کی محبت میں کہا۔ اگر کوئی بات بری لگے تو سخت معذرت خواہ ہوں۔''

مومنہ کشف کی بہاولپور سے گولہ باری ''چینی نکتہ چینی میں سب مجھے بھول کر اپنے گن گا رہے تھے اس لیے میں نے بھی سب کو گولا مار دیا ہے اور کسی کا بھی نام نہیں لوں گی۔ کہانیوں میں اس بار آپ نے دل خوش کر دیا۔ میرے پسندیدہ رائٹر امجد رئیس کی کہانی نے بڑا مزہ دیا۔ میں نے پوری کہانی سب سے پہلے پڑھی۔ بہت اچھی تھی۔ ٹام کروز نے جیک ریچر والی فلموں میں کام کیا ہے لیکن یہ ناول تو فلموں سے بھی زیادہ مزے کا تھا۔ اس بار آپ نے میرے فیورٹ جولیس آرچی کے ساتھ ساتھ شرمین ہومز کی کہانی بھی شامل کی۔ مجھے یہ دونوں سیریز بڑی اچھی لگتی ہیں۔ آپ ہر ماہ ان کو شامل کیا کریں۔ دوسری انگلش کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ انگارے اتنی اسپیڈ سے چل رہی تھی اس بار کہ بس کیا بتاؤں۔ مجھے تاجور کا بابا بالکل بھی اچھا نہیں لگا اور تاجور تو ویسے ہی زہر لگتی ہے۔ اس کی وجہ سے شاہی نے اپنی قسطینا کو بھی چھوڑ دیا۔ ہائے اللہ مجھے بڑا ہی رونا آیا تھا۔ طاہر انکل میری جیسی معصوم لڑکیوں کو بڑا رلاتے ہیں لیکن اچھے بھی بہت لگتے ہیں۔ آوارہ گرد ہمیں پسند نہیں اس لیے پڑھتے نہیں۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

انجم فاروق ساحلی، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔ احسان سحر، میانوالی۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال۔ محمد اقبال، کراچی۔ کاشف رفیق، کوٹری۔ انصار احمد، کراچی۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔

مردِ آہن

ایچ اقبال

ہاتھ معجز نما ہوں تو سانپ کا زہر بھی تریاق بن سکتا ہے ... اور اگر کسی بے وقوف کے ہاتھ میں پڑ جائے تو شہد بھی نقصان دہ ہوجاتا ہے... ہمارے اردگرد کے ماحول میں رچی بسی تحریر... وہ جنون پسند تھا... اپنے نظریات و خیالات کے زیرِ اثر سب کے ذہنوں پر اپنی حکمرانی چاہتا تھا... وہ ایسے موذی سانپ کے مانند تھا جو اپنی راہ میں آنے والے کسی بھی جاندار کو ڈس لیتا ہے... مگر ہر سانپ کے لیے کوئی نہ کوئی لاٹھی ضرور ہوتی ہے... اس کی سیاہ کار زندگی کے خاتمے کے لیے ایک مردِ آہن جنم لے چکا تھا...

ملک و قوم کی زندگی میں تغیرات و بھونچال لانے والے شرپسندوں کا کھیل......

وہ کوئی خاص بات نہیں تھی، ایک عام سا واقعہ تھا لیکن اس نے دلاور کے مستقبل پر ہی نہیں، ساری زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔

رات کے دس بجے تھے۔ دلاور ایک ایسی سڑک پر چہل قدمی کر رہا تھا جس کے دائیں بائیں شاندار کوٹھیاں اور بنگلے تھے۔ وہ سارا علاقہ تھا ہی نہایت متمول لوگوں کا یا اُن بڑے سرکاری افسران کا جو حد درجہ رشوت خور تھے۔ کوئی بنگلا ایسا نہیں تھا جس کی قیمت کروڑوں میں نہ ہو۔

جس سڑک پر دلاور چہل قدمی کر رہا تھا، وہ اس علاقے کی کوئی مرکزی سڑک نہیں تھی جہاں رات کے بارہ بجے بھی اچھا خاصا ٹریفک ہوتا تھا۔ یہ وہاں کے بنگلوں کی ایک درمیانی سڑک تھی جہاں رات کے بعد اِکّا دُکّا ہی کاریں آتی جاتی نظر آتی تھیں یا مکمل سناٹا ہوتا تھا۔

دلاور بھی اسی علاقے میں رہتا تھا۔ اس کے والد فوج میں تھے، لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ سال بھر پہلے انہیں ایک خفیہ ادارے کا سربراہ بنا دیا گیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ دلاور کو کیڈٹ کالج میں داخلہ دلائیں لیکن دلاور اپنے باپ کی طرح فوج میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کا مزاج آرٹسٹک تھا۔ اسے فنونِ لطیفہ سے دلچسپی تھی لیکن اس کی شخصیت میں تضاد بھی بلا کا تھا۔ مہم جوئی کا عنصر آرٹسٹک ذہن

رکھنے والوں میں کم ہی پایا جاتا ہوگا۔ دلاور میں وہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ کالج میں اکثر اس کے جھگڑے ہوتے رہتے تھے اور اس سے جھگڑا کرنے والے لڑکے کو اچھی خاصی چوٹیں کھانی پڑتی تھیں۔ بعض کو تو کچھ دن اسپتال میں بھی گزارنے پڑ جاتے تھے لیکن جب کالج کی انتظامیہ معاملے کی تحقیقات کرتی تھی تو دلاور کو بے قصور پاتی تھی۔ جھگڑے میں پٹنے والا ہی غلطی پر ہوتا تھا۔ اسی لیے دلاور کے خلاف کبھی کوئی تادیبی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ وہ لیفٹیننٹ جنرل اسد بٹ کا بیٹا تھا۔

کالج میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جو لڑکے اس سے بے تکلف تھے، وہ مذاق مذاق میں اس سے پوچھا کرتے تھے کہ اس نے لڑائی بھڑائی کی تربیت کسی مارشل آرٹ کے اسکول سے لی ہوگی۔ ان کا یہ خیال اس بنا پر تھا کہ وہ کئی کئی لڑکوں پر اکیلا ہی بھاری پڑتا تھا۔ اس کو لڑتا دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی ایکشن فلم کا ہیرو ہو جس کے سامنے دس بیس بھی نہیں ٹھہر سکتے لیکن حقیقت یہ تھی کہ فائن آرٹ کے ساتھ ساتھ لڑائی بھڑائی کا عنصر بھی اس کے مزاج میں قدرتی طور پر تھا جو اس رات سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے بھی اس کے کام آیا۔

ایک لڑکی ایک بنگلے سے نکلی تھی اور دلاور کی مخالف سمت میں چل دی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز چہل قدمی کا نہیں تھا۔ وہ عجلت میں معلوم ہوتی تھی۔ اس کا تعلق یقیناً کسی آسودہ حال گھرانے سے نہیں ہوسکتا تھا ورنہ اس کے پاس کار ہوتی۔ وہاں وہ کسی سے ملنے آئی ہوگی۔ تین چار فرلانگ کے بعد وہ اس سڑک پر پہنچ جاتی جہاں ابھی خاصا ٹریفک تھا۔ وہاں سے اسے ٹیکسی اور بس بھی کچھ مل جاتا۔

لیکن ابھی وہ مشکل سے پندرہ بیس قدم چلی تھی کہ ایک کار بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دلاور کے برابر سے نکلی اور پھر بہت تیزی سے اس کی رفتار کم بھی ہوتی چلی گئی۔ دلاور کی چھٹی حس نے یقین دلا دیا کہ وہ اس لڑکی کے قریب جا کر رکے گی۔

ایسے آوارہ گردوں کے قصے دلاور کے علم میں تھے جو سنسان مقامات پر لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتے ہیں یا کچھ اور حدود بھی پار کر جاتے ہیں یا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دماغ میں موجود انہی خیالات کی وجہ سے دلاور نے اپنی رفتار اتنی تیز کی جسے دوڑنا کہا جاسکتا تھا۔

وہ بروقت لڑکی کے قریب پہنچا۔ کار لڑکی سے ذرا آگے جا کے رُکی تھی۔ رکتے ہی اس میں سے دو آدمی اُترے اور لڑکی پر جھپٹے۔ لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی تو ان دونوں نے اسے جکڑ لیا۔

''بچ......'' لڑکی نے چیخنے کی کوشش کی تھی لیکن یقیناً اس کا منہ دبا دیا گیا ہوگا۔

دلاور کا فاصلہ چار پانچ قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ ان دونوں آدمیوں نے یقیناً اسے دیکھ بھی لیا ہوگا لیکن اس کی پروا نہیں کی تھی۔

عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگ ایسے واقعات سے دور ہی رہتے ہیں لیکن دلاور ایسے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے ایسے چھلانگ لگائی جیسے عقاب کسی پر جھپٹتا ہو۔

وہ دونوں لڑکی کو اٹھا کر یقیناً کار ہی میں لے جانا چاہتے تھے۔ یہ سراسر اغوا کا معاملہ تھا۔ وہ دونوں اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ ایک کی گردن پر دلاور کی کلائی اور دوسرے کے جبڑے پر گھونسا اتنی زور سے پڑا تھا کہ لڑکی ان کی گرفت سے نکل گئی۔ وہ دونوں لڑکھڑا کر گرتے گرتے سنبھلے اور غلیظ گالیاں بکتے ہوئے دلاور پر جھپٹے۔ یہ ان کی غلط فہمی تھی کہ ان کا تصادم کسی عام نوجوان سے ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کے پیٹ پر دلاور کی لات پڑی اور وہ کراہتا ہوا اپنی کار سے جا ٹکرایا۔ دوسرے کے جبڑے پر دائیں بائیں گھونسے پڑے اور وہ سڑک پر گر گیا، کیونکہ تیسرا گھونسا اس کی کنپٹی پر پڑا تھا۔

لڑکی ایک طرف کھڑی خوف سے کانپ رہی تھی۔ اسے وہاں سے بھاگنا چاہیے تھا لیکن خوف کی شدت سے اس کے قدم زمین سے جکڑ کر رہ گئے تھے اور وہ چیخنے چلانے سے بھی قاصر ہوگئی تھی۔

کار سے ان دونوں کا تیسرا ساتھی اُترا۔ وہ دلاور کے مقابل اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا چاہتا ہوگا۔ اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز کے ساتھ ''کون ہے، کون ہے'' کی ہانک بھی لگائی گئی تھی۔ وہ غالباً آس پاس کے گھروں کے چوکیدار ہوں گے۔

یہ صورتِ حال بنی تو ان تینوں نے وہاں سے بھاگ نکلنے ہی میں اپنی عافیت جانی۔ تیسرا آدمی واپس کار میں چلا گیا اور جن کی پٹائی دلاور کے ہاتھوں ہوئی تھی، وہ بھی کار کی طرف جھپٹے۔

دلاور نے ان کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی اور لڑکی کی طرف پہلی بار متوجہ ہوا۔

وہاں بہت تیز روشنی تو نہیں تھی لیکن اتنی کم بھی نہیں تھی

کہ دلاور لڑکی کو پہچان نہیں پاتا۔ وہ یونیورسٹی میں اس کی کلاس فیلو سعیدہ تھی جس نے دلاور کو بھی پہچان لیا تھا۔

''تم!'' سعیدہ کے منہ سے نکلا۔

اس وقت پانچ چوکیدار ان کے قریب آ گئے۔ سبھی نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ معاملے کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

''وہ بدمعاش ان صاحبہ کو اغوا کرنا چاہتے تھے۔'' دلاور نے انہیں جواب دیا۔ ''میں نے پٹائی کی تو بھاگ نکلے۔''

''بھاگ نکلے یا سب کچھ تمہارے منصوبے کے مطابق ہوا؟'' سعیدہ اچانک غصے سے بولی۔ ''اس قسم کے سین میں فلموں میں دیکھ چکی ہوں۔''

''ارے!'' دلاور حیرت سے بولا۔ ''یہ تم کیا سمجھ رہی ہو سعیدہ؟''

''میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں۔ تم مجھے اس طرح متاثر کرنا چاہتے ہو؟'' سعیدہ نے کہا اور پھر مڑ کر تیزی سے اسی طرف چل پڑی جدھر جا رہی تھی۔

''یہ کیا معاملہ ہے صاب جی؟'' ایک چوکیدار نے پوچھا۔ ''آپ جانتے ہو ان میم صاب کو؟''

''ہاں۔'' دلاور نے اتنا ہی کہا اور سعیدہ کے پیچھے چل پڑا۔

اس وقت کچھ گھروں کے مکین بھی نکل آئے تھے۔ وہ بھی دلاور سے سوالات کرتے جن سے دلاور بچنا چاہتا تھا۔ دوسرے اسے سعیدہ کی بھی فکر تھی۔ اسے شک تھا کہ وہ بدمعاش شاید کسی جگہ رک گئے ہوں اور ایک بار پھر سعیدہ کو اغوا کرنا چاہیں۔

''اب میرا پیچھا مت کرو!'' سعیدہ مڑ کر غصے سے بولی۔ اس نے دلاور کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔

''جب تم بڑی سڑک پر پہنچ جاؤ گی تو پھر میں تمہیں نہیں دکھائی دوں گا۔'' دلاور نے جواب دیا۔ اسے افسوس ہوا تھا کہ سعیدہ اس صورتِ حال سے غلط نتیجہ اخذ کر بیٹھی تھی۔

سعیدہ نہ جانے کیا بڑبڑاتی ہوئی پہلے سے زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔

دلاور نے اپنی رفتار کم کر دی۔ یونیورسٹی میں بھی سعیدہ اس پر کئی مرتبہ ناراض ہو چکی تھی لیکن یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ دلاور اس کی محبت اپنے دل سے نکال دیتا۔ وہ اس کی پور پور میں رچ بس چکی تھی۔

بڑی سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ وہاں سعیدہ نے ایک آٹو رکشا روکا اور روانہ ہو گئی۔ وہ رہتی بھی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں تھی۔

دلاور ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔

☆☆☆

وہ ایک عجیب ہی جگہ تھی۔ ڈیڑھ ہزار مربع فٹ سے کم تو نہ ہو گی۔ وہاں پھولوں اور پودوں کے درمیان راہداریاں تھیں۔ اسے کوئی پارک اس لیے نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ اس کے اوپر چھت بھی تھی اور وہ بھی لگ بھگ اسّی فٹ کی بلندی پر جہاں لگی ہوئی برقی روشنیاں اتنی تیز تھیں کہ وہاں کا ہر گوشہ اتنا منور تھا کہ دن ہونے کا گمان کیا جا سکتا تھا حالانکہ اس وقت رات کے بارہ بجنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔

عین وسط میں اس قسم کا ایک بستر تھا جیسے عموماً کسی ''بیچ'' کے کنارے ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جو بیچ پر غسل کرنے یا تیرنے کے بعد وہاں لیٹ کر دھوپ سینکتے ہیں۔ اس بستر کے دائیں جانب ایک ٹیبل بھی تھی جس پر مختلف قسم کی چیزوں کے ساتھ ایک ٹی وی سیٹ بھی رکھا تھا۔

اس بستر پر نیم دراز شخص کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کے بڑے بڑے گھونگریالے بال برف کی طرح سفید تھے۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ تھا۔ ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے عریاں تھیں کیونکہ وہ باتھ گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ اس کی پشت پر ایک بڑا سوئمنگ پول تھا اور سامنے ایک خاصا بڑا حوض جس کے شفاف پانی میں چھ سات مگرمچھ تیر رہے تھے۔

اپنے دانتوں میں دبا ہوا پائپ نکال کر سفید بالوں والے نے اپنے قریب کھڑے ہوئے دو مؤدب افراد کی طرف دیکھا اور اس طرح بھویں اچکائیں جیسے سوال کر رہا ہو۔

ان دونوں آدمیوں نے سر گھما کر ایک جانب دیکھا۔ سفید بالوں والے کی نظریں بھی اسی طرف گئیں۔ اس طرف سے تین افراد آگے بڑھتے نظر آ رہے تھے۔ وہ پودوں کی ایک درمیانی روش پر چلتے ہوئے قریب آ کر رک گئے۔

یہ وہ تینوں آدمی تھے جنہوں نے سعیدہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور ان ہی میں سے دو کو دلاور نے بُری طرح پیٹ ڈالا تھا۔ ان دونوں کی ہیئت کذائی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ناکامی کے بعد سیدھے وہیں آئے

تھے۔ جن دو آدمیوں کی دلاور نے پٹائی کی تھی، ان میں سے ایک کا چہرہ خاصا سوجا ہوا تھا۔ ایک آنکھ پر بھی اتنی سوجن تھی کہ وہ بند ہوئی جارہی تھی۔ ان تینوں ہی کے چہروں سے خوف اور حواس باختگی مترشح تھی۔

سفید بالوں والا خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ان تینوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''خوش ہوا ایکس مین، خوش ہوا کہ تم دونوں کی یہ حالت چھبیس ستائیس سال کے ایک لونڈے نے بنائی ہے۔ تم نے فون پر یہی عمر بتائی تھی نا؟''

نظریں اس شخص کے چہرے پر جم گئیں جو واقعے کے وقت، بعد میں کار سے نکلا تھا۔

''جی ماسٹر!'' اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''جب ان دونوں کا اس سے جھگڑا ہو رہا تھا، میں نے وڈیو بنالی تھی۔ وہ چھبیس ستائیس سال سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا۔''

''ایکس مین اسے دیکھنا پسند کرے گا۔''

''جی ماسٹر!''

وہ آدمی قریب آیا اور اس نے نہایت جدید طرز کا چھوٹا سا وڈیو کیمرا سفید بالوں والے کے بائیں ہاتھ کی تپائی پر رکھ دیا۔

ایک تپائی سفید بالوں والے کے دائیں ہاتھ پر بھی تھی جس پر گوشت کے بڑے بڑے پارچے رکھے ہوئے تھے۔ باتوں کے دوران میں وہ ایک ایک پارچہ اٹھا کر حوض میں پھینکتا رہا تھا اور مگرمچھ اس پارچے پر جھپٹتے رہے تھے۔

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا۔'' سفید بالوں والے نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''اس معاملے کا انچارج میں نے کسے بنایا تھا؟''

''مجھے...... ماسٹر!'' کیمرا دینے والا تھوک نگل کر بمشکل بول سکا۔

''ہوں۔'' سفید بالوں والے نے آہستگی سے سر ہلایا۔ ''میرے بالکل سامنے آکر کھڑے ہو اور میرے دو ایک سوالوں کا جواب دو۔'' وہ اتنے اطمینان سے بول رہا تھا جیسے گپ شپ کررہا ہو۔

کیمرا دینے والا ہچکچاتا ہوا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

''تم انچارج تھے۔'' سفید بالوں والے نے ایک پارچہ حوض کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے یہ دونوں پٹتے رہے اور تم کار میں بیٹھے اس یادگار منظر کی فلم بناتے رہے۔ کیا تمہیں فوری طور پر ان کی مدد کے لیے نہیں پہنچنا چاہیے تھا؟''

''جی...... جی...... ماسٹر!...... غلطی ہوئی مجھ سے......''

''اور سعیدہ بھی ہاتھ نہیں آسکی۔ بڑے دنوں کے بعد یہ موقع آیا تھا کہ وہ یونیورسٹی سے نکل کر کہیں گئی تھی۔''

''جی...... جی...... جی......''

''مجھے ذہنی جھٹکا لگا تھا یہ خبر سُن کر۔''

سامنے کھڑا ہوا آدمی اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

''اس خوشی میں......'' سفید بالوں والا پھر بولا۔ ''کیوں نا تمہاری ملاقات ان مگرمچھوں سے کروا دی جائے!''

''ماسٹر!'' گڑگڑانے کا سا انداز تھا اور چہرے پر سفیدی چھاگئی تھی۔

سفید بالوں والے کا بایاں ہاتھ اسی جانب لٹکا ہوا تھا۔ اس کی انگلی ایک بٹن پر گئی۔ پھر بٹن دبا اور سامنے کھڑے ہوئے شخص کے نیچے کا ٹائل اس طرح اوپر اٹھا جیسے اسے کسی اسپرنگ نے اچھالا ہو۔ وہ ٹائل اس زاویے سے اور اتنی زور سے اٹھا تھا کہ اس پر کھڑا ہوا شخص فضا میں اُچھلا اور حوض میں جاگرا۔ مگرمچھ اس پر جھپٹ پڑے۔

چیخیں......! چیخیں......!

وہاں چند ہی افراد تھے۔ ان سب کے چہرے جیسے پتھرا کررہ گئے۔

سفید بالوں والا اٹھا۔ سلیپر پہنتے ہوئے اس نے وڈیو کیمرا اٹھایا اور ایک جانب چل پڑا۔ جو مگرمچھوں کے حوض میں گرا تھا اس کی چیخیں یکایک ختم ہوگئیں۔ غالباً اس کی کھوپڑی ہی کسی مگرمچھ نے چباڈالی ہوگی۔

سفید بالوں والا ان دونوں آدمیوں کے قریب سے گزرا جو دلاور سے پٹ کرآئے تھے۔

''اپنا حلیہ ٹھیک کرو، ڈریسنگ کرواؤ جاکے۔'' سفید بالوں والے نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ان دونوں کے چہروں کی اُڑی ہوئی رنگت بحال ہوگئی۔ اس سے پہلے شاید ان کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ ان کے ایک ساتھی کے بعد ان کی باری بھی آسکتی ہے۔

سفید بالوں والا اس کشادہ جگہ کی دیوار تک پہنچ گیا جہاں ایک دروازہ تھا۔ وہ اس میں داخل ہوا۔ سامنے ہی

ایک اور دروازہ تھا جو ایک لفٹ کا تھا۔ سفید بالوں والا لفٹ میں سوار ہوا۔ ایک بٹن دبانے سے لفٹ اوپر اٹھنا شروع ہوئی۔

یہ سفاک شخص اپنے لوگوں میں ''ایکس مین'' کہلاتا تھا۔ جب لفٹ رکی تو وہ باہر نکلا۔ ایک چھوٹی سی راہداری طے کر کے وہ جس کمرے میں داخل ہوا، وہ ایک پُرآسائش خواب گاہ تھی۔ یہاں بھی تیز برقی روشنی تھی۔ ایکس مین کو ایسی ہی روشنی پسند ہوگی۔

کیمرا ایک طرف رکھ کر اس نے کھڑکی کے دبیز پردے سرکائے۔ وہ کسی عمارت کی اوپری منزل پر تھا۔ کھڑکی سے دور تک کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ شہر کی ایک متمول آبادی کا علاقہ تھا۔

کھڑکی سے ہٹ کر وہ کیمرے کے قریب گیا۔ وہیں ایک نہایت قیمتی کمپیوٹر رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی پرنٹر بھی......!

ایکس مین نے بستر پر لیٹ کر کیمرا اٹھایا۔ وڈیو فلم دیکھی۔ اسے صحیح بتایا گیا تھا کہ اس نوجوان کی عمر ستائیس سال سے زیادہ نہیں۔ ایکس مین کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس نوجوان نے اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کی تربیت حاصل کی ہوگی۔ وہ جس طرح دونوں کی پٹائی کر رہا تھا، وہ کسی عام نوجوان کے بس کی بات نہیں تھی۔ وڈیو دیکھنے کے بعد ایکس مین نے اس نوجوان کا ایک ''اسنیپ شاٹ'' اس طرح لیا کہ نوجوان کا چہرہ اس میں صاف نظر آسکے۔ پھر اس نے واٹس ایپ پر کسی سے رابطہ کیا۔

''میں نے غالباً آپ کی نیند خراب کی۔'' رابطہ قائم ہونے پر اس نے کہا۔ ''دراصل ایک بہت ضروری کام آپڑا ہے۔ میں آپ کو ایک تصویر بھیج رہا ہوں۔ مجھے جلد از جلد معلوم کرنا ہے کہ یہ نوجوان کون ہے۔ شناختی کارڈ والوں کے دفتر سے اس کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن اس وقت تو یہ ممکن نہیں ہوگا۔''

''پھر کب تک؟''

''کل صبح معلوم ہو سکے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر بھی جلد از جلد معلوم ہو جائے۔ میں آپ کو تصویر بھیج رہا ہوں۔''

ایکس مین نے واٹس ایپ سے ہی اس شخص کو تصویر بھیج دی جس سے بات کی تھی۔ پھر اس نے اس تصویر کا ایک فوٹو پرنٹ کیا اور موبائل پر اپنے اس آدمی سے رابطہ کیا جو اپنے ساتھی کے ساتھ پٹ کر آیا تھا۔

''میری ہدایت کے مطابق تم دونوں نے اپنی ڈریسنگ وغیرہ نہیں کرائی ہوگی۔ تم دونوں اسی حالت میں پولیس اسٹیشن جاؤ اور رپورٹ درج کرا دو۔ لکھوانا یہ ہوگا کہ ایک نوجوان کسی لڑکی کو چھیڑ رہا تھا۔ تم نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس کے اور ساتھی آگئے جنہوں نے تمہیں مارا پیٹا۔ جھگڑے کا مقام وہ نہیں بتانا جہاں جھگڑا ہوا تھا، کوئی اور جگہ بتانا۔ یہ بھی لکھوانا کہ جھگڑے کے دوران میں اس نوجوان کی جیب سے اس کی ایک تصویر گر گئی تھی جو بعد میں تم نے اٹھا لی۔ وہ تصویر بھی تم پولیس کے حوالے کرو گے۔''

''لیکن مجھے کوئی تصویر ملی ہی نہیں تھی ماسٹر!''

''پوری بات سنو۔'' ایکس مین غرایا۔ ''تصویر تم کو میں ابھی بھجوا رہا ہوں۔''

''ٹھ...... ٹھیک ہے ماسٹر!'' دوسری طرف سے بولنے والا ہکلا گیا۔

ایکس مین نے رابطہ منقطع کر کے اپنے سرہانے کی میز پر رکھے ہوئے انٹرکام پر کسی سے رابطہ کیا اور اسے فوراً طلب کیا۔ اسی آدمی کے ہاتھوں وہ تصویر بھجوانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح دس بجے کے قریب دلاور کلاس سے نکل کر ایک راہداری سے گزر رہا تھا کہ اس نے سامنے سے پروفیسر بیگم خورشید کے ساتھ سعیدہ کو آتے دیکھا تو ایک خیال اس کے ذہن میں چکرا گیا۔

سعیدہ جو بیگم خورشید سے کچھ کہہ رہی تھی، دلاور کو دیکھتے ہی خاموش ہو گئی۔ پروفیسر کی نظریں دلاور پر گڑ گئی تھیں۔ اس کے باوجود دلاور نے ان کے قریب سے گزر جانا چاہا تھا لیکن اسے رکنا پڑا۔

''سنو دلاور!'' پروفیسر بیگم خورشید نے کہا۔

''جی میڈم!''

''کیا اسے مناسب حرکت کہا جا سکتا ہے؟''

''کیسے میڈم؟''

''سعیدہ نے مجھے ابھی رات کے ڈرامے کے بارے میں بتایا ہے۔'' پروفیسر بیگم خورشید نے کہا۔ ''کسی لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے اس قسم کی حرکت کم از کم تمہیں زیب نہیں دیتی۔ تم ایک اچھے گھرانے کے لڑکے ہو۔ یونیورسٹی میں تم نے کسی پر ظاہر تو نہیں کیا لیکن دو ایک اور افراد کی طرح میں بھی جانتی ہوں کہ تم کس کے بیٹے ہو۔ اسد بٹ صاحب کو میں ذاتی طور پر بھی جانتی ہوں۔'' انہوں نے

دلاور کے والد کا نام لیا۔

دلاور نے ایک طویل سانس لی اور کہا۔ ''میڈم! آپ ڈیڈی کو ذاتی طور پر جانتی ہیں تو ان سے میری شکایت کر دیجیے۔''

''کیا؟'' بیگم خورشید کی پیشانی پر ایک سلوٹ پڑ گئی۔ ''تم اپنی اس حرکت پر شرمندہ بھی نہیں ہو؟''

''میں نے جو حرکت کی ہی نہیں تو شرمندہ کیوں ہوں گا؟''

بیگم خورشید کچھ بولتے بولتے اس لیے رک گئیں کہ دو طالبات اس طرف آرہی تھیں۔ وہ ان تینوں پر اچٹتی سی نظریں ڈالتی ہوئی گزر گئیں۔

دلاور بولا۔ ''مجھے تو اس وقت بہت دکھ ہوا ہے میڈم کہ سعیدہ نے آپ سے میری شکایت کی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ پولیس اسٹیشن میں اس واقعے کی رپورٹ درج کراتیں۔ یہ کوئی معمولی واقعہ تو نہیں کہ انہیں اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن......'' دلاور کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''لیکن یہ رپورٹ کیسے درج کراتیں......! انہوں نے تو اپنے خیال کے مطابق مجھ پر احسان کیا ہے۔ یہ رپورٹ درج کراتیں تو اس میں یہی لکھواتیں کہ میں نے یہ ڈراما رچایا تھا۔''

بیگم خورشید نے سعیدہ کی طرف دیکھا۔ سعیدہ نے دلاور پر نظر ڈالے بغیر دھیمی آواز میں کہا۔ ''میڈم! کیا آپ دلاور کے جواب سے مطمئن ہیں؟''

''غالباً بڑی حد تک......'' بیگم خورشید نے کہا۔ ''ایک تو دلاور کا پُراعتماد لہجہ، دوسرے میں بھی یہ سمجھ سکتی ہوں کہ بٹ صاحب نے اپنے بیٹے کی ایسی تربیت نہیں کی ہوگی۔''

''شکریہ میڈم!'' دلاور نے کہا اور سعیدہ کو پسند کرنے کے باوجود اس نے سعیدہ پر جو ایک نظر ڈالی، اس میں غصہ تھا۔

سعیدہ بہ دستور دھیمی آواز میں بولی۔ ''تو پھر میں اپنی شکایت واپس لیتی ہوں میڈم اور دلاور سے معافی چاہتی ہوں لیکن میں اس واقعے کی رپورٹ تو درج نہیں کرانا چاہتی۔ لڑکیوں کے اغوا تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اپنی ناکامی کے بعد وہ لوگ مجھے بھول کر کسی اور لڑکی کے چکر میں پڑ جائیں گے لیکن اگر میں نے رپورٹ درج کرائی تو وہ میرے دشمن بن جائیں گے۔ ہاتھ دھو کر میرے ہی پیچھے لگ جائیں گے۔''

''ہوں۔'' بیگم خورشید نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک سوچ رہی ہو۔ بہر حال لڑکیوں کو محتاط رہنا چاہیے۔ تم اتنی رات کو آخر ہاسٹل کے باہر گئیں کیسے؟''

''میں شام کو گئی تھی میڈم!...... وہاں میری ایک دوست رہتی ہے۔ وہاں یہ ہوا کہ......''

دلاور بول پڑا۔ ''کیا اب میں جاؤں میڈم؟''

''ہاں جاؤ، سعیدہ نے تم سے معافی بھی مانگ لی ہے۔''

''جی۔'' دلاور نے اتنا ہی کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ اب یہ سوچ رہا تھا کہ اسے سعیدہ کا خیال اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ابھی اس کی پسندیدگی ''مجنونیت'' کی طرف تو گئی نہیں تھی۔

وہ کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کے ایک کلاس فیلو اختر نے اس کا راستہ روک لیا۔

''کیا رہا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کس کا کیا رہا؟''

''ابھی تمہیں پروفیسر صاحبہ نے روکا تھا۔''

''وہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔'' دلاور نے ٹالنا چاہا۔

''خاص بات تو تھی۔'' اختر نے معنی خیز لہجے میں کہا اور دلاور کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

''لائبریری۔''

''ایک کتاب تو مجھے بھی دیکھنی ہے۔ میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ ہاں تو میں نے ابھی کہا تھا کہ خاص بات تو تھی۔ میں ذرا آڑ میں تھا اس لیے وہ دونوں مجھے نہیں دیکھ سکیں۔ میں نے وہ شکایت سن لی تھی جو سعیدہ نے پروفیسر صاحب سے کی تھی۔''

''ہوں۔'' دلاور کا موڈ بہ دستور خراب تھا۔

''میرا خیال ہے کہ شکایت غلط تھی۔''

''ہوں۔''

''کیا ہوں ہوں کیے جا رہے ہو، کچھ بولتے کیوں نہیں۔''

''کیا بولوں۔'' دلاور نے منہ بنا کر کہا۔ ''تم خود ہی خیال ظاہر کر چکے ہو کہ شکایت غلط تھی۔''

''اصل بات کیا ہے؟''

''سعیدہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں اسے بچانے کے لیے ان لوگوں سے بھڑ گیا تھا۔''

''کتنے تھے؟''

''تھے تو تین لیکن پٹائی میں نے دو کی ہی کی۔ تیسرا بعد میں کار سے اترا تھا اور اس وقت تک لوگ جمع ہونے

لگے تھے اس لیے وہ لوگ بھاگ نکلے۔‘‘
’’ان کا حلیہ کیسا تھا؟‘‘
’’وضع قطع تو بدمعاشوں جیسی نہیں تھی۔‘‘
باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں لائبریری میں داخل ہوئے۔ وہاں کچھ طلبہ پہلے ہی سے موجود تھے لیکن لائبریری خاصی بڑی تھی۔ اختر نے ایسی کرسیوں کا انتخاب کیا کہ دوسرے طلبہ ان کی باتیں نہ سن سکیں۔
’’تمہیں کوئی کتاب دیکھنا ہے۔‘‘ دلاور نے اختر کو یاد دلایا۔
’’وہ بھی دیکھ لوں گا۔ ابھی تو ہم باتیں کر رہے ہیں۔‘‘
’’اب کیا باتیں کرنی باقی ہیں؟‘‘
’’چھٹی کے بعد تم میرے ساتھ چلو۔ میرا ایک دوست ہے، بہت اچھا مصور ہے۔ اسے تم ان تینوں کا یا... کم ازکم دونوں کا حلیہ بتاؤ۔ وہ ان کا خاکہ بنالے گا۔‘‘
’’تو اس سے کیا ہوگا؟‘‘
’’وہ پولیس کو دکھایا جاسکتا ہے۔ میرا مطلب ہے ان لوگوں کا خاکہ! سعیدہ کی طرف سے ہم کرا دیں گے رپورٹ۔ آخر ہماری کلاس فیلو ہے وہ۔‘‘
’’میں اب خود کو اس معاملے سے الگ رکھنا چاہتا ہوں۔‘‘
’’میرا تو خیال ہے کہ تم سعیدہ کو پسند کرتے ہو۔‘‘
’’لیکن قیس یا فرہاد نہیں ہوں۔ اگر وہ مجھے پسند نہیں کرتی تو بہتر ہوگا کہ میں اس کا خیال بھی اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کروں۔‘‘
اختر نے اسے غور سے دیکھا، پھر خفیف سا مسکرا کر بولا۔ ’’ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔‘‘
’’جو کچھ پہلی بار ہوتا ہے، اس سے پہلے یہی کہا جاتا ہے کہ ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔‘‘
’’خیر!‘‘ اختر سنجیدہ ہوگیا۔ ’’سعیدہ میری بھی کلاس فیلو ہے۔ میں چاہوں گا کہ اسے اغوا کرنے والے گرفتار ہوں۔ تم بس میری ہی خاطر میرے آرٹسٹ دوست سے مل لو اور اسے ان لوگوں کا حلیہ بتاؤ۔ وہ ان کے خاکے تیار کر لے گا جو پولیس کے حوالے کیے جاسکتے ہیں۔‘‘
’’میں کہہ چکا ہوں کہ اب سعیدہ کے کسی معاملے میں

بالکل دلچسپی نہیں لینا چاہتا۔ بہتر ہوگا کہ تم وہ کتاب تلاش کرو جس کی بات کی تھی تم نے اور مجھے کچھ اسٹڈی کر لینے دو۔''
دلاور نے وہ کتاب کھول لی جو اس کے ہاتھ میں تھی۔

☆☆☆

لیفٹیننٹ جنرل اسد بٹ اپنے دفتر میں ایک میٹنگ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسے ایک ملاقاتی کارڈ دیا گیا۔ وہ ایس ایس پی نادر کا تھا۔ جنرل کی پیشانی پر ہلکی سی شکن پڑ گئی۔ نادر سے اس کا کچھ رسمی تعلق تو تھا لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ وہ اس سے ملنے کیوں آیا تھا۔ بہرحال اس نے اسے کمرے میں بُلا لیا۔
''خیریت تو ہے نادر صاحب!''
''خیریت ہی ہے سر، لیکن ایک خاص وجہ سے حاضر ہوا ہوں۔''
''فرمایئے!''
''رات گئے آپ کے بیٹے دلاور کے خلاف دو آدمیوں نے ایک پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرائی ہے۔''
''میرے بیٹے کے خلاف؟'' جنرل نے حیرت سے کہا۔
''جی ہاں۔'' ایس ایس پی نے جواب دیا۔ ''پھر ایک اہم بات اور بھی ہے۔ دراصل ایس ایچ او اتفاق سے آپ کے بیٹے کا چہرہ شناس ہے۔ اس نے کوشش کی تھی کہ ایف آئی آر درج نہ ہو لیکن......''
''پہلے یہ بتایئے کہ دلاور کے خلاف کس معاملے کی رپورٹ درج کرائی گئی ہے؟''
''وہ دو آدمی ہیں۔'' ایس ایس پی نے جواب دیا۔ ''ان کے بیان کے مطابق ایک ویران سی سڑک پر دلاور صاحب ایک لڑکی کو چھیڑ رہے تھے۔ ان دونوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو جھگڑا ہو گیا۔ دلاور صاحب کے کچھ ساتھی بھی آگئے۔ انہوں نے ان دونوں کو بہت مارا اور چلے گئے۔ جن آدمیوں نے رپورٹ درج کرائی ہے، ان کی حالت سے بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں بہت بُری طرح پیٹا گیا ہے۔ انہی دونوں کے بیان کے مطابق جھگڑے کے دوران میں دلاور صاحب کی جیب سے ان کی ایک تصویر گر گئی تھی۔ وہی تصویر رپورٹ کرانے والوں نے ایس ایچ او کو دکھائی تھی۔ نام سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔''
''ناممکن ہے یہ۔'' اسد بٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

''دلاور ایسی گھٹیا حرکت ہرگز نہیں کر سکتا۔ اس کی تربیت میں نے ہی نہیں، اس کی ماں نے بھی کی ہے اور اس تربیت کے باعث دلاور ایسی گھٹیا حرکت کر ہی نہیں سکتا۔''
''میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ ایف آئی آر درج کرنے سے ایس ایچ او کے گریز کو محسوس کرنے کے بعد ان دونوں میں سے ایک نے کسی کو فون کیا تھا۔ اس کے فوراً بعد ایس ایچ او نے ایک کال ریسیو کی۔ کال ایک بڑی شخصیت کی تھی۔ اس نے ایس ایچ او پر دباؤ ڈالا کہ ایف آئی آر کاٹی جائے اور ان دونوں کا میڈیکل چیک اپ کروا کے جتنی دفعات بھی ممکن ہوں، وہ ملزم پر لگائی جائیں۔''
''بہت خوب! تو ایف آئی آر درج کر لی گئی؟''
''دباؤ ہی اتنا بڑا تھا جنرل صاحب۔''
''اس کا نام نہیں بتایا ہے آپ نے۔''
''میں تو چونکا ہی تھا لیکن آپ بھی چونک جائیں گے سُن کر۔'' ایس ایس پی نے کہا۔ ''وہ کال خان زادہ جالب کی تھی۔''
''کیا!'' اسد بٹ واقعی چونکا۔ ''خان زادہ جالب، یعنی پریسیڈنٹ صاحب کا پرسنل سیکریٹری؟''
''جی ہاں۔'' ایس ایس پی نے جواب دیا۔ ''اور یہ تو آپ بھی جانتے ہی ہوں گے کہ ہمارے پریسیڈنٹ صاحب اپنے کچھ خاص مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ خان زادہ جالب کو انہوں نے اتنا بااختیار بنا دیا ہے کہ وہ کسی وقت بھی، کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کل صبح ہی انہوں نے ہمارے ڈی آئی جی صاحب کو بلا کر ایک معاملے میں بُری طرح جھاڑ پھٹکار دیا تھا۔ ڈی آئی جی صاحب استعفا دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔''
جنرل اسد کے ہونٹ بھنچ گئے۔ ''ہوں۔''
''ایس ایچ او میرے پاس آیا تھا۔ وہ پریشان ہے کہ کیا کرے۔ خان زادہ صاحب نے اسے آج بھی فون کیا تھا، پوچھا تھا کہ کیا کارروائی کی گئی۔ ایس ایچ او نے جواب دیا کہ تصویر شناختی کارڈ والوں کے دفتر بھیج دی گئی ہے اور وہ رپورٹ کا انتظار کر رہا ہے۔''
''ہوں۔''
''لیکن ہوا یہ ہے کہ خان زادہ نے غالباً شناختی کارڈ والوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہوگا اس لیے انہوں نے بڑی تیزی دکھائی۔ ایس ایچ او میرے پاس سے واپس اپنے دفتر پہنچا تو شناختی کارڈ والوں کی مفصل رپورٹ موجود تھی۔ ابھی

میں آپ کے پاس آرہا تھا تو ایس ایچ او نے مجھے فون پر اس کی اطلاع دی ہے۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔‘‘
’’ایکشن لو دلاور کے خلاف۔‘‘ جنرل اسد نے سنجیدگی سے کہا۔
’’جی!‘‘ ایس ایس پی ان کا منہ تکنے لگا۔
جنرل اسد ہنسے۔’’اس کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے۔ ایکشن نہ لیے جانے کی صورت میں خان زادہ کا فون شاید آپ کے پاس آئے کہ اس ایس ایچ او کو معطل کردیا جائے۔‘‘
’’لیکن جنرل صاحب......‘‘ ایس ایس پی نے کرسی پر پہلو بدلا۔
’’اگر آپ نے تساہل سے کام لیا تو آپ کی شامت بھی آسکتی ہے۔ خان زادہ اس وقت نیکسٹ ٹو پریسیڈنٹ بنا ہوا ہے۔ آپ جائیے، میں بھی دیکھتا ہوں کہ اس معاملے کو کس طرح ہینڈل کیا جائے۔‘‘
جنرل اسد نے جواب کا انتظار کیے بغیر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا۔
ایس ایس پی کچھ پریشانی کے عالم میں رخصت ہوا۔
جنرل اسد نے فون پر آپریٹر سے کہا۔’’بیرسٹر عابد حسین سے بات کراؤ۔‘‘
اس بار بھی آپریٹر کی کوئی بات سنے بغیر جنرل اسد نے ریسیور رکھ دیا اور موبائل پر دلاور سے رابطہ کیا۔
’’جی ڈیڈی!‘‘ دلاور کی آواز آئی۔’’اس وقت آپ کے فون نے تو مجھے حیران کیا ہے۔‘‘
’’بات کچھ ایسی ہی ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟‘‘
’’کلاس میں نہیں ہوں۔ کچھ پڑھنا تھا اس لیے لائبریری میں آگیا ہوں۔‘‘
’’فوراً چھٹی کرو یونیورسٹی سے اور میرے پاس آؤ......میں دفتر میں ہوں۔‘‘
’’خیریت تو ہے ڈیڈی؟‘‘
’’وہی تو نہیں ہے۔‘‘ جنرل نے کہا اور فوراً رابطہ منقطع کردیا کیونکہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔
آپریٹر نے بیرسٹر عابد حسین سے رابطہ کرلیا تھا۔
’’ہیلو عابد صاحب! کیسے مزاج ہیں؟...... میری خواہش ہے کہ آپ اس وقت کسی کیس کے باعث عدالت میں نہ ہوں۔‘‘
’’جی آج میں اپنے دفتر ہی میں ہوں۔ ایک کیس کی فائل دیکھ رہا تھا۔‘‘
’’گڈ۔‘‘ جنرل اسد نے کہا۔’’آپ بلاتاخیر میرے پاس آجائیں۔‘‘
’’میں آدھے گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔‘‘

جنرل اسد نے رابطہ منقطع کیا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کا تاثر بہت گہرا تھا لیکن پریشانی بالکل نہیں تھی۔

چند ہی لمحے بعد وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں سامنے پڑی ہوئی ایک فائل پر گئیں۔ اس نے فائل اٹھائی۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس کا ہاتھ موبائل پر گیا۔ ایک پل کے لیے اسے خیال آیا تھا کہ اپنی بیوی کو اس صورتِ حال سے آگاہ کر دے لیکن فوراً ہی اس نے اپنا ارادہ ترک بھی کر دیا۔ مناسب نہیں تھا کہ وہ اپنی بیوی کو پریشان کرتا۔

پھر اس نے فائل کھولی ہی تھی کہ پی اے نے کسی کرنل زنجانی کے بارے میں اطلاع دی کہ وہ ملنا چاہتا ہے۔

''آنے دو۔'' جنرل نے پی اے سے کہا۔

دو منٹ بعد ہی کرنل زنجانی اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ ''کل رات سعیدہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی سر!''

''اوہ!'' جنرل اسد کے دماغ میں کچھ ایسے خیالات چکرائے کہ وہ میز پر آگے کی طرف اس طرح جھکا جیسے کچھ زیادہ توجہ سے کرنل زنجانی کی بات سننا چاہتا ہو۔

''اور اس معاملے میں دلاور صاحب کا نام بھی سامنے آیا ہے۔'' کرنل زنجانی نے کہا۔

''وضاحت سے۔'' جنرل اسد نے کہا۔ ''شروع سے ساری بات بتائیں۔''

''جی سر!'' کرنل زنجانی نے کہا۔ ''دوسری لڑکیوں کی طرح سعیدہ بھی شام کے بعد ہاسٹل سے نہیں نکلتی تھی لیکن کل وہ اپنی ایک دوست سے ملنے اس کے گھر گئی۔ کیونکہ اس وقت اس کے باہر جانے کا امکان نہیں تھا اس لیے کیپٹن اختر بے خبر رہ گیا ورنہ وہ ضرور اس کا تعاقب کرتا۔ میں نے سرزنش تو کی ہے اختر کو۔''

''واقعہ بتائیے۔'' جنرل اسد کے انداز میں بے تابی تھی۔

''سعیدہ اپنی تعلیم..... کے سلسلے میں کچھ معلومات حاصل کرنے اپنی دوست کے گھر گئی تھی۔ وہاں اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس کی دوست نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ ایک گھنٹے بعد سعیدہ کی حالت سنبھلنا شروع ہوئی تو اس نے فون پر ہاسٹل کو اطلاع دے دی کہ اسے ہاسٹل آنے میں دیر ہو جائے گی۔ دیر ہونے کی وجہ بھی بتا دی تھی۔ مزید ایک گھنٹا گزرنے کے بعد اس کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی۔ اس کے بعد بھی وہ کچھ دیر وہاں رکی۔ پھر دس ساڑھے دس بجے کے قریب وہ وہاں سے نکلی۔ مین روڈ وہاں سے قریب ہی ہے جہاں سے وہ ٹیکسی کرنا چاہتی تھی لیکن وہاں تک کا راستہ تقریباً سنسان پڑا تھا۔ وہاں ایک کار اس کے قریب پہنچ کر رکی۔ اس میں سے دو آدمی اترے جنہوں نے سعیدہ کو اٹھا کر اس کار میں ڈالنا چاہا ہوگا۔ سعیدہ جس دوست کے گھر گئی تھی، وہ اسی علاقے میں ہے جہاں آپ کا گھر ہے۔ اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت دلاور صاحب چہل قدمی کرتے ہوئے اس سڑک پر پہنچ گئے۔'' پھر کرنل زنجانی نے وہ واقعہ بھی سنا دیا جو اس سڑک پر پیش آیا تھا۔

جنرل اسد بٹ نے وہ ساری کہانی بہت خاموشی سے سنی تھی۔

کرنل زنجانی نے مزید کہا۔ ''سعیدہ اس معاملے کی رپورٹ لکھانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کیپٹن اختر نے مجھے فون پر بھی بتایا ہے۔ اس نے چاہا تھا کہ دلاور صاحب اسے ان دونوں کا حلیہ بتا دیں تو آرٹسٹ سے ان دونوں کے خاکے بنوا لیے جائیں لیکن دلاور صاحب اب سعیدہ کے کسی معاملے میں کچھ بھی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ غالباً وہ سعیدہ سے دل برداشتہ ہو چکے ہیں۔ میں آپ کو کیپٹن اختر کی یہ رپورٹ تو دے ہی چکا ہوں کہ وہ سعیدہ سے محبت کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں لیکن پسند ضرور کرتے تھے۔ بس اس واقعے سے دل برداشتہ ہو گئے ہیں کہ سعیدہ نے ان کی شکایت ایک پروفیسر سے کر دی تھی۔ دراصل سعیدہ کا خیال ہے کہ دلاور صاحب نے وہ ڈراما رچایا تھا تاکہ سعیدہ کو متاثر کر سکیں۔''

''ہوں۔'' جنرل اسد نے پہلی مرتبہ سر ہلاتے ہوئے ذرا سی آواز نکالی۔

''دلاور صاحب کا تعاون حاصل ہو سکتا ہے اگر آپ چاہیں۔'' کرنل زنجانی پھر بولا۔

''اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دونوں آدمی سامنے آ چکے ہیں۔''

''کیسے؟'' کرنل زنجانی چونکا۔

اسی وقت پی اے نے بیرسٹر عابد حسین کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ کچھ جلدی ہی آ گیا تھا۔

''میں بعد میں بات کروں گا۔'' جنرل اسد نے کہا۔ ''ابھی تو تم جاؤ۔ کوئی آیا ہے مجھ سے ملنے۔''

''جی بہتر۔''

کرنل زنجانی کے بعد جنرل نے بیرسٹر کو بلا لیا اور اسے صورتِ حال بتا کر کہا۔ ''دلاور کی ضمانت قبل از گرفتاری کرانا ہے، فوری طور پر۔ میں نے دلاور کو یونیورسٹی سے بلایا ہے۔ وہ آتا ہی ہوگا۔''

''ضمانت!'' بیرسٹر عابد نے حیرت سے کہا۔ ''کیا

پولیس پر آپ کا دباؤ کام نہیں آسکتا۔''
''ایسے معاملات کو قانونی طور پر ہی حل کیا جانا چاہیے۔ ویسے بھی اس وقت ان دونوں کی پشت پناہ ایک بڑی سیاسی شخصیت سے ہے۔ مناسب نہیں ہوگا کہ میں اس کے مقابل جاؤں، البتہ کسی سے اس بات کا ذکر تو کروں گا۔'' اس وقت جنرل کے ذہن میں چیف آف آرمی اسٹاف تھا۔
''سیاسی شخصیت؟ غنڈوں کی پشت پناہ؟'' بیرسٹر کی حیرت اور بڑھ گئی۔
''یہی تو سب سے بڑا المیہ ہے اس وقت ہمارے ملک کا۔'' جنرل اسد نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔ ''جرائم میں اضافہ انہی سیاسی لوگوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔''
بات اس سے آگے نہیں چلی تھی کہ دلاور آگیا۔ آتے ہی اس نے باپ کے علاوہ بیرسٹر کو بھی سلام کیا لیکن بیرسٹر کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اُلجھن کے تاثرات نمایاں ہوگئے تھے۔ اس نے اپنی الجھن کا اظہار بھی کر دیا۔ ''آپ بھی اس وقت موجود ہیں بیرسٹر انکل!'' پھر اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ ''کیا کوئی قانونی مسئلہ میرے ہی سلسلے میں ہے ڈیڈی یا......''
''بیٹھ جاؤ۔'' جنرل اسد نے کہا۔ ''ابھی میں تم کو بہت مختصر طور پر بتاؤں گا کیونکہ عدالت کا وقت ختم ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری کروانا ہے۔''
''میں نے ایسا کیا کر دیا ڈیڈی!'' دلاور کی حیرت بھی بڑھی۔
''کل جن لوگوں سے تمہارا جھگڑا ہوا تھا، انہوں نے تمہارے خلاف ایف آئی آر درج کرائی ہے۔ الزام لگایا ہے کہ تم کسی لڑکی کو چھیڑ رہے تھے، انہوں نے تمہیں روکنا چاہا تو......''
جنرل اسد نے انتہائی اختصار سے کام لیا اور پھر کہا۔ ''بعد میں کچھ اور باتیں بھی کرنی ہیں تم سے۔ فی الحال تم اپنے بیرسٹر انکل کے ساتھ جاؤ۔''
''چلیے!'' بیرسٹر نے دلاور کی طرف دیکھتے اور کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ عدالت کا وقت ختم ہوجائے، ہمیں......''
''چلیے!'' دلاور اس کی بات کاٹتا ہوا کھڑا ہوگیا۔
جنرل اسد چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے کرنل زنجانی کو طلب کیا۔

''اس وقت مجھے کچھ اور مصروفیت تھی۔'' جنرل اسد نے اس سے کہا۔ ''میں تم سے آج یہ کہنا چاہتا تھا کہ سعیدہ پر صرف نظر رکھنے سے بات نہیں بن رہی ہے۔ داراب، ایکس مین سے خوف زدہ تو ہے ہی لیکن بہت چوکنا بھی ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے یونیورسٹی کا رخ نہیں کرے گا اور نہ ہی سعیدہ کو وہاں بلائے گا جہاں وہ روپوش ہے۔ امکان صرف یہ ہے کہ باپ بیٹی کی گفتگو موبائل پر ہوتی ہو۔ اگر سعیدہ اس سلسلے میں محتاط نہیں ہے اور باپ کا نمبر ڈیلیٹ نہیں کرتی تو......!''
''بات کاٹنے کی معذرت چاہتا ہوں سر! میں سمجھ گیا، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے کیپٹن اختر سے اس بارے میں کہا تھا۔ اختر اس کا موبائل چرانے میں بھی کامیاب ہوگیا تھا۔ تمام کالنگ اور ریسیونگ کالز کے نمبر بھی نوٹ کرلیے تھے اور پھر موبائل سعیدہ کو واپس کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ وہ اسے یونیورسٹی کے احاطے میں کسی پودے میں چھپا ہوا نظر آگیا تھا۔ بعد میں ان نمبروں کی چھان بین بھی کرلی گئی۔ نمبر بھی بہت کم تھے۔ وہ سب اس کی سہیلیوں کے ہیں۔''
جنرل اسد نے متفکر انداز میں سر ہلایا پھر بولا۔ ''یہ جو سعیدہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''
''ایک بات ذہن میں آئی تو ہے لیکن ضروری بھی نہیں ہے سر، کہ ایسا ہی ہو۔ یہ حرکت ایکس مین بھی کروا سکتا ہے۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ بیٹی کو خطرے سے بچانے کے لیے داراب سامنے آسکتا ہے۔''
''مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ اس میں ایکس مین ہی کا ہاتھ ہوگا۔ یقین کی وجہ یہ کہ دلاور کے خلاف رپورٹ درج کرانے والوں کی پشت پناہی خان زادہ جالب نے کی ہے اور یہ بات ہمارے علم میں آچکی ہے کہ ایکس مین کے روابط کچھ بڑی سیاسی شخصیات سے بھی ہیں۔ یہ تو پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے ایک شخصیت خان زادہ جالب کی ہے۔ میں یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ خان زادہ کسی معمولی جرائم پیشہ کی پشت پناہی کرے گا۔''
''پھر تو......'' کرنل زنجانی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس معاملے کو بہت ہی گمبھیر سمجھا جائے۔''
''گمبھیر تو یہ ہے ہی۔ ایکس مین کو میں غیر ملکی جاسوس ہی نہیں، دہشت گرد سمجھتا ہوں۔ ہاں البتہ تمہاری بات اس اعتبار سے درست ہے کہ خان زادہ جالب کا نام سامنے

آنے کے بعد اس معاملے کی گمبھیرتا میں اضافہ ہوا ہے۔ ہمیں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"سر، ان دونوں آدمیوں کی نگرانی تو ضروری ہے جنہوں نے دلاور صاحب کے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے۔"

"ہاں، پولیس سے ان دونوں کے نام اور پتے تو مل ہی جائیں گے۔ نگرانی ہی نہیں، ان دونوں کو اٹھوانا ہی پڑے گا۔ ہمیں ان سے بھی کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں اور وہ ایکس مین ہی کے آدمی ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ رپورٹ انہوں نے ایکس مین کی ہدایت پر ہی کی ہو گی۔ میں اس صورت میں یہ بھی کہوں گا کہ ایکس مین نے حماقت کی ہے۔ رپورٹ کرانے کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دلاور کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ بہت کینہ پرور بھی ہے وہ۔ وہ دلاور کو ختم کروانا چاہے گا جس کی وجہ سے اس کا پلان ناکام ہوا۔"

"گویا اب دلاور صاحب خطرے میں ہیں۔"

"سو فیصد۔ مجھے جلد ہی اطلاع ملے گی کہ اس کی ضمانت ہو گئی ہے۔ میں اسے ہدایت کروں گا کہ وہ عدالت سے سیدھا گھر جائے اور مجھ سے ملاقات کیے بغیر باہر نہ نکلے۔ مجھے اب اس معاملے کے بارے میں اسے بتا دینا چاہیے جبکہ اس قسم کے معاملات سے گھر والوں کو بے خبر ہی رکھتا ہوں۔"

کرنل زنجانی کے چہرے سے تشویش کا اظہار ہوا۔ اس نے کہا۔ "یعنی جب تک ہم ایکس مین پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہ ہو جائیں، دلاور صاحب کو گھر تک محدود رہنا چاہیے۔"

"نہیں، یونیورسٹی تو وہ جائے گا۔"

"آپ انہیں خطرے میں ڈالنا چاہتے ہیں؟"

"اس کی حفاظت کا مکمل بندوبست کیا جائے گا۔ یوں سمجھو کہ ہم ایکس مین کے سامنے چارا ڈالیں گے۔ جیسے مچھلی کا شکار کرنے کے لیے کانٹے میں جھینگا جیسی کوئی چیز پھنسا دی جاتی ہے۔"

"سر!" کرنل زنجانی کی تشویش برقرار رہی۔ "بعض مچھلیاں بڑی ہوشیاری سے جھینگا لے جاتی ہیں اور کانٹے میں نہیں پھنستیں۔"

"اگر اس معاملے میں ایسی کوئی بات ہوئی تو میں سمجھوں گا کہ میں ناکارہ لوگوں کے محکمے کا سربراہ ہوں۔"

"آپ ہم لوگوں کا امتحان لینے کے لیے اپنے بیٹے کی زندگی خطرے میں ڈالیں گے؟"

"مجھے ہر قیمت پر اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ کامیابی کے لیے اگر کوئی راستہ نظر آئے تو اسے نظر انداز کرنا فرض سے کوتاہی ہو گی، سعیدہ کے بعد ہمیں یہ دوسرا راستہ نظر آیا ہے۔"

کرنل زنجانی کے چہرے سے تشویش کا تاثر ختم نہیں ہوا۔

☆☆☆

جنرل اسد بٹ جب گھر پہنچے تو دلاور ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھا اپنی ماں سے باتیں کر رہا تھا۔

"بڑے ٹھیک وقت پر آئے۔" مسز بٹ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "یہ آج یونیورسٹی سے بہت جلدی آ گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک کئی بار پوچھ چکی ہوں لیکن یہ بتا ہی نہیں رہا ہے کہ جلدی کیسے آ گیا۔ کسی سے کوئی بات تو نہیں ہو گئی؟"

"کیوں؟" جنرل نے خفا ہونے کے انداز میں دلاور کی طرف دیکھا۔ "جلدی آ گئے آج؟"

"جی ڈیڈی!" دلاور نے نظریں جھکا لیں۔

"میں پوچھتا ہوں اس سے!" جنرل نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم چائے کا بندوبست کرواؤ اور ہاں! کچھ خواہش بروسٹ کی بھی ہے لیکن وہ تم اپنے ہاتھ سے بنانا، خانساماں سے زیادہ اچھا بناتی ہو تم۔"

اس طرح جنرل نے بیوی کو کچھ دیر کے لیے ٹال دیا تاکہ دلاور سے تنہائی میں بات کر سکیں۔

"یہ اچھا کیا تم نے کہ اپنی ماں کو نہیں بتایا۔" جنرل اسد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ذرا سی بات پر بھی پریشان ہو جانے کا مزاج ہے محترمہ کا۔"

"جی ڈیڈی! اسی لیے نہیں بتایا۔"

"تم ایک خطرناک معاملے میں الجھ گئے ہو دلاور۔" جنرل نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ تو مجھے آپ ہی بتائیں گے کہ یہ معاملہ زیادہ خطرناک کیسے ہو گیا۔ میں تو حیران ہوں کہ انہوں نے میرے خلاف رپورٹ درج کرانے کی ہمت کی۔ اس علاقے کے لوگ گواہی دیں گے کہ دراصل......"

"یہ وہ بھی سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے جھگڑے کا مقام وہ نہیں بتایا جہاں جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے پوری رپورٹ دیکھ لی ہے۔"

"اوہ...... تو آخر......"

''میں تمہیں شروع سے سب کچھ بتاؤں گا۔'' جنرل اسد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''وہ دونوں ایک غیر ملکی جاسوس...... بلکہ دہشت گرد کے آدمی ہیں۔''

''اوہ!'' دلاور کے منہ سے نکلا۔

''یہ جو دہشت گردی ہو رہی ہے، اس میں اسی کا ہاتھ ہے۔ خاصے دن سے اس کا سراغ لگانے کی کوششیں ہو رہی ہیں لیکن ابھی تک اس کے ٹھکانے کا پتا نہیں لگ سکا ہے۔ کوئی ایک ماہ قبل اس کا ایک آدمی ہاتھ لگا تھا۔ اس سے یہی کچھ معلومات ہو سکی ہیں۔ اس کا نام تو کچھ اور ہی ہوگا۔ اپنے کارندوں میں وہ ایکس مین کہلاتا ہے اور اسے ہمارے کچھ اہم سرکاری آدمیوں کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔''

''یہ تو واقعی بڑی خطرناک بات ہے۔'' دلاور بولا۔ ''جو آدمی پکڑا گیا تھا، اس نے ایکس مین کے ٹھکانے کے بارے میں نہیں بتایا؟''

''نہیں۔'' جنرل نے جواب دیا۔ ''اس کے بیان کے مطابق ایکس مین کے لیے کام کرنے والوں میں سے صرف وہی لوگ اس کے ٹھکانے سے واقف ہیں جن پر اسے مکمل اعتماد ہے۔ جس کو ہم نے گرفتار کیا ہے، وہ ایکس مین کے معتمد لوگوں میں سے نہیں۔''

''شاید وہ جھوٹ بول رہا ہو۔''

''اندازہ ہو جاتا ہے جھوٹ کا۔ اس سے ہمیں سب سے اہم بات جو معلوم ہوئی، اسی پر آج کل کام کیا جا رہا ہے۔ اس کے معتمد لوگوں میں ایک شخص داراب بھی ہے جس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ اس غلطی کی وجہ سے وہ روپوش ہو گیا ہے کیونکہ ایکس مین اپنے کسی ایسے آدمی کو زندہ نہیں چھوڑتا جس سے کوئی غلطی ہو جائے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ داراب کی بیوی مر چکی ہے اور اس کے گھر میں کوئی اور ہے نہیں اس لیے اس کی لڑکی جو یونیورسٹی میں پڑھتی ہے، وہ رہتی بھی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں ہے۔''

''پھر تو اسے میں بھی جانتا ہوں گا۔'' دلاور نے تیزی سے کہا۔

''اچھی طرح جانتے ہو۔ اسی کو بچانے کے لیے تو تم ان دونوں سے لڑ پڑے تھے۔''

''سعیدہ!'' دلاور چونکا۔

''ہاں۔'' جنرل اسد نے کہا۔ ''اور غالباً یہ بات اب ایکس مین کے علم میں بھی آ گئی ہے۔ اسی لیے اس نے سعیدہ کو اغوا کروانا چاہا تھا۔ سعیدہ کو قبضے میں لینے کے بعد وہ داراب کو سامنے آنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ اسی لیے فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہم سعیدہ پر نظر رکھیں۔''

''اختر آپ کا آدمی ہے؟'' دلاور تیزی سے بولا۔

''سمجھ گئے تم؟''

''ابھی سمجھا ہوں۔ الجھن پہلے بھی تھی کہ اسے داخلہ کیسے مل گیا جبکہ ان دنوں میں داخلہ ملنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ دوسرے اس کی عمر بھی زیادہ ہے۔ اس عمر میں...... میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے چھ سات سال بڑا ہے۔ اب آپ نے بتایا ہے تو یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ وہ مجھ سے ان دونوں کا حلیہ معلوم کر کے ان کے اسکیچ کیوں بنوانا چاہتا تھا۔''

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ رپورٹ لکھوانے کی وجہ سے وہ دونوں خود ہی سامنے آ گئے ہیں۔ ان کی نگرانی شروع کروا دی گئی ہے۔''

''یہ حماقت انہوں نے کی ہی کیوں؟ میرا مطلب ہے رپورٹ؟''

''ایکس مین چاہتا ہوگا کہ اس شخص کا پتا چل جائے جس نے اس کے آدمیوں کو مارا تھا۔ اس سے بھی اہم یہ کہ تمہاری وجہ سے اس کا پلان تباہ ہوا تھا۔ اب اسے معلوم ہو چکا ہوگا کہ تم کون ہو۔''

''کیسے معلوم ہوا ہوگا؟''

''پولیس ہی نے بتایا ہے۔ وہ لوگ مجبور تھے۔ اوپر سے دباؤ پڑا تھا پولیس پر! انہیں کچھ بتانا تو پڑے گا۔ اب تمہیں بہت ہوشیار رہنا ہوگا دلاور! وہ تمہیں ختم کرانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس کی اس کوشش کی وجہ سے ہم کچھ اور بھی جان سکیں گے۔ تمہاری حفاظت کا بہت معقول بندوبست کیا جائے گا۔ ایک احتیاط اور بھی کرو۔ یونیورسٹی جاؤ یا کہیں اور، بلٹ پروف جیکٹ پہن کر جاؤ۔''

''وہ تو میرے پاس نہیں ہے ڈیڈی!''

''آ جائے گی۔ کہہ دیا ہے میں نے۔ ایک آدھ گھنٹے میں کوئی لے کر آتا ہوگا۔ تم اس خطرے کی وجہ سے گھبراؤ گے تو نہیں؟''

''میں آپ کا بیٹا ہوں ڈیڈی!''

''ہوں۔'' جنرل اسد مسکرایا۔ ''مجھے یہی امید تھی۔ اس کے علاوہ تم ہمارے لیے ایک اور کام بھی کر سکتے ہو۔''

''غالباً آپ سعیدہ کے بارے میں کہیں گے۔''

جنرل اسد مسکرایا۔ ''آخر میرے بیٹے ہو، سمجھ گئے۔ ہاں میں یہی چاہتا ہوں کہ جب اس نے تم سے معافی مانگ

لی ہے تو اب تم اس سے اپنی خفگی ختم کرو۔ یہ رپورٹ کیپٹن اختر کی ہے کہ اس نے تم سے معافی مانگ لی ہے لیکن تم اس سے بہ دستور خفا ہو کہ اس نے پروفیسر سے تمہاری شکایت کی لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری خفگی صرف دکھاوے کی ہے۔ تم سعیدہ سے محبت کرتے ہو۔''

دلاور کی نظریں جھک گئیں۔ ''محبت کی بات تو نہیں ہے ڈیڈی۔''

''پسندیدگی کہہ لو۔''

''جی!'' دلاور کا لہجہ دبا دبا سا تھا۔

''تم اپنی مصنوعی خفگی ختم کر کے اس سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرو۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسے اپنے باپ کے بارے میں سب کچھ علم ہے یا نہیں۔ اس سے قربت کے باعث تمہاری پسندیدگی محبت میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ مجھے اس سے تمہاری شادی پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ میں طبقاتی اونچ نیچ کا قائل نہیں ہوں۔''

''اگر وہ ذہنی طور پر اپنے باپ ہی جیسی ہوئی تو؟''

''تو پھر کوئی فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہوگا۔''

''میں اسے بھول جاؤں گا۔'' دلاور نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں کوئی فرہاد تو ہوں نہیں، ویسے بھی مجھے ان داستانوں پر یقین نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی معاشقہ ہو جسے لوگوں نے بہت بڑھا چڑھا دیا ہے۔ یعنی دودھ کی نہر کا قصہ اور...... قیس کی دیوانگی۔''

''تم نے فوج میں جانے سے تو انکار کر دیا تھا۔ اب میری خواہش ہوگی کہ تم میرے محکمے میں آجاؤ۔ میں نے دو ایک باتوں سے محسوس کیا ہے کہ تم میں اس کی صلاحیت ہے۔''

دلاور نے کچھ رک کر جواب دیا۔ ''میں اس بارے میں سوچوں گا ڈیڈی!''

''فوری طور پر تو یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ یہ تمہاری تعلیم مکمل ہونے کا آخری سال ہے۔ ٹریننگ خاصا وقت لے گی۔ ابھی تمہیں یونیورسٹی میں اس لیے بھی رکنا ہے کہ سعیدہ کے بارے میں تمہیں کچھ کرنا ہے۔''

''وہاں کیپٹن اختر میرا معاون ہوگا۔''

''اسے ہدایت کر دی جائے گی لیکن اس کے تعاون کی ضرورت تمہیں شاید ہی پڑے۔ تمہیں تو بس سعیدہ کے قریب ہونا ہے۔''

''اس نے یہ خبر ٹی وی پر تو سن ہی لی ہوگی کہ ان دونوں نے میرے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے۔''

''مجھے علم نہیں کہ ٹی وی پر یہ خبر آچکی ہے۔ آج مجھے ٹی وی دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔''

''جی ہاں، آچکی ہے یہ خبر!...... ابھی عدالت سے آتے وقت میں نے موبائل پر ٹی وی دیکھا تھا۔ اس خبر نے اسے مزید یقین دلا دیا ہوگا کہ میں نے کوئی ڈراما نہیں کیا تھا۔''

''سمجھ تو جانا چاہیے۔ اب وہ تم سے خاصی متاثر ہو گی۔ تم بہ آسانی اس کی قربت حاصل کر سکو گے۔ کل تمہاری سالگرہ ہے۔ تمہاری ماں نے دعوت نامے تو تقسیم کرا دیے ہیں لیکن کچھ دعوت نامے پڑے ہوئے تو ہوں گے۔ کل یونیورسٹی جاؤ تو ایک دعوت نامہ اس کے لیے لیتے جانا۔''

''جی۔'' دلاور نے کہا لیکن یہ اس نے فوری طور پر سوچ لیا تھا کہ ایسا نہیں کرے گا۔ اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ سعیدہ دعوت نہ ملنے کے باوجود اس کی سالگرہ میں آئے گی۔ یونیورسٹی میں وہ کئی دوستوں کو مدعو کر چکا تھا اسی لیے اس کے خیال کے مطابق سعیدہ کو اس کی سالگرہ کا علم تو ہو جانا چاہیے تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن کے اخبارات میں سعیدہ کا بیان موجود تھا۔ اس نے گزشتہ روز شائع ہونے والی اس خبر کی تردید کی تھی کہ وہ مقام غلط لکھا گیا تھا جہاں اس کی وجہ سے کچھ لوگوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ مکمل تردیدی بیان تھا اس کا۔

''تردید کا شکریہ۔'' یونیورسٹی میں دلاور نے سعیدہ سے سرسری طور پر کہا اور آگے بڑھ جانا چاہا۔

''سنو دلاور!'' سعیدہ نے اسے روکا۔

دلاور رک گیا لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ سعیدہ اس کے قریب آگئی اور بولی۔ ''میں نے تم سے معافی مانگ لی تھی۔ تم اب تک ناراض ہو؟''

''ناراض نہیں ہوں، لیکن نہیں چاہتا کہ پھر ایسی کوئی بات ہو جسے تم میرا ڈراما سمجھو!'' دلاور نے کہا اور پھر بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سعیدہ سے زیادہ بات ہو۔ وہ اپنے اس یقین کو آزمانا چاہتا تھا کہ سعیدہ دعوت نامے کے بغیر بھی اس کی سالگرہ میں آئے گی۔ اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ سعیدہ کا اپنے باپ کی جرائم پیشہ زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ زندگی میں پہلی بار اسے کوئی لڑکی پسند آئی تھی اور وہ بھی امکانی طور پر صحیح لڑکی شاید نہیں تھی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اختر نے اسے تنہائی میں گھیر لیا۔

''تمہیں ایک بات بتانی ہے۔'' اختر نے کہا۔ ''لیکن

پہلے یہ بتادوں کہ ہم بہ دستور کلاس فیلو ہیں، دوست ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہیں بتایا تو جا چکا ہے کہ میں دراصل کون ہوں۔"

"ہاں، تو؟"

"مطلب یہ کہ ہمارے درمیان کسی قسم کا تکلف حائل نہیں ہونا چاہیے۔ میں کیپٹن ہوں، یا بریگیڈیئر، یا کچھ بھی۔ ہماری گفتگو کا انداز دوستانہ ہی رہنا چاہیے۔ میں بھی اپنے ذہن سے یہ بات جھٹک چکا ہوں کہ تم میرے محکمے کے سربراہ کے بیٹے ہو۔"

"ہوں۔" دلاور مسکرایا۔

"آج تو سعیدہ کی تردید بھی آ گئی ہے۔" اختر نے کہا۔ "اب تو اس سے تمہاری خفگی ختم ہو جانا چاہیے۔"

دلاور سمجھ گیا۔ ابھی اختر کو علم نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے والد ہی سے سعیدہ کے قریب ہونے کی ہدایت مل چکی تھی۔

"ہو جائے گی دھیرے دھیرے۔" دلاور مسکرایا۔

"میں نے صبح دیکھا تھا۔ اس نے تم سے بات کرنا چاہی تھی لیکن تمہارا رویہ درست نہیں تھا۔"

دلاور آہستہ سے ہنسا۔ "ابھی کہا تو ہے میں نے کہ دھیرے دھیرے......"

"اس معاملے میں اب ہمیں ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہے۔ تمہیں اس کے قریب ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ تمہیں اس کے باپ داراب کے بارے میں کچھ جاننے کا موقع مل سکتا ہے۔"

"دیکھوں گا۔"

اس موضوع پر ان میں مزید بات نہیں ہوئی۔ اس موقع پر دلاور سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہی کہ ذرا آڑ سے سعیدہ ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

'ضرور آئے گی۔' دلاور نے سوچا۔

اسی شام جب وہ تیار ہو کر مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا، اس کے ساتھ جنرل اسد بٹ بھی تھے جنہوں نے اپنے کچھ دوستوں کو بھی بلایا تھا۔ وہ ان دوستوں سے دلاور کا اور دلاور اپنے دوستوں کا تعارف ان سے کرا رہا تھا۔ اسی دوران میں دلاور نے محسوس کیا کہ اس کے والد قدرے فکرمند سے تھے۔

دو نئے مہمانوں کے بالکل قریب آنے سے پہلے جنرل اسد کے چہرے پر الجھن سی نظر آئی۔

"یہ کون صاحب آ گئے؟" وہ بڑبڑائے۔

"کون ڈیڈی؟" دلاور نے پوچھا۔

"وہ سفید بالوں والے۔" جنرل اسد نے کہا۔ "وہ جس کے ساتھ ہیں وہ تو میرے ایک پرانے دوست باقر صاحب ہیں۔"

دلاور نے اس شخص کی طرف دیکھا جس کی عمر اس کے اندازے کے مطابق پچاس پچپن سال ہو سکتی تھی۔ اس کے گھنگریالے بال برف کی طرح سفید تھے۔

وہ دونوں قریب آ گئے۔

"ہیلو اسد!" اس شخص نے جنرل کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہ ڈاکٹر احمت بغاطر ہیں۔ ایک سال پہلے ترکی سے آئے ہیں۔ ایک این جی او کی بنیاد رکھی ہے یہاں انہوں نے نوعمر لڑکوں کے لیے۔ ابھی میں گھر سے روانہ ہو رہا تھا کہ یہ آ گئے۔ تو میں انہیں بھی ساتھ لے آیا۔"

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" ڈاکٹر احمت بغاطر نے جنرل سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو مجھے بھی ہونی چاہیے۔" جنرل نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، پھر دلاور کا اپنے دوست باقر اور ڈاکٹر بغاطر سے تعارف کرایا۔ باقر نے تحفے کا ایک پیکٹ دلاور کو دیا۔

"تھینک یُو انکل!" دلاور نے تحفہ لے کر ایک ملازم کے حوالے کیا۔

"مجھ پر آپ کا تحفہ قرض رہا۔" ڈاکٹر بغاطر نے بہت صاف اردو میں کہا۔ اس سے قبل ان کی گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی۔

"بہت اچھی اُردو بولتے ہیں آپ۔"

"جب میں نے یہاں آ کر کام کرنے کا ارادہ کیا تھا، تبھی ترکی ہی میں سیکھی تھی۔"

"گڈ! آئیں، تشریف لائیں۔" دلاور کو اب وہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کے تمام دوست آ چکے تھے جن کا اسے استقبال کرنا تھا۔ اس کی توقع کے خلاف سعیدہ نہیں آئی تھی۔ دلاور کو اس بات سے ٹھیس پہنچی کہ اس کا یقین غلط ثابت ہوا تھا۔

اس تقریب میں خواتین کم آئی تھیں۔ بیگم اسد کے تعلقات بہت محدود تھے۔ انہوں نے اپنی جاننے والیوں کا استقبال دوسرے دروازے سے کیا تھا۔ وہ جاننے والیاں ہمیشہ اسی دروازے سے آتی تھیں۔

خاصے لوگ آئے تھے۔ اس ہنگامے میں دلاور کو باپ سے تنہائی میں بات کرنے کا ایک موقع ملا تو اس نے

وہی سوال کر ڈالا جو اسے قدرے الجھن میں ڈالے ہوئے تھا۔

''آپ کچھ پریشان ہیں ڈیڈی؟''

''نہیں۔'' جنرل نے کہا۔ ''بس الجھن ہے۔ جن دو آدمیوں نے تمہارے خلاف رپورٹ کرائی تھی، ان کے نظر میں آجانے سے ایک امید اور بندھی تھی جو ٹوٹ گئی۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''وہ دونوں غائب ہو گئے ہیں۔''

''اوہ!'' دلاور کے منہ سے نکلا۔ ''مار ڈالے گئے؟''

''یہ تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔'' جنرل نے کہا۔ ''مارا نہیں جاتا ہے جو غلطی کرتے ہیں۔ ان سے تو کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ تمہارے خلاف رپورٹ کرانے کا فیصلہ وہ خود نہیں کر سکتے تھے۔ ان سے یہ کام ایکس مین نے کروایا ہوگا۔''

''شاید وہ جان گیا ہو کہ ان دونوں کی نگرانی شروع ہو گئی ہے۔''

''اس کا امکان، میرا خیال ہے کہ نہیں۔ نگرانی بہت پیچیدہ انداز میں شروع کرائی تھی۔ ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ تمہارے بارے میں جان لینے کے بعد اس نے ضروری سمجھا ہو کہ وہ دونوں منظر سے ہٹ جائیں۔ غالباً وہ ایکس مین ہی کی ہدایت پر روپوش ہوئے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایکس مین نے انہیں شہر سے کہیں اور ہی بھیج دیا ہو۔''

دلاور نے طویل سانس لی۔ ''گویا صرف ایک ہی کارڈ آپ کے ہاتھ میں رہ گیا ہے۔ میرا مطلب ہے سعیدہ۔''

''ہاں، تم نے اسے بلایا نہیں؟''

''شاید کچھ دیر سے آئے۔'' دلاور نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے سعیدہ کو بلایا ہی نہیں تھا۔

''چلو اب کیک کاٹو!'' جنرل نے کہا۔

''جی۔''

دلاور نے جب کیک کاٹا، اس کے دائیں ہاتھ پر جنرل اسد اور بائیں ہاتھ پر اس کی والدہ، پھر دوسرے مہمان تھے۔

کیک کٹنے کے ساتھ ہی وسیع و عریض کمرا ''ہیپی برتھ ڈے'' کی آوازوں سے گونج اٹھا لیکن اس گونج میں بھی دلاور نے اپنے عقب سے آتی ہوئی وہ نسوانی آواز پہچان لی جو سعیدہ کی تھی۔ وہ تیزی سے مڑا۔

''بہت بہت مبارک ہو۔'' سعیدہ نے مسکراتے ہوئے گلاب کا ایک پھول دلاور کی طرف بڑھایا۔ ''میرا خیال ہے کہ ایسے موقعوں پر اس سے زیادہ اچھا تحفہ کوئی نہیں ہو سکتا۔''

''شکریہ سعیدہ۔'' دلاور کھل کر مسکرایا، پھر آہستہ سے بولا۔ ''ذرا الگ چلو۔'' وہ ایک طرف بڑھا۔ سعیدہ اس کے ساتھ تھی۔

اس وقت وہ دونوں اس سے بے خبر رہے کہ ڈاکٹر بغاطر نے ایک شخص کو کچھ اشارہ کیا تھا لیکن وہ اشارہ جنرل اسد بٹ کی نظر سے چھپا نہیں رہ سکا۔ وہ بہرحال ایک بڑے حساس ادارے کا سربراہ تھا جسے اپنے اردگرد کے ماحول پر کڑی نظر رکھنے کی عادت تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کرنل زنجانی کے قریب گیا۔

''ڈاکٹر بغاطر اور جعفر زیدی پر نظر رکھو۔'' جنرل کی آواز بہت دھیمی تھی۔

''جعفر زیدی؟ ڈائریکٹر آف پروٹوکول؟''

''ہوں۔''

''اور ڈاکٹر بغاطر؟''

''فوری طور پر اِدھر اُدھر مت دیکھنا۔ اس محفل میں صرف ایک ہی شخص ہے جس کے بال پکی برف کی طرح سفید ہیں۔ اس نے جعفر زیدی کو سعیدہ اور دلاور کی طرف متوجہ کیا تھا۔''

جنرل اسد نے اس سے مزید بات نہیں کی اور ایک مہمان کی طرف بڑھ گیا۔ سعیدہ اور دلاور ان باتوں سے بے خبر رہے تھے۔

''تم نے مجھے دعوت نہیں دی تھی۔'' سعیدہ کہہ رہی تھی، پھر وہ مسکرا کر بولی۔ ''میں ڈھیٹ بن کر چلی آئی۔ ایک دوست سے تمہارے گھر کا پتا پوچھ لیا تھا۔''

''مجھے یقین تھا کہ تم میری دعوت کے بغیر بھی آؤ گی۔''

''کیوں تھا یقین؟ تم تو ناراض تھے مجھ سے۔''

''بس پہلے دن تک...... اچھا آؤ! زیادہ دیر تک سب سے الگ تھلگ رہ کر باتیں نہیں کی جا سکتیں۔ چلو میں تمہیں اپنی والدہ سے ملاؤں۔''

سعیدہ سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چلی اور بولی۔ ''یونیورسٹی کے جو دوست ہیں، وہ ہماری طرف متوجہ ہیں۔ خاص طور سے اختر۔''

''اختر کو تو ہونا ہی چاہیے۔''

''کیوں؟ اسے خاص طور پر کیوں؟''

''ارے بس ایسے ہی کہہ بیٹھا، رواروی میں۔''

دلاور اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اختر دراصل کیا ہے۔

جب سعیدہ کو مسز اسد بٹ سے ملایا گیا تو انہوں نے شفقت سے سعیدہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ سعیدہ نے سلام کیا۔

''جیتی رہو۔'' مسز بٹ نے کہا، پھر دلاور سے کہا۔

''یونیورسٹی سے تمہارے جو دوست آئے ہیں، ان میں سعیدہ کے علاوہ ایک لڑکی اور ہے، حجاب میں۔ رہی بھی وہ سب سے الگ تھلگ ہے۔''

''جی ہاں، وہ......'' دلاور نے ایک طرف دیکھا۔

''دراصل اس کے مراسم اختر سے بہت اچھے ہیں۔ اختر ہی کے کہنے پر میں نے دعوت نامہ دیا تھا اسے۔ شگفتہ نام ہے اس کا۔'' پھر اس نے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے اختر کو اشارے سے قریب بلایا اور اس سے کہا۔ ''شگفتہ نے مجھے بس رسمی سی مبارک باد دی تھی۔ ایک قیمتی گھڑی بھی دی ہے تحفے میں۔ تم اسے کم از کم ممی سے تو ملا دیتے۔''

''ہاں، ہاں، ابھی بلاتا ہوں۔'' اختر تیزی سے شگفتہ کی طرف چلا گیا۔

دلاور کی والدہ سعیدہ سے یونیورسٹی کی باتیں کرنے لگی تھیں۔ اختر، شگفتہ کو قریب لے آیا۔

''تسلیمات امی صاحبہ۔'' شگفتہ نے کہا۔

''خوش رہو، جیتی رہو! لکھنؤ کی معلوم ہوتی ہو۔ یہ تسلیمات اور آداب وہیں کا رواج ہے۔''

''کیا آپ کو میرا تسلیمات کہنا برا لگا؟''

''ارے نہیں۔'' دلاور کی والدہ نے جلدی سے کہا۔ ''بلکہ اچھا لگا۔ اب تو یہ رواج ختم ہی ہو رہا ہے۔''

''شگفتہ بہت مذہبی بھی ہیں۔'' اختر ہنس کر بولا۔ ''پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھتی ہیں۔ روزے بھی شاید پورے رکھتی ہوں۔''

شگفتہ بولی۔ ''مجھے یاد نہیں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے کوئی روزہ چھوڑا ہو۔''

''ماشاء اللہ!'' دلاور کی والدہ نے کہا۔ ''تمہارے گھر والے......''

''ہم تین ہی ممبر ہیں۔'' شگفتہ نے فوراً جواب دیا۔ ''والد صاحب تو کئی سال سے نیروبی میں ہیں۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہوں۔ ان کی ٹانگوں پر فالج ہو گیا تھا۔ وہیل چیئر پر رہتی ہیں۔''

دلاور کی والدہ نے افسوس کا اظہار کیا، پھر کہا۔ ''ان کا خیال تو رکھنا پڑتا ہوگا۔ کوئی ملازمہ رکھی ہو گی؟''

''جی ہاں، لیکن وہ بس اتنی دیر رہتی ہے جتنی دیر کے لیے میں یونیورسٹی جاتی ہوں۔ اس وقت تو والدہ اکیلی ہی ہوں گی۔ میں انہیں تنہا نہیں چھوڑتی۔ اختر کے اصرار پر آ گئی۔ اب جلدی واپس جاؤں گی۔ تم کب جاؤ گی سعیدہ؟'' وہ سعیدہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''بس کچھ دیر اور رکوں گی۔'' سعیدہ نے کہا۔

''ٹیکسی کرو گی؟''

''ظاہر ہے۔''

''تو میری کار میں چلی چلو۔ رات تو ہو گئی ہے۔ دو دن ہی تو گزرے ہیں تمہیں ایک خطرے سے بچے ہوئے۔ احتیاط برتو۔''

''میں چھوڑ آؤں گا انہیں۔'' دلاور بول پڑا۔

کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے جنرل نے ان لوگوں کی باتیں سن لی تھیں۔

''تم ابھی کہیں نہیں جاؤ گے دلاور۔'' وہ وہیں سے بول پڑے۔ ''مجھے تم سے ابھی کوئی بات کرنی ہے۔ سعیدہ کو ان کے ساتھ جانے دو۔''

''بہتر ہے۔'' دلاور نے کہا، پھر سعیدہ سے بولا۔ ''تم انہی کے ساتھ چلی جاؤ۔''

''ڈرائیونگ تو تم خود ہی کرتی ہو؟'' سعیدہ نے شگفتہ سے کہا۔

''ہاں۔'' شگفتہ بولی۔ ''مرد ڈرائیور رکھنا مجھے پسند نہیں اس لیے سیکھ لی تھی ڈرائیونگ۔''

دلاور ان دونوں کو رخصت کرنے کے بعد اپنے والد کے قریب گیا۔ ''جی ڈیڈی!''

جنرل اسد اس وقت اپنے دوست اور ڈاکٹر بغاطر سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے ان دونوں سے دو منٹ کے لیے اجازت چاہی اور دلاور کو لے کر کچھ دور چلے گئے۔

''تمہیں بہت ہوشیار رہنا ہے اس وقت۔'' جنرل اسد نے کہا۔

''کوئی خاص بات ڈیڈی؟''

''میں ابھی دو ایک نام لوں گا۔ تم پلٹ کر ان لوگوں کی طرف دیکھنا مت۔ میں اب ڈاکٹر بغاطر کو شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔''

''اوہ، کوئی وجہ؟''

''ہاں۔'' جنرل نے جواب دیا۔ ''جب تم سعیدہ سے باتیں کر رہے تھے تو ڈاکٹر بغاطر نے جعفر زیدی کی طرف دیکھتے ہوئے تم دونوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اشارہ بھی

اتنے محتاط انداز میں کہ کوئی اس کا اشارہ دیکھ نہ سکے لیکن میں ہر طرف سے بہت ہوشیار رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ میں نے دیکھ لیا تھا۔ اشارہ بھی مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا۔ میں نے کرنل زنجانی کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ ان دونوں پر نظر رکھے۔ اس اشارے ہی کی وجہ سے میں نے ضروری سمجھا کہ تم اس وقت باہر نہ نکلو۔"

"جی۔" دلاور نے آہستہ سے کہا، پھر اس نے پوچھا۔ "یہ جعفر زیدی کون ہے؟"

"ڈائریکٹر آف پروٹوکول ہے۔"

"اور یہ ڈاکٹر بغاطر ہے کون؟"

"تم نے اندازہ تو لگا لیا ہوگا۔ آج میں اس سے پہلی بار ملا ہوں۔ وہ میرے دوست باقر کے ساتھ آیا تھا۔"

"جی، وہ تو میں نے دیکھا تھا۔"

"بس یہی کہنا تھا کہ ذرا ہوشیار رہنا۔ اب تم اپنے دوستوں کے پاس جاؤ، میں ڈاکٹر بغاطر سے باتیں کر کے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔"

"بہتر۔" دلاور نے کہا اور اپنے دوستوں کی طرف بڑھ گیا جو اپنا جتھا بنائے بیٹھے تھے۔ اس وقت دلاور نے ایک خاص بات بھی نوٹ کی۔

☆☆☆

ایک سڑک پر ٹریفک جام تھا۔ شگفتہ کو کار روکنی پڑی۔

"اب میری عشا کی نماز وقت پر تو نہیں ہو سکے گی۔" شگفتہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے برابر میں بیٹھی ہوئی سعیدہ سے کہا۔

"یہ تو اب شہر کا معمول بن چکا ہے۔" سعیدہ نے کہا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کہاں ٹریفک جام ہوگا۔"

"میری کوشش ہوتی ہے کہ وقت پر نماز پڑھی جائے۔" شگفتہ نے جیسے سعیدہ کی بات ہی نہیں سنی تھی۔

'جنونی مسلمان ہے یہ۔'

"تم پڑھتی ہو نماز؟" شگفتہ نے پوچھا۔

"کبھی کبھی۔" سعیدہ کو کہنا پڑا۔

"یہ تو اچھی بات نہیں ہے سعیدہ۔" شگفتہ نے کہا۔ "کم از کم فجر اور عشا تو پابندی سے پڑھ لیا کرو۔"

"کوشش کروں گی کہ تمہاری نصیحت پر عمل کروں۔" سعیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوشش نہیں، وعدہ کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ وعدہ کرتی ہوں۔"

"پکا وعدہ؟" شگفتہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"پکا۔" سعیدہ نے کہتے ہوئے مجبوراً اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس کے بعد شگفتہ نے باقاعدہ تبلیغ شروع کر دی۔ کار آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد ٹریفک کے ہجوم سے نکلنے کا موقع مل سکا۔

"اف!" شگفتہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "مجھ پر ایک احسان کرو گی سعیدہ؟"

"کیسا احسان؟"

"میرا گھر یونیورسٹی سے پہلے پڑتا ہے۔" شگفتہ نے کہا۔ "میں نے سوچا تھا کہ تمہیں چھوڑ کر واپس گھر آؤں گی تو وقت پر نماز پڑھ لوں گی لیکن اب تو صرف یہ صورت ہے کہ اگر تم اجازت دو تو میں پہلے اپنے گھر پر رک کر نماز پڑھ لوں، بلکہ تم بھی پڑھ لینا میرے ساتھ، ابھی تم وعدہ بھی کر چکی ہو کہ فجر اور عشا کی نماز ضرور پڑھا کرو گی۔ بس پندرہ منٹ لگیں گے سعیدہ۔"

"اچھا!" سعیدہ کو مجبوراً کہنا پڑا۔ "رک جاتی ہوں۔"

"تھینک یو سعیدہ۔" شگفتہ جیسے خوش ہو گئی۔

ذرا ہی دیر بعد اس نے اپنی کار اپارٹمنٹس کی ایک عمارت کے احاطے میں روکی۔

"آؤ۔" اس نے بڑی عجلت میں انجن بند کر کے اترنے کے لیے دروازہ کھولا تھا۔

دوسری طرف کے دروازے سے سعیدہ اتری۔

"تیسری منزل پر ہے میرا گھر۔" شگفتہ نے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن سیڑھیاں طے کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ لفٹ ہے۔"

وہ دونوں لفٹ سے تیسری منزل پر پہنچیں۔ شگفتہ ایک اپارٹمنٹ کا لاک کھولنے لگی۔

"لاک کر کے گئی تھیں؟" سعیدہ بول پڑی۔

"یہ اندر سے بھی کھولا جا سکتا ہے سعیدہ، جب ملازمہ کو کسی کام سے باہر نکلنا پڑتا ہے تو وہ چابی استعمال کرتی ہے لیکن اس وقت تو وہ ہوتی ہی نہیں ہے۔" شگفتہ نے دروازہ کھول کر قدم اندر رکھتے ہوئے کہا۔ "اور والدہ تو وہیل چیئر پر ہوتی ہیں۔ اس وقت تو وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہوں گی۔"

سعیدہ اس کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ ڈرائنگ روم خاصا آراستہ تھا۔

شگفتہ نے فوراً اپنے حجاب سے نجات حاصل کی۔ "آخر

آج مجھے موقع مل ہی گیا۔'' شگفتہ نے سعیدہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب!'' سعیدہ اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر چونکی۔

''میرا تعلق ایک تنظیم سے ہے جو کافروں کے اس ملک میں خلافت راشدہ کا نظام لانا چاہتی ہے۔'' شگفتہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تم نے جب مجھ سے نماز پڑھنے کا وعدہ کیا تھا تو تمہارا لہجہ چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ پھر جب تم نے پکا وعدہ کرنے کے لیے ہاتھ ملایا تھا تب بھی تمہارا انداز ایسا تھا جیسے تم نے وہ عمل بہ مجبوری کیا ہو۔ اب مجھے شبہ نہیں رہا کہ میری تنظیم کے امیر نے مجھے بالکل صحیح بتایا تھا۔ تم اور تمہارا باپ بہت عرصے سے تنظیم کی نظر میں ہیں۔ تمہارا باپ، بزدل باپ کہیں روپوش ہوگیا ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ گی کہ وہ کہاں ہے؟''

سعیدہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تم انہی لوگوں کی ساتھی ہو جنہوں نے مجھے اغوا کرنا چاہا تھا؟''

''ہاں۔'' شگفتہ نے جواب دیا۔ ''میں اسلام کے سچے پیروکاروں کے ساتھ ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارا باپ کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم، میں قسم کھا کر کہتی ہوں، میں نہیں جانتی۔''

''ہاں وہ بزدل چھپ تو گیا ہے لیکن اس سے فون پر تو بات ہوتی ہوگی تمہاری!''

''ہاں۔'' سعیدہ کو اپنا حلق خشک ہوتا ہوا لگا۔ ''فون پر ہی بات ہوتی ہے۔''

''اس کا نمبر بتاؤ۔''

''مجھے ان کا نمبر بھی نہیں معلوم۔''

''جھوٹی!'' شگفتہ نے اس کے گال پر تمانچا رسید کر دیا۔ ''جب وہ فون کرتا ہے تو اس کا نمبر تیرے موبائل پر نہیں آتا؟''

سعیدہ اپنا گال سہلا رہی تھی۔ ''ہر مرتبہ وہ کسی نئے نمبر سے فون کرتے ہیں۔''

''اپنا موبائل دے مجھے۔''

''خدا کے لیے مجھے جانے دو۔''

''میں کہہ رہی ہوں کہ موبائل دے۔'' شگفتہ نے غراتے ہوئے کہا اور اپنے جمپر کے نیچے کمر پر بندھا ہوا چابک نکال لیا۔ ''میں تیری کھال ادھیڑ دوں گی۔''

''میں دیتی ہوں موبائل۔'' سعیدہ نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''کیا پھر تم مجھے جانے دو گی؟'' وہ اپنا پرس کھولنے لگی جس میں اس کا موبائل تھا۔

''میں مسلمان ہوں۔ سچی مسلمان، میں کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتی۔ تجھے چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا فیصلہ میری تنظیم کے امیر کریں گے۔''

سعیدہ کو یقین ہوگیا کہ اسے چھوڑا نہیں جائے گا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بھاگی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ شگفتہ نے دروازہ نہ تو مقفل کیا تھا، نہ بولٹ کیا تھا۔ وہ آسانی سے دروازہ کھول سکتی تھی۔

اسے دروازے کی طرف بھاگتے دیکھ کر شگفتہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی کا سبب اس کی سمجھ میں اس وقت آیا جب اس نے دروازہ کھولا۔

''بھاگنے نہ پائے یہ!'' شگفتہ نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

سعیدہ کو واقعی بھاگنے کا موقع نہیں مل سکا۔ دروازے پر ایک آدمی کھڑا ہوا تھا جس نے سعیدہ کو بڑی زور سے دھکا دیا۔ وہ کمرے میں آگری۔

دھکا دینے والا اندر آگیا۔ اس نے تیزی سے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوسکی۔ باہر ایک اور آدمی موجود تھا جو اختر کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس نے آدمی کو بھی اتنی ہی زور سے دھکا دیا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے تیزی سے اپنی جیب میں بھی ہاتھ ڈالنا چاہا تھا لیکن اختر کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور سے گولی نکلی اور گرنے والے کا ہاتھ جیب تک پہنچنے سے پہلے ہی لہولہان ہوگیا۔

''جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش تمہیں دوسری دنیا میں پہنچا سکتی ہے۔'' اختر غرایا۔ پھر اس نے سعیدہ کی طرف دیکھا۔ ''تم ٹھیک ہونا؟''

''ہاں۔'' سعیدہ بمشکل بول سکی۔ اختر کو دیکھ کر وہ حیران بھی رہ گئی تھی۔

شگفتہ کا عالم یہ تھا کہ وہ اختر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

گولی کی آواز کے بمشکل ایک منٹ بعد تین اور آدمی تیزی سے کمرے میں آگئے۔

''ہتھکڑیاں لگا دو ان دونوں کے۔'' اختر نے ان کو حکم دیا۔

وہ تینوں تیزی سے آگے بڑھے۔ شگفتہ اور اس آدمی کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں جس کا ہاتھ زخمی ہوا تھا۔

"سعیدہ!" اختر بولا۔ "میرا تعلق ایک سرکاری ایجنسی سے ہے۔ یونیورسٹی میں کسی کو یہ مت بتانا!"
سعیدہ نے آہستہ سے سرہلا دیا۔
"میں نے تمہاری ہی حفاظت کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔" اختر پھر بولا۔
گولی چلنے کی آواز اپارٹمنٹس میں رہنے والوں نے بھی سنی تھی۔ باہر سے ان کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔
اختر کے بعد آنے والوں میں سے ایک دروازے پر ڈٹ گیا۔ "کوئی قریب نہ آئے۔ یہ پولیس کا معاملہ ہے۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔
تھوڑی دیر بعد اپارٹمنٹ کے لوگوں نے دیکھ لیا کہ باوردی پولیس بھی آگئی تھی۔ وہ شگفتہ اور زخمی ہاتھ والے کو پولیس وین میں ڈال کر لے گئی۔
اپارٹمنٹ میں کوئی اور نہیں تھا۔ شگفتہ نے جھوٹ بولا تھا کہ وہاں اس کی اپاہج ماں بھی ہے۔ حقیقتاً وہ وہاں اکیلی ہی رہتی تھی۔
"ابھی مجھے اس اپارٹمنٹ کی تلاشی لینا ہے سعیدہ! تم ان کے ساتھ یونیورسٹی چلی جاؤ۔" اس نے اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں کسی کو اس واقعے کے بارے میں مت بتانا۔"
سعیدہ نے سرہلا دیا۔ وہ اب تک مبہوت سی تھی۔ کوئی لفظ اس کے منہ سے نکلا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

گیارہ بج کر چالیس منٹ پر تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ دلاور اپنے کمرے میں لیٹا آرام کر رہا تھا۔ آرام کیا کر رہا تھا، خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکایا۔
"کون؟" اس نے بلند آواز میں پوچھا۔
"صاحب آپ کو ڈرائنگ روم میں بُلا رہے ہیں۔" باہر سے ملازم کی آواز آئی۔
"اچھا، آتا ہوں۔"
ایک ڈیڑھ منٹ بعد وہ ڈرائنگ روم میں تھا۔ جنرل اسد فکرمندی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ دلاور کو دیکھ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے اور دلاور سے بھی بیٹھنے کے لیے کہا۔
"میرا خیال تھا کہ آپ آرام کر رہے ہوں گے۔" وہ بولا۔
"آرام ہی کرتا لیکن تمہیں کچھ بتانا تھا اس لیے یہاں آ گیا۔ بیڈروم میں تمہاری والدہ کے سامنے وہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔"
دلاور سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔
"سعیدہ کو آج بھی اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔" جنرل نے کہا۔
دلاور چونکا۔ "وہ شگفتہ کے ساتھ گئی تھی۔"
"ثابت ہو گیا ہے کہ شگفتہ بھی انہی لوگوں میں سے ہے جو سعیدہ کو اغوا کر کے اس کے باپ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔"
"اوہ......! آپ نے کہا کہ کوشش کی گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ کامیاب نہیں ہو سکے۔"
"ہاں۔" جنرل نے کہا۔ "جب ڈاکٹر بغاطر نے جعفر زیدی کو اشارہ کیا تھا تو اس نے تم دونوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد اپنا موبائل نکال کر کال کی تھی۔ اس وقت میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ شگفتہ نے بھی اپنا موبائل نکالا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تو نہیں تھا کہ جعفر نے اسی سے بات کی ہو گی لیکن شبہ تو بہرحال ہو گیا تھا۔ میں نے زنجانی کو اس بارے میں بھی بتا دیا پھر جب میں نے شگفتہ کو تمہارے اور سعیدہ کے قریب دیکھا تو تم لوگوں کے اتنے قریب ہو گیا کہ تم لوگوں کی آوازیں سن سکوں۔ جب شگفتہ نے سعیدہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تھی اور تم نے کہا تھا کہ سعیدہ کو تم چھوڑ آؤ گے تو میں نے تمہیں روک لیا تھا۔ یہ تصدیق ضروری تھی کہ شگفتہ کوئی خاص کردار ادا کر رہی ہے یا میرا شبہ بے بنیاد تھا۔ جب وہ دونوں یہاں سے روانہ ہوئیں تو کیپٹن اختر ان کے تعاقب میں گیا تھا۔" جنرل نے کہا اور پھر وہ سب کچھ بتا دیا جو سعیدہ کے ساتھ پیش آیا تھا۔
"حیرت ہے۔" دلاور کے منہ سے نکلا۔ "تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شگفتہ کا تعلق ان لوگوں سے ہو گا۔"
جنرل اسد کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "اختر کا جو ساتھی سعیدہ کو چھوڑنے گیا تھا، اس نے سعیدہ سے یہ بھی پوچھ لیا کہ شگفتہ نے اس سے کیا باتیں کی تھیں۔"
جنرل نے وہ باتیں بھی دہرائیں، پھر پوچھا۔ "ان باتوں سے تم کیا نتیجہ اخذ کر سکتے ہو؟"
"یہ بات تو بالکل کھل گئی کہ ایکس مین نے یہاں مذہبی جنونیوں کی ایک تنظیم بھی بنالی ہے۔"
"بنالی ہے یا بنی بنائی کو اپنے لیے بھی استعمال کر رہا ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ ایکس مین کا ملک اس تنظیم کو اتنا فنڈ دیتا ہو گا کہ وہ لوگ اس کے لیے بھی کام کرتے ہوں

گے۔"

"شگفتہ نے کیا بیان دیا ہے؟"

"جو ہر مذہبی جنونی دیتا ہے۔ اس کی خواہش تو یہ ہے کہ وہ کسی معرکے میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہو جائے۔"

"یہ مائنڈ سیٹ یونیورسٹی تک بھی پہنچ گیا ہے۔"

"ہاں، لیکن میرا یقین ہے کہ اگر ایسے لوگوں کے ماضی کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ابتدائی تربیت وہیں ہوئی ہے جہاں برین واشنگ کی جاتی ہے اور انہیں جہاد و شہادت کی فضیلت سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ آگاہ کا لفظ تو میں نے شاید غلط استعمال کیا۔ یہ باتیں ان کے دماغ میں اس طرح بٹھادی جاتی ہیں جیسے پتھر پر لکیر۔"

دلاور نے طویل سانس لی۔ "اب مجھے کیا کرنا ہے ڈیڈی؟"

"کسی بھی طرح سعیدہ کے باپ کا پتا لگانا ضروری ہے۔ مجھے گمان ہے کہ ہمیں اس سے ایکس مین کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔"

"میں پوری پوری کوشش کروں گا۔"

"اچھا ہاں، یاد آیا۔ تمہیں ڈاکٹر بغاطر نے کوئی تحفہ دیا تھا؟"

"ہاں، جب وہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے اور اس وقت ہمارے قریب کوئی نہیں تھا، تب انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک ٹائی پن نکال کر دی تھی اس پر گفٹ پیکنگ نہیں تھی اور اسی لیے وہ انہوں نے سب کے سامنے مجھے نہیں دی تھی۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ تحفہ پھر کبھی سہی لیکن انہوں نے اصرار کیا تو میں نے لے لی۔"

"ہاں، تم دونوں اس وقت مجھ سے دور تھے لیکن میری نظریں ہر طرف گھومتی رہتی ہیں دلاور! میں نے دیکھ لیا تھا۔ کہاں ہے وہ ٹائی پن؟"

"میں نے اپنے کمرے میں رکھ دی تھی۔"

"کیونکہ ڈاکٹر بغاطر میری نظر میں مشکوک ہو چکا ہے اس لیے میں اس کی دی ہوئی ہر چیز کو شک ہی کی نظر سے دیکھوں گا۔"

"ٹائی پن......" دلاور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی کیمرا یا اس قسم کے آلات لگے ہوتے ہیں جو آوازیں نشر کر سکتے ہیں جو کسی اور ریسیونگ آلے پر سنی جا سکتی ہیں۔"

"جی مجھے علم ہے اسی لیے میں کہتے کہتے رک گیا تھا کہ ٹائی پن میں کیا ہو سکتا ہے۔"

"وہ لا کر مجھے دو۔ میں چیک کر لوں گا یا چیک کروا لوں گا لیکن جب تم وہ مجھے دو گے، اس وقت کوئی بات نہ کرنا، یا......" جنرل نے کہا۔ "میں خود تمہارے کمرے میں چلتا ہوں۔"

"چلیے!" دلاور کھڑا ہو گیا۔

پھر جنرل اسد نے ابھی اٹھنا چاہا تھا کہ ایک دھماکا سنائی دیا۔ درودیوار لرز کر رہ گئے۔

"یہ تو ہمارے گھر میں ہی کہیں ہوا ہے۔" جنرل اسد تیزی سے اٹھے۔

☆☆☆

جنرل اسد کا خیال غلط نہیں تھا۔ دھماکا دلاور کی خواب گاہ میں ہوا تھا۔ دلاور کے بستر کی سائڈ ٹیبل تباہ ہو گئی تھی۔ خاصے اثرات بستر تک بھی پہنچے تھے۔ ایک کھڑکی کے شیشے ٹوٹ گئے تھے لیکن درودیوار پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی۔

"وہ ٹائی پن تم نے کہاں رکھی تھی؟" جنرل نے تیزی سے پوچھا۔

"سرہانے!" گم صم سے دلاور نے جواب دیا۔ "سائڈ ٹیبل پر۔ تو آپ کا خیال ہے کہ دھماکا......"

"اور کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا دھماکے کا۔" جنرل نے کہا۔ "وہ کسی ڈبیا میں ہوگی!"

"جی ہاں۔"

"دھماکا خیز مادہ اس کی ڈبیا میں ہو سکتا ہے یا شاید ٹائی پن میں بھی ہو۔ اس کے باوجود اس میں دھماکا خیز مادہ اتنا نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کمرا ہی تباہ ہو جاتا۔ اسے اڑانے کے لیے یقیناً کوئی ریموٹ استعمال کیا گیا ہوگا۔ اس وقت تو تمہیں کمرے ہی میں ہونا چاہیے تھا نا۔"

"جی!" دلاور کی آواز دھیمی تھی۔ "گویا مجھے ہی ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔"

"اس کے علاوہ کوئی بات ذہن میں نہیں آتی۔ قیاس تو کر لیا گیا ہوگا کہ وہ ڈبیا تم نے سرہانے ہی رکھی ہوگی۔"

"یہ بھی ممکن تھا کہ میں اسے الماری میں رکھتا۔ اس صورت میں مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

"چانس لیا گیا ہوگا۔"

"اور چانس لینے والا ڈاکٹر بغاطر ہے۔"

"یقیناً وہ ایکس مین کے گروہ سے تعلق رکھتا ہوگا۔ میں نے تم سے بلاوجہ تو نہیں کہا تھا کہ تمہاری زندگی کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ یہ ایکس مین بہت کینہ پرور بھی ہے۔ وہ اسے برداشت نہیں کر سکا ہے کہ تمہاری وجہ سے سعیدہ اس کے ہاتھ

نہیں لگ سکی۔ دوسرے وہ مجھ پر بھی دباؤ ڈالنا چاہتا ہوگا۔ یعنی وہ میرے گھر میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں یہ معاملہ اخبارات میں نہیں آنے دوں گا۔ اسی لیے میں نے پولیس کو فون نہیں کیا۔ میرے ہی محکمے کے دو تین افراد یہاں آنے والے ہیں۔ وہی یہاں اس دھماکے کے بارے میں تحقیقات کریں گے۔ کل دن میں کمرے کو ٹھیک کروا لیا جائے گا۔ آج تم کسی اور کمرے میں سو جاؤ۔''

اس گفتگو سے قبل گھر کے ملازمین اور دلاور کی والدہ بھی گھبرائی ہوئی وہاں آئی تھیں لیکن جنرل نے ان سب کو رخصت کر دیا تھا۔

''کمرے میں آکر بتاؤں گا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔'' جنرل نے اپنی اہلیہ سے کہا۔

پانچ منٹ اور گزرے تھے کہ جنرل کے محکمے کے وہ افراد آگئے انہیں بلایا گیا تھا۔ جنرل نے ان لوگوں کو کچھ ہدایات دیں اور پھر دلاور کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔

''تمہاری والدہ بہت پریشان ہوں گی۔ میں جا کر انہیں تسلی دیتا ہوں۔ تم آج اس کمرے میں سو جاؤ جہاں میں ان دنوں میں سوتا ہوں جب تمہاری والدہ دو ایک روز کے لیے کہیں کسی عزیز سے ملنے چلی جاتی ہیں۔''

''بہتر، لیکن نیند تو کیا خاک آئے گی آج...... اور ہاں، کل میں یونیورسٹی جاؤں؟''

''یقیناً۔'' جنرل نے جواب دیا۔ ''ایکس مین اس ناکامی پر بھی جھنجلائے گا۔ جھنجلاہٹ ہی میں انسان سے غلطیاں ہوتی ہیں۔''

جنرل کی خواب گاہ قریب آگئی تھی۔ دلاور یہاں پر باپ سے الگ ہو گیا۔ خواب گاہ میں مسز اسد پریشانی کے عالم میں ٹہل رہی تھیں۔ جنرل اسد اگر اب ان سے کچھ چھپانے کی کوشش کرتے تو انہیں یقین نہیں آتا اس لیے جنرل نے انہیں مختصر طور پر صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ڈھارس بھی بندھائی۔

وہ بولیں۔ ''تو وہ ڈاکٹر بغاطر اسی لیے یہاں آیا تھا؟''

''ظاہر ہے کہ کسی معمولی آدمی کو تو گھر میں داخل ہی نہیں ہونے دیا جاتا۔''

''وہ باقر بھائی کے ساتھ آیا تھا نا؟''

''ہاں، کل صبح باقر سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کروں گا۔ اب تو ایک بج چکا ہے۔ اب تم بھی سونے کی کوشش کرو۔ میں تو ابھی اس کمرے میں جاؤں گا جہاں میرے آدمی کام کر رہے ہیں۔''

''دلاور کہاں ہے؟''

''اسے میں نے دوسرے کمرے میں بھیج دیا ہے۔''

''اب اسے اس وقت تک یونیورسٹی تو نہیں جانا چاہیے جب تک یہ معاملہ......''

''تم فکرمند نہ ہو۔ میں نے اس کی حفاظت کا مکمل بندوبست کیا ہے۔ اس واقعے کے بعد اسے خود بھی بہت محتاط رہنا ہوگا۔''

مسز اسد کے چہرے سے تشویش کے تاثرات ختم نہیں ہوئے لیکن پھر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

جنرل اسد کچھ دیر لیٹے رہے، پھر اٹھ کر اس کمرے میں پہنچے جہاں دھماکا ہوا تھا۔ وہاں کام کرنے والوں نے بتایا کہ انہیں ایک دو مخملی ٹکڑے ملے ہیں جو کسی ڈبیا کے ہو سکتے ہیں۔

''دکھاؤ، رنگت کیا ہے؟''

''بارود کا اثر ان ٹکڑوں پر بھی ہے لیکن بعض جگہ ہلکی سی نیلاہٹ رہ گئی ہے۔''

''کسی ٹائی پن کے ٹکڑے نہیں ملے؟''

''جی نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ بارود اس میں بھی ہوگا۔ ٹائی پن کی کرچیاں اڑ گئی ہوں گی۔ اب کتنی دیر اور لگے گی؟'' جنرل نے پوچھا۔

''کام ختم ہو گیا ہے سر! بس جو کچھ ملا ہے، وہ لیبارٹری بھجوا دیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اس کی خبر باہر نہ جائے کہ یہاں کیا ہوا ہے۔''

جنرل اسد بٹ نے انہیں رخصت کر دیا۔

☆☆☆

''اب تمہیں بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے سعیدہ!'' یونیورسٹی میں دلاور اس سے کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں جب پہلی مرتبہ اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تو خیال تھا کہ وہ ان جرائم پیشہ لوگوں کی حرکت ہوگی جو لڑکیوں کو اغوا کر کے انہیں فروخت کرتے ہیں لیکن اب یہ بات صاف نظر آرہی ہے کہ کچھ لوگ تمہیں کسی خاص وجہ سے اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑنے کا کوئی اور مطلب ہو ہی نہیں سکتا۔ آخر کوئی تمہارے پیچھے کیوں پڑ سکتا ہے؟''

اس سے پہلے کہ سعیدہ کوئی جواب دیتی، اس کے پرس میں پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سعیدہ نے

موبائل نکالا اور اس کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ اس وقت دلاور نے ایک عجیب سی بات محسوس کی۔ سعیدہ نے اسکرین سے بہ سرعت نظر ہٹا کر دلاور کی طرف دیکھا تھا۔

''ہوں۔'' اس نے ماؤتھ پیس منہ کے قریب کرتے ہوئے ہلکی سی آواز نکالی۔

اس سے بھی دلاور نے ایک نتیجہ اخذ کیا۔ سعیدہ نہیں چاہتی تھی کہ کال کرنے والے کے بارے میں دلاور کوئی اندازہ لگا سکے۔

چلتے چلتے اچانک دلاور لڑکھڑا گیا۔ اس وقت سعیدہ کو یہی محسوس ہوا ہوگا کہ دلاور نے کسی وجہ سے اپنا توازن کھو دیا تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ دلاور اس بہانے اس طرح جھکا تھا کہ اس کا کان سعیدہ کے موبائل کے قریب ہو جائے۔

''شام سات بجے، اسی درخت کے پاس۔'' دلاور نے مدھم سی مردانہ آواز سنی۔

''اچھا۔'' سعیدہ نے جلدی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

''معاف کرنا سعیدہ۔'' دلاور کے منہ سے نکلا۔ ''میں تو گر ہی جاتا ابھی تم پر! جانے کیا آ گیا تھا پیر کے نیچے۔''

''ایک بات بتاؤ گے دلاور؟'' سعیدہ نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا یاد آ گیا اچانک؟'' دلاور ہنسا۔

''اختر سے تعلقات تمہارے بھی اچھے ہیں۔''

''تو؟''

''اور اس کا تعلق؟'' سعیدہ نے اتنا ہی کہا اور استفہامیہ نظروں سے دلاور کی طرف دیکھنے لگی۔

دلاور بولا۔ ''مجھے بھی کل ہی معلوم ہوا ہے اس کے بارے میں۔''

''آخر کیا مطلب ہے اس کا؟'' سعیدہ نے پوچھا۔

''اس نے یونیورسٹی میں کچھ ہی عرصے پہلے داخلہ لیا ہے جبکہ اس وقت داخلے بھی بند ہو چکے تھے۔ تعلیم بھی وہ غالباً مکمل کر چکا ہوگا۔ اس کے بعد ہی اس محکمے میں گیا ہوگا۔ یونیورسٹی میں اسے داخلہ بھی اپنے محکمے کے دباؤ کی وجہ سے ملا ہوگا۔''

''تم نے آج بات کی تھی اس سے؟''

''ابھی تو موقع نہیں ملا۔ بات کرنا بھی چاہتی ہوں اس سے لیکن اب اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی عجیب سا لگے گا۔''

''یہ تو ہے۔'' دلاور نے سر ہلایا۔

''تم میری باتوں کا جواب گول کر گئے۔''

''میں بھی بات کرنا چاہتا ہوں اس سے، مجھے بھی موقع نہیں ملا۔''

سعیدہ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیوں؟'' دلاور مسکرایا۔ ''یقین نہیں آیا میری بات پر۔''

''تمہارے والد جنرل ہیں؟''

''لیفٹیننٹ جنرل۔''

''ایسے ہی عہدے داروں کو کسی سرکاری ایجنسی کا سربراہ بنایا جاتا ہے۔ دیکھو دلاور! مجھے بہلانے یا ٹالنے کی کوشش نہ کرنا۔''

''ہاں۔'' دلاور نے آئندہ کی گفتگو کے لیے میدان ہموار کرتے ہوئے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

''اور اختر انہی کے محکمے کا کوئی افسر ہے؟''

''یقین کرو، مجھے پہلے اس کا علم نہیں تھا۔ کل ہی معلوم ہوا ہے۔''

''تو پھر تمہیں اپنے والد ہی سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ اختر کو یہاں کیوں داخل کرایا گیا ہے۔''

''ہاں۔'' دلاور نے اثبات میں سر بھی ہلایا۔ ''شبہ تھا کہ تمہیں اغوا کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اختر کو تمہاری حفاظت کے لیے......''

''حفاظت کے لیے!'' سعیدہ نے کچھ تلخی سے کہتے ہوئے بات کاٹی۔ ''یا میرے ذریعے سے میرے والد تک پہنچنے کے لیے؟''

دلاور نے سنجیدگی سے چند سیکنڈ کے لیے سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر تمہیں اور سب کچھ بھی بتا دیا گیا ہوگا؟''

دلاور نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''پھر تو......'' سعیدہ نے تلخی سے کہا۔ ''تمہیں اب مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں رہنا چاہیے۔ آخر میں ایک جرائم پیشہ شخص کی بیٹی ہوں۔''

''تم خود تو جرائم پیشہ نہیں ہو۔''

''تو میرے لیے تمہارے جذبات اب بھی وہی ہیں؟''

''یقیناً سعیدہ! میرے جذبات اب بھی وہی ہیں۔ تم مجھے پسند ہو، اور تم ایک جرائم پیشہ شخص کی بیٹی ہو تو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔''

''اختر کا مقصد تو غالباً میرے والد کی گرفتاری ہے۔''

''ہاں، تم اپنے والد کو مشورہ دو کہ وہ خود کو قانون کے

حوالے کر دیں۔ تم سے میں یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ اگر انہوں نے کوئی بہت ہی سنگین جرم نہیں کیا ہے تو انہیں اس شخص کے خلاف سرکاری گواہ بنالیا جائے گا۔''

''اس شخص کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا ہے تمہیں؟''

''ہاں، ایکس مین کہلاتا ہے وہ۔ غیر ملکی جاسوس ہے جو یہاں دہشت گردی بھی پھیلا رہا ہے۔ تمہیں بھی یہ سب کچھ معلوم ہوگا۔''

''ہاں، والد نے مجھے بتایا تھا۔'' سعیدہ اب کچھ فکرمند نظر آنے لگی تھی۔

''کیا تم انہیں مشورہ دو گی کہ وہ خود کو......''

''کیا تم بھی اس محکمے کے لیے کام کرتے ہو؟''

''نہیں، ابھی تک تو نہیں۔ مستقبل میں شاید ایسا ہو۔''

''تو پھر تم مجھ سے یہ وعدہ کیسے کر سکتے ہو کہ انہیں سرکاری گواہ بنالیا جائے گا؟''

''میں اپنے والد سے اپنی کوئی بات تو منوا سکتا ہوں سعیدہ۔''

''میں چاہوں گی کہ پہلے ان سے بات کرلو تم...... ہاں، مجھے یہ نہیں معلوم کہ میرے والد نے کوئی سنگین جرم تو نہیں کیا۔''

''کب معلوم کرو گی؟''

''جب بھی ان سے ملاقات ہو گی۔ اخراجات دینے کے لیے وہ مجھ سے مہینے میں ایک بار تو ملتے ہیں۔''

''اب کب ملیں گے؟''

''یہ تو وہ فون کریں گے تو معلوم ہوگا مجھے۔''

دلاور سمجھ گیا کہ فی الحال سعیدہ اپنے باپ کے معاملے میں اس پر مکمل اعتماد نہیں کرنا چاہتی ورنہ بتا دیتی۔ دلاور کے خیال کے مطابق سعیدہ نے جو کال ریسیو کی تھی، وہ اس کے والد ہی کی تھی۔ اسے شام کے سات بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ کسی درخت کے پاس ملنے کی بات کی گئی تھی۔ وہ کوئی ایسا درخت ہوگا جہاں باپ بیٹی پہلے بھی ملتے رہے ہوں گے اسی لیے یہ وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ کس درخت کے نیچے۔

''تو جب وہ فون کریں یا تمہاری ملاقات ہو تو انہیں مشورہ دینا اور مجھے بتانا۔'' دلاور نے کہا، پھر بولا۔ ''میں اب جاؤں گا۔''

''چلو۔'' سعیدہ بولی۔ ''پارکنگ تک تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔''

''تمہیں کبھی دکھ نہیں ہوا کہ تم ایک جرائم پیشہ شخص کی بیٹی ہو؟'' دلاور نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' سعیدہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''دکھ تو ہوا، لیکن میں ہرگز نہیں چاہوں گی کہ انہیں کوئی سزا ملے۔ وہ بہرحال میرے باپ ہیں۔'' سعیدہ کی آواز بھرا گئی۔ ''مجھ سے محبت بھی کرتے ہیں۔ صرف میری خاطر وہ روپوش ہیں کافی دن سے۔ اگر میں نہ ہوتی تو وہ اس ملک سے کہیں اور چلے جاتے۔''

''آخر کب تک روپوش رہنے کا سوچا ہوگا انہوں نے؟''

''ان کی خواہش ہے کہ میں تعلیم مکمل کرلوں تو وہ میری شادی کر کے ہمیشہ کے لیے یہ ملک چھوڑ دیں۔'' اس مرتبہ سعیدہ کی آواز تو بھرائی ہی تھی، آنکھوں میں آنسو بھی ڈگمگا گئے تھے جنہیں اس نے پینے کی کوشش کی تھی۔

''میں نے کہا نا سعیدہ!'' دلاور بولا۔ ''انہیں سرکاری گواہ بنالیا جائے گا۔''

''بہ شرطیکہ انہوں نے کوئی بہت سنگین جرم نہ کیا ہو؟''

''ہاں۔'' دلاور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں اس صورت میں اپنے والد سے اپنی بات نہیں منوا سکوں گا۔''

باتیں کرتے ہوئے وہ کار تک پہنچ گئے تھے۔

''اپنا بھی خیال رکھنا دلاور۔'' سعیدہ اس وقت بولی جب دلاور کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ ''بابا نے ایک بار مجھے بتایا تھا، ایکس مین بہت کینہ پرور شخص ہے۔ وہ یہ بھولے گا نہیں کہ ایک مرتبہ میں تمہاری وجہ سے اس کے آدمیوں کے ہاتھ نہیں لگ سکی۔''

''میں ہمیشہ چوکس رہنے کا عادی ہوں۔'' دلاور نے مسکراتے ہوئے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''میں نے احتیاطاً تمہیں بتانا ضروری سمجھا کہ ایکس مین بہت کینہ پرور ہے۔''

''میری فکر نہ کرو۔'' دلاور نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر گاڑی حرکت میں لے آیا۔

جواب میں سعیدہ نے بھی ہاتھ ہلایا تھا۔

گھر سے یونیورسٹی آتے ہوئے بھی دلاور نے محسوس کیا تھا کہ دو کاریں اس کے آگے پیچھے اور ایک کار اس سے کچھ فاصلے پر رہتی تھی۔ ان کاروں میں وہی لوگ ہو سکتے تھے جنہیں دلاور کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔

جنرل اسد بٹ نے اپنے بیٹے کے لیے بلٹ پروف

جیکٹ بھی مہیا کردی تھی جو وہ اس وقت بھی پہنے ہوئے تھا۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے دلاور کا ذہن اس سوال میں الجھا رہا کہ وہ کیپٹن اختر کو سعیدہ سے باپ کی متوقع ملاقات کے بارے میں باخبر کرے یا نہ کرے...... اگر آج اختر سعیدہ پر بہت کڑی نظر رکھتا تو امکان تھا کہ سعیدہ کے باپ داراب کی گرفتاری عمل میں آجاتی۔ اس صورت میں سعیدہ کو شبہ ہوسکتا تھا کہ جب اس نے باپ سے موبائل پر بات کی تھی تو دلاور نے اس کے باپ کی آواز سن لی تھی۔ جب دلاور اپنا توازن کھونے کے بہانے اس طرح جھکا تھا کہ اس کا کان موبائل کے قریب ہو جائے تو سعیدہ نے ایک بار اس کی طرف قدرے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے کہا تو کچھ نہیں تھا لیکن اس کی آنکھوں میں اس شبہے نے انگڑائی یقیناً لی تھی کہ دلاور کے توازن بگڑنے کی وجہ شاید صرف یہ تھی کہ وہ اس طرح اس کے موبائل کے قریب ہو کر دوسری طرف سے آنے والی آواز سننا چاہتا تھا۔

آخر ایک فیصلہ کر کے دلاور نے کار ایک مناسب جگہ پارک کی اور موبائل پر اپنے باپ سے رابطہ کیا اور انہیں ساری صورتِ حال بتائی پھر بولا۔ ''اگر داراب کی گرفتاری عمل میں آجاتی ہے تو میں سعیدہ کا اعتماد کھو دوں گا۔ آئندہ اگر ضرورت پڑی تو میں اس کا تعاون حاصل نہیں کرسکوں گا۔ شاید وہ ذاتی طور پر مجھ سے بدظن ہو جائے کیونکہ وہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''ہوں۔'' جنرل اسد نے فوری طور پر جواب نہیں دیا۔

دلاور نے انتظار کیا جو زیادہ طویل نہیں تھا۔ بمشکل دس سیکنڈ بعد اس نے ان کی آواز سنی۔ ''تو ایسا ہے کہ اسے فوری طور پر گرفتار نہ کیا جائے۔ اس کی نگرانی کر کے اس کے ٹھکانے کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ بیٹی کے مشورے پر وہ سرکاری گواہ بننے کے لیے خود ہی گرفتاری دے دے۔ اگر نہیں دی تو پھر دیکھا جائے گا۔ اس کا ٹھکانا تو معلوم ہو ہی چکا ہوگا۔ تم پر سعیدہ کا اعتماد رہنا چاہیے۔ مستقبل میں کیا صورتِ حال ہو، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کوئی کھڑ بند نہیں رکھنا چاہیے۔''

جنرل کے خاموش ہوتے ہی دلاور نے کہا۔ ''داراب یقیناً بہت ہوشیار آدمی ہوگا۔ نگرانی کا اندازہ ہوتے ہی بھڑک نہ جائے۔''

''میں ناکارہ لوگوں کو محکمے سے نکال چکا ہوں۔ نگرانی کے لیے کئی آدمی مقرر کیے جائیں گے۔ کیپٹن اختر اکیلا نہیں ہوگا۔ میں ابھی کرنل زنجانی کو ہدایات دے دیتا ہوں۔ تم اختر کو بتا دو۔''

''بہتر ہے۔''

باپ سے گفتگو کرنے کے بعد دلاور نے موبائل پر ہی اختر سے رابطہ کیا۔ اختر کو سب کچھ بتانے کے بعد اس نے کار اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ اس وقت بھی اس نے محسوس کیا کہ تین کاریں اس کی کار کے آس پاس ہی تھیں۔ وہ زیرِلب مسکرا دیا۔ اب وہ یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس میں قدرتی طور پر وہ صلاحیت ہے جو اس کے والد کے محکمے میں کام کرنے والوں میں ہونا چاہیے۔

☆☆☆

شام گزر گئی۔ اختر بہت مستعد رہا لیکن سعیدہ کمرے سے نکلتے نہیں دکھائی دی۔ اختر سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ دلاور نے کچھ غلط تو نہیں سن لیا؟

پھر چند منٹ اور گزرے تھے کہ اس کے موبائل پر دلاور کا میسج آیا۔ ''کیا صورتِ حال ہے؟'' میسج کی تحریر تھی۔

اختر نے جوابی میسج کرنے کے بجائے دلاور کو فون کیا اور کہا۔ ''وہ ابھی تک اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ تم نے کچھ غلط تو نہیں سن لیا؟''

''ہرگز نہیں۔'' دلاور نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ فون پر مختصر بات کرنے کے باوجود داراب بہت محتاط ہو۔ لفظ ''شام'' کوڈ ورڈ بھی ہوسکتا ہے۔ سعیدہ جانتی ہو گی کہ اس کے باپ نے شام کہا ہے تو اس کا اصل مطلب کیا ہے۔''

''ہوں، یہ ممکن تو ہے۔''

''انتظار کرو اور چوکس رہو۔''

''چوکس تو میں ہوں۔'' اختر نے جواب دیا اور مزید کوئی بات کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

وہ ہوسٹل کی راہداری میں آڑ لیے اس طرح کھڑا تھا کہ سعیدہ کے کمرے پر بہ آسانی نظر رکھ سکے۔ وقت گزرتا رہا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں بھی دکھنے لگیں۔ کھانے کا وقت بھی نکل گیا۔ ساڑھے چھ بجے سے دس بجے تک کا وقت گزر چکا تھا۔ پیاس بھی اب شدت سے لگنے لگی تھی۔

اب کیا کیا جائے، وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر کال آئی۔ کال ان تین افراد میں سے ایک کی تھی جنہیں کرنل زنجانی نے یونیورسٹی کے اردگرد مامور کیا تھا۔ داراب کی نگرانی انہی لوگوں کو کرنی تھی۔ اختر کو صرف اتنا کرنا تھا کہ جب سعیدہ کمرے سے نکلے تو وہ اس کی اطلاع ان لوگوں کو دے دے۔

موبائل پر کال کرنے والے نے کہا۔ ''کیا سو گئے ہو؟''

''نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں برابر اس کے کمرے پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔''

دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔ ''تو کیا وہ جادو جانتی ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''وہ نکل بھی چکی ہے ہاسٹل سے۔ اس کی نگرانی کی جارہی ہے۔ تمہیں اس لیے فون کیا کہ تم نے ہمیں اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ اپنے کمرے سے بلکہ ہاسٹل سے نکل چکی ہے۔''

اختر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا، وہ بولا۔ ''یقین کرو، میں برابر اس کے دروازے پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔''

''تو پھر وہ کیسے نکل گئی؟''

''اس کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ ان کمروں میں کھڑکیاں بھی ہیں۔ وہ کھڑکی سے نکلی ہوگی۔ اسے خیال ہوگا کہ میں اس کی نگرانی کر سکتا ہوں۔ وہ مجھ سے واقف ہو چکی ہے اس لیے اسے یہ خیال آسکتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے، خیر! ہم اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ وہ اس وقت یونیورسٹی سے بمشکل دو یا ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کھڑی اپنے باپ ہی کا انتظار کر رہی ہے۔ خیر، اب تم آرام کرو۔ تمہاری ڈیوٹی بس یہی تھی کہ جب وہ نکلے تو ہمیں باخبر کرو۔''

امکان تھا کہ اس جملے کے بعد دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا جاتا لیکن اس سے پہلے ہی اختر نے ایسی آواز سنی جیسے گولی چلی ہو۔ ساتھ ہی بولنے والے کی کراہ اور پھر ایسی آواز آئی جیسے موبائل ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا ہو۔

اختر اپنا موبائل جیب میں رکھتے ہوئے تیزی سے باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ یہ اس نے سمجھ ہی لیا تھا کہ اس سے بات کرنے والے پر کسی نے گولی چلائی تھی لیکن اختر دوڑ کر جاتا کہاں؟ اسے بس اتنا ہی علم ہو سکا تھا کہ سعیدہ یونیورسٹی سے ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر کسی درخت کے نیچے کھڑی تھی لیکن کس جگہ؟ ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر یونیورسٹی کی کئی سمتوں میں درخت تھے۔ اختر کا دوڑ پڑنا بس ایک اضطراری فعل تھا۔

☆☆☆

اس وقت تک داراب نہیں آیا تھا اور سعیدہ بے چینی سے اس کی منتظر تھی کہ اس نے گولی چلنے کی آواز سنی اور گھبرا گئی۔ اسی وقت فراٹے بھرتی ہوئی ایک موٹر سائیکل اس کے قریب آکر رکی۔

''آؤ، جلدی سے بیٹھو۔ نکلو یہاں سے۔'' اس نے دلاور کی آواز سنی۔

وہ سعیدہ کے لیے ایک حیران کن لمحہ تھا لیکن وہ جلدی سے موٹر سائیکل پر دلاور کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اندھیرے میں دلاور کا چہرہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا اور اگر اندھیرا نہ ہوتا تو بھی اس کی شناخت نہ ہو پاتی کیونکہ اس کے سر پر ہیلمٹ تھا جس سے منسلک ''پروٹیکٹو شیلڈ'' نے اس کا چہرہ چھپا لیا تھا۔ وہ شیلڈ تاریک تھی۔

موٹر سائیکل تیزی سے حرکت میں آگئی۔ عقب سے اب بے تحاشا گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ دو گروپس کا تصادم ہی ہو سکتا تھا۔ ایک گولی موٹر سائیکل کی طرف بھی آئی۔ اگر نشانہ خطا نہ ہو جاتا تو وہ گولی سعیدہ ہی کو لگتی کیونکہ وہ پیچھے بیٹھی تھی۔ ممکن ہے دوسرا فائر بھی کیا گیا ہو لیکن اس وقت دلاور موٹر سائیکل کو ایک پتلی گلی میں موڑ چکا تھا۔

''اب ہم خطرے سے یقیناً نکل چکے ہیں۔'' دلاور اتنی بلند آواز میں بولا کہ موٹر سائیکل کے انجن کی آواز کے باوجود سعیدہ اس کی بات سن لے۔

''ہوں۔'' سعیدہ نے کہا۔ اسی وقت سعیدہ کے پرس میں پڑے ہوئے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فوراً موبائل نکالا۔

''غالباً تمہارے والد کی کال ہوگی۔'' دلاور بولا۔

''ان سے وہ بات ضرور کرنا جو میں تم سے کہہ چکا ہوں۔''

سعیدہ نے کال ریسیو کی۔ وہ اس کے باپ کی ہی کال تھی۔

''تم کہاں ہو اس وقت؟'' اضطراری لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

''میں وہیں درخت کے نیچے کھڑی تھی کہ گولیاں چلنے لگیں۔ میں بھاگ کر وہاں سے دور نکل آئی ہوں۔ آپ......''

''میں ٹھیک ہوں۔ تم سے بعد میں بات کروں گا۔''

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ سعیدہ ایک طویل سانس لے کر موبائل پرس میں رکھنے لگی۔

''تم نے بات نہیں کی؟'' دلاور نے جلدی سے پوچھا۔

''انہوں نے لائن کاٹ دی تھی۔ اب پھر کسی وقت

کریں گے فون، یہ اتنی گولیاں چلنے کا کیا مطلب ہے؟"
"اطمینان سے کہیں بیٹھ کر بات کریں گے۔"
اور یہ اطمینان انہیں تھوڑی دیر میں اس وقت میسر آیا جب وہ ایک ہوٹل کے کافی شاپ کی ایک میز پر بیٹھے تھے۔ دلاور نے اپنے سر سے ہیلمٹ اسی وقت اتار دیا تھا جب ہوٹل کے باہر موٹر سائیکل روکی تھی۔
"اس وقت تمہیں یونیورسٹی کی طرف لے جانا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔" دلاور نے کہا۔ "یعنی فوری طور پر یہ غلط ہوتا۔ یقیناً اس وقت بھی کچھ لوگ تمہاری تاک میں تھے۔ گولیاں چلنے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا میرے والد کے محکمے کے لوگوں سے تصادم ہو گیا تھا۔"
"تو تم نے میرے والد کی آواز سن لی تھی۔ توازن نہیں بگڑا تھا تمہارا۔ تم جان بوجھ کر میری طرف جھکے تھے۔"
"ہاں سعیدہ!" دلاور نے اعتراف کر لیا۔ "میں نے تمہارے والد کی آواز سن لی تھی۔ انہوں نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ شام سات بجے، اسی درخت کے پاس۔"
"اور تم نے یہ سب کچھ اپنے والد کو بتا دیا؟"
"ہاں۔" دلاور نے کہا۔ "اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس وقت صورتِ حال مختلف ہو سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ تم ان لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتیں۔ ڈیڈی نے کچھ لوگوں کو یونیورسٹی کے قریب متعین کر دیا تھا۔ میرا وہاں آنا تو محض اتفاق ہے۔ گھر پر پڑے پڑے بس اچانک خیال تھا کہ اس وقت مجھے بھی وہاں ہونا چاہیے۔"
"میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ تم نے دوسری بار مجھے بچایا ہے۔"
"تم اس وقت شاید اپنے دشمنوں سے نہ بچتیں اگر میں نے تمہارے والد کی آواز نہ سن لی ہوتی، لیکن تم سات بجے کے بجائے اتنی دیر سے نکلیں۔"
"میں اسی وقت نکلی جب مجھے نکلنا چاہیے تھا۔ سات بجے کا مطلب یہی تھا کہ میں اس وقت نکلوں۔"
"ہم اس وقت جس صورتِ حال سے نکلے ہیں، اگر وہ نہ ہوتی تو تم شاید میری اس حرکت کو اچھا نہ سمجھتیں۔"
"کس حرکت کو؟"
"وہ جو...... بظاہر میرا توازن بگڑا تھا۔" دلاور نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"مجھے شبہ تو اسی وقت ہو گیا تھا۔" سعیدہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اسی لیے مجھے خیال تھا کہ میرے والد تک پہنچنے کے لیے میری نگرانی کی جائے گی۔ اس خیال ہی کے باعث میں اپنے کمرے کے بجائے کھڑکی سے نکلی تھی۔"
دلاور نے اپنا سر خفیف سا ہلایا اور پھر اپنی جیب سے موبائل نکالتا ہوا بولا۔ "میں اپنے والد کو رپورٹ دے دوں۔ تمہارے غائب ہو جانے کی وجہ سے انہیں یہ خیال آیا ہوگا کہ تم دشمن کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ میرے بارے میں تو انہیں یہ خیال ہوگا کہ میں اپنے کمرے میں پڑا سو رہا ہوں گا۔"
سعیدہ کچھ نہیں بولی۔ دلاور نے موبائل پر اپنے والد سے رابطہ کیا۔
"میرا خیال تھا تم سو رہے ہو گے۔" جنرل اسد نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔
"میں جاننا چاہتا ہوں ڈیڈی کہ آپ کو اپنے آدمیوں سے کیا رپورٹ ملی ہے؟"
"داراب وہاں پہنچ رہا تھا لیکن وہاں گولیاں چل چکی تھیں۔ ہمارے آدمیوں اور ایکس مین کے آدمیوں کا ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ داراب گولیاں چلنے کی آوازیں سن کر وہاں سے بھاگ نکلا لیکن سعیدہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی ہے اور میں اس سلسلے میں بہت پریشان ہوں۔"
دلاور خفیف سا مسکرایا۔ "آپ کو یہ خیال کیوں ہے کہ سعیدہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی ہے؟"
"ان میں سے کسی کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ وہ سعیدہ کو اس پر بٹھا کر لے گیا۔ اس نے سعیدہ کو ریوالور دکھا کر مجبور کیا ہوگا کہ وہ اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھے۔ ہمارے آدمیوں نے موٹر سائیکل کی طرف دو فائر کیے تھے لیکن نشانہ صحیح نہیں لگا۔"
"اگر نشانہ صحیح لگتا تو سعیدہ زد میں آتی۔"
"گولیاں موٹر سائیکل کا ٹائر برسٹ کرنے کے لیے چلائی گئی تھیں۔"
"اوہ۔"
"تم ابھی تک کیسے جاگ رہے ہو؟"
"میں اپنے کمرے سے نہیں بول رہا ہوں ڈیڈی...... میں اس وقت ایک ہوٹل میں ہوں اور سعیدہ میرے ساتھ ہے۔"
"کیا مطلب؟" جنرل اسد چونکے۔
جواب میں دلاور نے وضاحت سے سب کچھ بتا دیا۔
دوسری طرف سے کچھ رک کر کہا گیا۔ "خوب......! اس کا صریح مطلب ہے کہ تمہاری صلاحیتوں کے بارے میں میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔"

''اب میں الجھن میں ہوں کہ سعیدہ کے سلسلے میں کیا کروں۔ اگر میں انہیں یونیورسٹی لے جاتا ہوں تو خطرے کا امکان ہے۔ میرے ذہن میں یہ خیال ہے کہ دشمن وہاں شاید اب بھی تاک لگائے بیٹھا ہو۔''

''اندیشہ غلط نہیں ہے تمہارا۔'' جنرل نے کہا پھر پوچھا۔ ''تم کس ہوٹل میں ہو؟''

دلاور نے ہوٹل کا نام بتا دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' جنرل نے کہا۔ ''تھوڑی دیر انتظار کرو۔ ایک پولیس موبائل آئے گی جو سعیدہ کو یونیورسٹی چھوڑ آئے گی۔''

''یہ مناسب ہوگا۔''

''تم اس کے بعد سیدھے گھر ہی آؤ گے نا؟''

''ظاہر ہے ڈیڈی۔''

''ہوں۔'' جنرل اسد نے رابطہ منقطع کر دیا۔

دلاور اور سعیدہ کو چائے وغیرہ سے فارغ ہونے میں پندرہ منٹ لگے۔ دلاور نے فوراً بل بھی ادا کر دیا کیونکہ پولیس موبائل اب کسی وقت بھی وہاں پہنچ سکتی تھی۔

بل کی ادائیگی کے بعد پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک سب انسپکٹر لابی میں داخل ہوتا نظر آیا۔ دلاور نے کھڑے ہوکر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ تیزی سے ان کے قریب آ گیا۔ اس کا نام مجیب ظفر تھا۔ دلاور اور سعیدہ اس کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھے تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگ غور سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

☆☆☆

پریشانی کی وجہ سے اس رات داراب کو تاخیر سے نیند آئی تھی لیکن وہ زیادہ دیر نہیں سو سکا۔ کسی قسم کی آوازوں نے اسے چونکا دیا۔ اس کے گھر کا دروازہ توڑا جا رہا تھا۔

اس وقت داراب کے دماغ میں اس کے سوا کوئی خیال آ ہی نہیں سکتا تھا کہ ایکس مین کے آدمی اس کا ٹھکانا تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

داراب نے بڑی تیزی سے اٹھتے ہوئے سرہانے رکھی ہوئی آٹومیٹک گن اٹھالی۔ داراب نے یہ فیصلہ ابتدا ہی میں کر لیا تھا کہ اگر کبھی ایسا موقع آیا تو وہ مارے گا یا مر جائے گا لیکن ایکس مین کے آدمی اسے زندہ نہیں پکڑ سکیں گے۔ وہ ان کے ہاتھوں اذیت کی موت کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

گن ہاتھ میں سنبھالے وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف گیا۔ اس نے دروازہ ٹوٹ جانے کی آواز سن لی تھی۔ وہ ایک معمولی گھر تھا جس کے دروازے کھڑکیاں مضبوط نہیں تھیں۔

داراب نے کھڑکی کھولی تو اس طرف دو پولیس موبائل کھڑی دیکھیں۔ فوراً ہی ان کے سائرن بھی بجنے لگے۔ کھڑکی کھلتے ہوئے دیکھ لی گئی تھی اور سائرن بجا کر اسے یہ اشارہ دیا گیا تھا کہ وہ اس طرف سے فرار نہیں ہو سکتا۔

داراب کھڑکی بند کرتے ہوئے تیزی سے مڑا۔ اس نے وزنی جوتوں کی دھمک سنی جو کمرے کے دروازے پر آ رکی۔

''داراب!'' ایک آواز آئی۔ ''بھاگنے کی کوشش کرو گے تو کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ بہتر ہے کہ خود ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر خود کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم یہ دروازہ بھی توڑ دیں گے۔''

داراب کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اب بچ کر نہیں نکل سکتا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے فوری طور پر فیصلہ کرنا تھا۔ مقابلہ کرتا تو شاید دو چار پولیس والوں کو ٹھنڈا کر دیتا لیکن خود بھی مارا جاتا۔ خود کو پولیس کے حوالے کر دینے کی صورت میں وہ کم از کم ایکس مین کے خونی پنجے سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اسے اپنے بچاؤ کی ایک صورت یہ بھی سمجھ میں آئی کہ وہ ایکس مین کے خلاف سرکاری گواہ بن کر بھی شاید قانون کی گرفت سے بچ جائے۔ اس کے خیال کے مطابق پولیس کے پاس اس کے خلاف کسی قسم کے ٹھوس ثبوت نہیں ہو سکتے تھے۔

آخر وہ بلند آواز میں بولا۔ ''تم لوگ مجھے کس جرم میں گرفتار کرنے آئے ہو؟''

''یہ تمہیں پولیس اسٹیشن لے جا کر بتایا جائے گا۔''

''میں ابھی جاننا چاہتا ہوں۔''

''کیا تمہارے کمرے کا دروازہ بھی توڑ دیا جائے؟'' سرد لہجے میں کہا گیا۔

''اچھا!'' داراب نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''میں کھولتا ہوں دروازہ۔''

''تمہارے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔'' باہر سے کہا گیا۔ ''دروازہ کھولتے ہی اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لینا۔''

داراب ذرا سا رکا، پھر اس نے اپنی گن بستر پر پھینک دی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دونوں ہاتھ بھی سر پر رکھ لیے۔

پولیس والوں کے ساتھ کچھ افراد سادہ لباس میں بھی تھے۔ وہ سب تیزی سے اندر آئے۔ سب مسلح تھے لیکن ہاتھ میں ریوالور صرف ایک ہی شخص نے لے رکھا تھا۔ اسی نے کسی کو حکم دیا کہ داراب کی تلاشی لی جائے۔

''کچھ نہیں ہے میرے پاس۔'' داراب بولا۔ ''ایک گن ہے۔ وہ بستر پر پڑی ہے۔''

اسے کوئی جواب نہیں دیا گیا اور اس کی تلاشی لی گئی۔

''تم ادھر بیٹھ جاؤ۔'' ریوالور کی جنبش سے ایک طرف اشارہ کیا گیا۔

داراب نے تعمیل کی۔

آنے والوں میں سے کچھ نے اس کے کمرے کی تلاشی لینا شروع کی۔ اس سلسلے میں داراب مطمئن تھا۔ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو اس کے لیے پریشانی کا سبب بنتی۔

ریوالور والا ٹہلتا رہا اور دھیمی آواز میں تلاشی لینے والوں سے کچھ کہتا بھی رہا۔ اس دوران میں داراب سے اس نے ایک بات بھی نہیں کی۔

ایک گھنٹے بعد وہ سب لوگ داراب کو لے کر اس کے گھر سے نکلے۔ اس کا کمرا ''سیل'' کر دیا گیا۔

رات خاصی گزر جانے کے باوجود آس پاس رہنے والوں کی خاصی تعداد داراب کے گھر کے باہر جمع ہو چکی تھی۔ وہ سبھی سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ داراب کے گھر پر چھاپے کے بارے میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔

داراب کو جس کار میں بٹھا کر روانگی عمل میں آئی، اس کار میں کوئی پولیس والا نہیں تھا۔ چاروں آدمی سادہ لباس میں تھے۔ ان میں سے دو پچھلی نشست پر داراب کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ ایک کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ ریوالور والا اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ اسے وہ لوگ کئی مرتبہ ''سر'' یا ''کرنل صاحب'' کہہ کر مخاطب کر چکے تھے۔

داراب نے ''کرنل صاحب'' کے الفاظ سے اندازہ لگایا تھا کہ اسے گرفتار کرنے والے کسی بڑی ایجنسی سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے اس اندازے پر داراب کو تعجب بھی ہوا۔ اس کے خیال کے مطابق کسی بڑی ایجنسی کو اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے تھی۔

کار جب ایک عمارت کے احاطے میں داخل ہوئی تب داراب کو معلوم ہوا کہ وہ کس ایجنسی کی گرفت میں تھا۔ وہ عمارت لوگوں کے لیے انجانی نہیں تھی۔ سبھی جانتے تھے کہ وہ کس ایجنسی کا دفتر تھا۔

داراب کو اس عمارت کے ایک ایسے کمرے میں بٹھایا گیا جس میں صرف دو ہی کرسیاں تھیں۔ دونوں کرسیوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی میز پر ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا۔ اس میز کے بالکل اوپر چھت سے ایک بلب لٹکا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں روشنی کا کوئی اور بندوبست نہیں تھا۔

جس شخص کو ''کرنل'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا رہا تھا، وہ داراب کے سامنے بیٹھ کر اسے گھورنے لگا۔

''کیا معاملہ ہے صاحب؟'' داراب بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں کوئی ایسا آدمی تو نہیں ہوں جس سے آپ جیسے لوگوں کو دلچسپی ہو۔''

''ہم جیسے لوگ؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''اس عمارت کو سبھی جانتے ہیں صاحب۔''

''ہوں۔'' کرنل پھر چند لمحے تک اسے گھورتا رہا، کچھ بولا نہیں۔ شاید وہ اس طرح داراب کو زیادہ سے زیادہ نروس کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح دلاور کی آنکھ دیر سے کھلی۔ اتوار تھا ورنہ اس کی والدہ اسے جگا دیتیں۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کے والد دفتر جا چکے تھے۔

اتوار کو دفتر؟ دلاور نے سوچا، یقیناً کوئی خاص بات ہوگی۔ اسے اب اس سارے معاملے سے اتنی دلچسپی ہو گئی تھی کہ وہ ہر لمحے کی صورتِ حال سے واقف رہنا چاہتا تھا۔ اس نے ناشتا کر کے موبائل پر اپنے والد سے رابطہ کیا۔

''ہاں، کیا بات ہے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''اس معاملے میں میری دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے۔ جاننا چاہتا تھا کہ......''

''بات لمبی ہو جائے گی۔ فون پر نہیں کی جا سکتی۔''

''میں آ جاؤں دفتر؟''

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''آ جاؤ۔''

دلاور نے روانگی کے لیے لباس تبدیل کیا۔ ان دنوں وہ بلٹ پروف جیکٹ ضرور پہننے لگا تھا۔ تیار ہو کر وہ گھر سے نکلا۔ کار سنبھالی اور روانہ ہو گیا۔ اس وقت بھی اس نے محسوس کر لیا کہ اس کے محافظ گارڈز کی کاریں اس سے دور نہیں تھیں۔

جب وہ دفتر پہنچا اور اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوا تو کرنل زنجانی کمرے سے رخصت ہو رہا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اس وقت بھی وہاں ہو جب دلاور نے باپ کو فون کیا تھا۔ ان دونوں میں مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور زنجانی باہر نکل گیا۔

''آؤ، بیٹھو۔'' جنرل اسد بٹ نے کہا۔

دلاور ان کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان کے سامنے ایک فائل کھلی ہوئی تھی۔ اسے بند کرتے ہوئے انہوں نے دلاور کی طرف دیکھا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ اس

معاملے میں تم اتنی دلچسپی لے رہے ہو۔ جیسے ہی تم تعلیم سے فارغ ہو گے، میں اپنے محکمے کے لیے تمہاری تربیت شروع کروا دوں گا۔''

''اب حالات کیا ہیں ڈیڈی؟ کچھ امپروومنٹ؟''

''یقیناً۔'' جنرل کا چہرہ خاصا سنجیدہ ہو گیا۔ ''یہ پہلا موقع ہے کہ میں بھی اس کیس میں ذاتی طور پر بہت دلچسپی لے رہا ہوں۔''

''فون پر امپروومنٹ کی بات ہوئی تھی۔''

''ہاں۔'' انہوں نے کہا۔ ''جب سعیدہ پر تمہارا معاملہ کھل گیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ اب داراب پر ہاتھ ڈال دیا جائے۔ کرنل زنجانی تو یہ قدم پہلے ہی اٹھانا چاہ رہا تھا، میں نے روکا تھا اسے۔ کل رات میں نے اسے اجازت دے دی۔ رات سے داراب ہماری قید میں ہے۔''

''اوہ!'' دلاور کے جسم میں ہلکی سی سنسنی پھیلی۔ ''کچھ معلوم ہوا اس سے؟''

''دو ایک بہت اہم باتیں۔'' جنرل نے کہا۔ ''لیکن اس نے زبان کھولنے میں ذرا دیر لگائی۔ تم نے شاید غور نہ کیا ہو، کرنل زنجانی کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی ہے کہ وہ رات بھر سو نہیں سکا۔ صبح اس نے مجھے رپورٹ دی کہ اب اسے داراب کی زبان کھلوانے میں کامیابی ہوئی ہے... اسی لیے میں فوراً دفتر آ گیا تھا۔''

''جب میں ناشتا کر رہا تھا تو ممی نے بتایا تھا کہ آپ نے ان سے وہ فولڈر منگوایا ہے جس میں میری سالگرہ کی تصویریں تھیں۔''

''ہاں۔'' جنرل نے کہا۔ ''زنجانی سے بات کر کے میں نے وہ تصویریں منگانا ضروری سمجھا تھا۔ دراصل داراب کی غلطی صرف یہ تھی کہ اس نے ایک مرتبہ ایکس مین کو دیکھ لیا تھا۔ یہ بات ایکس مین کو بھی معلوم ہو گئی تھی، اس لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ داراب کو ختم کر دیا جائے۔ ایک اور اہم بات بھی داراب سے معلوم ہوئی ہے۔ ایکس مین نے اپنی کمین گاہ زیرِ زمین بنوائی ہے۔ وہ علاقہ شمالی پہاڑی علاقے کے قریب کہیں ہے۔ اس پہاڑی علاقے میں ایک سرنگ ہے جو یقیناً بنوائی گئی ہو گی۔ اسی سرنگ کے ذریعے گروہ کے لوگ موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر اس کمین گاہ تک پہنچتے ہیں۔ وہ جگہ ایکس مین نے شاید کسی انگریزی فلم سے متاثر ہو کر بنوائی ہے۔ اس قسم کی جگہیں عموماً تو جیمز بانڈ کی فلموں میں دکھائی گئی ہیں۔''

''یعنی کیسی ڈیڈی؟''

جنرل نے اس جگہ کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو داراب سے کرنل زنجانی کو معلوم ہوا تھا۔

جنرل کے خاموش ہوتے ہی دلاور سوال کر بیٹھا۔

''داراب وہاں جاتا تھا تو اس نے ایکس مین کو کئی مرتبہ دیکھا ہو گا۔ آپ ابھی بتا چکے ہیں کہ اس نے ایکس مین کو ایک بار دیکھا تھا۔''

''اس نے ایک ہی بار دیکھا تھا۔ یہ تفصیلات اسے گروہ کے ہی ایک آدمی سے معلوم ہوئی تھیں جو ایکس مین کی کمین گاہ پر جاتا رہتا تھا۔ وہ اس وقت شاید نشے میں ہو گا جو داراب کو یہ باتیں بتا بیٹھا جس کے نتیجے میں ایکس مین نے اسے ختم کروا دیا۔ داراب اسی وقت سے روپوش تھا۔ بہرحال وہ اب ہماری قید میں ہے۔''

''کیا اسے سرکاری گواہ بنا لیا جائے گا؟''

''اس سے ابھی ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا۔ ہاں یہ ضرور کہا گیا ہے کہ اگر وہ ہمیں اس سرنگ تک پہنچا دے تو اسے سرکاری گواہ کی حیثیت سے خاصی رعایت مل جائے گی۔ گروہ میں اس کی شمولیت زیادہ پرانی نہیں ہے اس لیے اس کے جرائم بھی کچھ زیادہ سنگین نوعیت کے نہیں ہیں۔''

''تو وہ سرنگ تک پہنچانے کے لیے تیار نہیں ہے؟''

''کہہ تو یہی رہا ہے کہ اسے علم نہیں لیکن کرنل کو شبہ ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

''سرکاری گواہ کا وعدہ کرنے کے باوجود؟''

''غالباً وہ اس طرف جاتے ہوئے خوف زدہ ہے کہ مارا جائے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس سرنگ کے آس پاس ایکس مین نے کچھ آدمیوں کو ضرور مامور کیا ہو گا۔ وہ سرنگ اس کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ بہرحال زنجانی نے اس سرنگ کا سراغ لگانے کے لیے دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگائی تو ہے...... وہ یہ کوشش بھی کر رہا ہے کہ کسی طرح داراب کے ذہن سے خوف نکال دے۔''

''آپ نے میری سالگرہ کی تصویریں کیوں منگوائی تھیں؟''

''یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ داراب نے ایکس مین کا جو حلیہ بتایا ہے، وہ حلیہ ڈاکٹر احمت بغاطر کا ہے۔''

''اوہ۔''

''تمہاری سالگرہ کی تصاویر میں تین تصویریں ایسی ہیں جن میں احمت بغاطر بھی آیا ہے۔ ان میں سے ایک میں وہ خاصا صاف دکھائی دے رہا ہے۔ بہرحال میں نے وہ تینوں ہی تصویریں زنجانی کو دے دی ہیں جو وہ داراب کو

دکھائے گا۔ اس طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ کیا ڈاکٹر احمت بغاطر ہی ایکس مین ہے۔''

''کیا آپ فوری طور سے ڈاکٹر بغاطر پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے؟''

''کس جرم میں؟''

''اس نے مجھے جو ٹائی پن دی تھی، وہ دھماکے سے اڑ گئی تھی۔''

''اگر وہ انکار کردے کہ اس نے تمہیں کوئی ایسی ٹائی پن نہیں دی؟ کیا ثبوت ہے ہمارے پاس؟ صرف تمہارا بیان ثبوت نہیں بن سکتا۔''

''لوگوں کو شبہے میں بھی تو گرفتار کیا جاتا ہے۔''

''بغاطر کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ اس نے بہت بااثر لوگوں سے اپنے تعلقات بنالیے ہیں اور ان میں سے کچھ تو اس کے لیے کام بھی کررہے ہیں۔''

''وہ ڈائریکٹر آف پروٹوکول...... کیا نام ہے اس کا؟''

''جعفر زیدی۔'' جنرل نے جواب دیا۔

''آپ نے کہا تھا اس کی نگرانی کی جائے گی؟''

''کی گئی۔'' جنرل نے جواب دیا۔ ''لیکن کوئی ایسی بات سامنے نہیں آسکی کہ اس پر ہاتھ ڈالا جاسکتا۔''

''اور پھر وہ بھی ہے۔'' دلاور نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''پریسیڈنٹ صاحب کا پرسنل سیکریٹری خان زادہ جالب۔''

''یہی تو میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے کہ بغاطر پر ہاتھ ڈالنا مشکل کیوں ہے۔''

''حیرت ہے کہ ایسے سرکاری لوگ بھی بغاطر سے ملے ہوئے ہیں؟''

''یہی المیہ ہے ہمارا کہ یہ مائنڈ سیٹ ہمارے محکموں میں بھی موجود ہے بلکہ...... میں سمجھتا ہوں، گلی در گلی پھیل چکا ہے۔ بہت لوگ ان دہشت گرد تنظیموں کو سچا مسلمان سمجھنے لگے ہیں۔''

''اور ان میں سے ایک تنظیم بغاطر کا آلۂ کار بھی بنی ہوئی ہے۔''

''ہاں، یہ بات شگفتہ کی گرفتاری کی وجہ سے سامنے آئی ہے۔ سعیدہ سے اس نے جس قسم کی باتیں کی تھیں، ان سے بھی صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ خود کو واقعی بہت سچا مسلمان اور ہمیں کافر سمجھتے ہیں۔''

''شگفتہ سے کچھ اور معلومات حاصل ہوئیں؟''

دلاور کو جواب نہیں مل سکا۔ جنرل کے موبائل پر کال آگئی تھی۔

''ہاں زنجانی!'' انہوں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا اور دوسری طرف سے جواب سن کر ان کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ ''بہت خوب!'' وہ کچھ رک کر بولے۔ ''پھر دوسری طرف سے کچھ سن کر کہا۔ ''سوچنا پڑے گا زنجانی! ثبوت کے بغیر اس پر ہاتھ ڈالنا اب بھی مشکل ہوگا۔ بہرحال ہمیں ایک بہت اہم بات معلوم ہوگئی ہے۔ تم دفتر آؤ تو بات کرتے ہیں اس سلسلے میں...... ہاں ہاں، فوراً آجاؤ۔'' جنرل نے رابطہ منقطع کردیا۔

''بغاطر ہی ایکس مین ہے۔'' دلاور بول پڑا۔

''ٹھیک سمجھے تم۔ داراب نے تصویر پہچان لی ہے۔''

''اور بغاطر آپ کے دوست باقر صاحب کے ساتھ آیا تھا میری سالگرہ میں۔''

''ہاں، اگرچہ میں باقر کو بہت اچھا آدمی سمجھتا رہا ہوں لیکن اس معاملے کی وجہ سے شک ہوگیا ہے کہ کہیں وہ بھی بغاطر سے ملا ہوا نہ ہو۔ اسی لیے میں نے اس سے پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ چوکنا ہوجاتا وہ اس لیے اس کی بھی صرف نگرانی ہورہی ہے۔''

''یہ باقر صاحب کرتے کیا ہیں؟''

''بہت بڑا بزنس مین ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ بغاطر کے کہنے پر اس دہشت گرد تنظیم کو فنڈ فراہم کرتا ہو۔''

دلاور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کہاں آگیا ہے ہمارا ملک۔''

''اب ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ اس سرنگ کا سراغ لگایا جائے۔ بغاطر کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کی ضرورت ہے۔''

''اس کے لیے کیا کریں گے؟''

''سوچنا پڑے گا۔ اگر داراب بتادے تو آسانی ہو جائے گی۔''

دلاور چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔ ''اچھا ڈیڈی! میں اب چلوں؟''

''ہاں جاؤ۔ سب کچھ جان لیا ہے تم نے۔ بہت متجسس تھے۔''

دلاور سلام کرکے وہاں سے رخصت ہوا۔ گھر جاتے ہوئے وہ مسلسل سوچتا رہا کہ والد کو بتائے بغیر وہ اس سرنگ کا سراغ لگانے کے لیے کیا کرسکتا ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے طور پر کوئی کارنامہ سرانجام دے۔

اس سُرنگ کے آس پاس ایکس مین کے آدمیوں کی

موجودگی یقینی تھی اوران کی نظر سے بچنا ہرگز آسان نہیں ہوتا۔
سوچتے سوچتے دلاور گھر پہنچ گیا لیکن کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آسکی۔ لاؤنج میں بیٹھ کر اس نے ٹی وی کھولا اور انگریزی چینل تلاش کیے۔ یہ اس کی ناتجربہ کاری ہی تھی کہ وہ کسی فلم سے کوئی ایسا آئیڈیا لینا چاہتا تھا کہ اس پر عمل کر کے سرنگ تک پہنچ سکے۔ اس نے جستہ جستہ کئی فلمیں دیکھ ڈالیں لیکن کچھ حاصل نہیں ہوسکا۔ اس میں اتنا وقت گزر گیا کہ کھانے کا وقت آگیا۔ والدہ کے کہنے پر وہ ڈائننگ روم میں پہنچا۔

کھانے کے دوران میں والدہ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ تم مختلف چینلز پر انگریزی فلمیں دیکھتے رہے۔''

''بس وقت گزار رہا تھا۔''

''تم وقت گزارنے کے لیے عموماً کتب بینی کرتے ہو۔''

''آج دماغ الجھا ہوا سا ہے۔''

''کیوں؟ خیریت؟''

''وہی...... سعیدہ کا معاملہ۔''

''اسے دیکھنا تمہارے والد کا کام ہے۔ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ کھانے کے بعد آرام کرنا۔ ممکن ہو تو سو جانا، ذہن ہلکا ہوجائے گا۔''

''جی بہتر۔'' دلاور نے کہہ تو دیا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آرام نہیں کر سکے گا۔ وہ بے چین تھا کہ اس معاملے میں کوئی کارنامہ سرانجام دے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے کمرے میں جا کر کمپیوٹر کھولے گا اور یوٹیوب پر جا کر مزید فلمیں دیکھے گا لیکن کھانے کے بعد والدہ اسے اپنے ساتھ اس کے کمرے میں لے گئیں۔

''بس لیٹ جاؤ، آرام کرو۔''

دلاور ہنس کر بستر پر لیٹ گیا۔

''بس اب سونے کی کوشش کرو۔'' والدہ نے کہا اور جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ پھر جاتے جاتے کمرے کی لائٹ بھی بجھا گئیں۔

ماں بھی کیا چیز ہوتی ہے، سوچتے ہوئے دلاور کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اسے وہ فلمیں یاد آنے لگیں جن میں اولاد کے لیے ماؤں کی تڑپ دکھائی گئی تھی۔

پھر مشکل سے پانچ منٹ گزرے تھے کہ فائرنگ کی آواز نے اسے چونک کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ فائرنگ اس کے گھر کے باہر کہیں ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ ایک ہولناک دھماکا ہوا۔ فرش ہل گیا تھا۔ دلاور گرتے گرتے بچا اور اسی دوران میں اسے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے دیواریں گر رہی ہوں، چھتیں گر رہی ہوں۔ خود اس کے کمرے کی بھی ایک دیوار گری۔ پھر وہ نہ جانے کتنا وزن تھا جس میں وہ دب گیا اور اس کے دماغ پر اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

☆☆☆

ٹی وی چینلز پر پہلے یہ خبر آئی کہ شہر میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سنی گئی ہے۔ پولیس معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ دھماکا کہاں ہوا ہے۔ پھر یہ خبر آئی کہ دھماکا ایک حساس ایجنسی کے سربراہ کے گھر پر ہوا ہے۔ پھر جنرل اسد بٹ کا نام بھی آگیا۔ شہر میں یہ خبر تیزی سے پھیلی۔ جو لوگ جنرل اسد بٹ کے نام سے واقف نہیں تھے، انہیں واقف کاروں نے بتایا جس سے سنسنی اور زیادہ پھیلی۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خودکش حملہ تھا۔ ایک تیز رفتار ٹینکر بنگلے کا پھاٹک توڑتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور اس میں بیٹھے ہوئے چار آدمیوں نے ٹینکر کے رکتے ہی فائرنگ شروع کر دی تھی جس سے چوکیدار اور دو مالی تو فوراً ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ محافظ گارڈز نے بھی تیز رفتار فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وہ دو کو ہلاک اور تیسرے کو زخمی حالت میں گرفتار کر سکے تھے لیکن چوتھا گھر میں داخل ہو گیا تھا جس نے غالباً بنگلے کے وسط میں جا کر خود کو دھماکے سے اڑا لیا تھا۔

بہت جلد ٹی وی چینلز کی گاڑیاں بھی وہاں پہنچ گئیں اور لوگوں نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا کہ تین چوتھائی بنگلا ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ ٹی وی چینلز پر قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں کہ اتنا بڑا دھماکا کتنے کلوگرام بارود کا ہوسکتا ہے۔

ان حالات سے بے خبر دلاور کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو کسی اسپتال کے کمرے میں بستر پر پڑا پایا۔ وہاں ایک ڈاکٹر، ایک نرس کے علاوہ کیپٹن اختر بھی موجود تھا۔ دلاور نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر نے فوراً اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔

''نہیں دلاور صاحب! اٹھیے نہیں۔ پندرہ منٹ بعد آہستہ آہستہ اٹھیے گا۔ جھٹکا نہ لگے۔ اگرچہ زخم خطرناک نہیں لیکن جھٹکا لگنے سے تکلیف بڑھ جائے گی۔''

دلاور نے پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں، یہ کوئی اسپتال معلوم ہو رہا ہے۔'' اسے خود محسوس ہوا کہ اس کی آواز دھیمی

تھی۔

''تم شہر کے سب سے اچھے اسپتال میں ہو دلاور۔'' اختر بول پڑا۔

''دھماکا ہوا تھا گھر میں۔'' دلاور بولا۔ ''مجھ پر کچھ گرا تھا۔ اس کے بعد...... مجھے کچھ یاد نہیں۔'' وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

''تم بے ہوش ہو گئے تھے۔'' اختر نے جواب دیا۔

ڈاکٹر، نرس سے کچھ کہہ رہا تھا لیکن اتنی مدھم آواز میں کہ دلاور کچھ نہیں سن سکا۔ نرس اس طرح سر ہلا رہی تھی جیسے ڈاکٹر کی ہدایات سمجھ رہی ہو۔

''ہوا کیا تھا اختر؟'' دلاور نے بے چینی سے پوچھا۔

''سب معلوم ہو جائے گا آپ کو دلاور صاحب!'' اس مرتبہ ڈاکٹر نے کہا۔ ''ابھی آپ خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کریں۔''

''میں پُرسکون نہیں ہو سکتا۔'' دلاور کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔ ''میرا ہیجان بڑھ رہا ہے۔''

اسی دوران میں نرس نے ایک انجکشن تیار کر لیا تھا۔

''یہ انجکشن آپ کو پُرسکون کر دے گا۔'' ڈاکٹر بولا۔

نرس نے اسے انجکشن لگا دیا۔

''مسکن؟'' دلاور نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''خواب آور تو...... نہیں...... نن......'' اتنا کہتے کہتے دلاور کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ انجکشن خواب آور ہی تھا۔

دوبارہ دلاور کی آنکھ کھلی تو کمرے میں ڈاکٹر نہیں تھا، صرف نرس اور اختر تھے۔

''مجھے...... مجھے سُلا دیا گیا تھا؟'' دلاور آہستہ سے بولا۔

''ضروری تھا دلاور صاحب۔'' نرس نے جواب دیا۔ ''اب آپ سکون محسوس کر رہے ہوں گے۔''

''کتنی دیر...... کتنی دیر سویا ہوں؟''

''تقریباً چھ گھنٹے۔''

''رات ہو چکی ہے؟''

''جی...... نو بجنے والے ہیں۔''

''ڈیڈی......'' دلاور نے اختر کی طرف دیکھا۔

''تمہیں جب ہوش آیا ہے، اس سے چند منٹ پہلے وہ یہیں تھے۔'' اختر نے جواب دیا۔ ''جب تم سو رہے تھے، اس وقت بھی وہ آئے تھے، چند منٹ رک کر چلے گئے۔ بہت مصروف ہیں وہ۔''

''ہوا کیا تھا؟ اب تو بتاؤ؟'' دلاور کی بے چینی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

''دھماکا۔'' اختر نے جواب دیا۔ ''خودکش حملہ کیا گیا تھا۔''

''او، یعنی...... پھر؟''

''بنگلے کو بہت نقصان پہنچا ہے۔''

''ممی؟''

''ٹھیک ہیں وہ۔''

''جھوٹ بول رہے ہو تم۔'' دلاور اٹھ بیٹھا۔ ''وہ بھی زخمی ہوئی ہوں گی ورنہ وہ میرے پاس ہوتیں۔''

اختر اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا جس کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''جی سر!...... جی...... جی ہاں، اب وہ جاگ گئے ہیں۔''

دلاور سمجھ گیا کہ کال اس کے والد کی تھی۔ اس نے جلدی سے اختر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''مجھے دو فون!''

اختر نے موبائل بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا جواب سنتے ہی انہوں نے ڈس کنکٹ کر دیا۔ غالباً وہ خود آئیں گے۔''

''ڈس کنکشن'' کے بارے میں دلاور نے یقین کر لیا۔ اختر یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ خود لائن کاٹتا۔

''ممی کے بارے میں بتاؤ اختر؟'' دلاور نے ہیجانی انداز میں کہا۔

''وہ خاصی زخمی ہیں۔'' اختر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوہ، کہاں ہیں وہ؟''

''وہ ملٹری اسپتال میں ہیں۔ تم کو ریسکیو والوں نے یہاں پہنچا دیا تھا۔'' اختر نے جواب دیا۔

''میں وہاں جاؤں گا۔'' دلاور نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''ڈاکٹر نے انہیں سلا دیا ہے۔''

''پھر بھی میں......''

اسی وقت ڈاکٹر تیزی سے کمرے میں آیا۔ غالباً نرس نے ابتدا ہی میں محسوس کر لیا ہوگا کہ وہ یا اختر بھی دلاور کو نہیں سنبھال سکیں گے، اس لیے اس نے ڈاکٹر کو فون پر اطلاع دے دی ہوگی۔

ڈاکٹر تیزی سے دلاور کے قریب پہنچ گیا۔ ''آپ تیزی سے حرکت کریں گے تو سر کی تکلیف اتنی زیادہ... بڑھے گی کہ شاید آپ گر پڑیں، بے ہوش ہو جائیں۔''

''میں ایسا نہیں محسوس کر رہا ہوں۔'' دلاور بستر سے اٹھا۔

اسی وقت کئی وارڈ بوائے بھی کمرے میں آ گئے تھے۔

''دلاور صاحب!'' ڈاکٹر بولا۔ ''اس وقت آپ میرے لیے جنرل صاحب کے بیٹے نہیں، صرف مریض ہیں میرے۔ میرا فرض ہے کہ میں آپ کی بہتری کا خیال رکھوں۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کرنے کا اختیار رکھتا ہوں۔ یہ جو وارڈ بوائز آئے ہیں، یہ آپ کو زبردستی روک سکتے ہیں۔ کیا آپ اس میں اپنی اہانت محسوس نہیں کریں گے؟'' ڈاکٹر نے یہ سب کچھ بہت تیزی سے کہا تھا۔

دلاور نے بڑے غصے سے وارڈ بوائز کی طرف دیکھا اور دھم سے بستر پر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ سر میں اتنی ہی شدید تکلیف ہوئی تھی۔

''کہا گیا تھا نا آپ سے۔'' ڈاکٹر بولا۔ ''آپ اس وقت تیزی سے حرکت نہیں کر سکتے۔ لیٹ جائیے۔''

اختر نے دلاور کو لٹانے کی کوشش کی۔ دلاور نے مزاحمت نہیں کی۔ تکلیف کی وجہ سے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ نرس کو ابتدا ہی میں ڈاکٹر سے اشارہ مل چکا تھا اور وہ تیزی سے ایک انجکشن تیار کر چکی تھی جو اس نے بڑی پھرتی سے دلاور کو لگا دیا۔

جب دوبارہ دلاور کی آنکھ کھلی تو رات کے دو بج چکے تھے۔ کمرے میں نرس اب دوسری تھی۔ اختر بھی موجود تھا۔

دلاور چند لمحے پلکیں جھپکائے بغیر ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ''مجھے پھر خواب آور انجکشن دے دیا تھا؟''

''اگر تم خود کو قابو میں نہیں رکھو گے تو پھر یہی ہوگا؟''

''تم یہاں کب سے موجود ہو؟''

''تمہارے سونے کے بعد میں چلا گیا تھا۔ ابھی آدھے گھنٹے پہلے دوبارہ آیا ہوں۔''

''ڈیڈی؟''

''وہ آئے تھے۔ تمہیں اس وقت سلایا جا چکا تھا۔ وہ چلے گئے۔ وہ بہت مصروف ہیں۔''

''ممی؟'' دلاور نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

''میں اب اس وقت کی صورتِ حال سے بے خبر ہوں۔''

''ڈیڈی سے بات کراؤ میری۔''

اختر نے موبائل نکال کر نمبر ملایا، پھر چند لمحے رک کر بولا۔ ''سر! دلاور صاحب جاگ گئے ہیں۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' پھر اس نے سر ہلایا اور موبائل دلاور کو دے دیا۔

''ڈیڈی!'' دلاور کی آواز کچھ بھرا گئی۔ ''جو کچھ ہوا، وہ تو مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ اختر نے بتایا ہے کہ ممی ملٹری اسپتال میں ہیں۔ میں ان کے پاس جانا چاہتا ہوں لیکن......''

انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں کئی بار تمہیں دیکھنے آ چکا ہوں۔ پہلی بار تم بے ہوش ہی تھے۔ پھر سوتے ہوئے ملے۔ ڈاکٹر کی بات نہیں مانو گے تو یہی ہوگا کہ تمہیں سلا دیا جائے گا۔ ڈاکٹر سے میری بات ہو چکی ہے اور مریض کو اپنے ڈاکٹر کی بات ماننی چاہیے۔ تم کل اس قابل ہو سکو گے کہ حرکت کر سکو۔ میں بہت مصروف ہوں۔ رات جاگتے ہوئے ہی گزرے گی۔ تم کل میرا انتظار کرنا۔ میں خود لینے آؤں گا تمہیں......فوری طور پر ضدمت کرو۔''

''وہ خیریت سے تو ہیں نا؟'' دلاور مضطرب تھا۔

''تم کیوں سمجھ رہے ہو کہ اختر تم سے جھوٹ بول رہا ہے؟......بہتر ہوگا کہ آرام کرو۔ اختر کے بجائے کسی اور کی کال ہوتی تو میں ریسیو بھی نہیں کرتا، بہت مصروف ہوں۔ اس وقت بھی میٹنگ میں ہوں۔ شب بخیر۔'' دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

دلاور ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

باپ کے حکم سے سرتابی اس کے لیے ممکن نہیں تھی۔ اسے دوسرے دن کا انتظار کرنا ہی تھا۔ اسے نیند بہرحال نہیں آئی۔ اب وہ اکیلا بھی اس اعتبار سے تھا کہ نرس تو تھی لیکن اختر چلا گیا تھا۔ وہ بستر پر پڑا بے چینی کا شکار رہا۔ کافی سو چکا تھا اس لیے اسے صبح تک نیند بھی نہیں آئی۔ اسے یہ شکایت بھی تھی کہ اس کے کمرے میں ٹی وی نہیں تھا جو اسے حالات سے باخبر رکھ سکتا۔ اس کی شکایت کے جواب میں کہا گیا تھا کہ ٹی وی دیکھنے سے اس کی آنکھوں پر جو زور پڑے گا، اس سے اس کے سر کی تکلیف بڑھ جائے گی۔

صبح وہ جاگ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا۔ اس کے سامنے ہی نرس نے اس کے سر کی ڈریسنگ کی

''میں بستر پر پڑے پڑے بہت اکتا گیا ہوں۔'' اس نے ڈاکٹر سے کہا۔

''تو چہل قدمی کر لیتے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''میں نے صرف یہ کہا تھا کہ سر کو جھٹکا نہ لگے۔ اب بھی چند گھنٹے کی احتیاط ضروری ہے۔ تیسرے پہر کے بعد آپ کو ڈس چارج بھی کیا جا سکتا ہے۔ کل صبح آ کر ڈریسنگ کروا لیجیے گا۔

پرسوں سے ڈریسنگ کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ آپ بالکل ٹھیک ہوں گے۔''

دلاور ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے والد اسے تیسرے پہر کے بعد ہی اسپتال سے لے جاسکتے تھے۔ وہ اپنی والدہ کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ اس کے خیال کے مطابق اس کی والدہ بہت زیادہ زخمی تھیں اس لیے اس سے بات چھپائی جا رہی تھی۔ ایک آدھ بار اسے یہ خیال بھی آیا کہ وہ کہیں...... لیکن وہ ایسی ویسی کوئی بات سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر وہ اس وقت جاگا جب اسے جگایا گیا۔ اس نے ڈیڈی کو بھی دیکھا۔ ان کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ گزشتہ روز سے اب تک شاید ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکے تھے۔

دلاور جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اس جھٹکے کے باوجود اس نے اپنے سر میں تکلیف محسوس نہیں کی۔

''ڈیڈی!'' وہ بولا۔ ''اب تو ممی کو دیکھنے جاسکتا ہوں۔ آپ مجھے لینے آئے ہیں نا؟''

''ہاں۔'' انہوں نے کہا۔ ''اب تم اسپتال سے ڈس چارج ہو۔''

''میں چلوں؟'' دلاور نے بے چینی سے پوچھا۔

''تمہارے لیے کپڑے لایا ہوں۔'' انہوں نے ایک پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''بازار سے خریدا ہوا لباس ہے۔ فٹنگ بالکل صحیح تو نہیں ہوگی لیکن فوری طور پر یہی ہوسکتا تھا۔ تمہارا کمرا تو بالکل تباہ ہوگیا تھا۔''

دلاور اسپتال کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھا۔ اس نے فوراً پارٹیشن کے پیچھے جا کر لباس بدلا۔

''اب چلیں۔'' وہ باپ سے بولا۔

''ہاں، فی الحال رہنے کا بندوبست ایک دوست کے گھر میں کیا گیا ہے۔ وہیں چلنا ہے۔''

''ممی بھی وہیں ہیں یا اب بھی اسپتال میں ہیں؟''

''نہیں، اب وہ گھر پر ہی ہیں۔ مغرب سے پہلے ان کی تدفین کردی جائے گی۔''

''کیا؟'' دلاور بھونچکا رہ گیا۔

''فوری طور پر تم سے چھپانا ضروری تھا۔'' انہوں نے کہا۔ ''وہ ملبے سے زندہ نہیں نکلی تھیں۔''

''ڈیڈی!'' دلاور چیخ کر باپ سے لپٹ گیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس وقت ان کے چہرے پر بھی افسردگی آگئی تھی جسے انہوں نے اب تک اپنے چہرے پر نہیں آنے دیا تھا۔

☆☆☆

اسی شام یونیورسٹی پر حملہ ہوا۔ وہ آٹھ نقاب پوش تھے جو ہلکی قسم کی مشین گنوں سے گولیاں برساتے ہوئے یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ اس فائرنگ سے کتنے لوگ ہلاک اور کتنے زخمی ہوئے، اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی سعیدہ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں اس کے سوا کچھ نہیں کرسکی کہ اس نے کمرے کی کھڑکی بند کرلی۔ دروازہ پہلے ہی بند تھا۔ جب اس نے اپنا موبائل سنبھالا تو اس کے دونوں ہی ہاتھوں میں لرزش تھی۔ اس نے کرنل زنجانی کا نمبر ملایا جو اسے اختر سے ملا تھا۔ خود اپنا نمبر بھی اختر نے اسے دیا تھا لیکن اس نے کرنل زنجانی ہی کو صورتِ حال سے باخبر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کرنل زنجانی سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوتی، کمرے کا دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ ٹوٹ کر کمرے میں آگرا۔ اس پر بہ یک وقت تین آدمیوں نے پوری طاقت سے ٹکر ماری تھی۔ ٹکر اتنی زوردار تھی کہ وہ تینوں بھی ٹوٹے ہوئے دروازے پر گرتے گرتے بچے۔ کیونکہ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہوں گے اس لیے انہوں نے کسی طرح خود کو گرنے سے سنبھال لیا۔ وہ تینوں نقاب پوش تھے اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے ہاتھ میں آتشیں ہتھیار نہ ہو۔

موبائل سعیدہ کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ ہذیانی انداز میں مدد کے لیے چیخنے لگی۔

وہ تینوں جھپٹ کر اس کے قریب پہنچے اور پھر اس کی کنپٹی پر نہ جانے کیا اتنی زور سے مارا کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگئی۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ اپنی جگہ پر ہل رہی ہو۔ اسے یہ بھی یاد آگیا تھا کہ اس نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں اور پھر تین نقاب پوش دروازہ توڑ کر اس کے کمرے میں گھس آئے تھے۔ انہوں نے کوئی سخت چیز اس کی کنپٹی پر ماری تھی جس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

اور اب وہ مضبوط ڈوریوں کے ایک جال میں تھی جو فضا میں ہل رہا تھا۔ اس کی رسی جیسی چھ مضبوط ڈوریاں بہت اوپر ایک چھت تک چلی گئی تھیں۔ تیز روشنی میں اسے سب کچھ نظر آرہا تھا لیکن چھت کی بلندی کے باعث وہ یہ نہ دیکھ سکی کہ وہ رسیاں یا ڈوریاں کہاں بندھی ہوئی تھیں۔

کہاں آ گئی؟ وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔

’’نیچے دیکھو لڑکی!‘‘ آواز آئی۔ اسے محسوس ہو گیا کہ آواز نیچے ہی سے آئی تھی۔

نیچے دیکھنے کے لیے اسے جال میں کروٹ لینی پڑی۔

وہ زمین سے چند گز کی بلندی پر تھی۔ اس نے ان لوگوں کو دیکھا جو ایک سوئمنگ پول کے قریب کھڑے تھے اور ایک عجیب سی کرسی پر برف جیسے سفید بالوں کا ایک شخص بیٹھا ہوا سعیدہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سوئمنگ پول میں سعیدہ نے جبڑے پھاڑے ہوئے مگر مچھ دیکھے اور اس کے سارے جسم میں خون کی سنسناہٹ پھیل گئی۔ اگر وہ جال سمیت بھی اس پول میں جا گرتی تو وہ مگر مچھ جال کے باوجود اسے اپنے جبڑوں میں بھر لیتے۔

’’اندازہ ہے؟‘‘ سفید بالوں والا سوالیہ انداز میں بولا۔ ’’کہاں ہو تم؟‘‘ وہ سعیدہ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سعیدہ کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بمشکل جواب دینے کے بجائے سوال کر سکی۔ ’’کہاں ہوں میں؟‘‘

’’موت کے جبڑوں کے پاس۔‘‘ سفید بالوں والے نے کہا۔ ’’اگر تم نے میرے ایک سوال کا جواب نہ دیا تو تم کو اس پول میں گرا دیا جائے گا اور یہ مگر مچھ تمہاری ہڈیاں تک چبا جائیں گے۔‘‘

اب سعیدہ سمجھ چکی تھی کہ آخر کار وہ اپنے باپ کے دشمنوں کے ہاتھ لگ ہی گئی۔

’’بس ایک سوال۔‘‘ سفید بالوں والا پھر بولا۔ ’’تمہارا باپ کس بل میں جا کر چھپا ہے؟‘‘

سعیدہ کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔ اس کے فرشتے بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ وہ کبھی بھی باخبر نہیں رہی تھی کہ اس کا باپ کہاں تھا، وہ تھوک نگل کر رہ گئی۔

’’بولو۔‘‘ سفید بالوں والا غرایا۔

’’میں...... میں نہیں...... جان جانتی۔‘‘ سعیدہ تقریباً ہکلا گئی۔

’’پھر سوچ لو! یہ مگر مچھ تمہاری ہڈیاں چبا جائیں گے۔‘‘

’’خدا کے لیے۔‘‘ سعیدہ چیخ پڑی ’’خدا کے لیے میری بات پر یقین کرو۔ میں قسم کھاتی ہوں...... مجھے نہیں معلوم۔‘‘

وہ سمجھ چکی تھی کہ سفید بالوں والا ایکس مین کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ صرف وہی ایک شخص تھا جسے اس کے باپ کی تلاش تھی۔

ایکس مین نے وہاں موجود ایک شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’تمہارا نشانہ بہت سچا ہے۔ فائر کر کے جال کی ایک رسی توڑ دو۔‘‘

اس آدمی نے فوراً رائفل سیدھی کی۔

’’نہیں۔‘‘ سعیدہ بہت زور سے چیخی۔

اسی وقت فائر ہوا۔ ایک رسی ٹوٹ گئی۔ جال تھوڑا سا ایک طرف جھک گیا۔

’’نہیں۔‘‘ سعیدہ زور سے چیخی۔

’’لڑکی!‘‘ ایکس مین بولا۔ ’’دوسری رسی ٹوٹنے پر بھی تم نیچے نہیں گرو گی۔ گھبراؤ نہیں۔ گرو گی اسی وقت جب تیسری رسی ٹوٹے گی۔‘‘

اسی وقت دوسرا فائر ہوا۔ دوسری رسی ٹوٹی۔ جال اور جھک گیا۔

’’اب بھی بتا دو۔‘‘ ایکس مین بولا۔ ’’تیسری رسی ٹوٹنے کے بعد تم اس پول میں گرو گی جہاں......‘‘

’’خدا کے لیے مجھے مت مارو۔‘‘ سعیدہ رونے اور گڑگڑانے لگی۔ ’’میں کیسے یقین دلاؤں کہ میں...... میں نہیں جانتی۔‘‘

رائفل والے نے اب بھی نشانہ لے رکھا تھا لیکن تیسرا فائر کرنے سے پہلے اس نے ایکس مین کی طرف دیکھا۔

ایکس مین نے اسے کچھ اشارہ کیا اور اس نے تیسرا فائر بھی کر دیا۔

’’اللہ!‘‘ سعیدہ نے روتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

تیسرے فائر کی آواز سنائی دی لیکن سعیدہ جال سے نہیں گری۔ جال نے ایک جھٹکا ضرور کھایا تھا۔

سعیدہ نے ایکس مین کی سفاکانہ ہنسی سنی۔

’’غلط کہا تھا میں نے تم سے۔‘‘ وہ بولا۔ ’’تمہیں ڈرانے کے لیے کہا تھا۔ تم چوتھی رسی ٹوٹنے کے بعد گرو گی۔‘‘

سعیدہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو چکا تھا۔

اسی وقت ایکس مین کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر ’’ڈور انٹرکام‘‘ کے حروف ...... چمک رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے گھر کے پھاٹک پر لگے ہوئے ’’ڈور انٹرکام‘‘ کا بٹن دبایا گیا تھا۔

ایکس مین نے وہ ڈور انٹرکام اپنی خواب گاہ میں لگوایا تھا جو ایک خاص قسم کا انٹرکام تھا۔ باہر سے کوئی اس کا بٹن دباتا تو انٹرکام کا رابطہ اس کے موبائل سے ہو جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی انٹرکام کا ماؤتھ پیس بھی کھل جاتا تھا۔

''کون؟'' ایکس مین نے موبائل میں پوچھا تھا لیکن اس کی آواز ڈور انٹرکام کے ذریعے بنگلے کے باہر موجود اس شخص نے بھی سنی ہوگی جس نے انٹرکام کا بٹن دبایا تھا چنانچہ ایکس مین نے اپنے موبائل پر اس کا جواب سنا۔

''میں دلاور ہوں ڈاکٹر بغاطر!...... ادھر سے گزر رہا تھا تو خیال آیا کہ آپ سے ملتا چلوں۔ اس دن آپ میری سالگرہ میں آئے تھے تو آپ کی شخصیت میرے لیے متاثر کن ثابت ہوئی تھی۔ اسی وقت میں نے سوچا تھا کہ آپ سے دوبارہ بھی ملوں گا۔ اگر آپ مصروف ہوں تو میں پھر کسی دن آجاؤں گا۔''

یہ سب کچھ سنتے ہوئے ایکس مین کے دماغ میں کئی خیال چکرانے لگے تھے۔ اس نے کچھ سوچ بھی لیا تھا۔ اسی لیے اس نے فوراً جواب دیا۔

''میں ابھی ملازم کو ہدایت کر دیتا ہوں۔ وہ پھاٹک کھول دے گا۔ آپ کو لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دے گا لیکن میں آپ سے پندرہ منٹ بعد مل سکوں گا۔ دراصل میں اس وقت باتھ روم میں ہوں۔ کیا آپ پندرہ منٹ انتظار کر سکیں گے؟''

''ہاں، ہاں۔ کوئی حرج نہیں ہے۔''

''میں ابھی ملازم سے کہہ دیتا ہوں۔'' ایکس مین نے کہا اور رابطہ منقطع کر کے کسی سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''سیفی! پھاٹک پر ایک صاحب ہیں۔ انہیں اندر لا کر ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ بہت ادب سے پیش آنا۔ یہ بھی کہہ دینا کہ میں باتھ روم میں ہوں۔''

ایکس مین نے جواب سننے کی زحمت نہیں کی اور رابطہ منقطع کر کے جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''فی الحال تو اسے اتار لو۔'' اس کا اشارہ سعیدہ کی طرف تھا۔ جواب کا انتظار اس نے اب بھی نہیں کیا اور تیزی سے اس طرف چل پڑا جہاں لفٹ تھی۔

اس دوران میں بھی کچھ خیالات اس کے ذہن میں چکراتے رہے تھے۔

☆☆☆

ملازم نے پھاٹک کھول کر دلاور کو اندر بلایا اور لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ اس نے دلاور سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ''صاحب'' باتھ روم میں ہیں اس لیے اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔''

دلاور کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ ماں کی تدفین کے بعد سیدھا یہیں پہنچا تھا۔ ماں کی موت کے سبب اس کا خون کھول رہا تھا اور وہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ ڈاکٹر بغاطر کے سینے میں وہ ساری گولیاں اتار دے گا جو اس کی جیب میں پڑے ہوئے ریوالور میں تھیں۔ اسے اپنے باپ کی اصول پسندی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ثبوت کے بغیر کسی پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اسے ختم تو کیا جا سکتا ہے۔ دلاور نے سوچا تھا۔

آخر اس کا انتظار ختم ہوا۔ ایکس مین نہایت اعلیٰ سوٹ پہنے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کی شخصیت واقعی پُرکشش تھی جس کا ایک بنیادی سبب شاید اس کے سفید بال تھے۔

دلاور اس طرح کھڑا ہوا جیسے ایکس مین کا احترام مقصود ہو جبکہ وہ اس کا احترام کر ہی نہیں سکتا تھا جس پر اس کی ماں کی موت کی ذمے داری تھی۔

''خیریت سے ہیں آپ؟'' ایکس مین نے کہا۔

''خوشی ہوئی مجھے۔ میں نے ٹی وی پر خبر سنی تھی کہ آپ کے گھر پر خودکش حملہ ہوا تھا۔''

''اور وہ حملہ صرف اس لیے تھا کہ مجھے ختم کرنا مقصود تھا۔''

''یہ خیال کیوں ہے آپ کو؟ اوہ! آپ تشریف تو رکھیں۔''

''میں یہاں صرف ایک کام سے آیا ہوں۔''

''میں آپ کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ رہا ہوں۔''

''کیا ماں کے قاتل کو دیکھتے ہوئے غصہ نہیں آئے گا؟'' دلاور نے کہتے ہوئے جیب سے ریوالور نکال لیا۔ ''تمہیں پہچانا جا چکا ہے ایکس مین!''

''کیا مطلب؟'' ایکس مین نے حیرت ظاہر کی۔

''تمہاری تصویر ایکس مین کی حیثیت سے پہچان لی گئی ہے۔ لیکن یہ باتیں کر کے میں نے اپنا وقت ضائع کیا ہے۔ میں پھانسی پر چڑھنے کے لیے تیار ہوں ایکس مین لیکن اپنی ماں کے قاتل کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

دلاور فوراً ہی ٹریگر دبانا چاہتا تھا اور پھر دباتا ہی چلا جاتا۔ اسے ساری گولیاں ایکس مین کے سینے میں اتارنی تھیں لیکن وہ ایک بھی گولی نہیں چلا سکا۔ فائر کسی اور جانب سے ہوا تھا اور وہ گولی دلاور کے ریوالور کی نال پر لگی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر کچھ دور جا گرا تھا۔

''شاباش!'' ایکس مین نے دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی سے کہا جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

دلاور نے ریوالور کی طرف جھپٹنا چاہا لیکن ایکس مین

بڑی تیزی سے اس کے اور اس کے ریوالور کے درمیان آ گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا تھا جس کا رخ دلاور کی طرف تھا۔

''بچوں کو شیر کی کچھار میں نہیں کودنا چاہیے۔'' اس نے دلاور کا مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ پھر ذرا سا پیچھے ہٹا اور فرش پر پڑا ہوا دلاور کا ریوالور اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

''اب......'' ایکس مین نے دلاور کی طرف سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے تمہارے پاس کوئی اور ریوالور بھی ہو اس لیے تمہاری تلاشی لینی ضروری ہے۔''

جس آدمی نے دلاور کے ریوالور پر گولی چلائی تھی، وہ اپنے ''آقا'' کا اشارہ سمجھ گیا اور تیزی سے دلاور کے قریب آیا۔ دلاور کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔

''نہیں باس۔'' اس شخص نے ایکس مین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی اور ہتھیار نہیں ہے اس کے پاس۔''

''گڈ!'' ایکس مین نے کہا اور پھر دلاور کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اب تم اس طرف چلو۔'' ایکس مین ریوالور سے اشارہ کرتا ہوا سخت لہجے میں بولا۔

دلاور کو اس کی بات ماننی پڑی، تاہم وہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ اب زندگی بچنا مشکل ہی ہوگا۔ اپنے بارے میں اپنے والد کی تعریف اسے مضحکہ خیز معلوم ہونے لگی۔ وہ جس طرح ایکس مین کے گھر آیا تھا، وہ اس کی ناتجربہ کاری کی نشاندہی کر چکی تھی۔ اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ کتنے خطرناک آدمی سے اس طرح ٹکرانے کا فیصلہ کر بیٹھا ہے۔

وہ ایکس مین کے اشارے پر قدم بڑھاتا رہا۔ ایکس مین اس سے چار پانچ قدم پیچھے چل رہا تھا۔ جلد ہی وہ ایسے کمرے میں جا پہنچے جہاں آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دلاور نے عقب سے ایکس مین کی آواز سنی۔ ''بائیں جانب آٹھ قدم چلو۔ مڑ کر میری طرف ہرگز نہ دیکھنا۔''

لاور کو یہ بھی کرنا پڑا۔ اب وہ کمرے کے ایک کونے میں تھا۔ جلد ہی اس نے فرش میں تھرتھراہٹ محسوس کی۔ وہ بس چند لمحوں کی بات تھی۔ تھرتھراہٹ ختم ہوگئی۔

''اب مڑو۔'' ایکس مین کی آواز سنائی دی۔

دلاور مڑا۔ اس نے دیکھا کہ جو دیوار سپاٹ نظر آ رہی تھی۔ اس میں اب خلا تھا۔

''چلو۔'' ایکس مین نے خلا کی طرف اشارہ کیا۔

دلاور اس طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ خلا میں ایک قدم آگے بڑھنے کے بعد ایک چھوٹا سا آہنی کمرا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر اس آہنی کمرے میں داخل ہوا اور تب اسے اندازہ ہوا کہ وہ لفٹ تھی۔ اس میں اتنی گنجائش تھی کہ آٹھ آدمی بھی آسکتے تھے۔

''دوسری طرف منہ کر کے کھڑے ہو۔'' ایکس مین نے اس وقت کہا جب دلاور نے سر گھما کر دیکھا تھا۔ ''دیوار سے بالکل چپک جاؤ۔''

دلاور کو ساکت ہو جانا پڑا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ لفٹ حرکت میں آ چکی تھی اور نیچے جا رہی تھی۔ نیچے جا کر رکنے کا دورانیہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔

چند لمحے کے توقف سے دلاور نے ایکس مین کی آواز سنی۔ ''اب مڑو!''

دلاور مڑا۔ ایکس مین لفٹ سے باہر کھڑا تھا۔ اس کے ریوالور کی نال دلاور کے سینے کو نشانہ بنائے ہوئے تھی۔

اب باہر آ جاؤ۔'' ایکس مین نے کہا۔

دلاور باہر نکل آیا۔ اس نے خود کو ایک راہداری میں پایا۔ کچھ ہی قدم آگے ایک دروازہ تھا۔ راہداری وہیں تک تھی۔

''چلے آؤ۔'' ایکس مین نے کہا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ ایکس مین نے دروازے کے قریب پہنچ کر اسے کھولا۔ یہ عمل کرتے ہوئے بھی اس کی نظر دلاور پر رہی تھی۔

دوسری طرف پہنچ کر اس نے وہ عجیب و غریب جگہ دیکھی جس کے بارے میں داراب نے کسی دوست سے سنا تھا اور کرنل زنجانی کو بتایا تھا۔

اب ایکس مین پھر دلاور کے پیچھا آ گیا۔

''چلو۔'' اس نے دلاور سے کہا۔

دلاور آگے بڑھتا ہوا سوئمنگ پول کے قریب پہنچا تو اس نے سعیدہ کو دیکھا جس کے دونوں ہاتھ دو آدمیوں نے پکڑ رکھے تھے۔ وہ بے حد خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر دلاور کو ذہنی جھٹکا لگا۔ اسے یونیورسٹی پر ہونے والے حملے کا علم نہیں تھا۔

سعیدہ نے دلاور کو دیکھا تو اس کا منہ کھلا۔ شاید وہ دلاور کو پکارنا چاہتی تھی لیکن پھر فوراً ہی اس کی نظر ایکس مین پر بھی پڑ گئی جس کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کا رخ دلاور کی طرف تھا۔

''اسے جال میں ڈالو اور لٹکا دو۔'' ایکس مین نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے حکم صادر کیا۔

☆☆☆

وہ چھ نہایت طاقت ور آدمی تھے جنہوں نے دلاور کو

ایک جال میں ڈالا جو زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس جال کی چھ موٹی موٹی ڈوریاں اوپر چھت تک چلی گئی تھیں۔ اسے جال میں ڈالنے کے بعد ان آدمیوں نے جانے کیا کیا کہ چھ ڈوریاں کس گئیں۔ اور وہ جال میں بند ہو گیا۔ پھر جال نے بلند ہونا بھی شروع کیا۔ بارہ چودہ فٹ بلند ہونے کے بعد وہ رکا اور پھر بائیں جانب سرکنا شروع ہوا۔

جب جال سوئمنگ پول کے اوپر جا کر رکا تو دلاور نے دیکھا کہ نیچے ایکس مین ایک عجیب سی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ باقی لوگ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے تھے۔

''کیا حال ہے جنرل صاحب کے بیٹے!'' ایکس مین بلند آواز سے طنزیہ انداز میں بولا۔

دلاور نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''حال تو میں تمہیں بتا دیتا اگر تم نے مجھے ریوالور کی زد میں نہ رکھا ہوتا۔''

''ایکس مین ہنسا۔ ''اکڑ نہیں گئی ابھی...... آخر جنرل کے بیٹے ہو...... لیکن ہو بے وقوف! جب تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں ایکس مین ہوں تو تمہیں بس ایک ریوالور لے کر میرے گھر نہیں آنا چاہیے تھا۔''

خود دلاور کو بھی اپنی حماقت کا احساس ہو چکا تھا۔ ماں کی موت کے باعث اس کی ذہنی کیفیت اتنی جنونی ہو گئی تھی کہ وہ اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھا تھا۔ اس پر بس خون سوار ہو گیا تھا اور وہ جلد از جلد ایکس مین کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا تھا۔

''تم مجھے مارنے آئے تھے۔'' ایکس مین چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن اب تمہیں اس طرح مرنا ہے کہ وقفے وقفے سے تم موت کو اپنے قریب آتا دیکھو گے۔ گولی چلا کر جال کی ایک رسی توڑی جائے گی۔ پھر دوسری، پھر تیسری...... اور چوتھی رسی کٹنے کے بعد تم اس پول میں گرو گے۔''

دلاور دیکھ چکا تھا کہ سوئمنگ پول میں مگرمچھ تیر رہے تھے۔

''رسیاں وقفے وقفے سے توڑی جائیں گی۔'' ایکس مین پھر بولا۔ ''تم خود کو دھیرے دھیرے موت کے قریب جاتا ہوا محسوس کرو گے۔''

''اپنے انجام سے تم بھی نہیں بچو گے ایکس مین۔'' دلاور نے کہا۔ ''یہ سارا سیٹ اپ تم نے فلمی انداز کا بنایا ہے جو تمہارے بچکانے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ ایسی ذہنیت والے مجرم اپنے انجام سے بہت زیادہ دور نہیں ہوتے۔''

یہ سب کچھ کہتے ہوئے دلاور یہ بھی سوچتا رہا تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر سکتا ہے یا نہیں، اور اگر کچھ کر سکتا ہے تو کیا؟

کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آنے کی صورت میں وہ ان مگرمچھوں کے جبڑوں میں ہوتا۔ وہ اس کی ہڈیاں تک چبا ڈالتے۔ اس نے ایک نظر سعیدہ کی طرف بھی دیکھا جس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ چکا تھا اور تیز روشنی میں شاید کچھ زیادہ ہی سفید نظر آ رہا تھا۔

''تم اپنا کام شروع کرو۔'' ایکس مین نے اس آدمی سے کہا جس نے سعیدہ کے جال کی رسیوں پر گولیاں چلائی تھیں۔ اس شخص نے رائفل سیدھی کی۔

''اب موت کی طرف تمہارا سفر شروع ہو گا۔'' ایکس مین نے جال میں پھنسے ہوئے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

رائفل سے ایک فائر ہوا۔ ایک رسی کٹ گئی۔ جال کو جھٹکا لگا۔ اس کے ساتھ ہی ایکس مین نے ایک قہقہہ لگایا۔ دلاور نے دانت پر دانت جما لیے تھے۔

ایکس مین کا اشارہ ملتے ہی رائفل بردار نے دوسرا فائر کیا۔ یقیناً وہ بہت اچھا نشانے باز تھا۔ جال کی ایک اور رسی کٹ گئی۔ جال جھٹکا کھا کر ایک طرف جھکنے لگا۔

''کیا حال ہے جنرل کے بیٹے!'' ایکس مین طنزیہ انداز میں بولا۔ ''موت کے قریب جاتے ہوئے کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

سچویشن ایسی نہیں تھی کہ دلاور جواب میں کوئی تیز جملہ کہہ سکتا۔ اس وقت موت اسے اپنے سر پر کھڑی محسوس ہو رہی تھی۔

رائفل بردار نے تیسرے فائر کا اشارہ لینے کے لیے ایکس مین کی طرف دیکھا۔ اس وقت ایکس مین چونک کر اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جس سے خطرے کے سائرن جیسی آواز سنائی دی تھی۔

ایکس مین نے جلدی سے وہ ٹی وی آن کیا جو اس کے دائیں ہاتھ کی میز پر رکھا تھا۔ اسکرین جھلملائی، پھر اس کمرے کا منظر دکھائی دیا جہاں سے وہ اور دلاور لفٹ میں سوار ہوئے تھے۔

ایکس مین نے موبائل کا کوئی بٹن دبا کر خطرے کے سائرن کی آواز بند کر دی تھی اور ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والا منظر دیکھ کر اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔

''خوب!'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز بڑھائی۔

''تمہارا باپ میرے گھر میں گھس آیا ہے جنرل کے بیٹے......لو، آواز سنو ان لوگوں کی۔''

اس نے ٹی وی کی آواز اتنی بڑھا دی تھی کہ آواز دلاور بھی سن سکے۔

''یہ تو عجیب سا کمرا ہے سر!''

دلاور نے آواز سنی اور پہچان بھی گیا۔ وہ کیپٹن اختر کی آواز تھی۔

''ہاں، عجیب تو ہے۔'' یہ جنرل اسد بٹ کی آواز تھی۔

''کہیں ایک کھڑکی بھی نہیں، اب تک ہم نے جتنے کمرے دیکھے ہیں، وہ ایسے نہیں تھے۔''

''خوب!'' ایکس مین بڑبڑایا۔ ''پورے گھر کی تلاشی لی جا چکی ہے، یعنی سیفی تو مارا جا چکا ہوگا یا......''

سیفی اسی شخص کا نام تھا جس نے دلاور کو گھر میں بلا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا۔

''تمہارے باپ کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ میرے گھر میں گھس آیا؟'' ایکس مین نے دلاور کو گھورتے ہوئے کہا۔

دلاور نے محسوس کیا کہ ایکس مین کے چہرے پر غصے کے آثار ہونے کے علاوہ ذہنی الجھن بھی مترشح تھی لیکن وہ خوف زدہ بالکل نہیں تھا۔ اس کی نظریں پھر اسکرین پر جم گئی تھیں۔

جنرل اسد کے ساتھ چھ سات مسلح افراد تھے۔ اسد غائر نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''تمہارے باپ کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔'' ایکس مین نے دلاور کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں جس کے گھر پر کوئی ادارہ بھی اس طرح چڑھ دوڑے۔ اسے ایک خاص گھر میں گھسنے کی جواب دہی تو کرنی ہی پڑے گی۔ میں دوسرے راستے سے نکل جاؤں گا یہاں سے۔''

''کیا ہوا ہے باس؟'' ایک آدمی نے پوچھا۔ وہ ایکس مین سے بہت قریب ہوگا۔ ہر ایک کو تو ایکس مین سے اس طرح سوال کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

ایکس مین نے اسے مختصراً بتایا، پھر کہا۔ ''اب مجھے اسی راستے سے نکلنا ہوگا جس راستے سے تم لوگ آتے جاتے ہو۔ اور اب ہمیں جلدی بھی کرنی ہوگی۔'' پھر اس نے رائفل بردار کی طرف دیکھا جو گولیاں چلا کر دو رسیاں توڑ چکا تھا۔

''جنرل کو بتا کر آئے تھے تم کہ میرے گھر آرہے ہو؟'' رائفل والے کی طرف دیکھنے کے بعد اس نے دلاور کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اس کے اس طرح چڑھ دوڑنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ تمہاری واپسی نہ ہونے کی صورت میں اس نے تمہیں خطرے میں محسوس کر لیا ہو۔''

دلاور کچھ نہیں بولا۔ وہ اس سے قطعی بے خبر تھا کہ اس کے باپ نے ایکس مین کے گھر پر چڑھائی کیسے کر دی تھی اور پھر اہم بات یہ کہ یہ آپریشن اس نے خود کیا تھا، اپنے کسی ماتحت سے نہیں کروایا تھا۔

''لیکن یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے......'' ایکس مین نے کہا۔ ''اسے ختم کرو۔ میں مگرمچھوں کے جبڑوں میں اس کی چیخیں سننا چاہتا ہوں۔'' اس کا اشارہ دلاور کی طرف تھا۔

رائفل بردار نے ایک بار پھر اپنی رائفل سیدھی کی اور فائر کر دیا۔ تیسری رسی کٹ گئی۔ جال کو ایک جھٹکا لگا۔ اس کے جھکاؤ نے دلاور کو یقین دلا دیا کہ چوتھی رسی کٹتے ہی جال اس حد تک کھل جائے گا کہ وہ نیچے مگرمچھوں کے درمیان جا گرے۔

چوتھا فائر بھی تاخیر کے بغیر کیا گیا تھا۔ چوتھی رسی کٹ گئی۔ اس وقت سعیدہ کی چیخ بہت تیز تھی۔

☆☆☆

ایکس مین کے گھر کی لفٹ والے کمرے میں جنرل اسد، اختر سے کہہ رہا تھا۔ ''جب تم نے مجھے اطلاع دی تھی کہ دلاور یہاں پہنچا ہے، اس کے بعد سے اب تک تم یہاں سے ایک پل کے لیے بھی نہیں ہٹے؟''

''جی نہیں سر!''

''تو پھر ایکس مین اور دلاور کا یہاں سے غائب ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے۔''

''میری تو عقل چکرا گئی ہے۔''

''ضرور یہاں کوئی خفیہ راستہ ہونا چاہیے۔ دلاور ناتجربہ کار ہے۔ ایکس مین نے اس پر قابو پا لیا ہوگا۔ یہاں کوئی خفیہ راستہ ہونا چاہیے جس سے ایکس مین دلاور کو یہاں سے کہیں لے گیا ہے اور کہیں بھی کیا، وہ اسے وہیں لے گیا ہوگا جس جگہ کے بارے میں داراب سے معلوم ہوا ہے اور مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ وہ جگہ اس بنگلے کے نیچے ہوگی۔''

''بالکل ابھی میرے ذہن میں بھی یہ خیال آیا ہے سر! وہ سرنگ جس پہاڑی علاقے میں ہے، اس سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر یہ علاقہ ہے جہاں یہ آبادی ہے جس کے ایک بنگلے میں ہم کھڑے ہیں۔ اس سرنگ سے وہ لوگ یہاں پہنچتے ہوں گے۔''

''ہاں یہی قرینِ قیاس ہے۔'' جنرل اسد نے کہا۔ ''یہاں کوئی لفٹ ضرور ہونی چاہیے جس سے ایکس مین وہاں

آتا جاتا ہوگا۔“

”لیکن وہ لفٹ ہمیں نظر تو آئے۔“

”شاید اسی کمرے میں وہ خفیہ میکنزم ہو جو لفٹ ہمارے سامنے لے آئے۔“

”وہ میکنزم تلاش کرنا ہوگا۔“

اسی وقت جنرل اسد کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ جنرل نے کال ریسیو کی۔ وہ کرنل زنجانی کی تھی۔

”سر!“ اس نے کہا۔ ”داراب اس سرنگ کے بارے میں بتانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ اس علاقے کی طرف روانہ ہو چکا ہوں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں اس لیے آپ کو بعد میں بتا دوں گا لیکن ابھی ابھی خیال آیا کہ آپ میری اس حرکت پر ناراض ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے......“

”تم کہاں ہو اب؟“ جنرل نے تیزی سے پوچھا۔

”میں اس علاقے کے قریب پہنچ چکا ہوں۔“

”میں بھی قریب ہی ہوں جنرل نے فوراً کہا۔ ”کوئی پوائنٹ بتاؤ جہاں میں تم سے آملوں۔“

”میں پانچ منٹ میں اس سڑک پر پہنچ جاؤں گا جہاں سے ایک راستہ پہاڑی علاقے کی طرف جاتا ہے۔“

”میں فوراً وہاں آ رہا ہوں۔ ایک آدھ منٹ کی تاخیر ہو جائے تو میرا انتظار کرنا۔“

”بہتر ہے۔“

جنرل اسد نے رابطہ منقطع کیا اور تیزی سے دروازے کی طرف مڑتا ہوا بولا۔ ”آؤ۔“

”کیا اطلاع ملی ہے سر؟“ اختر نے پوچھا۔

تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے جنرل نے کرنل زنجانی سے ملنے والی اطلاع کے بارے میں بتایا۔ وہ لوگ سیفی کی لاش کے پاس سے بھی گزرے جس نے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی اور گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔

تین گاڑیوں میں ان کا قافلہ روانہ ہو گیا۔ کچھ لوگوں کو جنرل نے وہیں چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ وہاں ضابطے کی کارروائی مکمل کر سکیں۔

تین گاڑیوں کا یہ قافلہ اس پوائنٹ پر پہنچ گیا جہاں کرنل زنجانی ان کا منتظر تھا۔ جنرل نے دیکھا کہ کرنل زنجانی ایک آرمرڈ کار بھی لایا تھا۔

”اتنی تیاری؟“ جنرل نے کرنل زنجانی سے پوچھا۔

”آپ کہاں تھے سر؟“ کرنل زنجانی نے پوچھا۔

”دلاور نے اختر سے خاصی رقم لی تھی جو اختر نے اسے دے تو دی لیکن اس کا ذہن الجھ گیا تھا کہ اچانک دلاور کو اتنی رقم کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ اس نے دلاور کی نگرانی کی تھی۔ دلاور نے چور بازار سے ایک ریوالور خریدا تھا اور ایکس مین کے گھر پہنچ گیا تھا۔“

”ڈاکٹر بغاطر؟“

”ہاں۔“ جنرل نے کہا۔ ”جب اختر نے مجھے اس کی اطلاع دی تو میں سمجھ گیا کہ ماں کی موت کی وجہ سے دلاور پر خون سوار ہو گیا ہے...... وہ ایکس مین کو ہلاک کرنا چاہتا ہے لیکن مجھے اندازہ تھا کہ ایسا کرنا اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ وہ خود ہی اس کی گرفت میں آجاتا یا مارا جاتا اسی لیے میں نے فوراً ڈاکٹر بغاطر کے گھر پر ریڈ کی تھی۔“

”تو اب دلاور صاحب کو اس کے قبضے میں ہونا چاہیے۔“

”یقیناً اور مجھے یقین ہے کہ وہ سرنگ ہمیں اس تک پہنچا دے گی۔ ڈاکٹر بغاطر نے اپنے بنگلے کے نیچے ہی وہ جگہ بنائی ہوگی جس کے بارے میں داراب نے بتایا تھا۔“

”ابھی آپ نے بتایا ہے کہ اس کے گھر میں کوئی لفٹ ہو سکتی ہے۔ وہ اسی کے ذریعے نیچے جاتا ہوگا۔ وہاں سے نکلنے کے لیے بھی وہ وہی لفٹ استعمال کر سکتا ہے۔“

”ہاں۔“ جنرل نے کہا۔ ”اور وہ دلاور کو بھی لے گیا ہوگا۔“

کرنل زنجانی نے سر ہلایا، پھر کہا۔ ”یہ پہلا موقع ہے کہ کسی آپریشن کی کمانڈ آپ خود کر رہے ہیں۔“

جنرل خاموش رہا۔ وہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی وجہ سے اتنا بے چین ہوا تھا کہ خود ہی حرکت میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

چوتھی رسی کٹتے ہی دلاور نیچے گر کر سوئمنگ پول میں تیرتے مگرمچھوں کی خوراک بن جاتا۔ اسی لیے سعیدہ کی چیخ نکل گئی تھی لیکن وہ نہیں ہوا جس کا سعیدہ کو خیال تھا۔ انتہائی خطرناک صورتِ حال ہوتے ہوئے بھی دلاور نے اپنے حواس نہیں کھوئے تھے۔ اس نے فوراً جال کی مضبوط رسیاں ہی پکڑ لی تھیں۔

ایکس مین نے انگریزی میں ایک گندی گالی دی اور رائفل بردار کو حکم دیا کہ وہ باقی دونوں رسیاں بھی کاٹ دے۔

دلاور نے فوراً اپنے جسم کو اس طرح حرکت دی کہ جال کسی جھولے کی طرح جھول گیا اور رائفل بردار کا نشانہ خالی گیا۔

دلاور نے دنیا کے اس عجیب جھولے کی رفتار بڑھا دی اور پھر ایک گولی ضائع ہوگئی۔

ایکس مین نے اب مسلسل گالیاں بکنی شروع کر دی تھیں۔

پھر ایک فائر ہوا۔ نشانہ اب بھی خطا گیا۔

جیسے ہی دلاور کو محسوس ہوا کہ وہ ''جھولا'' اب سوئمنگ پول کے اوپر نہیں تھا، اس نے جھولا چھوڑ دیا اور کوشش کی کہ زمین پر گرتے وقت اسے کوئی خطرناک چوٹ نہ لگے۔

پھر یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ وہاں موجود ایک شخص کے اوپر گرا تھا۔ اس شخص نے بچنے کی کوشش تو کی تھی لیکن اندازے کی غلطی کے باعث وہ بچ نہیں سکا۔ دلاور نے اس کے کندھے سے لٹکی ہوئی آٹو میٹک رائفل کھینچ لی۔ پھر اس نے پہلی گولی اسی شخص کے سینے میں اتاری تھی جس کی رائفل اب اس کے قبضے میں تھی۔ وہ اب اس کے پہلو میں ہی لیٹ گیا تھا اور وہاں موجود لوگوں پر گولیاں برسانی شروع کر دی تھیں۔

وہاں چودہ پندرہ افراد تھے۔ ان میں سے تین کے علاوہ باقی سب ٹھکانے لگ گئے۔ تین نے اپنے ہتھیار پھینک کر جلدی سے ہاتھ اوپر اٹھا لیے تھے۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ ایکس مین ہکا بکا رہ گیا تھا اور جب وہ اس کیفیت سے نکلا، اس وقت تک اس کے بارہ تیرہ آدمی موت کی نیند سو چکے تھے۔ اب اس نے جلدی سے اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی۔

دلاور چاہتا تو سب سے پہلے اسے بھی نشانہ بنا سکتا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ ایکس مین کو زندہ پکڑے۔ جب اس نے دیکھا کہ ایکس مین اپنی جیب میں ہاتھ ڈال رہا ہے تو اس نے ایکس مین کے اسی ہاتھ کے بازو پر گولی چلا دی جس ہاتھ سے وہ ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔

دلاور اب سیدھا کھڑا ہوگیا۔

''ریوالور نکالنے کی کوشش کرو گے تو دوسری گولی تمہارے سینے میں پیوست ہوگی، ایکس مین عرف ڈاکٹر بغاطر!'' دلاور کا لہجہ اب چبھتا ہوا ہوگیا۔

ایکس مین اب دوسرے ہاتھ سے اپنا زخمی بازو پکڑے ہوئے تھا لیکن اس شخص کے چہرے پر اب بھی تکلیف کے آثار نہیں تھے۔

سعیدہ اب خوشی سے چیخنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا چہرہ تمتما گیا تھا کہ سچویشن اب دلاور کے قابو میں تھی۔

''کوئی بھی غلط حرکت نہیں کرنا۔'' دلاور نے ایکس مین کو پھر للکارا۔

ٹی وی اب بھی کھلا ہوا تھا لیکن اب اس سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ دلاور کو احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ آوازیں آنے کا سلسلہ کب بند ہوا تھا۔

جو تین افراد ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے، دلاور نے ان سے کہا۔ ''تم تینوں اپنے آقا کے قریب ہو جاؤ، جلدی کرو۔''

وہ تینوں فوراً حرکت میں آگئے۔

جلد ہی وہ ایکس مین کے قریب پہنچ گئے جو اب بھی اپنا بازو پکڑے ہوئے تھا۔ بہتے ہوئے خون نے اس کا وہ ہاتھ بھی سرخ کر دیا تھا۔

اب دلاور تیزی سے ان چاروں کے قریب پہنچا۔ سعیدہ اس کے پیچھے آگئی۔

''ماردو نہیں دلاور!'' وہ بولی۔ ''ماردو ان سب کو۔''

لیکن دلاور کچھ اور ہی سوچے ہوئے تھا۔

جیسے ہی وہ ان چاروں کے قریب پہنچا، میز پر رکھے ہوئے ایکس مین کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ دلاور نے فوراً موبائل اٹھایا لیکن ان چاروں کی طرف سے غافل بالکل نہیں ہوا۔

کال ریسیو کرتے ہی دلاور نے گولیاں چلنے کے دھماکے سنے۔

''اٹیک ہو گیا ہے باس۔'' دوسری طرف سے کسی نے چیخ کر کہا۔ ''ہم مقابلہ کر رہے ہیں۔''

دلاور نے فوراً فون بند کر دیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب اس کے باپ نے سرنگ پر حملہ کروا دیا ہے۔ اس کی دانست میں کال سرنگ کے دہانے سے کی گئی تھی۔ کسی اور جگہ کا خیال اسے آ ہی نہیں سکتا تھا۔

ٹی وی پر اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کمرا اب خالی پڑا تھا جہاں لفٹ تھی۔ جنرل اسد وغیرہ وہاں سے جا چکے تھے۔

دفعتاً دلاور نے رائفل کی نال بہت زور سے ایکس مین کی کنپٹی پر ماری اور وہ تیورا کر گر پڑا۔ دلاور نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ امکان یہی تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہوگا۔

دلاور نے تینوں آدمیوں کو ریوالور کی زد پر رکھتے ہوئے جھک کر ایکس مین کی تلاشی لی۔ وہ ایکس مین کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔ اس نے یہ امکان نظرانداز نہیں کیا تھا کہ ایکس مین بے ہوشی کی اداکاری بھی کر سکتا ہے۔

لیکن وہ واقعی بے ہوش تھا ورنہ اس موقع پر وہ دلاور کے ہاتھ سے رائفل جھپٹنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ دلاور نے اس

کی تلاشی لے کر دو ریوالور نکالے۔ پھر باقی تینوں آدمیوں کی تلاشی بھی لی جو اپنے ہتھیار پھینک چکے تھے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

''اب اسے اٹھاؤ۔'' دلاور نے ایکس مین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں حکم دیا۔

''تم انہیں ختم کیوں نہیں کرتے دلاور؟'' سعیدہ بولی۔ نہ جانے کیوں اب وہ تیز تیز سانس لینے لگی تھی۔

لیکن دلاور نے کچھ اور ہی سوچا تھا جس پر وہ جلد از جلد عمل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سرنگ کے دہانے پر جو مقابلہ ہو رہا تھا، اس میں کامیابی یقیناً پولیس ہی کو ہوتی اور دلاور پولیس کے آنے سے پہلے وہ سب کچھ کر گزرنا چاہتا تھا جو اس کے دماغ میں تھا۔

ان تینوں نے ایکس مین کو اٹھا لیا۔ ایکس مین کے بہتے ہوئے خون سے ان کے کپڑے بھی رنگین ہونے لگے۔

''اب......'' دلاور نے ان تینوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اسے وہیں لے چلو جہاں جال پڑے ہوئے ہیں۔''

اس جگہ جہاں اسے جال میں باندھا گیا تھا، وہاں اس نے دو تین جال اور دیکھے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ایکس مین اس طرح بھی لوگوں کو مارا کرتا تھا جس سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ وہ اذیت رساں بھی تھا۔

''اب اپنے آقا کو ایک جال میں باندھو۔'' دلاور نے حکم دیا۔ ''اور اس کے جال کو سوئمنگ پول کے اوپر لے جاؤ۔ یقیناً تم لوگ اس طریقے سے ناواقف نہیں ہو گے۔''

ویسے خود دلاور نے بھی دیکھ لیا تھا کہ وہاں زمین پر ایک عجیب ساخت کی مشین رکھی ہوئی تھی جس سے منسلک ایک تار اوپر چھت تک چلا گیا تھا۔

اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔ انہوں نے اپنے آقا کو ایک جال میں باندھ دیا۔ وہ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ دلاور ان کے آقا کا کیا حشر کرنا چاہتا تھا۔

''تم...... تم......'' سعیدہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''ہاں۔'' دلاور نے کہا۔ ''تم سمجھ گئی ہو گی کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں، لیکن اسے میں اس لیے مگرمچھوں کی خوراک نہیں بنانا چاہتا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کرنا چاہتا تھا۔ میں تو اس سے اپنی ماں کا انتقام لینا چاہتا ہوں جنہوں نے اسپتال میں شدید اذیت کے عالم میں دم توڑا تھا۔''

سعیدہ چپ رہ گئی۔

جلد ہی وہ وقت آ گیا جب جال سوئمنگ پول کے اوپر تھا اور ایکس مین اس میں بے ہوش پڑا تھا۔

''اسے ہوش میں آنا چاہیے۔'' دلاور بڑبڑایا۔ ''یہ مجھے احساس دلانا چاہتا تھا کہ موت کو قریب آتے دیکھ کر انسان پر کیا گزرتی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اسے یہ احساس دلاؤں۔''

اس نے ایک اچٹتی سی نظر اپنی گھڑی پر بھی ڈالی۔ وہ مضطرب بھی تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ایکس مین کے گھر میں ناکامی کے بعد ہی اس کے باپ نے سرنگ پر ریڈ کروائی ہو گی۔ کامیابی کے بعد وہ لوگ یہاں پہنچتے تو ان کے ساتھ اس کا باپ بھی ہوتا جو دلاور کو اس حرکت سے باز رکھنا چاہتا۔ قانون کی نظر میں ہاتھ آئے ہوئے مجرم کی جان لینا جرم ہوتا ہے اور جنرل اسد ایک ایسا ہی آفیسر تھا جو ہر حال میں قانون کا احترام کرتا تھا۔

دلاور کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ ایکس مین جلد از جلد ہوش میں آ جائے اور دیکھ لے کہ وہ کس طرح اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ اسی لیے وہ مضطرب تھا۔ ایکس مین کو ایک اذیت ناک موت مار کر ہی اسے سکون ملتا اور اس کے خیال کے مطابق وہ اس طرح ماں کے دودھ کا حق ادا کر دیتا۔

''ہوش میں آ جا کم بخت!'' وہ جال کی طرف دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔

اسے اپنی یہ خواہش پوری ہوتی نظر آئی۔ جال میں ایکس مین نے کروٹ لی تھی۔ شاید اس کے منہ سے کراہ بھی نکلی ہو جو دلاور کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی۔

ایکس مین کے بازو سے بہتا ہوا خون سوئمنگ پول میں گر کر مگرمچھوں کو بے چین کر رہا تھا۔ شاید خون کی بو مگرمچھوں کی اشتہا بڑھا رہی ہو۔

''ہوش آ رہا ہے اسے۔'' دلاور خوشی سے بڑبڑایا۔

ایکس مین کے تینوں آدمیوں کو اس نے کچھ دور کھڑا کر دیا تھا۔

''ڈاکٹر بغاطر......! ایکس مین!'' دلاور بلند آواز میں بولا۔

ایکس مین نے اس کی طرف دیکھا۔

''اب تم بتانا مجھے!'' دلاور پھر بولا۔ ''موت کو قریب آتے دیکھ کر انسان کیا محسوس کرتا ہے۔''

ایکس مین کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

اسی وقت وزنی جوتوں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ پولیس قریب آتی جا رہی تھی۔ سرنگ کے محافظوں کو یقیناً ٹھکانے لگایا جا چکا ہو گا اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان میں سے کچھ نے خود ہی ہتھیار ڈال کر خود کو قانون کے حوالے کر دیا ہو۔

پُراثر تحریروں سے مرصع نومبر 2017 کا پُرکیف شمارہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قلم کے جوہر...... قسط وار ناول کی صورت
سیما رضا ردا کا خوب صورت منی ناول...... ہم کو عبث بدنام کیا کا منطقی انجام......
رفاقت جاوید نے کھلائے محبت کے رنگ...... فصلِ محبت میں......
بچوں اور ان کی پرورش کے حوالے سے
ماؤں کی ذمے داریاں شائستہ زریں
کے تحقیقی سروے میں......
اختر شجاعت اور ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے ایمان افروز مضامین......
رائٹرز کی کہکشاں...... رخ چوھدری کے شوخ قلم سے احوالِ تقریب
سمیرا یونس ہارون کا پُرلطف مکمل ناول...... کوئی تعویذ ہو ردِ بلا کا
دردانہ نوشین خان کی حیرت انگیز تحریر...... خواب گزیدہ......
شہناز وسیم، حیا بخاری اور نصرت یوسف کی مؤثر کاوشیں......
اس کے علاوہ
اُمِ ایمان، شگفتہ شاہ، ساجرہ ریحان، سیما بنت عاصم، شمیم فضل خالق، ناہید چوھدری، ریحانہ آفتاب و دیگر مشاق تحریر نگاروں کی دلکش کاوشیں......
اس کے ساتھ ساتھ معلوماتی تراشے، متاثر کن مستقل سلسلے اور دل پزیر شاعری اور بہت کچھ آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر......
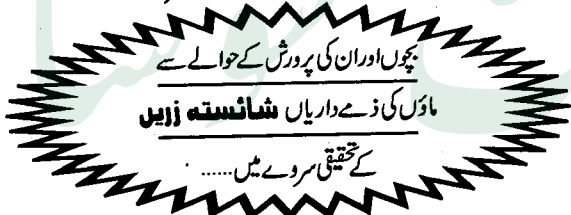
دلاور نے جلدی سے کئی گولیاں چلا دیں۔ اس کے کچھ نشانے خطا گئے لیکن تین گولیاں کام کر گئیں۔ تین رسیاں کٹ گئیں اور جال نے خاصے جھٹکے کھائے۔

''یہ کیا کر رہے ہو دلاور!'' اس نے اپنے باپ کی چیختی ہوئی آواز سنی اور چونک کر آواز کی طرف دیکھا۔

پولیس کے آگے جنرل اسد اور کرنل زنجانی دکھائی دیے۔

''ڈیڈی!'' دلاور بولا۔ ''کچھ دیر پہلے اس کتے نے مجھے بھی اسی طرح ان مگرمچھوں کے حوالے کرنا چاہا تھا لیکن میں اس سے اپنا انتقام نہیں لینا چاہتا۔ مجھے تو وہ اذیت محسوس ہو رہی ہے جو میری ماں نے محسوس کی ہوگی۔''

''یہ اب ہمارے قابو میں ہے دلاور!'' جنرل اسد نے کہا۔ ''اسے ہلاک کرنا قانوناً غلط ہوگا۔'' وہ تیزی سے دلاور کی طرف بڑھنے لگے۔

''میں ہر صورت میں اپنی ماں کا انتقام لوں گا ڈیڈی۔'' دلاور پر خون سوار تھا۔

''ہرگز نہیں۔ تم میرے سامنے یہ قانون شکنی نہیں کر سکتے۔'' جنرل اسد نے قریب آتے ہوئے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا تھا۔ ''اگر اب تم نے گن اس کی طرف اٹھائی تو میں تم پر گولی چلا دوں گا۔''

''مجھے کسی بات کی پروا نہیں ڈیڈی!'' دلاور نے کہتے ہوئے آٹومیٹک گن کا رخ جال کی طرف کیا۔

جنرل اسد کے ریوالور سے گولی نکلی۔ انہوں نے دلاور کے ہاتھ ہی کا نشانہ لیا تھا لیکن گولی ایک ڈیڑھ انچ کے فاصلے سے گزر گئی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرتے دلاور نے آٹومیٹک گن کا ٹریگر اس طرح دبایا کہ اس پر سے دباؤ ہٹایا ہی نہیں۔ جال کی رسیوں پر گولیوں کی بارش ہوگئی۔ باقی تینوں رسیاں بھی کٹ گئیں۔ جال ایکس مین کو لیے ہوئے سوئمنگ پول میں گرا۔ پانی چھپاکے کے ساتھ اچھلا اور پھر ایکس مین کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ مگرمچھ اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔

''مائی گاڈ!'' جنرل اسد نے ایک طویل سانس لی اور ان کا ریوالور والا ہاتھ جھک گیا۔

سعیدہ پر اس وقت نہ جانے ایسی کیا کیفیت طاری ہوئی کہ وہ دلاور سے لپٹ گئی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ شاید وہ سمجھی تھی کہ جنرل اسد کی گولی دلاور کو ختم کر دے گی۔

ایکس مین کی چیخیں یک لخت رک گئیں۔ کسی مگرمچھ نے اس کی کھوپڑی ہی چبا ڈالی ہوگی۔

دلاور نے گن پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔

''اب آپ مجھے ہتھکڑیاں لگوا سکتے ہیں ڈیڈی!'' وہ بڑے سکون سے بولا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' جنرل اسد نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب تم خود کو زیرِ حراست سمجھو۔''

''اب میں ہر سزا بھگت لوں گا ڈیڈی۔'' دلاور نے کہا۔

''یہ فیصلہ تو عدالت کرے گی کہ تمہیں کیا سزا دی جائے۔''

''آپ کو اپنی شریکِ حیات کا غم نہیں ہے ڈیڈی؟'' دلاور بولا۔

''کاش تم میرے دل میں جھانک سکتے۔'' جنرل اسد کی آواز میں لرزش آگئی۔

☆☆☆

کچھ دن بعد سعیدہ کو اس بات کی تو خوشی ہوئی کہ اس کے باپ کو سرکاری گواہ بننے کی وجہ سے عدالت نے کوئی سزا نہیں دی تھی لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جب دلاور کو پانچ سال قید کی سزا سنائی گئی۔

جنرل اسد اس وقت عدالت میں نہیں، اپنے گھر پر تھے اور ایک ٹک اپنی شریکِ حیات کی تصویر دیکھے جا رہے تھے۔

''میری روح!'' وہ دل ہی دل میں کہہ رہے تھے۔ ''مجھے معاف کر دینا۔ میں قانون کا غلام ہوں۔ تمہارے بیٹے کو سزا سے بچانا میرے اختیار میں نہیں تھا۔''

اور جس روز سعیدہ جیل میں دلاور سے ملی تھی تو اس نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کہا تھا۔ ''میں پانچ سال تمہارا انتظار کروں گی دلاور!''

دلاور اس کی طرف محبت سے دیکھ کر مسکرا دیا۔

''رہائی کے بعد تم کہاں جاؤ گے؟'' سعیدہ نے پوچھا۔

''اپنے گھر کے علاوہ کہاں جا سکتا ہوں سعیدہ؟''

''جنرل صاحب نے گرفتار کیا تھا تمہیں۔''

''انہوں نے وہی کیا جو ایک ایمان دار افسر کو کرنا چاہیے لیکن جب میں گھر جاؤں گا تو وہ ایک باپ کی حیثیت سے مجھے اپنے سینے سے بھی لگائیں گے۔''

سعیدہ اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

''لیکن جیل سے میں پہلے گھر نہیں جاؤں گا سعیدہ۔'' دلاور نے کہا۔ ''پہلے میں اپنی ماں کی قبر پر جاؤں گا۔'' دلاور کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے اور سعیدہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

چارۂ کار

عمران قریشی

عقل کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنا کبھی کبھی بہت مہنگا پڑ جاتا ہے... واقعات کی پٹری پر چلتے چلتے اچانک لڑکھڑا کر گر جانے والے چالاک شخص کا المیہ... مجرم کے کھیل اور قانون کے تقاضوں کا باہم ٹکراؤ...

بینک ڈکیتی کی واردات کا دلچسپ ماجرا......

ریگستانی قصبے کے قریب قسطا روڈ پر واقع بینک میں بیلر کو حال ہی میں تعینات کیا گیا تھا۔ مختصر بینک کی اہمیت کا اندازہ بیلر کو پہلے مہینے کی کلوزنگ کے دوران میں ہی ہو گیا تھا۔ جب بینک میں موجود رقم کی فیگر کسی بڑے اور معروف بینک کے مطابق نکلی۔ دراصل قسطا روڈ پر پیٹرول پمپوں کی بھرمار تھی لیکن بینک ایک ہی تھا۔ اس کے باوجود کام کے

لحاظ سے عملے کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ تاہم منجھے ہوئے اسٹاف کی بدولت اب تک اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بیلر کے علاوہ چھ افراد بینک میں کام کرتے تھے۔ ایملی اور وینڈی کلرک تھیں۔ کارٹر کیشیئر اور نارمن کمپیوٹر آپریٹر تھا۔ ان کے علاوہ دو مسلح گارڈز کی ڈیوٹی بینک کے دروازے پر تھی۔ عمارت دومنزلہ اور ائرکنڈیشنڈ تھی۔ اس کے باوجود جب سے بیلر نے بینک میں کام سنبھالا تھا، سخت۔۔ گرمی کی وجہ سے اپنے قویٰ کو مضمحل اور شل محسوس کیا تھا۔ بیئر کے ٹھنڈے گلاس بھی طبیعت میں بحالی کا باعث نہ بن سکے تھے۔

اس دن بھی اس کا دماغ ماؤف تھا۔ اسے شدت سے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی وہ کافی منگوانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے بینک کے باہر گاڑی کے بریکوں کی آواز سنائی دی۔ بیلر نے چونک کر شیشے کے دروازے سے باہر دیکھا۔ عمارت کے سامنے سالخوردہ بیوک کا قدیم ڈھانچا کھڑا ہانپ رہا تھا۔ بیلر کو خطرے کا احساس ہوا۔ بیوک میں سے تین مرد باہر نکلے۔ ان تینوں نے اپنے چہروں کو سیاہ کپڑوں سے ڈھانپ رکھا تھا اور ان کے ہاتھوں میں ریوالور دھوپ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ بیلر نے بینک کے باہر کھڑے ہوئے گارڈ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہولسٹروں میں سے ریوالور باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن نقاب پوشوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ریوالوروں نے انہیں موقع نہیں دیا۔ ماحول فائرنگ کی آواز سے گونجا اور دونوں گارڈز زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ تینوں نقاب پوش طوفان کی طرح بینک میں داخل ہونے کے بعد مختصر عملے پر چھا گئے۔ ان میں سے ایک بیلر کے کمرے میں چلا آیا اور ریوالور کی نال اس کے سر کے ساتھ لگاتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

''خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہو۔ حرکت کرنے کی صورت میں، میں جان کی ضمانت نہیں دے پاؤں گا۔'' باہر کھڑے ہوئے دونوں نقاب پوشوں نے ریوالوروں کے دستے ایملی اور وینڈی کے سروں پر رسید کیے۔ وہ دونوں بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئیں۔ بیلر کے سر پر کھڑے ہوئے نقاب پوش نے اس سے والٹ روم کی چابی مانگی۔ اس نے خاموشی کے ساتھ دراز میں سے چابی نکالی اور اسے تھما دی۔ اتنی دیر میں باہر کھڑے ہوئے دونوں نقاب پوش کارٹر کو بھی بے ہوش کر چکے تھے اور ہاتھوں میں چمڑے کے تین خستہ حال بیگ تھامے بیلر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ بیلر کی پشت پر کھڑے ہوئے نقاب پوش نے ہاتھوں میں پکڑی چابی ان دونوں میں سے ایک کی جانب اچھال دی۔ وہ دونوں خاموشی کے ساتھ والٹ روم میں گھس گئے۔ بیلر کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ بینک کے محل وقوع سے بخوبی آگاہ تھے لیکن شاید وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ حال ہی میں بیلر کی خصوصی درخواست پر بینک کی عمارت کے اندر کیمرے نصب کر دیے گئے تھے اور دوسری منزل پر بیٹھا نارمن بینک میں ہونے والی ڈکیتی کو کمپیوٹر اسکرین پر دیکھنے کے بعد پولیس ڈپارٹمنٹ کو ڈکیتی کی واردات سے مطلع کر چکا ہوگا۔ پولیس کو عمارت تک پہنچنے میں پندرہ سے بیس منٹ کا وقت درکار تھا۔ بینک میں کیمرے نصب کروانے کے بعد بیلر نے بینک کے قریب پولیس چوکی کے قیام کی درخواست ہیڈ کوارٹر کو ارسال کی تھی۔ تاحال اس کی درخواست پر نظر ثانی نہیں کی جاسکی تھی۔ اس کے پیچھے والٹ روم کا دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھلا اور دونوں نقاب پوش ہاتھوں میں سیاہ بیگ تھامے نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایک بیگ بیلر کے پیچھے کھڑے ہوئے نقاب پوش کے ہاتھ میں تھما دیا اور بیلر کو کمرے سے باہر کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ بیلر نے خاموشی کے ساتھ ان کے حکم کی تعمیل کی اور شیشے کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ وینڈی اور ایملی کے وجود زمین پر آڑھے ترچھے پڑے تھے۔ کارٹر کے بوٹ کاؤنٹر کے پیچھے سے جھانک رہے تھے۔ تینوں نقاب پوشوں میں سے ایک نے بینک کا دروازہ کھولا اور وہ عمارت سے باہر نکل آئے۔

دونوں گارڈز کی لاشوں کے گرد خون کے چھوٹے چھوٹے تالاب بن گئے تھے۔ ان میں سے ایک اوندھے منہ پڑا تھا اور دوسرا پشت کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کی لاشوں کو پھاند کر وہ چاروں بیوک کی طرف چلے آئے۔ نقاب پوش کا سرغنہ بیلر کے آگے چل رہا تھا اور باقی دونوں بیلر کے پیچھے تھے۔ ابھی وہ بیوک کے قریب پہنچے بھی نہیں پائے تھے کہ ریگستانی سڑک کا ماحول فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ ایک گولی بیلر کے کان کے پاس سے سائیں کی آواز کے ساتھ گزری اور وہ گھبرا کر زمین پر گر گیا۔ اس کا گرنا ہی اسے موت کے منہ میں جانے سے بچا گیا۔ متعدد گولیوں نے بیوک کی چادر میں چھید کر دیے۔ بیلر کے پیچھے چلنے والے دونوں نقاب پوش زمین پر گر کر تڑپنے لگے۔ بینک کی عمارت کے پاس اوندھے منہ گرا ہوا گارڈ ہاتھ میں ریوالور تھامے

یوں کھڑا تھا جیسے اسے رسیوں سے باندھ کر کھینچنے کے بعد کھڑا کر دیا گیا ہو۔ اس تمام فائرنگ کے دوران میں بیلر اور اس کے آگے چلنے والا نقاب پوش مکمل طور پر محفوظ رہے۔ نقاب پوش نے فائرنگ ہوتے ہی نہایت پھرتی کے ساتھ ہاتھ میں پکڑا ہوا بیگ بیوک کی کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر پھینکا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے کے بعد بلا اشتعال گارڈ پر فائرنگ شروع کر دی۔ وہ دوبارہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ بیوک اسٹارٹ ہوئی اور دھول اُڑاتی ہوئی عمارت کے مخالف جانب بھاگنے لگی۔

بیلر نے زمین سے کھڑے ہوتے ہی پاس گرے ہوئے دونوں نقاب پوشوں میں سے ایک کا ریوالور اٹھا لیا اور بے دریغ بیوک پر فائر کر دیا۔ بیوک کی رفتار میں اضافہ ہوا اور بیلر کو یہ جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا نشانہ خطا گیا تھا۔ اس نے ریوالور کو زمین پر پھینک دیا اور دونوں سیاہ بیگوں کو اٹھا کر ان کا معائنہ کرنے لگا۔ بیگوں میں متعدد چھید دکھائی دے رہے تھے۔ جن میں سے ڈالر باہر جھانک رہے تھے۔ ان ڈالرز کو دیکھ کر بیلر کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بیگز کو لے کر قریبی پارکنگ میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف چلا آیا۔ اس نے گاڑی کی ڈکی کو کھولا اور بیگز کو اس کے اندر رکھنے کے بعد ڈکی کو تالا لگا دیا۔ عمارت کا دروازہ کھول کر نارمن باہر نکلا اور اس کی خیریت دریافت کرنے لگا۔ بیلر نے اسے ڈکیتی کی تفصیل سے مطلع کیا اور بینک کے اندر چلا آیا۔

شیرف تھامس شیشے کے کمرے میں بیلر کی کرسی پر براجمان تھا۔ بیلر اور نارمن اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ شیرف ہم کلام تھا۔

''تو تم دونوں کے کہنے کے مطابق تین نقاب پوش بینک میں داخل ہوئے۔ انہوں نے گارڈز کو گولیاں مار کر زخمی کیا، ایملی، وینڈی اور کارٹر کو بے ہوش کرنے کے بعد تمہارے کمرے میں گھستے چلے آئے۔ پھر تم سے والٹ روم کی چابی لینے کے بعد بینک میں موجود تمام مہینے کی رقم کو تین بیگوں میں منتقل کرنے کے بعد فرار ہونے کی کوشش کی۔ تب زخمی گارڈ نے ان پر فائرنگ کر کے دو نقاب پوشوں کو ہلاک کر دیا۔ لیکن تیسرا گارڈ کو گولیاں مارنے کے بعد بیگوں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔'' بیلر نے سر اثبات میں ہلا کر شیرف کے بیان کردہ واقعات کی تائید کی۔ شیرف نے نارمن سے پوچھا۔

''تم اوپری کمرے میں ٹی وی اسکرین پر ڈکیتی ہوتے ہوئے دیکھتے رہے لیکن تم نے بیلر کی مدد کرنے کی قطعی کوشش نہیں کی؟'' نارمن نے جواب دیا۔

''میں نے فون پر ڈکیتی کی اطلاع تم کو دے کر بیلر کی مدد کی۔ یہ تمہاری نااہلی ہے کہ مطلع کرنے کے باوجود بھی تم دیر سے آئے۔'' شیرف کے تاثرات ابھرے اور وہ سرد لہجے میں بولا۔

''پولیس ڈپارٹمنٹ کی عمارت سے یہاں تک کا فاصلہ بیس منٹ اور پینتالیس سیکنڈ ہے۔ ہم نے تیز رفتاری کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے یہ فاصلہ صرف اٹھارہ منٹ میں طے کیا اس لیے تم ہمیں موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم نے کیمرے صرف عمارت کے اندر نصب کروائے ہیں۔ بینک کے باہر کا حصہ ان کی رینج میں نہیں آتا۔ اگر کیمرے باہر نصب ہوتے تو ہم بیوک کا نمبر بہ آسانی حاصل کر سکتے تھے۔''

''وہ تینوں نہایت احمق ہوتے۔ اگر صحیح نمبروں والی نمبر پلیٹ لگا کر ڈکیتی کرنے چلے آتے۔'' شیرف نے نارمن کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس دفعہ بیلر سے پوچھا۔

''تم نے گارڈ کے ہلاک ہونے کے بعد بیوک پر فائر کیا اگر یہ فائر بیگوں کو اٹھاتے ہوئے نقاب پوش پر کر دیتے تب بینک کے بہت سے ڈالر چوری ہونے سے بچ جاتے۔'' بیلر اب تک شیرف کی بکواس کو نہایت تحمل مزاجی کے ساتھ سن رہا تھا۔ اب کی دفعہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بیگ اٹھاتے ہوئے اس کے ریوالور کی نال کا رخ میرے چہرے کی طرف تھا۔ اس لیے میں کچھ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم مجرموں کا سراغ لگانے کے بجائے ہم دونوں کو معاملے میں زبردستی گھسیٹنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟'' شیرف سپاٹ لہجے میں بولا۔

''کیونکہ زیادہ تر بینک ڈکیتیوں میں ان کا اپنا عملہ ملوث ہوتا ہے۔ تم دونوں کا نقاب پوشوں کے ساتھ ملا ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔ اس لیے تم دونوں کی حیثیت میری نگاہوں میں مشکوک ہے۔''

نارمن کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرے۔ تاہم بیلر بات کو بدلنے کے لیے بولا۔

''عمارت میں کیمروں کے ہوتے ہوئے اسٹاف کا ڈکیتی میں ملوث ہونا ممکن نہیں۔ اس کے باوجود بھی مجھے حتمی یقین ہے کہ وہ بینک کے حدود اربع سے واقفیت رکھتے تھے۔ یقیناً قریبی کسی ٹاؤن کے رہائشی ہوں گے۔ تم وہاں

سے تفتیش کا آغاز کر سکتے ہو۔"

"بینک کے حدود اربع سے تم دونوں سے زیادہ بھلا کون واقف ہو سکتا ہے اور کیمروں کے آگے ڈراما رچانا کوئی مشکل کام نہیں۔ انہوں نے ایملی، وینڈی اور کارٹر کو بے ہوش کیا۔ لیکن تم دونوں کو نہیں کیا اس کی وجہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ مہربانی کر کے جب تک تفتیش مکمل نہیں ہوتی، ٹاؤن سے باہر جانے کی کوشش نہ کرنا۔" وہ کرسی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ بیلر کے منہ سے طویل سانس خارج ہوئی اور اس نے نارمن کو اپنے کمرے میں جانے کے لیے کہا۔

ایملی، وینڈی اور کارٹر کو ہوش آچکا تھا لیکن ان کے اوسان ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے اس لیے سر تھامے اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں گارڈز اور ہلاک ہونے والے نقاب پوشوں کی لاشوں کو بینک کے سامنے سے ہٹایا جا رہا تھا۔ بیلر نے فون کر کے بینک کے ڈائریکٹرز کو ڈکیتی کے متعلق بتایا۔ انہوں نے دوسرے دن تفتیشی ٹیم بھجوانے کی اطلاع دی اور بیلر نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ دونوں بیگ اس کی گاڑی کی ڈکی میں رکھے ہوئے تھے اور وہ جلد از جلد انہیں مناسب مقام پر منتقل کر دینا چاہتا تھا۔ دوپہر کا کھانا اس نے نہایت بے دلی کے ساتھ کھایا۔ پولیس کا عملہ فنگر پرنٹ اور بینک میں نصب کیمروں پر بننے والی فلم کی کاپی لینے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ باقی کا دن رقم کو ٹھکانے لگانے کے متعلق سوچتے ہوئے گزر گیا۔

چھ بجے کے قریب بینک کو بند کرنے کے بعد اس نے اپنی گاڑی کا رخ کیا اور پارکنگ سے نکلنے کے بعد اسے فستا روڈ پر لے آیا۔ وہ رقم کو اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ خبطی شیرف اس کے گھر کی تلاشی بھی لے سکتا تھا۔ اس کی گاڑی فستا روڈ پر سست روی سے سفر کرنے لگی۔ وہ رقم کو ٹھکانے لگانے کے لیے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ لیکن سیدھے ہاتھ کی طرف ایک سو پینتیس ویسٹ کے پاس دو کمروں پر مشتمل ایک ویران اور اجڑا ہوا مکان دکھائی دے رہا تھا۔ بیلر نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی مکان کے قریب جا کر رک گئی۔ بینک کی طرف جاتے ہوئے اس کی نگاہ اکثر اوقات مکان پر پڑتی تھی اور وہ ہمیشہ دل میں تہیہ کرتا تھا کہ مکان کے مالک سے بات چیت کرنے کے بعد مکان کو کرائے پر حاصل کرے گا۔ بینک کے نزدیک ہونے کی وجہ سے وہ اس کی رہائش کے لیے موزوں تھا۔ تاہم اس کی خستہ حالی کو دیکھتے ہوئے اس نے اب تک عملی قدم اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ گاڑی سے اتر کر مکان کی چار دیواری کے قریب آگیا۔ گیٹ پر زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس نے اردگرد دیکھتے ہوئے چھلانگ لگائی اور دیوار پر چڑھ کر اندر کا جائزہ لینے لگا۔ دیوار کے آگے اجڑا ہوا لان تھا۔ اس کے سامنے برآمدہ بنا تھا۔ برآمدے کی چھت پر لوہے کی ٹنکی رکھی ہوئی تھی۔ بیلر نے گاڑی کی ڈکی میں سے دونوں بیگوں کو باہر نکالا اور دیوار پر چڑھ کر ٹنکی تک چلا آیا۔ اس نے ٹنکی کا ڈھکنا کھول کر اندر جھانکا۔ وہ خالی اور زنگ آلود تھی۔ یہ جگہ وقتی طور پر بیگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے موزوں تھی۔ اس نے بیگوں کو ٹنکی کے اندر پھینکا اور ڈھکنا بند کرنے کے بعد جیب میں سے چھوٹا سا تالا نکال کر لگا دیا پھر مطمئن انداز میں واپس گاڑی کی طرف آگیا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ سورج غروب ہونے کے بعد وہاں اِکّا دُکّا گاڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔

اگلے دن ہیڈ کوارٹر کے تفتیشی عملے پر مشتمل ٹیم بینک میں آگئی۔ انہوں نے چوری ہونے والی رقم کا تخمینہ لگایا۔ حفاظتی انتظامات میں تبدیلیوں کے مشوروں پر غور کیا اور کیمروں کی تعداد بڑھانے کی اجازت دے دی۔ پھر رخصت ہونے سے قبل بیلر کو بتایا کہ پولیس چوکی کے قیام کے احکامات صادر کر دیے گئے ہیں اور جلد ہی بینک کے قریب چوکی کا قیام عمل میں آجائے گا۔ اس شام گھر واپس جاتے ہوئے بیلر نے خالی مکان پر سرسری نگاہ دوڑائی اور تیز رفتاری کے ساتھ قریب سے گزر گیا۔ وہ اب کسی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔ تمام دن شیرف نے بینک کا رخ نہیں کیا تھا۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ وہ قریب کے کسی ٹاؤن میں فرار ہونے والے نقاب پوش کی تلاش میں سرگرداں ہوگا اور جیسے ہی وہاں سے فارغ ہوگا، دوبارہ بینک کا رخ کرے گا لیکن اب بیلر بینک کے ڈائریکٹرز سے صلاح مشورہ کرنے اور انہیں مزید حفاظتی انتظامات کی درخواست دینے کے بہانے کسی بھی وقت شہر جا سکتا تھا اس لیے رقم کو شہر منتقل کرنا اس کے لیے دشوار نہیں تھا۔

دوسری صبح بینک کی طرف جاتے ہوئے جب وہ مکان کے پاس سے گزرا تو اسے اپنے ہاتھوں کے طوطے اُڑتے محسوس ہوئے۔ مکان کا گیٹ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔

گیٹ کے قریب ایک ٹرک کھڑا تھا جس میں سے میز اور کرسیاں اتار کا مکان کے اندر منتقل کی جارہی تھیں۔ ٹرک کے قریب پولیس ڈپارٹمنٹ کی گاڑی سے پشت لگائے تھامس کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سڑک کی طرف تھا۔ بیلر کی گاڑی پر نظر پڑتے ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ بیلر اس کے ساتھ مغز ماری کرنے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن اس سے الجھنا بھی نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے گاڑی کو ایک سائڈ پر کر کے روک دیا اور اتر کر شیرف کی طرف چلا آیا۔ شیرف کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔ بیلر کے قریب آنے پر وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''اب ڈکیتی کی صورت میں ہمیں بینک تک پہنچنے کے لیے صرف تین منٹ درکار ہوں گے۔ کیونکہ پولیس چوکی کو اس خالی مکان میں منتقل کر دیا گیا ہے۔'' بیلر نے پریشان نگاہوں سے مکان کی طرف دیکھا۔ شیرف کہہ رہا تھا۔

''تم میرے ساتھ اندر چلو۔ میں تم سے کچھ بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔'' بیلر خوابیدہ انداز میں اس کے پیچھے چلتا ہوا مکان میں داخل ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا یہ عجیب اتفاق تھا کہ پولیس ڈپارٹمنٹ نے چوکی بنانے کے لیے جس مکان کا انتخاب کیا تھا، چوری ہونے والی رقم اسی مکان میں پوشیدہ تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ بینک کے اردگرد وہ واحد مکان تھا جو چوکی کے لیے مناسب تھا۔ مکان کے ایک کمرے کو خالی کر کے اسے آفس کی شکل دی جارہی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد شیرف میز کے پیچھے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیلر کو سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور فخریہ لہجے میں بولا۔

''ہمارا عملہ اس مستعدی پر یقیناً داد کا مستحق ہے۔ تمہارے بینک کے ڈائریکٹرز کی درخواست کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ہم نے ایک ہی دن میں پولیس چوکی کو بینک کے قریب منتقل کر دیا۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟'' بیلر کسی حد تک ذہنی جھٹکے سے باہر آچکا تھا اس لیے طنزیہ لہجے میں بولا

''میرے خیال میں داد کے مستحق تم اس وقت گردانے جاؤ گے جب بینک ڈکیتی میں ملوث افراد کو کیفرِ کردار تک پہنچا دو گے۔ ڈکیتی کے بعد پولیس چوکی کو بینک کے قریب منتقل کرنا کوئی تعریفی عمل نہیں ہے۔'' شیرف مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں نے ڈکیتی کے متعلق بات چیت کرنے کے لیے تمہیں چوکی پر بلایا ہے۔ ہماری اب تک کی تفتیش کے مطابق بینک سے فرار ہونے والا مجرم رقم کے ہمراہ فرار نہیں ہو پایا تھا۔ بیگ بینک میں ہی رہ گئے تھے۔'' بیلر تلخ لہجے میں بولا۔

''اگر بینک میں رہ گئے تھے تو پھر انہیں آسمان کھا گیا یا پھر زمین نگل گئی۔ برائے مہربانی قبل از وقت حتمی رائے قائم کرنے کی کوشش مت کرو۔'' شیرف اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تمہارے پیچھے چلنے والے دونوں نقاب پوشوں میں سے ایک مرنے سے بچ گیا ہے۔ گولیوں نے اس کے دل کو نقصان نہیں پہنچایا۔ تاہم اس کی حالت اب بھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اس کا بیان ریکارڈ کیا جاچکا ہے۔ جس کے مطابق فائرنگ کے بعد ان کا تیسرا ساتھی رقم لے کر فرار نہیں ہوسکا تھا لیکن بے ہوش ہوجانے کی وجہ سے ان تینوں بیگز کے متعلق وہ کچھ نہیں

جانتا۔'' بیلر اس کی بات کو درمیان میں کاٹتے ہوئے بولا۔

''ایک ایسے شخص کا بیان کتنی اہمیت رکھتا ہے جس کے جسم میں بیک وقت تین سے چار گولیاں پیوست ہوں اور وہ قریب المرگ ہو۔ مجھے اس کے بیان سے اختلاف ہے۔'' شیرف اس کی تنقید کو نظرانداز کرتے ہوئے بولتا رہا۔

''ہم نے بچ جانے والے نقاب پوش سے مزید معلومات حاصل کیں اور ان معلومات کی روشنی میں ان کے تیسرے ساتھی کو گرفتار کرلیا۔ ہمیں اس کے پاس سے رقم دستیاب نہیں ہوسکی۔ ہمارے استفسار پر اس نے بتایا کہ غیر متوقع فائرنگ کی بدولت عجلت کے عالم میں رقم بینک کے احاطے میں رہ گئی تھی۔ اسے بینک کے عملے میں سے کسی نے چھپایا ہے۔ اگر میں غلط نہیں تو نقاب پوش کے فرار کے بعد تم بیگز کے زیادہ قریب تھے اس لیے نارمن کی نگاہوں سے بچتے ہوئے انہیں بہ آسانی محفوظ مقام پر منتقل کرسکتے تھے۔ ہم تشدد کے ذریعے سچ اُگلوا سکتے ہیں لیکن اگر خود مان جاؤ تو بہتر ہوگا۔''

بیلر کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرے اور اس کی زبان گنگ ہوکر رہ گئی۔ شیرف کی بیان کردہ تفصیل میں کس حد تک سچائی تھی، وہ اس کے متعلق حتمی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا لیکن پولیس کا تشدد برداشت کرنا بہرحال اس کے اختیار سے باہر تھا۔ شیرف اس کی دماغی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بینک ڈکیتی کا سب معاملہ میرے اور تمہارے بیان کا مرہونِ منت ہے۔ اس معاملے کی پیش رفت کو باہمی تعاون کے ذریعے روکا جاسکتا ہے۔ اگر تم رقم میں حصے کے طور پر مجھے قبول کرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔'' بیلر نے چونکتے ہوئے شیرف کی طرف دیکھا پھر سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''اور ڈکیتی میں ملوث تیسرے نقاب پوش کے متعلق تم نے کیا سوچا ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق وہ گرفتار ہوچکا ہے۔'' شیرف ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہ جیسے گرفتار ہوا تھا۔ اسی طرح فرار بھی ہوسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تین بیگز میں سے ایک اس کے حوالے کردیا جائے تو وہ باقی دونوں بیگوں کو یکسر فراموش کردے گا۔'' بیلر نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد کہا۔

''مجھے معلوم نہیں ہے کہ تمہارے بیان میں کس حد تک صداقت پائی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ گرفتار ہونے والا نقاب پوش ایک بیگ کے ہمراہ فرار ہوا تھا۔ باقی کے دونوں بیگ تمہاری اس نامکمل چوکی کی ٹینکی میں موجود ہیں۔'' شیرف کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرے اور وہ عجلت کے عالم میں بولا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے بیگوں کو ٹینکی میں ہی چھپایا تھا؟'' بیلر نے حیرت بھرے انداز میں سر کو اثبات میں ہلایا اور سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ رقم وہاں محفوظ ہے۔''

''اگر پانی میں بھیگنے سے بچ گئی ہو تو یقیناً محفوظ ہوگی۔ گزشتہ رات چوکی کو یہاں منتقل کرنے سے قبل ٹینکی کو پانی سے لبالب بھر دیا گیا تھا۔ اب تک اسے بھرے ہوئے دس گھنٹوں سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔'' اس نے عجلت کے عالم میں میز کے پاس کھڑے اپنے ماتحت کو حکم دیا کہ وہ ٹینکی سے دونوں بیگوں کو نکال کر لے آئے۔ بیلر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تالے کی چابی ماتحت کی طرف اچھال دی اور وہ چابی کو تھام کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں بیگ شیرف کی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ بیگوں کی خستہ حالت کو دیکھتے ہوئے شیرف نے مایوسانہ انداز میں سر کو نفی میں ہلایا۔ بیگز کی زپ کو کھول دیا۔ پانی کی وجہ سے تمام ڈالرز گھل کر رہ گئے تھے۔ ان کی حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے بینک کے ذریعے انہیں تبدیل کروانا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ پھٹ کر ٹکڑوں میں تبدیل ہوکر رہ گئے تھے۔ ڈالرز کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد اس نے تاسف بھری نگاہوں سے بیلر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں بینک ڈکیتی میں ملوث ہونے کے جرم سے بچا نہیں سکتا لیکن اگر میں فرار ہونے والے نقاب پوش کو گرفتار کرلوں تو میرے ترقی کے امکانات حتمی ہیں۔'' بیلر نے چونکتے ہوئے شیرف کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا وہ گرفتار نہیں ہوا۔''

''اس کی گرفتاری کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ یقیناً جلد از جلد گرفتار ہوجائے گا۔ اگر اس کے دونوں ساتھی مرنے سے بچ جاتے تو شاید اب تک گرفتار ہوچکا ہوتا لیکن وہ دونوں تو موقع پر ہی ہلاک ہوگئے تھے۔'' شیرف نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

بیلر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔ سر پیٹنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا۔

جب میں اور کومٹ جائے وقوعہ پر پہنچے تو وہاں پھٹے ہوئے کپڑوں، گوشت، خون اور ہڈیوں کے بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ لاش رات بھر گلی میں پڑی رہی تھی جسے چوہے اور کتے کھاتے رہے۔ یہ کوئی خوش گوار نظارہ نہیں تھا اور کومٹ جو ویسے بھی بہت نفاست پسند ہے۔ اسے الٹیاں آنے لگیں، وہاں کھڑے لوگوں نے جب اسے زرد پڑتے دیکھا تو قہقہے لگانے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہوتا اور لوگوں کو مزید ہنسنے کا موقع ملتا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ہولی کراس اسپتال جا کر ڈاکٹر سائمن کو لے آئے جو عام طور پر اس طرح کے کیسز دیکھتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اسے یہاں آنے پر اعتراض ہوگا کیونکہ وہ اپنی آپریشن ٹیبل چھوڑ کر بھاری بھرکم وجود کے ساتھ اتنی دور آنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ اسپتال میں ہی لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیا کرتا تھا۔ تاہم مرنے والے کا سماجی رتبہ اور اس علاقے کی بری ساکھ کو دیکھتے ہوئے میں نے مناسب سمجھا کہ ڈاکٹر کو یہیں بلا لیا جائے۔ میری بات سنتے ہی کومٹ کے چہرے پر رونق

بے بسی

عکسِ فاطمہ

اصل قاتل کی تلاش اور سزا کے مستحق کو اس کے انجام تک پہنچانا ہی انصاف ہوتا ہے۔ فی زمانہ ہر شعبے میں ایسے لوگ ہیں جو سامنے والے کے شاہانہ رکھ رکھاؤ سے متاثر ہو جاتے ہیں اور پھر خطاکار کو اپنے کیے کی سزا سے بچانے والے بڑی آسانی سے نکال کر لے جاتے ہیں... ایک ایسے ہی کیس کی سراغرسی... وہ امیر آدمی سرِ راہ قتل ہو چکا تھا...

قاتل و مقتول کے درمیان پائے جانے والے پراسرار معاملات......

آ گئی کیونکہ وہ مزید مذاق کا نشانہ بننے سے بچ گیا تھا اور اس نے اسپتال کی طرف دوڑ لگا دی۔

گوکہ لاش بہت بُری حالت میں تھی لیکن میں جانتا تھا کہ مرنے والے کے نام کی شناخت کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ جس شخص کے آدمیوں نے لاش دریافت کی اس نے رضا کارانہ طور پر سٹی پولیس کو بتا دیا کہ گوشت کا یہ ڈھیر مسٹر ارناؤ ڈی ولاسیکا کا ہے۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ اس علاقے میں سب لوگ انہیں جانتے تھے اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ٹوٹلا ایک ہی نظر میں انہیں پہچاننے میں کامیاب ہوگیا ورنہ اس خون آلود ڈھیر کو کوئی نام دینا آسان نہ تھا اور میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انیسویں صدی کے اختتام تک ہم اس خامی پر قابو نہ پا سکے۔ فارنسک سائنس ابھی ابتدائی مراحل میں ہے اور کسی بھی پولیس آفیسر کے پاس اپنے علم پر بھروسا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

میری بیوی ماریا نے کبھی میرے پولیس آفیسر ہونے پر فخر کا اظہار نہیں کیا حالانکہ میں ہر ہفتے جو تنخواہ لے کر آتا ہوں اس پر اسے کوئی گلہ نہیں۔ ایک لانس کارپورل کی آمدنی اتنی اچھی نہیں ہوتی لیکن اگر اس کا موازنہ اس معاوضے سے کیا جائے جو زیادہ تر ورکرز کماتے ہیں تو میری بیوی کوئی شکایت نہیں کر سکتی کیونکہ تنخواہ کے علاوہ میری اوپر کی آمدنی بھی اچھی خاصی ہے جب میں کسی معاملے میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو لوگوں کی طرف سے نقدی کے علاوہ مختلف تحائف بھی ملتے ہیں جن میں کسی جانور کی سالم ران، چاکلیٹ کا ڈبا اور قیمتی ملبوسات وغیرہ شامل ہیں۔ وہ چاہے کتنی ہی شکایت کرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک ملکہ کی طرح زندگی بسر کر رہی ہے اور اس کے توشہ خانہ میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔

یہ سچ ہے کہ بارسلونا میں پولیس والوں کی کوئی اچھی ساکھ نہیں ہے اور اسی وجہ سے ماریا کے دوستوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہم بارسلونا کے پورٹ ایریا میں رہتے ہیں اور مقامی آبادی کو وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب پولیس والوں نے کارکنوں پر اندھا دھند تشدد کیا تھا اور اس وجہ سے ہر کوئی ہمیں شک کی نظر سے دیکھتا ہے لیکن ہمیشہ ماریا سے یہی کہتا ہوں کہ ہم صرف احکامات کی تعمیل کرتے ہیں اگر مجھے لاٹھی چارج کے لیے کہا جائے گا تو میں لوگوں پر ڈنڈے برساؤں گا اور اگر کسی قتل کا کیس حل کرنے کے لیے کہا جائے گا تو میں اس کی تفتیش کروں گا۔ میرا صرف یہی کام ہے چاہے وہ اسے پسند کرے یا نہیں۔

پولیس کی درجہ بندی میں لانس کارپورل کا عہدہ کم و بیش سارجنٹ کے برابر ہوتا ہے۔ بارسلونا شہر میں اس عہدے کے صرف دو افسران ہیں اور یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ اتنے بڑے شہر میں امن وامان کی صورتِ حال سنبھالنے کے لیے صرف دو لانس کارپورل تعینات کیے گئے ہیں۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ چھوٹے شہروں اور دیہات میں جرائم کی شرح زیادہ ہونے کی وجہ سے وہاں توجہ دینے کی ضرورت ہے جبکہ بارسلونا میں ہماری موجودگی محض علامتی ہے اور یہاں جرائم تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جب ہم کسی معاملے میں گھپلا کرتے ہیں تو کارپورل ٹوریلو کو کہنا پڑتا ہے کہ اگر شہر میں سٹی پولیس، نیشنل پولیس اور سول گارڈز نہ ہوتے تو ہمیں جواب دینا مشکل ہو جاتا۔

میرا نام جورڈی پرونا ہے۔ عمر سینتیس سال اور 1874ء سے پولیس میں فرائض انجام دے رہا ہوں۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح میں نے بھی اس وقت یہ ملازمت اختیار کی جب الفانسو یاز دہم نے سیکیورٹی فورس بحال کی جسے آٹھ سال قبل جنرل پرم نے تحلیل کر دیا تھا۔ تیرہ سال کی ملازمت کے بعد میں اس فورس میں تجربہ کار سپاہی سمجھا جاتا ہوں جس کے بہت سے فائدے اور کچھ نقصانات بھی ہیں۔ ان میں سے چند فائدے میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ سخت مشکل مسائل ہمیشہ میرے حصے میں ہی آتے ہیں۔

مسٹر ارناؤ ڈی ولاسیکا کا قتل بھی ایک ایسا ہی کیس تھا جو شہ سرخیوں کی زینت بن سکتا تھا اور شاید اسی لیے نیشنل پولیس نے اس سے دور رہنے اور ہمارے سر تھوپنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے لاش کی حالت دیکھنے سے پہلے ہی کارپورل ٹوریلو کو متنبہ کر دیا تھا کہ اگر ہم نے ہوشیاری سے کام نہ لیا تو یہ کیس ہمارے گلے پڑ سکتا ہے۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کندھے اچکائے اور مجھے تفتیش کرنے کی ہدایت کی۔

''کومٹ کو اپنے ساتھ لے جانا۔'' اس نے کہا۔ ''اور خیال رہے کہ اس کا تعلق گریشیا سے ہے اور وہ ہماری طرح تہ سے کیچڑ نکالنے کا عادی نہیں ہے۔ اس لیے اسے ڈرانے میں جلدی نہ کرنا۔''

مسٹر ارناؤ ڈی ولاسیکا کا تعلق سیلف میڈ لوگوں کی تازہ ترین کھیپ سے تھا۔ انہوں نے دولت مند صنعت کاروں کی طرح ایک معزز خاتون سے شادی کی جس کی وجہ سے ان کے لیے بارسلونا کے طبقۂ اعلیٰ کے ڈرائنگ روم کے دروازے کھل گئے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس نے ناجائز

ذرائع سے دولت جمع کی تھی لیکن کسی نے اس بارے میں سوال نہیں کیا کیونکہ یہ ایک گستاخی ہوتی۔ اسی روز مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مرنے والا ڈسٹرکٹ ٹی وی کا مستقل گاہک تھا اور گزشتہ ایک سال سے ٹٹولا کی لڑکیوں کے پاس آرہا تھا۔ جب میں کومٹ اور ڈاکٹر کے آنے کا انتظار کررہا تھا تو میں نے یہ افواہ سنی کہ مسٹر ولاسیکا کی لاش رمبلا کے علاقے میں دائیں ہاتھ پر واقع ایک تنگ سڑک پر ملی۔ میں نے طوائفوں اور ان کے کرتا دھرتاؤں کو شور وغوغا کرتے دیکھا۔ انہوں نے اپنے بازو اوپر اٹھائے ہوئے تھے اور میں اس کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔

امیر اور باعزت لوگ جنہیں ان سڑکوں سے گزرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان سپلائر کو مکمل تحفظ حاصل ہے اور انہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ چور، شرابی، دکان دار، نوعمر لڑکیاں، نوسرباز اور دربان سب ہی اس لین دین سے واقف تھے جو سول گارڈ سٹی پولیس اور ہم ان دلالوں سے کیا کرتے۔ یہ کوئی خفیہ راز نہیں تھا۔ فی الوقت کسی بے رحم سرمایہ دار کے لیے اس علاقے سے زیادہ محفوظ جگہ نہیں تھی۔ انہیں چھیڑنے کا مطلب ٹٹولا اور اس ڈسٹرکٹ کے دوسرے دلالوں سے الجھنا تھا۔ بالفاظِ دیگر آپ کی زندگی داؤ پر لگ سکتی تھی۔

ہر علاقے کے اپنے غیر تحریر شدہ قوانین ہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ ڈسٹرکٹ ٹی وی میں رائج قوانین کی خلاف ورزی ممکن نہیں گوکہ اس سانحے کا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا لیکن میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ لاش کے گرد جمع ہونے والے راہ گیر اس پر متفق تھے کہ یہ قتل کا کیس ہے۔ لاش کی تیزی سے بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیونکر اس نتیجے پر پہنچے لیکن اگر ان کا خیال درست تھا تو اس احمق قاتل کو قانون کے ساتھ ساتھ ان دلالوں کا بھی سامنا کرنا ہوگا جس نے ان کے کاروبار کو نقصان پہنچایا۔ اگر ٹٹولا اور اس کے آدمی ہم سے پہلے اسے پکڑ لیتے تو ہمارے پاس مزید کارروائی کے لیے کچھ نہ بچتا۔

وہ وسط جولائی کی ایک گرم صبح تھی کیونکہ اپریل سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے گرمی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ماحول میں اتنی آلودگی تھی کہ اس فضا میں سانس لینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ماحول میں پھیلی ہوئی ناگوار بُو، گرمی اور حبس اور لاش سے اٹھنے والی بُو نے سانس لینا دشوار بنا دیا تھا۔

اس ناخوشگوار ماحول میں ڈاکٹر سائمن پسینے میں شرابور اپنی مخصوص مہک کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس نے آتے ہی کرخت لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا پرونا کہ مجھے احکامات دو گے؟''

اس نے مجھے پانچ منٹ میں بہت کچھ کہہ دیا اور میں صبر و سکون کے ساتھ اس کی باتیں سنتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی مرنے والے کا نام لوں گا، اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا جب وہ اپنی طویل تقریر ختم کرچکا تو میں نے اسے بڑے ادب سے بتایا کہ مرنے والا معروف صنعت کار ارناؤڈی ولاسیکا تھا۔ اس نے پہلے تو ردِعمل کے طور پر شک کا اظہار کیا پھر بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ اس کا لہجہ یک لخت تبدیل ہوگیا اور وہ ہکلاتے ہوئے معذرت کرنے لگا۔ نہ صرف یہ کہ وہ مسٹر ولاسیکا کے مقام سے واقف تھا بلکہ اسے ذاتی طور پر بھی جانتا تھا۔

''اس کے معالج ڈاکٹر کیلوبوگ نے ایک سال قبل اس سے میرا تعارف کروایا تھا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر ولاسیکا کا ایک سولہ سالہ لڑکا تھا جو ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنا چاہ رہا تھا اور باپ اس کے لیے ایک سرپرست اور مشیر کی تلاش میں تھا۔'' اس نے اپنے چہرے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا کہ وہ اور ولاسیکا دونوں ہی ویگنر نامی موسیقار کو پسند کرتے تھے جو اوپیرا ہاؤس میں بہت مقبول ہے اور اس مطابقت کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ دورانِ گفتگو ڈاکٹر اس پر رضامند ہوگیا کہ جب اس کے بیٹے کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے گا تو وہ اس پر خصوصی توجہ دے گا اور اسے ایک ممتاز ڈاکٹر بنائے گا۔ اس کے عوض مسٹر ولاسیکا نے اس کے اسپتال کے لیے ایک معقول عطیہ دینے کا وعدہ کیا۔

''اس لاش میں شاید ہی کچھ باقی بچا ہو۔'' اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اس کو اسپتال لے جانا ہوگا۔''

اس نے فوجی انداز میں اپنے ساتھ آئے ہوئے دونوں وارڈ بوائز کو حکم دیا کہ وہ لاش کو گاڑی میں رکھ دیں۔ اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ لاش کی خستہ حالت کو دیکھتے ہوئے وہ صرف یہی تصدیق کرسکتا ہے کہ وہ مرچکا ہے۔''

''میں جانتا ہوں کہ یہ اتنا آسان نہ ہوگا۔'' میں نے

اپنی آواز نیچی کرتے ہوئے کہا تاکہ اردگرد کھڑے ہوئے لوگ نہ سن سکیں۔ ”لیکن اگر تم یہ تصدیق کرسکو کہ یہ لاش مسٹر ولاسیکا ہی کی ہے تو ہماری تسلی ہو جائے گی گو کہ کئی لوگ اسے شناخت کرچکے ہیں لیکن تمہاری رپورٹ حتمی ہوگی۔“

ڈاکٹر نے مذاق اُڑانے کے انداز میں مجھے دیکھا جیسے میری درخواست نے اسے خفا کردیا ہو لیکن میں نے اسے نظر انداز کردیا اور کوئی تفصیل نہیں بتائی۔ میں جانتا تھا کہ ٹٹولا اور اس کے آدمیوں کی جانب سے دی جانے والی شہادت کو سرکاری رپورٹ کا حصہ بنانا ٹھیک نہ ہوگا اور بہتر ہوگا کہ اس بارے میں ماہرانہ رائے حاصل کی جائے تاکہ متوفی کے گھر والوں کو مطمئن کیا جاسکے۔

”ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر نے اس خون آلود ڈھیر کا معائنہ کرنے کے بعد ایک سرد آہ بھری اور کہا۔ ”اس کا چہرہ جانور کھاچکے ہیں اور میرے لیے یہ تصدیق کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ وہی ہے لیکن لگتا یہی ہے کہ یہ کوئی معزز شخص ہے۔ تاہم میں اس کے معالج سے بات کروں گا جو اس کی کسی ایسی امتیازی خصوصیت کی نشاندہی کرسکے جس کی بدولت ہم اس کی شناخت کرسکیں۔ اس کی موت کیسے ہوئی۔ اس بارے میں زیادہ توقعات مت کرنا کیونکہ تم خود دیکھ سکتے ہو کہ کتوں اور چوہوں نے لاش کا کیا حشر کیا ہے۔ عملاً انہوں نے اس کے دل، پھیپھڑوں، جگر اور آنتوں کا کوئی حصہ باقی نہیں چھوڑا۔ اگر مثال کے طور پر چاقو گھونپا گیا ہے اور اس نے ہڈی کو نہیں چھوا تو میں موت کی وجہ کا تعین نہیں کرسکوں گا۔“

اس نے ایک بار پھر اپنا پسینا صاف کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”لگتا ہے کہ اس علاقے میں صرف انسان ہی بھوکے نہیں مر رہے بلکہ......“

”شاید اس کی موت کا سبب قدرتی ہو۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اس کی عمر کافی زیادہ تھی۔“

”تقریباً میری ہی عمر کا تھا یا کچھ زیادہ ہوگا۔“

ڈاکٹر کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی اور اس ملک میں اوسط عمر اڑتالیس سال تصور کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ولاسیکا کا شمار عمر رسیدہ افراد میں ہوتا تھا۔ اچھی خبر یہ ہوتی اگر ڈاکٹر یہ بتاتا کہ ولاسیکا طبعی موت مرا ہے۔ اس طرح ہم ایک معزز آدمی کی نجی زندگی میں جھانکنے سے بچ جاتے اور اس کے گھر والوں کو بھی وضاحتیں نہ دینا پڑتیں۔“

”وہ جانور خون کی بُو سونگھ کر ہی لاش کو کھانے آئے ہوں گے۔“ ڈاکٹر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال میں بھی کہہ سکتا ہوں۔“

”میں اس معاملے کی تفتیش کروں گا۔“ میں نے مثبت ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”تم جو کرسکتے ہو، وہ ضرور کرو۔“

ڈاکٹر سائمن اور اس کے مددگار بچی کھچی لاش کو لے گئے تو میں نے کیس کا تانا بانا بُننے اور اس کی تحقیقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کومٹ کو اپنے ساتھ رہنے کے لیے کہا حالانکہ ابھی تک اس کے چہرے کی شادابی بحال نہیں ہوئی تھی اور وہ پریشان تھا۔ اگر وہ پولیس والا بننا چاہتا ہے تو اسے اپنے کام کے بارے میں سیکھنا ہوگا اور یہ صرف کتابیں پڑھنے سے نہیں بلکہ مشتبہ افراد سے تفتیش اور گلیوں میں گشت کرکے ہی آئے گا۔ ٹٹولا اور اس کے غنڈوں نے اپنے مخبر چھوڑ دیے تھے جو علاقے میں سراغ تلاش کرتے پھر رہے تھے اور یہ ہمارے لیے ایک اچھی علامت تھی کیونکہ اس طرح ہمارے کام کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔

”ابھی تک یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قتل کی واردات ہے۔“ میں نے انتہائی محتاط انداز میں ٹٹولا سے کہا۔ ”ممکن ہے کہ اس کی موت طبعی ہو۔ اس لیے فوری طور پر کوئی نتیجہ نہیں اخذ کرو۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے کہ ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔“

”جی جناب جو تم کہو۔“ اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ میری بات سے متفق نہیں ہے۔

مجھے لگا کہ ٹٹولا کچھ بے چین ہے اور کوئی بات چھپا رہا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں نے اس پر دباؤ ڈالا یا دھمکی دی تو میری بھی خیر نہیں۔ بالآخر چند سیکنڈ ٹہلنے کے بعد اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک رومال نکالا۔ ”ذرا اس پر ایک نظر ڈالو۔“ اس نے سرگوشی میں کہا اور رومال کھول دیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک چھ ملی میٹر کا فلوبرٹ پستول لیے ہوئے کھڑا تھا جو عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ اسے عملاً ایک بے ضرور ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی دس سینٹی میٹر سے زیادہ نہیں ہوتی اور یہ بہ آسانی ہینڈ بیگ میں آجاتا ہے یا اسے موزوں میں بھی چھپایا جاسکتا ہے۔

میں نے اس کی نال سونگھی۔ اس میں سے ابھی تک بارود کی بُو آرہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے حال ہی میں استعمال کیا گیا تھا۔ ”پیوکس کو یہ گزشتہ شب لاش کے پاس سے ملا تھا۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کرہی لیا۔ ”اس بے وقوف نے اسے اپنے پاس رکھا اور ہمیں کچھ

نہیں بتایا۔‘‘

’’اوہ، اب یہ معاملہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔‘‘

مجھے یاد آگیا کہ پیٹوکس کون ہے۔ وہ ایک مقامی جیب کترا تھا جسے پولیس کئی بار پکڑ چکی تھی۔ وہ پندرہ سال کی عمر سے ہی چھوٹے موٹے جرائم کرنے لگا تھا۔

’’تمہیں یقین ہے کہ اسے یہ لاش کے پاس سے ہی ملا تھا؟‘‘ میں نے پستول ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

’’جی جناب، اور اس کا کہنا ہے کہ جب اس نے یہ پستول اٹھایا۔ اس وقت تک وہاں چوہے نہیں آئے تھے۔‘‘

’’ممکن ہے کہ وہ اس وقت بھی زندہ ہو۔ اتنے چھوٹے پستول سے کسی کو مارنا بہت مشکل ہے۔‘‘

’’بے وقوف۔‘‘ ٹٹولا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ’’وہ اتنا پریشان ہے کہ رات بھر نہیں سو سکا۔‘‘

’’ہم یہ کیسے معلوم کریں کہ اُسے یہ ہتھیار کب ملا؟‘‘ میں نے ٹٹولا کے خدشات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ’’یہ میں نے اس سے نہیں پوچھا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ تم اسے بلاؤ، میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تم آرام سے بیٹھو۔ میں اسے بلاتا ہوں۔ تب تک ہم بار میں چل کر ایک ایک گلاس وائن پیتے ہیں۔‘‘

میں ہچکچاتے ہوئے تیار ہوگیا اور پستول اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے آدمیوں کے جاتے ہی ہم تینوں ایمپائر بار کی طرف چل دیے جہاں دوسری جگہوں کے مقابلے میں عمدہ شراب مہیا کی جاتی تھی۔ جب ہم مشروب سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو میری نظر اتفاقیہ طور پر پستول پر گئی۔ اس کے دستے پر ایم وی کے حروف کندہ تھے۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

’’اگر فوری طور پر یہ مان لیا جائے کہ وی سے مراد ولاسیکا ہے تب بھی ایم کا کیا مطلب ہے؟‘‘ میری بات سن کر کومٹ نے تائید میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد پیٹوکس بھی ٹٹولا کے آدمیوں کے ساتھ آگیا۔ اس کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ قمیص پر خون کے دھبے اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی حالت پر توجہ نہ دی ہو۔

’’تمہیں یہ پستول کب اور کہاں سے ملا؟‘‘ میں نے اس سے پوچھا۔

گو کہ وہ گھبرایا ہوا تھا لیکن اس نے مجھے فوراً پہچان لیا اور ملتجیانہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا گو کہ وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے آنسو نہ نکلنے پائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پولیس والوں سے خوف زدہ تھا لیکن اس سے زیادہ اس پر ٹٹولا اور اس کے ساتھیوں کی دہشت سوار تھی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے میرے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی۔

’’میں...... میں...... یقین......‘‘

’’یاد کرنے کی کوشش کرو۔‘‘

’’میں...... میں...... نے کچھ نہیں کیا۔‘‘

میں نے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے گہری سانس لی اور فیصلہ کیا کہ اس کے ساتھ چھوٹے بچوں جیسا برتاؤ کرنا چاہیے پھر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا کہ جب اسے یہ پستول ملا تو وہ کہاں سے آرہا تھا اور کہاں جارہا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان لاش کے پاس سے گزرا تھا۔ صحیح وقت معلوم کرنا بہت مشکل تھا لیکن یہ پتا چل گیا کہ متوفی کو رات شروع ہونے کے بعد کسی وقت قتل کیا گیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ لڑکے کو وہ پستول لاش سے ایک میٹر کے فاصلے پر ملا تھا جس کا مطلب ہے کہ مرنے والے نے خودکشی نہیں کی، میرا شروع سے ہی یہ اندازہ تھا کیونکہ میں سوچ رہا تھا کہ ایک معزز اور دولت مند شخص جس کے گھر میں ہی ایک عالی شان دفتر ہو، خودکشی کے لیے ایک گندی اور بدبودار عقبی سڑک کا انتخاب نہیں کرسکتا۔

’’لیکن اگر اسے گولی ماری گئی تو کسی نے اس کی آواز کیوں نہیں سنی؟‘‘ کومٹ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

’’بہت خوب۔‘‘ میں نے بناوٹی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ’’ایک دن تم ضرور اچھے سراغ رساں بن جاؤ گے اگر الٹیاں کرنا چھوڑ دو۔‘‘

کومٹ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ شرمندگی سے مسکرانے لگا۔ اس لڑکے نے ایک اہم بات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس علاقے میں لوگ جلدی نہیں سوتے اور یہ بڑی عجیب بات تھی کہ کسی نے فائر کی آواز نہیں سنی۔ یہ ضرور ہے کہ ان دنوں شرپسندوں نے فساد برپا کیا ہوا تھا اور لوگ فائر کی آوازوں پر کم ہی توجہ دیتے تھے لیکن یہ عقبی سڑک ٹٹولا کی عمل داری میں بھی آتی تھی اور شرپسند کبھی بھی اس علاقے میں آکر اپنی گولیاں ضائع نہ کرتے۔ جہاں تک ٹٹولا اور اس کے ساتھیوں کا تعلق تھا تو وہ اپنی بات منوانے کے لیے

گھونسوں، لاٹھیوں اور چاقو کا استعمال کرتے تھے۔ انہیں اتنا چھوٹا پستول اپنے پاس رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے پھر تم کیا کہتے ہو؟'' میں نے ٹٹولا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی نے فائر کی آواز نہ سنی ہو؟''

''گزشتہ رات اس علاقے میں کافی ہنگامہ تھا۔'' اس نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم بھول گئے؟''

ٹٹولا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ چودہ جولائی کا دن تھا اور بڑی تعداد میں لوگوں نے وہ شام بھاگتے دوڑتے اور فائرنگ کرتے گزاری۔ وہ کسی انقلاب کی سوویں سالگرہ منا رہے تھے۔ میں تو شراب کے نشے میں گہری نیند سویا ہوا تھا لیکن میری بیوی اس شور شرابے کی وجہ سے رات بھر جاگتی رہی اور اس نے صبح ناشتے کی میز پر رات بھر ہونے والے ہنگامے کے بارے میں بتایا۔

کومٹ، گریسا میں رہتا تھا اور اس نے بھی فائرنگ کی آوازیں نہیں سنیں لیکن میں نے ٹٹولا کی وضاحت قبول کرلی کیونکہ میری بیوی اس کی تصدیق کرسکتی تھی۔ میں نے پیوکس کو جانے دیا جو ابھی تک کانپ رہا تھا اور ٹٹولا کو سمجھایا کہ وہ اس لڑکے کو تنگ نہ کرے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر وہ مجھ سے متفق نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے یقین دلایا کہ اگر اسے کوئی نئی بات معلوم ہوئی تو وہ مجھے ضرور بتائے گا۔

''چیف اس بار ہم دونوں ایک ہی کشتی میں تیر رہے ہیں۔'' اس نے جاتے جاتے کہا۔

''خیال رکھنا کہ دونوں ہی ایک ساتھ نہ ڈوب جائیں۔''

مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں کومٹ کو لے کر کھانا کھانے چلا گیا۔ میری عادت ہے کہ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کرتا ہوں۔ ابھی میں گھر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کومٹ بولا۔ ''سر کیوں نا ہم اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔''

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''کومٹ ہم نے غالباً واردات میں ہونے والا اسلحہ برآمد کرلیا ہے اور پیوکس کے بیان کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم قریب قریب موت کا وقت بھی معلوم کرچکے ہیں، کیا آج کے لیے اتنا کافی نہیں ہے؟''

''نہیں لیکن......''

''اب ہمیں تھوڑا سا غور وفکر کرنا ہوگا جیسا کہ سب اچھے سراغ رساں کرتے ہیں... اب اچھے بچوں کی طرح گھر جاؤ، اپنی محبوبہ کے ساتھ وقت گزارو یا جو تمہارا دل چاہے، وہ کرو۔ ہم کل صبح دوبارہ ملیں گے۔''

کومٹ اور میں اگلے روز صبح پولیس اسٹیشن ملنے پر متفق ہوگئے تاکہ کارپورل کو اب تک کی پیش رفت سے آگاہ کرسکیں۔ دوسرے دن میں پروگرام کے مطابق پولیس اسٹیشن گیا اور میں نے کارپورل کو پستول کے علاوہ پیوکس سے ہونے والی گفتگو سے بھی آگاہ کیا۔ اس کے سپاٹ چہرے پر کسی قسم کے تاثرات ظاہر نہ ہوئے اور کہا کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے وہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دیکھنا چاہے گا اور ہمیں پہلے اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔ اس کی بات سن کر میں اور کومٹ فوراً ہی ہولی کراس اسپتال روانہ ہوگئے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر سائمن اسپتال میں موجود تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس وقت وہ ایک آپریشن میں مصروف ہے اور ہمیں اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر کا دفتر انتہائی گرد آلود اور کسی بھوتوں کے مسکن سے کم نہ تھا۔ کمرے میں انتہائی کم روشنی تھی اور ہوا کے اخراج کا انتظام بھی مناسب نہیں تھا۔ ڈاکٹر کی میز پر کاغذات کا انبار لگا ہوا تھا اور ایش ٹرے سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ دیوار گیر الماریوں میں طب کی کتابیں اور مختلف قسم کے چھوٹے بڑے جار رکھے ہوئے تھے جن میں مختلف انسانی اعضا کو محفوظ کیا گیا تھا۔ ایک بار پھر کومٹ کا جی متلانے لگا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ اس طرف نہ دیکھے۔

''میں نے مسٹر ولاسیکا کے ڈاکٹر سے بات کی تھی۔'' ڈاکٹر سائمن نے کہا۔ ''یہ ولاسیکا ہی کی لاش ہے۔ ہم نے اسے اس کے تین سونے کے دانتوں سے پہچانا۔ اس کے علاوہ اس کا بٹوا، گھڑی اور شادی کی انگوٹھی جس پر اس کا نام کھدا ہوا ہے۔''

''مجھے اس طرف دھیان دینا چاہیے تھا۔'' میں اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

''یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ان میں سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ اس کے بٹوے میں ایک ہزار سے زیادہ کے نوٹ تھے اور اس کی گھڑی خالص سونے کی ہے۔''

''ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ اس علاقے میں آنے والا مستقل گاہک تھا اسی لیے کسی نے اسے چھونے کی جرأت نہیں کی۔''

''مجھے یہ بھی ملی ہے۔'' اس نے ایک چھوٹی سی گولی

دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس کی دائیں ران کی ہڈی میں پھنسی ہوئی تھی۔''

میں نے اس گولی کو قریب سے دیکھا۔ اس کی لمبائی چھ ملی میٹر تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ غالباً فلوبرٹ سے چلائی گئی تھی۔

''میں آتشیں ہتھیاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جس کسی نے بھی یہ گولی چلائی، اس کا نشانہ بہت اچھا تھا اگر یہ گولی ان کی ران کی ہڈی میں نہ لگتی تو اتنا زیادہ خون نہ بہتا اور وہ آج بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔ یہ رہی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور ان کی ذاتی اشیا۔'' اس نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا کام ختم ہوگیا۔ اب تم اس کی باقیات کو لے جاسکتے ہو لیکن اسے تابوت میں بند کر کے لے جانا اور گھر کے کسی فرد کو بھی باقی ماندہ لاش مت دیکھنے دینا۔ مجھے خود اسے دیکھتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور رپورٹ کے ساتھ ہی ولاسیکا کی ذاتی اشیاء بھی کومٹ کے حوالے کر دیں البتہ وہ گولی اپنی جیب میں رکھ لی۔ میری چھٹی حس نے باور کرایا کہ فی الوقت ڈاکٹر کو یہ بتانا مناسب نہ ہوگا کہ اس لڑکے پیوکس کو لاش کے پاس ایک پستول ملا تھا۔

''اگر اس کی ران کی ہڈی میں گولی لگی تھی تب بھی اتنی جلدی ڈھیروں خون کیسے بہہ گیا۔'' وہ مدد کے لیے کیوں نہیں بھاگا؟''

ڈاکٹر نے سگار دوبارہ سلگایا اور کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ وہ صدمے یا تکلیف کی وجہ سے بے ہوش ہوگیا ہوگا اور دوبارہ ہوش میں نہ آسکا۔ اس کے سر میں بھی ایک چوٹ کا نشان ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ زمین پر گرنے کی وجہ سے آیا ہوگا۔''

ڈاکٹر نے لمحہ بھر توقف کیا اور گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں۔''

''بولو ڈاکٹر۔''

''یہ بہت ہی خفیہ بات ہے۔''

''تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو ڈاکٹر۔''

''مسٹر ولاسیکا کو ایک جنسی بیماری تھی اور اس سے اس کی بیوی بھی متاثر ہو رہی تھی بلکہ اس کی حالت زیادہ خراب تھی۔''

''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس نے یہ بیماری اس میں منتقل کی؟''

''نہیں بالکل نہیں، مردوں اور عورتوں میں یہ بیماری مختلف طرح پھیلتی ہے۔'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''یہ بات میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ اس بیماری کا پتا چلنے سے پہلے ہی وہ اسے اپنی بیوی کو منتقل کر چکا تھا۔ مجھے اس بارے میں سو فیصد یقین تو نہیں ہے۔''

اس اطلاع نے کیس کو ایک نیا رخ دے دیا۔ ڈاکٹر نے ہمیں قتل کا محرک بتا دیا تھا۔

''کیا تمہیں اس کی بیوی کا نام معلوم ہے؟'' مجھے پستول کے دستے پر کندہ ایم وی کے حروف یاد آگئے تھے۔ ''میرا مطلب ہے کہ اس کا اصلی نام؟''

ڈاکٹر نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس کا نام مرینا ہے، لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں بس یونہی اس کا نام جاننا چاہ رہا تھا۔''

جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور کسی طوفان کی آمد تھی جس کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ سب لوگوں کی نگاہیں آسمان پر تھیں اور وہ تیز بارش کی توقع کر رہے تھے تاکہ گرمی کی شدت میں کمی کے ساتھ ساتھ ماحول کی کثافت بھی دور ہو جائے۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' کومٹ نے پوچھا۔

''اتنی جلدی کوئی نتیجہ نہیں اخذ کیا جاسکتا میرے بچے۔''

''لیکن پستول پر کھدے ہوئے وہ حروف...... ڈاکٹر نے سب کچھ وضاحت سے بتا دیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟''

''پہلے تم بتاؤ۔ تمہارے خیال میں کیا واقعہ ہوا ہوگا؟'' میں نے شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی انتقامی کارروائی ہے۔ مسٹر ولاسیکا کو یہ بیماری کسی طوائف سے ملی اور انہوں نے اسے اپنی بیوی کو منتقل کر دیا۔ پرسوں اس نے اپنی آنکھوں سے شوہر کو اس قحبہ خانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور انہیں قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''لیکن اس نے پرسوں کا انتخاب ہی کیوں کیا؟ اس میں کیا خاص بات تھی؟'' میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''انگوٹھی پر کندہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ پرسوں ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ ان کی شادی کو تیس برس ہو گئے ہیں۔''

مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ اس کا مشاہدہ غضب کا تھا۔

''کیا تم نہیں سمجھتے۔'' میں نے کسی عیار وکیل کی طرح جرح کرتے ہوئے کہا۔ ''کہ اس عورت کا نشانہ بہت اچھا ہے تبھی اس نے ران پر گولی چلائی؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ وہ تھوڑا سا اوپر گولی مارنا چاہ رہی تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ اس کا نشانہ خطا گیا۔'' اس لڑکے کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

''ٹھیک ہے، ہمیں پولیس اسٹیشن جا کر ٹوریلو سے بات کرنا ہوگی۔ فی الحال تم اس بارے میں کسی سے کچھ نہ کہنا جب تک کہ کارپورل سے بات نہ ہو جائے، سمجھ گئے۔''

''بالکل سمجھ گیا جناب۔''

کارپورل ٹوریلو اپنے دفتر میں بیٹھا کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا جب ہم نے اسے بتایا کہ اس کے لیے اچھی خبر ہے اور ہم نے عملاً اس کیس کو حل کر لیا ہے تو اس نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیے بغیر ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خاموشی سے ہماری بات سننے لگا۔

ہمارا خیال تھا کہ وہ ہمیں شاباش دے گا اور شاید ایک دن کی چھٹی بھی مل جائے کیونکہ ہم نے اتنی جلدی یہ کیس حل کر دیا تھا لیکن وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''کوشش بُری نہیں ہے۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا۔''

''لیکن جناب! میرے خیال میں یہ بہت واضح ہے۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔

اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا۔ ''مسٹر ولاسیکا اپنے پرانے دوست ڈاکٹر سائمن سے ملنے، ہولی کراس اسپتال جا رہے تھے کہ ایک شرابی نے ان کا راستہ روک لیا۔ وہ ان کا بٹوا چھیننا چاہ رہا تھا۔ مسٹر ولاسیکا نے مزاحمت کی تو اس نے انہیں گولی مار دی اور وہاں سے بھاگ گیا۔ یہ ہے اصل کہانی۔''

''شرابی کے پاس فلوبرٹ؟'' میں نے اعتراض کیا۔

''مجھے ہنسنے پر مجبور مت کرو کارپورل۔''

''مسٹر ولاسیکا کے پاس وہ پستول تھا۔'' اس نے تمسخرانہ انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جدوجہد کے دوران انہوں نے حادثاتی طور پر خود کو گولی مار لی۔ وہ ایک بہادر آدمی تھے اور انہوں نے لڑتے ہوئے جان دی۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہم اس شرابی کو کہاں تلاش کریں؟'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''ہم یہ کام پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اس کا نام ریمنڈ ہے اور اس کی لاش مردہ خانہ میں پڑی ہوئی ہے۔'' کارپورل نے کاغذات پر نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا دوسرے شرابیوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔''

''ریمنڈ؟ لیکن وہ تو ایک ہفتہ پہلے شراب خانہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ تم جانتے ہو کہ وہ بہت ہی بے ضرر شرابی ہے۔''

''بے ضرر ہے یا نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ وہی ہمارا مجرم تھا۔ اب تم ولاسیکا کے گھر جاؤ اور اس کی بیوی کو بتا دو کہ ہم نے اس کے شوہر کے قاتل کو پکڑ لیا ہے اور وہ لاش وصول کر کے تدفین کی تیاری شروع کر سکتی ہے۔ میں خود اس کے پاس جاتا لیکن سہ پہر میں میری ایک میٹنگ ہے۔''

اس نے دراز کھول کر پستول نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ''جب تم وہاں جاؤ تو یہ بھی اُسے واپس کر دینا۔''

گو کہ میں پوری طرح سمجھ چکا تھا کہ مسز ولاسیکا نے اپنے شوہر کو گولی کیوں ماری لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس کا الزام بے چارے ریمنڈ کے سر تھوپا جائے۔ میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں لیکن یہ سوچ کر مجھے غصہ آتا ہے کہ اس ملک میں امیر اور غریب کے لیے الگ الگ قانون ہے۔ میں ان نام نہاد انقلابیوں سے اتفاق نہیں کرتا اور سمجھتا ہوں کہ ہر جگہ امیر غریب اور نوکر مالک کی تفریق موجود ہے لیکن ان کی بات ایک حد تک صحیح ہے کہ ہمیشہ ریمنڈ یا بینوکس جیسے غریب ہی امیروں کے جرم کی سزا کیوں بھگتتے ہیں۔ اس شہر میں سیکڑوں امیر اور متوسط طبقے کے لوگ موجود ہیں جن پر کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ قتل کا محرک اور آلۂ قتل برآمد ہونے کے باوجود میں اصل مجرم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ مجھے اوپر والوں کی حمایت حاصل نہیں تھی اور نہ ہی جائے وقوعہ پر قاتل کی موجودگی کا کوئی ثبوت موجود تھا۔

کئی برس پہلے ولاسیکا نے گنجان آبادی والا علاقہ چھوڑ کر شہر کی پُرفضا مضافاتی آبادی میں رہائش اختیار کر لی تھی جو کسی عالیشان محل سے کم نہ تھی۔ ایک خادمہ نے دروازہ کھولا اور ہمیں سٹنگ روم میں بٹھاتے ہوئے بولی۔ ''مادام ابھی آ رہی ہیں۔''

ولاسیکا کی بیوہ نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ اس کے ہمراہ بڑی بیٹی بھی تھی۔ دونوں خواتین نے موقع کی مناسبت سے سیاہ ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ لیکن وہ کوئی معمولی کپڑا نہیں تھا۔ دونوں ماں بیٹی کا لباس بالکل نیا اور عمدہ سلک سے بنا ہوا تھا۔ جس میں موتی جڑے ہوئے تھے۔ ان کے انداز سے یوں لگا جیسے وہ سوگ کے بجائے خوشی منا رہی ہیں۔

ماں اور بیٹی میں سے کوئی بھی اس نقصان سے متاثر نظر نہیں آرہا تھا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے چہرے کی شادابی اور آنکھوں کی چمک بتارہی تھی کہ اسے اپنے باپ کی موت کا کوئی صدمہ نہیں ہے۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے کومٹ کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ پہلی ہی نظر میں اسے بھا گیا ہو۔ اس کے برعکس ماں کے چہرے کے نقوش اس کی بیماری کو ظاہر کررہے تھے جس کی جانب ڈاکٹر سائمن پہلے ہی اشارہ کرچکا تھا۔

ہماری گفتگو غیر معمولی طور پر مختصر رہی۔ ماں بیٹی سے تعزیت کرنے اور ایک گلاس مشروب پینے کے بعد میں نے انہیں وہ سب کچھ بتادیا جو کارپورل ٹوریلو کے ذہن کی اختراع تھی۔ اس کے علاوہ اس کے شوہر کی چیزیں اور پستول بھی کوئی تبصرہ کیے بغیر واپس کردیا۔ اس کے جواب میں اس نے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ سرد مہری سے میرا شکریہ ادا کرکے طویل راہداری میں غائب ہوگئی۔

بیٹی نے ماں کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئی۔ لابی میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ کومٹ کے بہت قریب ہوگئی تھی اور اس نے بڑے بے ڈھب انداز میں اسے پیار سے چھوتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں میری ضرورت ہو تو تمہیں معلوم ہے کہ میں کہاں مل سکتی ہوں۔'' وہ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں یہاں ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔''

یہ سن کر کومٹ کا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہوگیا اور مجھے بھی پسینے آنے لگے۔

جب ہم باہر آئے تو بارش شروع ہوچکی تھی اور سڑکوں کے کنارے کھڑے لوگ موسم کی تبدیلی سے لطف اندوز ہورہے تھے لیکن بدقسمتی سے ہم پر اس تبدیلی کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ ہم ذہنی طور پر الجھے ہوئے تھے۔ ہم نے راستے میں ایک جگہ رک کر کافی پی۔ تھوڑی دیر بعد بارش رک گئی تو ہم واپس پولیس اسٹیشن کی جانب چل دیے۔

''کیا تم بھی میری طرح یہی سمجھتے ہو کہ مسٹر ٹوریلو کی رپورٹ یہ نہیں بتاتی کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا۔ کیا تمہیں یہ فکر نہیں کہ مسٹر ولاسیکا کا قاتل نہ پکڑا جائے اور ایک بے چارے شرابی پر قتل کا الزام ڈال دیا جائے۔''

''تم جانتے ہو۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں صرف ایک پولیس والا ہوں۔ انصاف کرنا میرا کام نہیں۔''

مجھے اس سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ میں نے جل کر کہا۔ ''کیا تم اس کی وضاحت کروگے؟''

''مجھے معما حل کرنا اور ٹکڑوں کو ان کی جگہ پر رکھنا پسند ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''باقی کام عدالت کا ہے۔ یاد رکھو کہ ہر ایک کا الگ الگ کام ہے اور ہمیں اسی سے غرض رکھنا چاہیے۔''

میں سمجھ گیا کہ ولاسیکا کی لڑکی میریسا کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ میں نے اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے کہا۔ ''لیکن ابھی ایک بات واضح نہیں ہوئی۔ اگر تم اس پر غور کرو تو ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ماں اور بیٹی میں سے کس نے گولی چلائی۔ کیونکہ دونوں کا نام ایم سے ہی شروع ہوتا ہے اور بظاہر اس کی ماں ایک بیمار عورت ہے کہ شاید بیٹی اپنے باپ کو اس بات کی سزا دینا چاہتی ہو کہ اس نے بیوی کو بیماری کا تحفہ کیوں دیا؟''

''اوہ نہیں جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ گولی ماں ہی نے چلائی ہوگی۔''

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''کیونکہ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اسے سامنے سے گولی ماری گئی اور قاتل نے دایاں ہاتھ استعمال کیا جب کہ وہ لڑکی بائیں ہاتھ سے کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اس پر غور کیا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور سب کچھ بھلادیا۔ میرا باس اور ماتحت دونوں ہی مفادات کے اسیر ہوچکے تھے۔ کارپورل ٹوریلو کو دولت مند بیوی نے خرید لیا تھا اور کومٹ کو بیٹی کے حسن نے گرویدہ بنالیا تھا۔ یہ میری بے بسی کی انتہا تھی کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اصل قاتل کو بے نقاب نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے یہ ماننا پڑا کہ پورے کیریئر کے دوران میں کومٹ جیسا عجیب انسان نہیں دیکھا۔

''آپ تصور نہیں کرسکتے جناب کہ آپ کے ساتھ کام کرکے مجھے کتنا فخر محسوس ہوتا ہے۔'' وہ اچانک بول اٹھا۔ ''گو کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو میری بہت سی عادتیں پسند نہیں لیکن پریشان نہ ہوں۔ میں اتنا عجیب نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔''

میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ یہ شخص کس طرح میرے خیالات پڑھ لیتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے لفظوں کے ضائع ہونے پر حیرت ہوئی۔ اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ وہ واقعی عجیب شخص تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ آئندہ اس کی موجودگی میں اپنے ذہن کو خالی رکھوں گا کیونکہ اس کے پاس دماغ پڑھنے کی صلاحیت ہے۔ خدا اس کی مدد کرے۔

انتقام

اعزاز سلیم وصلی

شعلے جب بھڑکتے ہیں تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی لپیٹ میں کون کون آئے گا... دشمنی اور انتقام کی آگ کے شعلے ایسے ہی بے رحم ہوتے ہیں... زندگی کے سہانے اور یادگار دنوں کو انتقام کی نذر کردینے والے منتقم مزاج کا منصوبہ۔

ماضی سے جڑے واقعے کی بازگشت۔ایک لرزش نے اسے مجرم بنادیا تھا......

''اے ابھی تک یہاں کیا کر رہی ہو؟'' چوبیس سال کے اس نوجوان نے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی چپ بیٹھی رہی۔ دوسری بار لڑکے نے چلا کر کہا۔لڑکی چپ رہی...... وہ دوسری سائڈ پر دیکھ رہی تھی۔ لڑکے نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا ہلایا۔لڑکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔رات کے وقت اس پارک میں کوئی موجود نہ تھا۔لڑکی نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''بیچاری...... گونگی اور بہری ہے۔''

لڑکے نے تاسف سے سوچا۔''اتنی خوبصورتی کس کام کی۔''

لڑکی سچ میں بہت خوبصورت تھی۔ لمبے بال، سفید رنگت اور چہرے پر پاکیزگی اور معصومیت تھی۔ بیس سال کی عمر میں اس کا حسن عروج پر تھا۔لڑکے نے پیار سے اس کے گال پر ہاتھ لگایا...... نرم گال کے لمس نے اس کے جسم میں سنسنی پیدا کر دی۔ آہستہ آہستہ اس نے لڑکی کے جسم کے

دوسرے حصوں کو چھونا شروع کر دیا۔

انسان کے بھیس میں اس درندے کی درندگی کا اندازہ لڑکی کو بہت دیر سے ہوا۔ اس نے منہ کھولنا چاہا مگر لڑکے نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا، وہ چلا نہ سکی۔

اگلے کچھ لمحے شیطانی تھے۔ اس لڑکے نے بے زبان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا۔ کچھ لمحوں بعد ہوس کی آگ ٹھنڈی پڑی تو وہ چونک کر لڑکی سے دور ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اپنا لباس درست کیا۔ لڑکی بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس نے اردگرد دیکھا...... کوئی دکھائی نہ دیا...... وہ بھاگ کر پارک سے باہر جانے لگا۔ راستے میں وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''یہ میں نے کیا کر دیا...... یہ میں نے کیا کر دیا......''

وہ نہیں جانتا تھا، دو آنکھوں نے اسے پارک سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔

☆☆☆

عارف حسین ملک کا مشہور صحافی تھا۔ ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کرنے کے بعد اس نے جب ایک پرائیویٹ چینل جوائن کیا تو ملک بھر میں اس کے بے باک انداز نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ حکومت کے خلاف سڑکوں پر پروگرام کرنے پر اس کی شہرت آسمانوں پر پہنچ گئی۔ اس کا شمار ملک کے بااثر ترین صحافیوں میں ہوتا تھا۔ مشہور چینل میں ٹاپ ریٹنگ پروگرام کرنے کے علاوہ کالم نگاری میں بھی اس نے اپنا نام پیدا کیا تھا۔ اس وقت ایک چینل پر پینتالیس سالہ عارف حسین کا انٹرویو ہو رہا تھا۔

''عارف صاحب اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟'' خوبصورت میزبان نے بڑے اسٹائل سے سوال پوچھا۔

''جی جی...... میں اپنے بارے میں کچھ نہیں چھپاتا...... میرے والد کی کریانہ کی ایک دکان تھی۔ ہمارا شمار لوئر مڈل کلاس میں ہوتا تھا...... میرے والدین نے بڑی ہی مشکلوں سے مجھے تعلیم دلوائی مگر افسوس وہ میرا اچھا وقت نہیں دیکھ سکے۔'' آخری بات کرتے ہوئے ان کے چہرے پر افسردگی اُمڈ آئی۔

سوالات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس وقت ان کے گھر میں بڑی ایل سی ڈی پر نظریں دوڑائے اس کی اکلوتی بیٹی فرحت اپنی ماں کے ساتھ بڑے شوق سے پروگرام دیکھ رہی تھی۔ اٹھارہ سال کی فرحت میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔ روپے پیسے کی فراوانی نے اس کے خوبصورت نقوش اور حسن کو چار چاند لگا رکھے تھے۔ فرحت کی ماں رفعت بیٹی کے ساتھ شوہر کے جوابات سن رہی تھی۔

''آپ نے پچھلے دنوں چودھری احسان بخش پر ایک کالم لکھا تھا...... کسی معذور لڑکی سے زیادتی کا کیس تھا جس کے بعد سنا ہے آپ کو کافی دھمکایا گیا...... اس کے بارے کچھ بتائیں گے؟''

میزبان کا سوال سن کر عارف حسین کے چہرے پر نفرت کا تاثر ابھرا۔ ''جی بالکل میں نے کالم لکھا تھا اور یہ ظلم کے خلاف جہاد ہے...... رہی بات دھمکیوں کی تو میں اب ان گیدڑ بھبکیوں سے نہیں ڈرتا۔'' عارف نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''سوالات کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا...... لیتے ہیں ایک چھوٹی سی بریک ہمارے ساتھ رہیے گا۔'' میزبان نے کیمرے کی طرف منہ کر کے کہا۔

☆☆☆

ٹھیک اسی وقت ٹی وی اسٹوڈیو سے دور ایک فلیٹ میں تیس سال سے زائد ایک شخص ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ عارف حسین کے آخری سوال کا جواب سن کر اس کے چہرے پر شدید نفرت اور غصہ اُمڈ آیا۔ ''کمینہ ذلیل...... تو جہاد کرے گا۔'' اس نے چلاتے ہوئے ٹی وی کو لات ماری۔ ٹی وی اسکرین ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئی...... اس پر جنون سوار تھا۔ اس نے زور زور سے ٹکڑوں کو ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ ساتھ ساتھ وہ چلا بھی رہا تھا۔

☆☆☆

عارف حسین اپنے اسسٹنٹ جہانزیب کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ جہانزیب کو عارف حسین کے ساتھ کام کرتے ہوئے چھ سال سے زیادہ ہو گئے تھے۔ عارف حسین، جہانزیب کو بہت پسند کرتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا جہانزیب اکثر ان کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ ''سر کیسا رہا انٹرویو؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''کیا یار وہی روایتی سوالات...... اب تو بور ہونے لگا ہوں ان انٹرویوز سے۔'' عارف نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سر وہ......''

''کیا وہ؟'' عارف حسین نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''سر چودھری احسان کا ایک کارندہ پھر کل یہ پیغام دے گیا ہے۔'' جہانزیب نے جیب سے کاغذ نکال کر اسے دیا۔ اس پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ ''کالم نگار

صاحب لگتا ہے چینل پر بولتے وقت زبان کچھ زیادہ چلتی ہے...... اور لکھتے وقت انگلیاں تو کاٹنے لگتی ہیں...... ہم زمیندار لوگ ہیں دوسروں کی بہنوں بیٹیوں کی عزت کرتے ہیں...... آپ کی بیٹی بھی ہماری بیٹیوں جیسی ہے ہم نہیں چاہتے کہ میٹرک کی اسٹوڈنٹ اسکول سے واپسی پر گھر نہ پہنچ سکے۔''

خط پڑھتے ہی عارف کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''اب یہ ذلیل انسان میری بیٹی کو لے کر مجھے دھمکیاں دے رہا ہے۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''سر آپ پولیس سے کیوں نہیں بات کرتے؟'' جہانزیب نے مشورہ دیا۔

''کی ہے بات پر یہ پاکستان ہے یہاں قانون کے رکھوالے چودھری جیسے بندوں کے پالتو ہوتے ہیں...... ایک ہی جواب ہے کہ یہ چودھری نہیں...... کسی اور شخص کی حرکت ہے۔'' عارف کے لہجے میں دکھ تھا۔

چودھری احسان ایک وزیر کا بھائی تھا۔ بدمعاش قسم کے ان سیاست دانوں سے کوئی الجھتا نہیں تھا۔

''جہانزیب، تم کل کسی سیکیورٹی ایجنسی سے بات کرو...... گھر اور باہر دونوں جگہ پر رفعت اور فرحت کے ساتھ گارڈز ہونے چاہئیں۔'' عارف نے اسے ہدایت کی۔

''ٹھیک ہے سر۔'' جہانزیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

مگر گارڈز لگانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دوسرے دن اسکول سے فرحت گھر نہیں آئی۔ ڈرائیور سے پہلے اسے کوئی لے گیا تھا۔

☆☆☆

فرحت کے اغوا کی رپورٹ علاقے کی سب سے بااثر فیملی کے رکن چودھری احسان کے خلاف درج ہوئی۔ ان سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے جانے والا انسپکٹر اسلم کا شمار پولیس کے بہترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ رشوت اور سفارش کے سخت خلاف انسپکٹر اسلم نے سخت لہجے میں پوچھ گچھ کی مگر چودھری احسان نے پُرسکون لہجے میں جوابات دیے۔ اس کے نام سے عارف حسین کو جو دھمکیاں دی گئی تھیں ان سے بھی اس نے صاف انکار کر دیا۔ ایک گھنٹے کی اس پوچھ گچھ کا اختتام ایک فون کال نے کیا جسے سنتے ہی انسپکٹر اسلم تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا تھا۔ فل اسپیڈ سے بھگا کر وہ کال پر بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچا تو ایک بری خبر اس کی منتظر تھی۔ اغوا ہونے والی فرحت کی تشدد زدہ لاش چودھری احسان کے فارم ہاؤس کے پاس سے ملی تھی۔

اس کو شدید تشدد اور زیادتی کا نشانہ بنائے جانے کے بعد بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ انسپکٹر اسلم اس کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ اسے پہچاننے میں اسے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ لاش کے پاس ہی ایک کاغذ پڑا تھا جس پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ ''منع کیا تھا ناں...... زیادہ بولتے لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے، امید ہے اب چپ رہو گے۔'' انسپکٹر اسلم نے وہ کاغذ اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ انسپکٹر اسلم کی اگلی کال پر احسان کو گرفتار کر لیا گیا۔ فرحت کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا کر انسپکٹر اسلم پولیس اسٹیشن آ گیا۔ چودھری احسان کو عام ملزم کے برعکس ایک کرسی پر بڑی عزت سے بٹھایا گیا تھا۔ انسپکٹر اسلم کی نگاہوں میں معصوم فرحت کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کرسی پہ بیٹھے احسان کو ایک زوردار لات جمائی۔ ''بول کیا قصور تھا اس بیچاری معصوم کا...... یہی کہ اس کے ایمان دار باپ نے تیرے خلاف لکھا تھا...... یہی کہ تو نے ایک لنگڑی لولی لڑکی کے ساتھ زیادتی کی تھی۔'' انسپکٹر اسلم بولنے کے ساتھ ساتھ اسے مار بھی رہا تھا۔ احسان اپنے ساتھ اس سلوک پر حیران تھا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک معمولی پولیس انسپکٹر اس کے ساتھ یہ سلوک کرے گا۔ انسپکٹر اسلم پر جنون سوار تھا۔ ایک کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر بڑی مشکل سے اسے قابو کیا۔

☆☆☆

فرحت کی دردناک موت کی خبر عارف حسین کے گھر پر بجلی بن کر گری۔ اکلوتی اولاد کی موت کے صدمے نے ماں کو اسپتال پہنچا دیا۔ گھر میں تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ عارف حسین غم سے نڈھال تھا۔ سب مہمانوں سے ملنے کے ساتھ ساتھ اسپتال کے چکر کاٹ کر جہانزیب کا تھکن سے برا حال تھا۔ پوری صحافی برادری احتجاج کر رہی تھی۔ مجرموں کو سخت سے سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔

یہ ایک ہفتے بعد کی بات ہے...... رفعت گھر واپس آ چکی تھی۔ اس شام رفعت، عارف اور جہانزیب مل کر بیٹھے تھے۔ رفعت بالکل چپ تھی...... جہانزیب نے پولیس کی تفتیش کے بارے میں بات شروع کر دی۔ ''چودھری احسان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں...... معذور لڑکی والے کیس کی طرح یہاں سے بھی بچ جائے گا۔''

''ہاں...... میں اب اس کے خلاف خود کھڑا ہوں

گا...... اس نے میری فرحت کو مارا ہے...... وہ بچ نہیں سکے گا۔'' عارف کی آنکھ میں آنسو تھے۔

''ہاں ہاں...... فرحت چلی گئی...... اب تم اور میں زندہ ہیں...... پہلے تمہاری ضد نے فرحت کی جان لی، اب میری یا تمہاری باری آئے گی۔'' رفعت...... تلخ لہجے میں بولتی ہوئی اندر چلی گئی۔

عارف حسین نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

''سر اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟'' جہانزیب نے پوچھا۔ عارف نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''فرحت کی موت کا غم مجھے بھی بہت زیادہ ہے...... قاتلوں کو میں بھی سزا دلوانا چاہتا ہوں...... اگر میں ثبوت اکٹھے کروں تو؟'' جہانزیب نے کہا۔

عارف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسی وقت ایک گاڑی میں انسپکٹر اسلم گھر میں داخل ہوا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے پاس آیا۔ رسمی کلمات کے بعد انسپکٹر اسلم نے انہیں تسلی دی۔ ''میں انشاء اللہ جلد قاتلوں تک پہنچ جاؤں گا۔ فرحت کی موت کا بہت دکھ ہے۔ ایک معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک کوئی ذہنی مریض ہی کر سکتا ہے۔''

عارف کے چہرے پہ نفرت کے تاثرات ابھرے۔

''وہ کمینہ ذہنی مریض ہی ہے...... پولیس کی کسٹڈی میں ہے مگر پھر بھی پولیس اس سے جرم نہیں اگلوا سکی۔''

''پولیس بھی مجبور ہے جناب...... ابھی تک ٹھوس ثبوت نہیں ملا اس کے خلاف۔'' انسپکٹر اسلم نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''ہماری پولیس مجبور ہی رہے گی۔ کیا یہ کم ثبوت ہے کہ چودھری احسان کے کارندے نے ہمیں دھمکیاں دی تھیں...... دھمکی والے خط لکھے گئے...... فون کالز ملیں...... فرحت کی لاش کے ساتھ بھی زبان بند رکھنے کا پیغام ملا...... بس پولیس مجبوری کا رونا روتی رہے گی اور سچ بولنے والے اسی طرح ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے۔'' جہانزیب جذباتی انداز میں بولا۔

''ابھی کچھ ہاتھ سے نہیں نکلا جہانزیب صاحب...... ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ ثبوت تلاش کر سکیں۔ دراصل میں آج پوچھنے یہ آیا تھا کہ فرحت کی موت کے بعد کوئی دھمکی یا پیغام تو نہیں ملا؟'' انسپکٹر اسلم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میری تو حالت ٹھیک نہیں تھی شاید جہانزیب کو پتا ہو؟'' عارف نے جہانزیب کی طرف دیکھا۔

''نہیں جناب...... جس دن فرحت اغوا ہوئی، اس دن کے بعد کچھ کوئی پیغام یا فون کال نہیں ملی۔''

''ہم۔ چلو میں ابھی چلتا ہوں کچھ اہم پیش رفت ہوئی تو ضرور بتاؤں گا...... آپ کو بھی اگر کچھ ثبوت ملے یا کسی قسم کا دباؤ ڈالا جائے تو رابطہ ضرور کریں۔'' انسپکٹر اسلم کھڑا ہوا۔ جہانزیب اور عارف سے ہاتھ ملا کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

''سر میں کوشش کرتا ہوں ثبوت تلاش کرنے کی...... میرے پاس ایک کلیو ہے۔'' انسپکٹر اسلم کے جانے کے بعد جہانزیب نے عارف سے کہا۔

''اگر کلیو ہے تو انسپکٹر اسلم کے ساتھ شیئر کیوں نہیں کیا۔'' عارف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''پہلے میں اپنے طور پر کوشش کرنا چاہتا ہوں۔'' جہانزیب نے مبہم انداز میں جواب دیا۔

''او کے بیسٹ آف لک...... مجھے فخر ہے جہانزیب تم پر...... تم نے ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا ہے۔'' عارف نے کہا۔ جہانزیب مسکرا دیا۔

☆☆☆

''سر میرے پاس ثبوت ہے...... فرحت کے اسکول کے گیٹ پر لگے سیکیورٹی کیمرے میں چودھری احسان اور اس کے کارندے کی واضح فوٹیج ہے۔ فرحت بھی ان کے ساتھ ہے، میں حیران ہوں سر پولیس کا اس طرف دھیان کیوں نہیں گیا۔'' ٹھیک ایک ہفتے بعد عارف کو جہانزیب کی کال موصول ہوئی وہ پُرجوش لہجے میں بول رہا تھا۔

عارف اچھل پڑا۔ ''کک کہاں ہو تم۔ ابھی لے آؤ وہ فوٹیج۔''

''نہیں سر...... میں فلیٹ سے نہیں نکل سکتا...... مجھے لگتا ہے چودھری احسان کے بندے میرا پیچھا کر رہے ہیں...... آپ میرے نئے فلیٹ پر آجائیں۔''

عارف اس کے پرانے ایڈریس سے واقف تھا۔

''ایڈریس دو نئے فلیٹ کا۔'' اس نے ایڈریس بتایا۔ رفعت نے عارف کے اشارے پر لکھ لیا۔ عارف تیزی سے باہر نکلا۔ کچھ دیر بعد اس کی گاڑی بجلی کی رفتار سے جہانزیب کے فلیٹ کی طرف دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

انسپکٹر اسلم پولیس اسٹیشن میں بیٹھا حالات پر غور کر رہا تھا۔ اسے نجانے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ معاملہ جتنا سیدھا نظر آتا ہے، اتنا ہے نہیں...... اس نے پاس پڑا ایک رجسٹر

اٹھایا۔ بے دھیانی میں وہ تمام لوگوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے اہم پوائنٹس رجسٹر میں لکھنے لگا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اس نے جلدی سے جیب میں ہاتھ مارا۔ اس کے ہاتھ میں فرحت کی لاش کے پاس پڑا ہوا کاغذ آیا۔ اس کے ذہن میں گھومنے والی الجھن کا حل اچانک سامنے آگیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر عارف کے نمبر پر کال ملائی۔ بیل جاتی رہی مگر عارف نے کال اٹینڈ نہ کی۔ اس نے جلدی سے عارف کے گھر کا نمبر ملایا۔ کال رفعت نے ریسیو کی۔

''ہیلو...... عارف صاحب کہاں ہیں میں انسپکٹر اسلم بول رہا ہوں۔''

''جی وہ کچھ دیر پہلے گھر سے نکل چکے ہیں۔'' رفعت نے جواب دیا۔

''کدھر گئے ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''جہانزیب نے بلایا ہے کسی اہم کام کے لیے۔''

انسپکٹر اسلم نے ایڈریس پوچھا تو رفعت نے ایڈریس اسے بتا دیا جو اس نے کچھ دیر پہلے ہی لکھا تھا۔ انسپکٹر اسلم تیزی سے باہر نکلا۔ کچھ دیر بعد اس کی کار جہانزیب کے فلیٹ کی طرف دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

عارف فلیٹ میں داخل ہوا تو اسے انجانا سا خوف محسوس ہوا۔ جہانزیب کے فلیٹ کی سیٹنگ عجیب طرح سے ہوئی تھی۔ چاروں طرف ایک لڑکی کی تصویریں لگی ہوئی تھی۔ ایک سائڈ پر ٹی وی کی ٹوٹی اسکرین کے ٹکڑے پڑے تھے۔ واش روم سے جہانزیب باہر آیا۔ ''آئیں سر...... آپ کا انتظار تھا۔''

عارف ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''یہ لڑکی کون ہے جہانزیب؟'' اس نے پوچھا۔ ''اتنی جلدی بھول گئے سر...... صرف اکیس سال تو ہوئے ہیں اس لڑکی کے قتل کو۔'' جہانزیب کے لہجے نے عارف کو چونکا دیا۔

''کک کیا مطلب؟'' اسے ڈر محسوس ہوا۔

''غور سے دیکھیں اس لڑکی کو جناب...... اور اپنے اس شاندار دماغ کو استعمال میں لائیں...... پہچانیں اس معصوم کو۔'' جہانزیب چلّایا۔

عارف نے ایک تصویر پر غور کیا۔ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا...... اس کا سر چکرایا...... پارک...... گونگی بہری لڑکی...... چوبیس سال کا عارف۔ ماضی کا وہ واقعہ جسے عارف بھلا چکا تھا...... ایک گناہ جس پر ماضی کی گرد پڑ چکی تھی۔

''شرمندگی''

''کل فینسی ڈریس پارٹی میں میری آنٹی کو کافی شرمندگی اٹھانا پڑی۔''

''ایک خاتون نے ان سے فرمائش کی کہ وہ اپنا ماسک اتار دیں۔''

''تو اس میں شرمندگی کی کیا بات تھی؟''

''وہ ماسک پہنے ہوئے ہی نہیں تھیں۔''

بجلی

ایک صاحب نے گھبراہٹ میں ڈاکٹر کو فون کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب میرے بچے کو کرنٹ لگ گیا ہے، میں کیا کروں؟''

''سب سے پہلے شکرانے کے دو نفل پڑھیں کہ آپ کے گھر بجلی آرہی ہے۔ میں گھپ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں۔''

''کک کون ہو تم...... کیسے جانتے ہو یہ سب؟'' اس نے جہانزیب کی طرف دیکھا۔

جہانزیب نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا پستول تھا۔ ''وقت کم ہے مختصر الفاظ میں بتاتا ہوں۔ یقیناً میرے بارے میں جاننا تمہاری آخری خواہش ہوگی۔''

☆☆☆

عرفان احمد کی بڑی بیٹی سعدیہ گونگی اور بہری تھی۔ اسے جتنی توجہ کی ضرورت تھی، اتنی صرف ایک ماں ہی دے سکتی ہے مگر جہانزیب کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی مدیحہ چل بسی۔ عرفان احمد کی مین مارکیٹ میں تین دکانیں تھیں۔ انہیں اپنے کام پر توجہ دینی پڑتی تھی۔ بچوں کے لیے ایک ملازمہ کا بندوبست کیا۔ جہانزیب کو بچپن سے ہی یہ کہا گیا تھا کہ اپنے سے پانچ سال بڑی بہن کو محبت دینی ہے...... اسے کبھی محرومی کا احساس نہیں ہونے دینا...... اسی لیے جہانزیب بہت چھوٹی عمر میں سعدیہ کی آواز بن گیا۔ اسے اپنی بڑی بہن سے بے تحاشا محبت تھی۔ سعدیہ بہت حسین تھی مگر اس محرومی نے اس کے حسن کو گہنا دیا تھا۔ جہانزیب صرف تیرہ سال کا تھا جب عرفان بھی ان کو تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ اس کے معصوم ذہن کی رگ رگ میں بہن کی محبت بسی تھی۔ اگلے دو سال وہ سعدیہ کا سایہ بنا رہا۔ خوش قسمتی سے ان کا کاروبار ایک ایماندار شخص کے ہاتھ میں تھا...... جو ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ خود غرض رشتے داروں نے بھی مڑ

کر نہیں دیکھا۔ دو سال اسی طرح بیت گئے۔ سعدیہ ہر شام گھر سے تھوڑی دور پارک میں جاتی تھی۔ جہانزیب اس کے ساتھ ہوتا تھا...... وہ دن جہانزیب کی زندگی کا سیاہ ترین دن تھا جب سعدیہ کو تنہا چھوڑ کر قریب ہی ایک دوست سے ملنے چلا گیا۔ ایک ہوس کے مارے درندے نے سعدیہ کو اپنا نشانہ بنا ڈالا۔ دو دن بعد ہی سعدیہ چل بسی۔ جہانزیب نے اس شخص کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھول ہی نہیں سکتا تھا اسے...... اس نے اپنی زندگی کا صرف ایک مقصد بنا لیا تھا...... انتقام...... اپنی معصوم بہن کا۔ اس نے بہن کی موت پر ایک آنسو بھی نہیں بہایا۔ اس نے سعدیہ کی میت سے وعدہ کیا تھا، وہ روئے گا نہیں بلکہ رلائے گا...... اکیس سال میں اسے بار بار موقع ملا...... وہ عارف کو قتل کر سکتا تھا مگر اس کے نزدیک یہ ایک بہت چھوٹی سزا تھی۔ اس نے پہلے عارف کا اعتماد جیتا۔ اس کا اسسٹنٹ بنا...... اس کے گھر میں جگہ بنائی۔ پھر چودھری احسان والے معاملے کے بعد اسے بدلہ لینے کا پورا موقع ملا اور اس نے عارف سے اس کی سب سے پیاری چیز چھین لی۔ اس کی پلاننگ پرفیکٹ تھی...... چودھری احسان کی طرف سے دی جانے والی ساری دھمکیاں جہانزیب کی تحریر شدہ تھیں مگر ابھی بدلہ باقی تھا۔ عارف ابھی زندہ تھا۔ قاتل ابھی زندہ تھا...... اسے مارنے کے بعد جہانزیب کی زخمی حالت میں دی گئی گواہی چودھری احسان کے خلاف ہوتی...... کوئی اس پر شک نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

جہانزیب کی کہانی ختم ہوتے ہی عارف نے اٹھ کر بھاگنا چاہا مگر جہانزیب اس سے غافل نہیں تھا۔ اس نے بجلی کی تیزی سے عارف کو پکڑا اور اس کے سر پر پستول سے وار کیا۔ کچھ دیر بعد عارف نیم بے ہوش کرسی پر بندھا پڑا تھا۔ اس کے منہ پر ٹیپ لگی ہوئی تھی۔ جہانزیب نے اس کے اردگرد پیٹرول چھڑکنا شروع کر دیا...... ابھی وہ پیٹرول چھڑک رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ عارف کے بے جان جسم میں بھی جان پڑ گئی۔ اس نے منہ سے آواز نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

''کون ہے؟'' جہانزیب نے بلند آواز میں پوچھا۔

''دروازہ کھولو جہانزیب...... میں انسپکٹر اسلم ہوں۔''

انسپکٹر اسلم کی آواز سنتے ہی جہانزیب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ''یہ یہاں کیسے؟'' وہ بڑبڑایا...... اس نے آگے بڑھ کر کی ہول سے جھانکنے کی کوشش کی۔ اسی لمحے انسپکٹر اسلم نے پوری قوت سے دروازے کو ٹکر ماری۔ لکڑی کا دروازہ انسپکٹر اسلم کا یہ وار برداشت کر گیا۔ انسپکٹر اسلم نے پیٹرول کی بو سونگھ لی تھی۔ اس نے دیوانہ وار دوسری کوشش کی...... ابھی وہ دروازے سے ٹکرانے ہی لگا تھا کہ جہانزیب نے اچانک دروازہ کھول دیا۔ انسپکٹر اسلم اپنی جھونک میں آگے نکل گیا۔

''حرکت مت کرنا اسلم...... گولی مار دوں گا۔''

جہانزیب چیخا۔ انسپکٹر اسلم ساکت ہو گیا۔ جہانزیب نے اپنی جیب سے لائٹر نکالا۔

ابھی وہ جلانے ہی لگا تھا کہ پیچھے سے ایک دھکا لگا۔ جہانزیب آگے جا گرا۔ انسپکٹر اسلم فلیٹ میں داخل ہونے سے پہلے پولیس پارٹی کو کال کر چکا تھا...... دو تین سپاہیوں نے جہانزیب کو گھیر لیا تھا...... وہ اسے بے بس کرنا چاہتے تھے کہ اچانک اس نے لائٹر جلا کر عارف کی طرف پھینکا۔ پیٹرول نے ایک سیکنڈ میں آگ پکڑ لی...... انسپکٹر اسلم اور سپاہی اچھل کر ایک طرف ہوئے۔ عارف کا جسم آگ میں جل رہا تھا۔ اس کے منہ سے بھیانک چیخیں نکل رہی تھیں۔ جہانزیب مسکرایا۔ اس کا بدلہ پورا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر اسلم جیل میں جہانزیب سے ملنے آیا تھا۔

''کیوں کیا تم نے یہ سب؟'' اس نے جہانزیب سے پوچھا۔

''میرا انتقام تھا۔'' اس کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ تھی۔ ''بتانا پسند کرو گے۔'' انسپکٹر اسلم نے پوچھا تو جہانزیب نے رک رک کر سب کتھا بتا دی۔

''میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں آخر آپ کو مجھ پر کیسے شک ہوا؟'' جہانزیب نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''جب میں عارف حسین کے گھر آیا تھا تب تم نے جذباتی انداز میں ایک جملہ ادا کیا تھا کہ فرحت کی لاش کے ساتھ ہمیں زبان بند رکھنے کا کہا گیا ہے۔ اس پیغام کے بارے میں میرے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ صرف وہ شخص جانتا تھا جس نے یہ دھمکی دی تھی۔ وہی لائن میرے ذہن میں آ گئی۔ اس سے پہلے بھی مجھے شک تھا۔ فرحت کے اغوا کے وقت کہیں سے پتا نہیں چلا تھا کہ اسے کوئی زبردستی لے گیا ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا۔ اصلی قاتل گھر میں ہے۔'' انسپکٹر اسلم کے چہرے پر افسردگی تھی۔ چودھری احسان رہا ہو چکا تھا۔ جہانزیب کے اندھے انتقام نے بہت کچھ لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اجنبی تحریر

جمال دستی

صلاحیت ایک سربستہ راز ہے... صلاحیت جب کسی انسان کو نوازتی ہے تو اس سے یہ نہیں پوچھتی کہ تم کس ملک اور کس علاقے کے رہنے والے ہو... اسے بھی یہ صلاحیت ورثے میں نہیں ملی تھی... اس نے اپنے اندر یہ صلاحیت خود پیدا کی تھی... خواہش اور کوشش کے باوجود وہ اپنے مقرر کردہ ہدف کو نہ چھو سکا...

قاتل کی نشاندہی کر دینے والی خاموش... نہ سمجھ میں آنے والی اجنبی تحریر کا معاملہ......

پٹرول مین ٹائرون پی فورڈ پہلا شخص تھا جس نے لاش کا معائنہ کیا جو پانی کی سطح سے پانچ انچ اوپر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس شخص کی موت کو چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں۔ وہ درمیانی عمر کا شخص تھا۔ اس نے عام قسم کے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کی کھوپڑی کے عقب میں ایک خوفناک زخم تھا۔ وہ خود گھسٹتا ہوا وہاں تک نہیں پہنچا،

غالباً اسے قتل کیا گیا تھا۔

"آفیسر پٹی فورڈ لائن پر ہے سارجنٹ۔" سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کی استقبالیہ کلرک نے سراغ رساں فرٹز ڈولنگر کو پیغام دیتے ہوئے کہا۔

پٹی فورڈ نے لاش کی ظاہری حالت بتاتے ہوئے کہا۔ "اس کے پاس سے کوئی شناختی کارڈ، چابیاں یا رقم نہیں ملی۔"

"لاش کس نے دیکھی تھی؟"

"دو بچوں نے...... وہ پُل پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

ہیڈ کوارٹر سے نکلنے سے پہلے ڈولنگر نے گمشدہ افراد کی رپورٹ دیکھی لیکن اسے کچھ نہیں ملا۔ جائے وقوعہ پر پہنچ کر اس نے مناسب سمجھا کہ پانی میں اترنے کے بجائے دور سے ہی لاش کو دیکھ لیا جائے تا کہ اس کا قیمتی چشمہ اور بہترین سوٹ خراب ہونے سے بچ جائے۔

پٹی فورڈ کی ارجنٹ کال پر شہادتیں جمع کرنے کے لیے سارجنٹ ڈیوڈ بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ جائے وقوعہ کے گرد زرد فیتہ باندھنے کے بعد ڈیوڈ تصویریں بنانے میں مصروف ہو گیا۔ یہ کام مکمل کرنے کے بعد اس نے کیمرا وین میں رکھا اور مرنے والے کی انگلیوں کے نشانات لینے کے لیے ایک پورٹیبل اسکینر لے کر واپس پل کے نیچے گیا۔

کافی دیر بعد سراغ رساں اسٹیمی نے لاش کو مردہ خانے لے جانے کا حکم دیا۔ ڈیوڈ جائے وقوعہ کے گرد زمین کا معائنہ کر رہا تھا تا کہ اسے ٹائروں یا کسی اور چیز کے نشانات نظر آ سکیں۔ میڈیا کے نمائندے اس وقت پہنچے جب مردہ خانے کا عملہ لاش کو ایک بڑے تھیلے میں ڈال چکا تھا۔ لاش خراب ہونے کے پیشِ نظر اس کا جلد از جلد پوسٹ مارٹم ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ اس موقع پر ڈولنگر اور اسٹیمی کی دوبارہ ملاقات ہوئی۔

لاش کو معائنے کی غرض سے تیار کرنے کے لیے مردہ خانے کے اٹینڈنٹ جولیس نے اس کے کپڑے اتار کر ایک اسٹینڈ پر ڈال دیے۔ پتلون کی جیب سے کچھ چیزیں برآمد ہوئیں جن میں دو عدد بیس ڈالر کے نوٹ، پنسل کا ایک دو انچ لمبا ٹکڑا اور ایک ہاتھی دانت کے رنگ کا پلاسٹک کا ٹکڑا جس پر پنسل سے تین لائنوں میں ایک مخفی تحریر لکھی ہوئی تھی۔

اسٹیمی نے وہ سلپ دونوں کناروں سے پکڑ کر ڈولنگر کو دکھائی اور بولا۔ "اگر میں یونانی زبان نہ جانتا تو یہی کہتا کہ یہ یونانی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیا تم اسے پڑھ سکتے ہو؟"

ڈولنگر انگریزی اور جرمن زبان سے واقف تھا۔ اس نے تحریر کو دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں۔"

اسی دوران فارنسک پیتھالوجسٹ ڈاکٹر ویلنطائن بھی وہاں آ گیا اور بولا۔ "میں ماہرِ لسانیات تو نہیں ہوں لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ پہلا لفظ عبرانی یا یہودی زبان کا ہے۔"

اس سے پہلے کہ ویلنطائن اپنا کام ختم کرتا، ڈولنگر نے اس لفظ کے معنی اپنے اسمارٹ فون پر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے اپنی ریسرچ ترک کر کے پوری توجہ پوسٹ مارٹم پر مرکوز کر دی۔

ویلنطائن نے اپنے معاون سے کہا کہ وہ لاش پر نظر آنے والے نشانات کو پانی سے نہ دھوئے کیونکہ یہ کیچڑ نہیں ہے۔ اسٹیمی نے پوچھا۔ "پھر یہ کیا ہے؟"

"سلائڈ دیکھے بغیر میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ویلنطائن بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ ایسے نشانات فریزر میں رکھے ہوئے گوشت پر ہوتے ہیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" ڈولنگر نے کہا۔ "وہ تین چار گھنٹوں سے زیادہ فریزر میں نہیں رہا ہوگا۔"

"ہمارے پاس کوئی فریزر نہیں ہے اور جس کمرے میں اسے رکھا گیا، اس کا درجۂ حرارت بیالیس درجہ فارن ہائٹ ہے۔ اس سے کم پر چھوٹے چھوٹے خلیوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر اس منجمد لاش کی چیر پھاڑ کرنا چاہوں تو اس کے لیے چھینی ہتھوڑے کی ضرورت پیش آئے گی۔"

"پھر یہ نشانات کیسے ہیں؟"

"اس سوال کا جواب تمہیں تلاش کرنا ہے لیکن میں تمہیں کچھ اشارے دے سکتا ہوں۔ یہ جسم میں پانی کی کمی سے ہوا ہے اور اسے بڑھنے میں کئی دن لگتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ لاش برف میں کئی دنوں تک پڑی رہی؟"

ویلنطائن نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کام میں لگا رہا۔ اس نے بڑی احتیاط سے خون کے نمونے، معدے کے اجزا اور دیگر بافتیں لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے محفوظ کر لیں۔ اس کے بعد لاش کو بیالیس درجہ فارن ہائٹ پر شناخت کا عمل مکمل ہونے تک رکھ دیا جاتا ہے۔ تاہم اس کے قد، وزن، عمر، ٹاٹوز اور دیگر نشانات کے بارے میں تفصیلات جمع کر لی گئیں جنہیں مقامی اخبارات اور میڈیا کے ذریعے

لوگوں تک پہنچایا جاتا۔

گوکہ ویلنٹائن نے خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ ایک حادثاتی موت ہوسکتی ہے۔ لیکن مرنے والے نے اپنی جیبیں خود خالی نہیں کی ہوں گی اور نہ ہی وہ خود گھسٹتا ہوا اس جگہ تک آیا ہوگا جہاں سے اس کی لاش ملی تھی۔ جب تک لاش کی شناخت نہ ہوجاتی، ڈولنگر کی تحقیقات محض دو نکات تک محدود تھیں۔ اول متوفی کی جیب سے برآمد ہونے والی سلپ پر اجنبی تحریر اور دوسرے، ویلنٹائن کا ابتدائی نظریہ کہ لاش کئی دن تک فریزر میں رکھی رہی۔ اس نظریے کی روشنی میں گھریلو ڈیپ فریزر کے علاوہ کسی ایسے تجارتی فریزر کا استعمال بھی ممکن تھا جس میں مچھلی، گوشت اور دیگر اشیا رکھی جاتی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہوگیا تھا کہ گزشتہ کئی ہفتوں کے دوران میں لاپتا ہونے والے افراد کی رپورٹوں کا ایک بار پھر جائزہ لیا جائے۔

ہیڈ کوارٹر واپس آتے ہوئے ڈولنگر نے مرنے والے کے کپڑے مرکز شہر میں واقع فارنسک لیبارٹری میں معائنے کے لیے دے دیے۔ منگل کے روز ڈولنگر کو ڈیوڈ کی جانب سے جائے وقوعہ کے بارے میں تفصیلی رپورٹ مع تصاویر موصول ہوگئی۔ اسے جائے وقوعہ سے پچاس فٹ کے دائرے میں کسی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات نہیں ملے۔

ڈاکٹر ویلنٹائن نے بدھ کے روز پوسٹ مارٹم کی جو تفصیلی رپورٹ جاری کی، اس میں بھی کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ اس رپورٹ سے کھال کے نمونوں میں برف کے ذرات کی تصدیق ہوگئی۔ دوسری رپورٹ میں بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے تحقیقات میں مدد مل سکتی۔

ڈولنگر کو ابھی تک اپنے باس سراغ رساں لیفٹیننٹ اوبرن سے اس کیس پر گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا تھا گوکہ دونوں کا دفتر ایک ہی تھا لیکن اوبرن میٹنگز اور عدالتوں کے چکر لگانے کی وجہ سے اکثر دفتر سے غیر حاضر رہتا۔ وہ بدھ کی صبح تاخیر سے دفتر آیا تاہم کھانے کے وقفے میں اسے اوبرن سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔

”تم نے کتنے عرصے سے لاپتا افراد کی رپورٹوں کا جائزہ لیا؟“

”گزشتہ اکتوبر سے اب تک جتنے افراد لاپتا ہوئے ہیں، میں نے ان سب کی رپورٹس دیکھ لی ہیں۔“

اوبرن نے پلاسٹک کی سلپ پر پنسل سے لکھی ہوئی لائنوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ پورے کیس کی چابی ہو سکتی ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ اس کے کچھ الفاظ سمجھ میں آتے ہیں؟“

”پہلی لائن کا پہلا لفظ mikah عبرانی ہے۔“

”مجھے دکھاؤ۔“

ڈولنگر نے اپنے کمپیوٹر کا اسکرین کھولا اور ایک ایک کر کے تمام الفاظ کی نشاندہی کردی۔

”کوشش بُری نہیں ہے لیکن کیا عبرانی زبان دائیں سے بائیں نہیں لکھی جاتی؟“

ڈولنگر نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور اسے mikah کے بجائے ahkim پڑھا۔

اوبرن نے فوراً ہی سارجنٹ وولف سے رابطہ کیا جو ڈسٹرکٹ ڈائریکٹر کمیونٹی ریلیشنز ہونے کے علاوہ ہل ٹمپل اسکول میں جزوقتی استاد بھی تھا۔ اس نے فوراً ہی اس لفظ کا ترجمہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا مطلب ہابیل اور قابیل ہے جبکہ بقیہ الفاظ کو سمجھنے سے اس نے معذوری ظاہر کردی جو غالباً عبرانی زبان کے نہیں تھے۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ ڈولنگر نے پوچھا۔ ”ہم ایک ایک کر کے دوسرے ترجمہ کرنے والوں سے ان الفاظ کا مطلب جاننے کی کوشش کریں یا اس عبارت کو اخبار میں شائع کرادیں۔ شاید کوئی اسے پڑھ سکے۔“

”میں ترجمہ کرنے والوں کو ترجیح دوں گا کیونکہ انہیں ٹیکنیکل اور تجارتی خط و کتابت سے واقفیت ہوتی ہے اور یہ بھی اسی طرح کی تحریر ہے۔ میں اسے شائع کرنے کے حق میں نہیں ہوں جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہوجائے کہ مقتول کون ہے۔ کہاں سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا اور اس کی لاش غیر معینہ عرصے تک کولڈ اسٹوریج میں کیوں رہی۔ ہمیں اس تحریر کو شائع کرنے میں محتاط رہنا چاہیے کیونکہ لگتا یہی ہے کہ مرنے والا ان معلومات کو خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے مختلف زبانوں کے الفاظ کا انتخاب کیا۔ تم اس کی ایک نقل مجھے دے دو۔“

کچھ دیر بعد کورونرز آفس کے ایک کلرک نے فون پر ڈولنگر کو فون پر اطلاع دی کہ ایک عورت آرلین ٹاؤن شپ سے آرہی ہے جس کا خیال ہے کہ مرنے والا غالباً اس کا شوہر ہے۔ ڈولنگر اس سے مردہ خانے میں ملنے پر رضامند ہو گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس عورت کی شناخت درست ہے کیونکہ اسٹیمی نے پہلے ہی لاش کا موازنہ اس عورت کے شوہر کے ڈرائیونگ لائسنس کی تصویر سے کرلیا تھا جو اس نے بیورو آف موٹر وہیکلز سے حاصل کیا تھا۔

اس کے مطابق مرنے والے کا نام کارل زونڈیک

تھا۔ اس کی عمر ستاون برس تھی اور وہ مقامی کالج میں لسانیات کا پروفیسر تھا۔ ایک ایسا شخص ہی مختلف زبانوں کے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرسکتا تھا۔ جولیس نے لاش پر چادر ڈال دی تھی تاکہ اس کی کھوپڑی میں لگا ہوا زخم اور پوسٹ مارٹم کے دوران چیر پھاڑ نظر نہ آسکے۔ مسز زونڈیک نے بڑی متانت اور وقار سے اپنے شوہر کی لاش کو شناخت کیا۔ ڈولنگر انتظار کرتا رہا کہ اسٹیمی رسمی کارروائیوں سے فارغ ہو جائے تو وہ اس سے بات کرے۔

وہ ہیڈکوارٹر آنے پر تیار ہوگئی لیکن اس نے سواری کی پیشکش ٹھکرادی اور اپنے دوست کے ساتھ سفر کرنے کو ترجیح دی جو اسے لے کر مردہ خانے آیا تھا۔ اس شخص کا نام ہوورڈ پال تھا اور وہ پالمیرا میں ایک اسٹور کا مالک تھا۔ جب وہ ہیڈکوارٹر پہنچے تو ہوورڈ بھی مسز زونڈیک کے ساتھ انٹرویو میں شریک ہوگیا۔

مسز زونڈیک نے کوئی جیولری، میک اپ یا نیل پالش نہیں لگائی ہوئی تھی۔ کوئی کھوج لگائے بغیر ڈولنگر کو معلوم ہوگیا تھا کہ وہ پال کے اسٹور پر ایک کلرک اور بک کیپر کے طور پر کام کرتی ہے اور زونڈیک سے اس کی شادی کو تیس سال ہوچکے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

''وہ موسم گرما میں نہیں پڑھاتا تھا۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور چند دنوں کے لیے گھومنے پھرنے نکل جاتا تھا۔''

''پیدل ہی؟'' ڈولنگر نے پوچھا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ پروفیسر کی کار گھر میں کھڑی ہوئی تھی۔

''ہاں، وہ مختلف لوگوں سے ملتا اور ان کے ساتھ چند روز قیام کرتا۔''

''کیا اس نے ہوٹلوں میں قیام کیا ہوگا۔ کرائے پر کار لی ہوگی؟ ہمیں جلد از جلد اس کے آخری کریڈٹ کارڈ اسٹیٹمنٹ کو دیکھنا ہوگا اور تم ان کمپنیوں کو مطلع کروگی کہ اس کے کریڈٹ کارڈ چوری یا گم ہوگئے ہیں۔''

''کارل کے پاس کوئی کریڈٹ کارڈ نہیں تھا۔''

''کیا وہ تم سے رابطہ کرکے بتاتا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟''

''کبھی کبھار وہ ایسا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔''

''اور تمہیں اس کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی جبکہ اسے گئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا تھا۔''

ہوورڈ پال جو کافی دیر سے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ بول پڑا۔ ''فیونا، تمہیں اس شخص کو سچ بتادینا چاہیے۔''

اس نے اپنی کرسی گھمائی اور ڈولنگر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ڈاکٹر تو نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ایک ذہنی بیماری میں مبتلا ہوچکا تھا اور اس کا دماغ صحیح طرح کام نہیں کررہا تھا۔ وہ آدھی رات کو کھیتوں اور میدانوں میں لیٹ کر دوربین سے آسمان کو دیکھا کرتا۔ تم اسے کوئی متوازن رویہ نہیں کہہ سکتے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اسے پانچ سال کے لیے جیل میں ڈال دیتا۔''

مسز زونڈیک نے تھوڑا سا شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ جیسا بھی تھا، اس کے باوجود ہم اتنے برسوں تک ایک ساتھ رہتے رہے۔''

ڈولنگر نے اسے محتاط انداز میں بتایا کہ اس کے شوہر کی لاش کافی عرصے تک کولڈ اسٹوریج میں رہی ہے۔ اس کے ردعمل سے لگا جیسے اسے اس بات کی توقع تھی لیکن وہ اس معمے کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں دے سکی۔ اب جبکہ زونڈیک کی شناخت ہوچکی تھی تو اس بات کا بھی امکان تھا کہ پلاسٹک کی پٹی پر لکھی ہوئی تحریر سے اس کے محلِ وقوع، تعلقات اور آخری روز کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ معلومات مل جائیں گی۔ جب ڈولنگر نے مسز زونڈیک کو اس پٹی کی فوٹو کاپی دکھائی تو اس نے فوراً اسے پہچان لیا۔

''وہ ہمیشہ اس طرح کی پٹیاں اپنے ساتھ رکھتا تھا تاکہ ذہن میں آنے والے خیالات کو ان پر منتقل کرسکے۔ اس سے غرض نہیں کہ وہ کہاں تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اخبار کے لیے کچھ لکھ رہا ہو یا اس نے آسمان پر کچھ دیکھا ہو لیکن مجھ سے اس کا مطلب مت پوچھنا۔ وہ لسانیات کا پروفیسر تھا اور اسے خود بھی یاد نہیں کہ کتنی زبانیں سمجھتا تھا۔ وہ اپنی پوری نوٹ بک ایسی تحریروں سے بھر دیتا جنہیں کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ البتہ ایک شخص کے لیے یہ تحریریں کچھ اہمیت رکھتی تھیں۔ کارل اور پروفیسر براؤن پیغام رسانی کے لیے اس طرح کی تحریر استعمال کرتے تھے۔''

''کیا پروفیسر براؤن بھی تمہارے شوہر کے ساتھ اسی کالج میں پڑھاتا تھا؟''

''ہاں گوکہ وہ دونوں دوست نہیں تھے اور ان کے درمیان کارل کے کسی نظریے پر برسوں سے بحث چل رہی تھی۔ ان کے زیادہ تر پیغامات ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہوتے تھے۔''

دو دن مزید گزر گئے۔ لیبارٹری کی رپورٹ بھی آگئی۔ متوفی کے خون یا نظامِ ہضم میں کوئی الکحل، منشیات یا زہریلے مادے نہیں پائے گئے۔ پروفیسر براؤن نے گزشتہ اڑتالیس گھنٹے کے دوران کسی پیغام یا ای میل کا جواب نہیں دیا۔ رولنز کاؤنٹی کے شیرف نے فون پر اوبرن کو بتایا کہ مقامی کالج کے کچھ طالب علموں کو پروفیسر زونڈیک کی دوربین اس کے گھر سے دو میل کے فاصلے پر ملی ہے جس پر اس کا نام اور پتا درج ہے۔ وہ طالبِ علم ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ سائیکل چلا رہے تھے۔

یہ قیمتی دوربین چمڑے کے کیس میں چار لڑکیوں کو ملی تھی جن میں سے دو پروفیسر کی شاگرد رہ چکی تھیں۔ انہوں نے اپنی دریافت کے علاوہ اس جگہ کی تصویر بھی لے لی جو ای میل کے ذریعے انہیں بھیجی جارہی تھیں۔ شیرف نے نیم دلی کے ساتھ ان کے ہمراہ اس جگہ جانے کی پیشکش کی کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس قتل کی تحقیقات سے دور رکھنا چاہ رہا تھا۔ اوبرن نے بھی کچھ وجوہ کی بنا پر یہ پیشکش مسترد کر دی۔

ڈولنگر گیارہ بجے دفتر آیا تو اوبرن نے تجویز پیش کی کہ کھانے کے وقفے کے بعد وہ دونوں پالمیرا جا کر اس جگہ کا معائنہ کریں جس کی نشاندہی شیرف آفس کی بھیجی گئی تصویروں میں کی گئی تھی۔

ڈولنگر کے دماغ میں کوئی اور بات تھی۔ اس نے کہا۔ ”وہاں جانے سے بہتر ہے کہ ہم پروفیسر براؤن سے ملنے کی کوشش کریں۔“

پالمیرا کی حدود سے نکلنے کے بعد وہ ایک مختصر راستہ طے کر کے بٹرروٹ اکیڈمی کے کیمپس پہنچ گئے۔ وہاں سے پالمیرا سوئچنگ یارڈ دو میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ ایک بنجر زمین تھی جو ہائی وے کے ساتھ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جس پر ریل ٹریک کے ساتھ ساتھ سگنل ٹاور، بجلی کے کھمبے اور سوئچ باکس نصب تھے۔ ایک طرف سیاہ اور سرخ باکس کاروں کی ایک قطار تھی اور کچھ فاصلے پر ایک سوئچنگ انجن کھڑا ہوا تھا۔

ڈولنگر نے اس جگہ سے چند گز کے فاصلے پر گاڑی کھڑی کی جس کی نشاندہی تصویر میں کی گئی تھی۔ انہوں نے وہ جگہ بھی دیکھی جہاں لڑکیاں اپنی سائیکلیں چھوڑ گئی تھیں لیکن انہیں وہ جگہ نظر نہیں آئی جہاں سے دوربین ملی تھی۔ انہوں نے ریلوے لائن کے اطراف میں کئی گز تک تلاشی لی اور تصویریں بھی بنائیں لیکن انہیں وہاں فاؤل پلے کی کوئی

علامت نظر نہیں آئی۔

وہاں انہیں کمبر لینڈ ائر کے تین خالی ڈبے ملے۔ ڈولنگر نے انہیں ایک بڑے ڈبے میں رکھا۔ اس پر تاریخ، وقت اور اس جگہ کا اندراج کیا پھر اسے سیل کر کے دونوں نے دستخط کر دیے۔ کچھ فاصلے پر ایک عمارت تھی جس کے باہر کھڑی تین کاریں اور ایک پوسٹل ٹرک وہاں انسانوں کی موجودگی کا پتا دے رہی تھیں۔ انہوں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا جو نیچے آرہا تھا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہاں کا انچارج کون ہے؟''

''ویگرام۔ یارڈ ماسٹر۔'' اس نے رکے بغیر جواب دیا۔

اندر کا ماحول باہر سے قدرے مختلف تھا۔ ائر کنڈیشنر، ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی، پبلک ریسٹ روم اور ایک سوفٹ ڈرنکنگ مشین، وہ گنجا شخص ایک کنٹرول بورڈ کے پاس کھڑا شیشے کی کھڑکی سے یارڈ کا جائزہ لے رہا تھا۔

''مسٹر ویگرام؟''

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

اوبرن اور ڈولنگر نے اسے اپنے شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم ایک شخص کی موت کی تحقیقات کر رہے ہیں جو شاید اس علاقے میں زخمی ہوا۔ غالباً ٹرین سے۔''

ویگرام کو یہ سوال پسند نہیں آیا۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تم کس شخص کی بات کر رہے ہو، تمہارا اشارہ یہاں کام کرنے والے کسی فرد کی جانب ہے؟''

''نہیں، وہ کارل زونڈیک نامی ایک پروفیسر ہے۔ اس کی لاش پیر کے روز یہاں سے ستر میل دور ملی ہے۔''

ویگرام نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔''

''گزشتہ روز اس کی دوربین ریلوے لائن سے دو سو گز کے فاصلے پر ملی ہے۔''

''وہ کسی ٹرین کا مسافر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں سے کوئی مسافر ٹرین نہیں گزرتی۔''

''ہم یہ نہیں سمجھتے کہ وہ ریل سے سفر کر رہا تھا۔'' ڈولنگر نے وضاحت کی۔ ''اسے رات کو دوربین لے کر گھومنے کی عادت تھی اور ہمارا خیال ہے کہ وہ کسی ٹرین کے سامنے آگیا ہوگا۔''

''اگر ایسا ہوا ہے تو کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا ورنہ یہاں معائنہ کاروں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا۔ اگر یہ حادثہ یہاں پیش آیا تو اس کی لاش ستر میل دور کیسے پہنچ گئی؟''

''ہم بھی اسی معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

ویگرام کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون سننے کے بعد نصف میل دور کھڑے انجن سے رابطہ کیا اور انجینئر کو کچھ ہدایات دیں پھر اس نے مزید کچھ بٹن دبائے۔

''اس یارڈ پر کافی ٹریفک ہے۔'' اوبرن نے کہا۔

''یہاں گیارہ کمپنیوں کی ٹرینیں آتی ہیں لیکن سارا کام کمپیوٹر کے ذریعے ہوتا ہے لیکن ہم ان ٹرینوں کو پہلے فارغ کرتے ہیں جو کوئلہ لے کر آتی ہیں جس کے نتیجے میں ہمارا اپنا سامان گھنٹوں سائڈ ٹریک پر پڑا رہتا ہے۔''

یہ سب بہت دلچسپ تھا لیکن اس سے پروفیسر زونڈیک کے قتل کا معما حل ہونے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ انہوں نے یارڈ ماسٹر کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے جانے لگے۔ جاتے جاتے ڈولنگر نے بال مشین کی کچھ تصویریں لے لیں۔

واپسی میں انہوں نے پروفیسر براؤن کو فون کیا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا پھر اس شرط پر تیار ہو گیا کہ یہ ملاقات کیمپس سے باہر ہوگی۔

''ہم دونوں کے درمیان برسوں سے بحث چل رہی تھی۔ اب وہ مر چکا ہے۔ اگر مجھے پولیس والوں کو انٹرویو دیتے دیکھ لیا گیا تو پورا کیمپس یہی سمجھے گا کہ میرا اس قتل سے کوئی تعلق ہے۔''

''لیکن ہم وردی میں نہیں ہیں۔''

''پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ میری چار بجے تک کلاس ہے۔ کیوں نہ ہم پانچ بجے انجلینا پیزا پر ملیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم وہاں آجائیں گے۔''

اسی دوران ڈولنگر نے بٹر روٹ اکیڈمی کی ویب سائٹ تک رسائی حاصل کر لی اور پروفیسر زونڈیک اور پروفیسر براؤن کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ دونوں کا پس منظر اور کیریئر تقریباً ایک جیسا تھا۔ دونوں کی عمر تقریباً برابر تھی اور یکساں تعلیمی قابلیت کے حامل تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں اور بے شمار علمی مضامین لکھ رکھے تھے۔

گو کہ ان کے پاس کافی وقت تھا لیکن اوبرن نے شیرف سائٹیل سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے بجائے وہ آرلین ٹاؤن شپ میں واقع زونڈیک کے فارم ہاؤس چلے گئے لیکن مسز زونڈیک وہاں موجود نہیں تھی۔

زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مصروف ہوگی یا اپنے کام پر واپس چلی گئی ہوگی۔

حیرت کی بات ہے کہ پروفیسر پیزا نہیں کھاتا تھا پھر اس نے ملاقات کے لیے پیزا شاپ کا انتخاب کیوں کیا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ قصبے میں یہ واحد جگہ ہے جہاں وائی فائی کی سہولت میسر تھی۔

''میں نہیں جانتا کہ تم مجھ سے کیا پوچھو گے۔'' اس نے کہا۔''میں اسی لیے لیپ ٹاپ ساتھ لے کر آیا ہوں تاکہ ضرورت پڑنے پر اس سے مدد لے سکوں۔ کارل کی موت کیسے واقع ہوئی۔ اخبار میں لکھا ہے کہ شاید یہ حادثہ تھا؟''

''اس کی موت کی وجہ سر میں لگنے والا مہلک زخم تھا۔'' ڈولنگر نے کہا۔''اس کے علاوہ ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ تم اس سے حال ہی میں کب ملے تھے؟''

''دو جون کی صبح جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر۔''

''کیا وہ معمول کے مطابق نظر آرہا تھا۔ سنا ہے کہ وہ ذہنی طور پر مضبوط نہیں تھا۔''

''یہ بالکل صحیح ہے، وہ کسی آوارہ گرد کی طرح ست نظر آرہا تھا۔ اسے ہمیشہ سے ہی گھومنے کا شوق تھا۔ کسی بھی شخص کے لیے یہ بہت مناسب موقع تھا جو اسے غائب کرنا چاہتا ہو۔''

''مثلاً؟''

''میں نہیں سمجھتا کہ کیمپس میں وہ کسی کے نشانے پر تھا۔ میں اور وہ ہمیشہ علمی بحث میں الجھے رہتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جسمانی تشدد پر اتر آئیں۔ کسی شاگرد کو بھی اس سے دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی بیوی اس سے ناخوش تھی۔''

''تم مسز زونڈیک کو جانتے ہو؟''

''بہت تھوڑا۔ وہ دیہاتی عورت ہے۔ اس کے والدین کا دیھوئی کے شمال میں فروٹ فارم ہے۔ کارل نے رضا کارانہ طور پر اسپتالوں میں مترجم کے فرائض انجام دیے اور اس کا واسطہ ہر طرح کے لوگوں سے پڑتا تھا جن میں زیادہ تر اسی کی طرح خانہ بدوش ہوتے تھے۔''

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اسے علم فلکیات سے بھی دلچسپی تھی۔'' اوبرن نے کہا۔''گزشتہ روز کچھ طالب علموں کو ریلوے لائن کے پاس اس کی دوربین ملی ہے۔''

''کئی برس پہلے وہ آسمان پر ستاروں کو دیکھتا جب چاند گرہن ہو یا سیاروں کا ظہور لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اس کے ذہن کی اختراع تھی۔ ستاروں اور سیاروں کے اپنے نام ہیں جن سے وہ جڑا ہوا تھا۔''

''تمہارا کہنا ہے کہ تمہارے پاس ایسے پیغامات ہیں جو کارل نے مرنے سے پہلے لکھے تھے۔'' پروفیسر نے نیپکن سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

ڈولنگر نے اس کے سامنے میز پر ایک فوٹو کاپی رکھ دی۔ پروفیسر اسے حیرت سے دیکھنے لگا پھر اس نے نفی میں سرہلا دیا۔

''تمہیں یقین نہیں آرہا کہ یہ تحریر زونڈیک کی ہے؟''

''اگر یہ اس نے لکھی ہے تو پھر وہ نشے میں ہوگا جس پر میں یقین نہیں کرسکتا اور ہاں...... میں سمجھ گیا۔ اس نے یہ تحریر اندھیرے میں لکھی ہے۔ اسی لیے لائنیں بے ترتیب اور ٹیڑھی میڑھی ہیں۔''

''یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔'' اوبرن نے کہا۔''کیا ان میں سے کسی لفظ کا مطلب تمہاری سمجھ میں آرہا ہے؟''

''اوہ ہاں، کارل اور میں ہمیشہ اسی طرح بے ترتیب تحریریں لکھا کرتے تھے۔ اس میں کچھ یونانی، تھوڑی سی سنسکرت اور سسلی میں بولی جانے والی زبان کے الفاظ ہوتے تھے۔ ہم پہلے عبرانی زبان کے لفظ Ahkim سے شروع کرتے ہیں۔ یہ انگریزی لفظ برادر کی جمع ہے لیکن ہم ان کی تعداد نہیں بتا سکتے۔ لہٰذا یہ دو یا اس سے زیادہ بھائی ہو سکتے ہیں۔''

''اب ہم دوسرے لفظ کی طرف آتے ہیں۔ یہ لاطینی زبان میں ہے۔ اس کا مطلب ہے پولینڈ کے لوگ جو شاہ بلوط کے جنگل میں رہتے ہیں۔ یہ پولش لفظ بھی ہوسکتا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے مجھے کچھ مدد درکار ہوگی۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور اس کے بٹن دبا کر اسکرین کو دیکھنے لگا۔

''مل گیا۔ پولش زبان میں یہ Dombinski ہے۔ اس کے وہی معنی ہیں۔ وہ لوگ جو شاہ بلوط کے جنگل میں رہتے ہیں۔ اب دونوں لفظوں کو ملا کر پڑھیں تو یہ ڈیم بنسکی برادرز بنتا ہے۔ یہ کسی کا بھی نام ہوسکتا ہے۔ کوئی وکیلوں کی فرم، بھولا بسرا ناول یا دو قریبی ساتھی جن سے کارل کی کسی تقریب میں ملاقات ہوئی ہوگی۔ اس سے آگے دیکھنا تمہارا کام ہے۔''

''باقی دو لائنوں کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''میں اسی طرف آرہا ہوں۔ دوسری لائن میں سات

حروف ہیں اور ہر ایک کے نیچے ایک ہندسہ لکھا گیا ہے جو عربی زبان میں ہے اور مجھے لگتا ہے کہ یہ اوہیو کی کسی کار کی نمبر پلیٹ ہے۔''

پروفیسر نے اپنا مشروب ختم کرتے ہوئے کہا۔''مجھے امید ہے کہ جلد یا بدیر میں سنسکرت کو پڑھنے کے قابل بھی ہو جاؤں گا لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ تم مجھے اپنا ای میل ایڈریس دے دو۔ میں جلد ہی تمہیں اس کا ترجمہ بھیج دوں گا۔''

وہ آٹھ بجے ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ انہوں نے تینوں کنستر ایک کمرے میں مقفل کیے اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئے۔ پانچ منٹ کے اندر ہی انہیں ڈیم بنسکی برادرز کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئیں۔ یہ اوہائیو کی ایک ہول سیل فوڈ کمپنی تھی جو خاص طور پر فروزن گوشت اور مچھلی کا کاروبار کرتی تھی۔ پروفیسر زونڈ یک نے جو نمبر کوڈ کیا تھا وہ انہی کے ایک ٹرک کی نمبر پلیٹ تھی۔ اس ٹرک میں ایک ریفریجریشن یونٹ بھی نصب تھا۔

اس وقت فرداً فرداً پوچھ گچھ کرنا ممکن نہیں تھا لیکن اوبرن اور ڈولنگر قانون نافذ کرنے والے نیٹ ورک کے ذریعے مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے بعد وہ اپنی تحقیقات کا دائرہ آگے بڑھا سکتے تھے۔ اس کمپنی کو دادا نے قائم کیا اور اب پوتے چلا رہے تھے۔ کئی بار یہ کمپنی دیوالیا ہوئی۔ ڈیڑھ برس پہلے اس پر ایک ٹرک کو ہائی جیک کر کے فروزن گوشت لوٹنے کا الزام لگایا گیا لیکن ناکافی شواہد ہونے کی وجہ سے جرم ثابت نہ ہو سکا۔

جمعے کی صبح دفتر آتے ہی انہوں نے ڈیم بنسکی برادرز کوالٹی فورڈز کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔ یہ کمپنی کئی برسوں سے سڑکوں پر فروزن گوشت فروخت کر رہی تھی۔ کم از کم نو ایسے مقامات تھے جہاں اس سرگرمی کا نوٹس لیا گیا۔

زیادہ تر متعلقہ تحقیقات قانون نافذ کرنے والے ادارے کی مدد کے بغیر کی گئی شکایات روایتی انداز میں بزنس بیورو کی شاخ یا مقامی محکمۂ صحت کو بھیج دی جاتیں۔ ایک ہیلتھ انسپکٹر سیل پوائنٹ کا دورہ کرتا اور متعلقہ کاغذات دیکھنے کے علاوہ فریزر کا درجۂ حرارت اور گوشت کے پیکٹ پر درج تاریخ چیک کرتا اور تمام چیزیں درست ہونے کی صورت میں وہ اپنی رپورٹ جمع کرا دیتا۔

لیکن اس انسپکٹر کو فروخت کی انوائس یا بل چیک کرنے کا اختیار نہیں تھا تاکہ یہ تصدیق ہو سکے کہ فروخت کنندہ کو قانونی طور پر مقامی تاجروں کو گوشت فروخت کرنے کا اختیار تھا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ کمپنی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھی اور وہ بدقسمتی سے پکڑ میں آ گئے تھے۔

ڈولنگر نے اوہایو اسٹیٹ ہائی وے پٹرول کے ذریعے ویلیلیا میں کمپنی کے مرکزی دفتر سے رابطہ کیا۔ آفس منیجر کمپنی کی غیر قانونی سرگرمیوں سے لاعلم تھی۔ اس لیے اس سے کوئی معلومات نہ مل سکیں البتہ وہ صرف اتنا بتا سکی کہ مطلوبہ ٹرک اس وقت لوئیس ول کے علاقے میں سامان کی ترسیل کر رہا ہے۔ ڈرائیور کا نام آندرے خیرش ہے۔ ڈولنگر نے اس کا سیل نمبر بھی معلوم کر لیا۔

ایک بار پھر اوبرن اور ڈولنگر نے سوئچنگ یارڈ کا رخ کیا جہاں ویگرام ایک زیرِ تربیت شخص کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

''کیا تم نے پروفیسر کے بارے میں مزید کوئی بات معلوم کی؟''

''تھوڑی بہت۔'' اوبرن نے کہا۔''ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کیسے اور کہاں فوت ہوا۔''

''واقعی؟''

''ہاں، تین ہفتے قبل وہ رات میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس نے یارڈ میں کوئی غیر معمولی سرگرمی دیکھی۔ دو آدمی ایک کنویئر کے ذریعے سائڈ میں کھڑے ریفریجریٹڈ ٹرین کار سے برابر میں کھڑے ہوئے ایک ریفریجریٹڈ ٹرک میں سامان منتقل کر رہے تھے۔ اسے یہ کارروائی معمول سے ہٹ کر لگی۔ درحقیقت یہ ایک مجرمانہ فعل معلوم ہو رہا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یارڈ میں چوری ہوئی لیکن کسی نے اس کی رپورٹ نہیں کی؟''

''اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ جیسا کہ تم نے اس روز بتایا تھا کہ کوئلے سے لدی ٹرینوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور دوسری ٹرینوں کو ایک طرف کھڑا کر دیا جاتا ہے جن پر خراب ہونے والی اشیا مثلاً فروزن گوشت لدا ہوتا ہے۔ یونین کے دباؤ کی وجہ سے ورکرز مقررہ وقت کے بعد کام نہیں کرتے اور اسے اتارنے میں دیر لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس پر سامان کے مالک نے انشورنس کلیم کیا۔ انسپکٹر نے تین ہفتے قبل معائنہ کیا اور اس سے پہلے کہ کارروائی آگے بڑھتی، تباہ شدہ گوشت انسانی صحت کے لیے مضر ہو چکا تھا۔ انسپکٹر نے صرف

گوشت کی ظاہری شکل اور کاغذات دیکھے اور کلیم منظور کر لیا۔ اس دوران کسی کو یہ اطلاع مل گئی اور اس نے سامان اپنے قبضے میں لے لیا۔''

''خراب ہونے سے پہلے؟''

اوبرن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' آدمی رات کے وقت کسی نے اس پر توجہ نہیں دی کیونکہ اس علاقے میں رات کو کرفیو ہوتا ہے اور شیرف کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ وہ ہائی وے سے بیس گز کے فاصلے پر ہونے والی چوری کا سراغ لگا سکے۔''

ویگرام کا معاون کنٹرول بورڈ کے بجائے اوبرن کی جانب متوجہ تھا۔ ویگرام نے اسے گھور کر دیکھا تاکہ وہ اپنے کام پر دھیان دے سکے۔

اوبرن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اتفاق سے پروفیسر اس طرف آ گیا اور اس نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ وہ اسے قریب سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا تو پیچھے سے ایک آدمی نے آ کر اس کے سر پر سلاخ سے ضرب لگائی اور وہ وہیں گر گیا۔''

''یہ بھی اچھا ہوا کہ اس کی ٹکر کسی انجن سے نہیں ہوئی لیکن تم ان لوگوں کو کیسے پکڑو گے اگر تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔''

''ہمیں دو باتوں سے مدد مل رہی ہے۔ پروفیسر نے مرنے سے پہلے ٹرک کی مال کمپنی کا نام اور لائسنس پلیٹ کا نمبر لکھ لیا تھا۔''

''تم مذاق کر رہے ہو؟''

اب ویگرام کو اپنا دھیان کام پر رکھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ اوبرن اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا پھر ویگرام نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کہ اس نے کسی ایسے ٹرک کا نمبر لکھا ہو جو اس پر ٹرک کے چھینٹے اڑاتا ہوا جا رہا تھا۔''

''ہمارے پاس اور بھی ثبوت ہے۔'' ڈولنگر نے کہا۔

''ان چوروں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ مال گاڑی کا تالا کوئی نشان ڈالے بغیر توڑ لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک تین فٹ لمبی سلاخ بولٹ کے سرے میں ڈال کر اسے اوپر اٹھاتا ہے جبکہ دوسرا بولٹ پر لگے ہوئے کمبر یسڈ ائر کے کنستر کو ایک ایک کر کے ڈسچارج کرتا ہے۔ اس طرح تالا کھل جاتا ہے۔''

''ہاں میں نے انٹرنیٹ پر دیکھا تھا۔'' ویگرام کا شاگرد بولا۔

''جب دروازہ کھل گیا تو انہوں نے اس کے ساتھ کنویئر بیلٹ لگا دی اور سامان ٹرک میں منتقل کرنے لگے۔ جس شخص نے کنستر استعمال کیے تھے، اس نے انہیں زمین پر چھوڑ دیا۔ ان پر اس کی انگلیوں کے نشانات بھی ہیں۔''

''اس کا نام آندرے خیرش ہے۔'' اوبرن نے کہا۔

''اور اس وقت وہ ایونس ویلا میں زیرِ حراست ہے۔''

ویگرام کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے کہا۔ ''اس کی انگلیوں کے نشانات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہے۔''

''ہاں لیکن اس نے پوچھ گچھ کے دوران ایک بڑی چوری اور انسانی لاش کو غیر قانونی طور پر لے جانے کا اعتراف کر لیا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ بھی قتل جیسے جرم میں شریک ہے۔''

''کیا کہا تم نے شریک جرم؟''

اوبرن نے دیکھا کہ کاؤنٹی شیرف کی کار عمارت کے پارکنگ ایریا میں آ کر رکی ہے۔ شیرف مارون سائٹیل بذاتِ خود ایک خاتون ڈپٹی کے ساتھ عمارت میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی اوبرن نے کہا۔ ''میں یارڈ ماسٹر کو بتانے ہی والا تھا کہ پروفیسر زونڈیک نے قتل ہونے سے پہلے کس طرح اس شخص کا حلیہ کوڈ ورڈز میں بیان کیا جسے اس نے ٹرین کو لوٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ لمبا، گنجا اور لنگڑا۔ خیرش کے مطابق یہ اس شخص پر پورا اترتا ہے جس نے زونڈیک کو قتل کیا اور اسے قائل کیا کہ وہ لاش کو اپنے ریفریجریٹڈ ٹرک میں رکھ کر وہاں سے لے جائے۔''

شیرف نے ازراہِ مذاق کہا۔ ''کیا اس شخص کا نام اوبرن ہے؟''

''نہیں شیرف۔ یہ میرا نام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس ویگرام کی گرفتاری کا وارنٹ ہوگا۔''

جولائی کے وسط میں ڈولنگر کو پروفیسر براؤن کی طرف سے ایک ای میل موصول ہوئی جس میں اس نے زونڈیک کے تحریر کردہ سنسکرت کے دو متبادل مطلب تجویز کیے تھے۔ ڈولنگر نے اس کا پرنٹ آؤٹ اوبرن کو دیا تو وہ بولا۔

''اسے کسی فائل میں رکھ لو۔ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔''

ڈولنگر ان جملوں کو غور سے دیکھنے لگا جو ترجمہ ہونے کے باوجود اس کی سمجھ سے باہر تھے۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

انتیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک اور رنگ اور دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پا چکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا

پیچھا کرتا ہوا پاراہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی شختی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جارہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیرزمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیرزمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کردی تھی۔ برونائی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ ان کا ایک ہی تقاضا تھا کہ اب مار دو یا مر جاؤ۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارا قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا...... ہر طرف گولیاں...... شیلنگ اور دھواں دھار لڑائی تھی...... بالآخر پسپی ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنوں سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب تخت کے ابراہیم اور قسطینا حق دار تھے...... وہاں کے تمام معاملات بخوبی نمٹانے کے بعد ہم وطن واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ جامابی کے عوام کسی بھی صورت مجھے جانے نہیں دے رہے تھے مگر مجھے جانا تھا...... میں...... انیق اور سجاول ان کے جتنے کام آ سکتے تھے آ چکے تھے...... وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر جا چکی تھی...... میں داؤد بھاؤ کے پاس تھا...... لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا...... جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا...... ٹیکساری گینگ پاکستان آ کے ہر طرف قتل و غارت گری پھیلا رہے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

داؤد بھاؤ نے کہا۔ ”وہ ٹاپ کی ہیروئن ہے یار! اگر خدانخواستہ وہ ماری گئی تو بہت شور مچے گا یہاں۔“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا داؤد بھاؤ...... آپ کو بتایا ہے نا کہ یہ مجسم شیطانوں کا ٹولا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

داؤد بھاؤ سوچ میں ڈوب گیا۔ پیشانی کے بال اڑ جانے کی وجہ سے اس کا ماتھا غیر معمولی طور پر چوڑا نظر آتا تھا۔ اس کے ماتھے پر تفکر کی شکنیں تھیں، وہ بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ کم از کم پندرہ بیس دن کے لیے تم یہاں روپوش رہو اور گراؤنڈ فلور پر جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ شیطانی ٹولا زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکے گا۔ مایوس ہوں گے تو پھر یہ لوگ واپس لوٹ جائیں گے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلانا مناسب سمجھا۔ جہاں تک میرا ذاتی خیال تھا، میں اس طرح چوہے کی طرح دبک کر ہرگز نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ لوگ بالکل بھی سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ مجھے باہر لانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ کوئی بھی ایسا کام جس سے میں شدید اذیت میں مبتلا ہوتا۔

یہ اگلے روز شام کا ذکر ہے۔ داؤد بھاؤ کے منع کرنے کے باوجود میں گراؤنڈ فلور پر چلا گیا۔ عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ انیق بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم ہال کے ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھ گئے۔ یہاں اسنوکر اور بلیئرڈ کی درجنوں میزیں تھیں اور کھیل جاری تھا۔ ہر کوئی اپنے حال میں مست تھا۔ دو چار واقف حال لوگوں کے سوا کسی نے ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ بیس تیس فٹ کی دوری پر شیشے کی دیوار گیر کھڑکی تھی جس میں سے ایک بارونق سڑک کا منظر نظر آتا تھا۔ روشنیوں کا شہر آہستہ آہستہ روشن ہو رہا تھا۔ زندگی رواں دواں تھی۔ مرد وزن اور بچے اپنے اپنے راستوں پر گامزن تھے۔ گاڑیاں حرکت میں تھیں۔ کچھ برق رفتار کچھ دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی، رنگین آنچل، مسکراہٹیں، پُرمسرت قہقہے، خریداریاں، گپ شپ کے انداز...... رنگ برنگ پھولوں کی جھلکیاں۔ یہ لاہور کی ایک زندگی سے بھرپور شام تھی مگر میں خود کو اس کا حصہ نہیں سمجھ رہا تھا اور اس زندگی سے بہت دور محسوس کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ میرے لیے نہیں تھا۔ میرے شب و روز کچھ اور تھے، میں کسی اور راستے کا مسافر تھا۔ وہ

یہاں وارد ہوچکے تھے، ایک بار مجھ سے ٹکرا چکے تھے۔ اور ایک بار مجھ سے پھر ٹکرانا تھا۔ بار بار۔ یہاں تک کہ ان کے بدلے کی آگ ٹھنڈی ہوجاتی۔

''کن سوچوں میں کھو گئے جناب! آپ تو دیوداس ہی بنتے جارہے ہیں۔'' انیق کی آواز نے مجھے چونکایا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''شاید، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''دیوداس تو ہر وقت نشے میں ڈوبا رہتا تھا...... اور آپ تو بالکل باز آگئے ہیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔'' اس نے ہوا میں ہاتھ گھمائے اور خیالی الفاظ کو پکڑ کر واپس منہ میں ڈال لیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ''ویسے جناب! دیوداس کا تصور ذہن میں آتے ہی امریش پوری کا خیال آگیا ہے۔ بہت بُری گزر رہی ہوگی بے چارے پر...... کیا پتا کہ گریبان پھاڑ کر ڈیرے کی ویران پہاڑیوں میں گھوم رہا ہو اور خورسنہ کو یاد کرکے گا رہا ہو...... کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں، یہ بہاریں یہ سماں!''

''زیادہ مسخریاں نہ کرو۔ تم جانتے ہو، میں پریشان ہوں۔''

''آپ کی ''پریشانی'' تو سکھیرا گاؤں میں ہے اور آپ چاہیں تو حل بھی ہوسکتی ہے۔ خدانخواستہ خدانخواستہ آپ کو کسی نے امریش پوری کی طرح دھتکارا تو نہیں، پھٹکارا تو نہیں۔ مجھے تو وہ سین یاد آتا ہے جب سجاول عرف امریش پوری جہاز میں بیٹھنے سے پہلے مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا تھا...... اُف کتنا مایوس تھوبڑا تھا اس کا۔ جیسے...... ادھیڑ عمر بھینسے کو اس کی جوان مادہ نے عین بہار کے موسم میں ٹکریں مار کر بھگا دیا ہو۔'' انیق کی آنکھوں میں خوشی ناچنے لگی۔

ان دونوں کے درمیان نفرت اور اپنائیت کا عجیب ملا جلا سا تعلق تھا، میں نے کہا۔ ''انیق! اگر تمہیں کوئی کام کی بات نہیں کرنی تو میں اٹھ جاؤں یہاں سے؟'' میں نے کرسی کے ہتھوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے والا انداز اپنایا تو وہ فوراً سنجیدہ ہوگیا۔

میری طرح وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ حالات کتنے سنگین ہیں۔ داؤد بھاؤ کے ساتھ ساتھ میں نے انیق کو بھی بتا دیا تھا کہ یہ ''ڈیتھ اسکواڈ'' کس بلا کا نام ہے۔ اس کی پیدائش کیسے ہوئی؟ کیسے ٹیسٹ ٹیوبز کے ذریعے درجنوں بچوں کو کرائے کی ماؤں کے ذریعے پروان چڑھایا گیا...... اور پھر انہیں ان کے خطرناک ترین والد گرامی ''ایول'' کے مشابہ بنانے کی کوشش کی گئی۔

سننے میں یہ سب کچھ بڑا داستانی لگتا تھا مگر جدید دور میں جہاں زندگی کے ہر شعبے میں ناقابلِ یقین اختراعات ہوئی ہیں، جرم کی دنیا میں بھی بہت کچھ نیا ہوچکا ہے اور ہو رہا ہے۔ یہ ڈیتھ اسکواڈ بھی اسی کی ایک زندہ مثال تھی۔

انیق نے کہا۔ ''مجھے تو یقین ہے شاہ زیب بھائی! یہاں آپ بالکل محفوظ ہیں۔ ان حرام زادوں کی گرد بھی آپ کو نہیں پاسکتی یا یوں کہہ لیں کہ وہ آپ کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔''

''نہیں انیق، تم ان لوگوں کو پوری طرح جانتے نہیں ہو اس لیے یہ بات کہہ رہے ہو۔ ہم انہیں زیادہ دیر خود سے دور نہیں رکھ سکتے...... اور سچی بات یہ ہے انیق! کہ میں ان سے مزید چھپنا بھی نہیں چاہتا۔ میں یہ گوارا نہیں کروں گا کہ میں اس طرح بل میں گھس کر بیٹھا رہوں اور وہ یہاں میری تلاش میں دندناتے پھریں۔''

''تو پھر؟'' انیق نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''جو ہونا ہے، وہ تو ہونا ہی ہے۔ تو پھر کیوں نا جلدی ہوجائے۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھے ڈھونڈیں، کیوں نا میں خود ہی ان کے سامنے آجاؤں۔''

انیق نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''آپ کہیں جذباتی تو نہیں ہو رہے؟''

''نہیں انیق...... میں سوچ سمجھ کر بات کر رہا ہوں۔ جب میں خود ان کے سامنے آجاؤں گا تو بے خبری میں مارے جانے والا امکان ختم ہوجائے گا۔ میری بھی پوری تیاری ہوگی۔ اس کے علاوہ وقت اور مقام کا تعین بھی میرا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ کسی گنجان جگہ پر وہ میدان سجالیں اور پہلے کی طرح درجنوں شہریوں کو بھون ڈالیں۔''

انیق نے ایک طویل سانس لی اور کرسی پر بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ جان رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ شکایتی لہجے میں بولا۔ ''یہ آپ بار بار ''میں اور میرا'' کے الفاظ کیوں استعمال فرما رہے ہیں۔ میں آپ کو اکیلے کچھ نہیں کرنے دوں گا۔ جو ہوگا، ہم دونوں کے ساتھ ہوگا، یا پھر نہیں ہوگا۔''

''اب ''تم'' جذباتی ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔ خیر چھوڑو اس موضوع کو۔ فی الحال میں کچھ اور کہنا چاہ رہا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک بار چچا

حفیظ اور ولید سے مل لوں۔ عرصہ ہو گیا ہے اُن کی شکل دیکھے ہوئے۔''

''ولید تو جیل میں ہے نا؟'' انیق نے پوچھا۔

''آخری اطلاعات تک تو جیل میں ہی تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ شکیل داراب کے پاس ہمیں اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے ایک ہتھکنڈا موجود ہے۔''

''ہتھکنڈے تو کئی ہیں، اور ہمارے پاس بھی ہیں لیکن فی الحال تو شکیل داراب سے بڑی مصیبت گلے پڑ چکی ہے بلکہ بہت بڑی۔''

''یعنی ٹیکساری گینگ سے آپ کی پرانی دشمنی...... اور گینگ کا یہ ڈیتھ اسکواڈ؟''

''بالکل۔ میں آنے والے دنوں کو خاصا تاریک دیکھ رہا ہوں۔''

انیق جیسے اندر سے تڑپ گیا، نہایت سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ مایوسی کی بات کریں گے تو میرا دل خون ہو جائے گا۔ آپ تو اس خاکسار کا آئیڈیل ہیں جناب۔''

''آئیڈیل اکثر مایوس ہی کرتے ہیں۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''آپ مایوس کرنے والے آئیڈیل نہیں ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ دل کی گہرائیوں سے بولا۔ اس کے اندھے یقین نے مجھ پر وہی بوجھ ڈالا جو جا بجا مجھ میں لوگوں کا یقین اور بھروسا ڈالتا تھا۔ جب قسطینا، ابراہیم، بیگم نورل اور کمانڈر فارس جان جیسے مجھ سے بہت پیار کرنے والے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ میں ہر مسئلے کا حل ہوں اور ہر طرح کے حالات کو شکست دے سکتا ہوں تو میرے کندھے ایک نادیدہ بوجھ سے جھک جاتے تھے...... آج انیق کی صورت دیکھ کر کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔

☆☆☆

میں ایک بار پھر چچا حفیظ کے گاؤں مراد پور جا رہا تھا۔ انیق بھی میرے ساتھ آنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ میں نے گول سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کئی دن تک شیو نہ کرنے کے سبب چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی نظر آنے لگی تھی۔ آنکھوں پر ہلکے رنگ کے سن گلاسز تھے۔ کڑھائی دار شلوار کرتے میں حلیہ کافی بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ میں داؤد بھاؤ کی فراہم کی ہوئی ایک سوزوکی سوئفٹ میں تھا۔ اس کے شیشے ٹنڈ تھے۔ لاہور سے مراد پور کا فاصلہ پندرہ بیس میل سے زیادہ نہیں تھا۔ تاہم اس مختصر راستے سے گزرتے ہوئے میری کئی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ میں نے سڑک کا وہ حصہ دیکھا جہاں میرے ساتھ سرمنڈاتے ہی اولے پڑنے والا معاملہ ہوا تھا۔ کوپن ہیگن سے لاہور اور لاہور سے اس علاقے میں پہنچتے ہی میں نے ایک روڈ ایکسیڈنٹ دیکھا تھا۔ خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت ایک زخمی عارف کو اسپتال پہنچایا تھا اور پھر انسپکٹر قیصر نے مجھے ایک خطرناک چکر میں پھنسا کر چند ہی دنوں میں دہشت گرد بنا ڈالا تھا۔

میں مراد پور پہنچا۔ وہ جلا ہوا گھر دیکھا جہاں میری چچا زاد فائزہ اپنی شادی سے چند روز قبل ہی کفن پہننے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اسی گھر میں فائزہ اور چچی آمنہ نے آگ کے بے رحم شعلوں میں زندگی کی بازی ہاری تھی...... اور پھر میرا چچا زاد ولید پولیس فائرنگ سے شدید زخمی ہونے کے بعد جیل جا پہنچا تھا۔

وہ مناظر آنکھوں کے سامنے آئے تو خون رگوں میں کھولنے لگا۔ انسپکٹر قیصر چودھری، لالہ وریام اور ان کے پشت پناہ شکیل داراب کے لیے نفرت کا دریا سا میرے سینے میں بہہ گیا۔ میرا جی چاہا کہ شکیل داراب میرے سامنے ہو اور میں اسے سیکڑوں لوگوں کے سامنے چاقو سے چیر ڈالوں، جیسے میں نے ٹیکساری گینگ کے ''ولی عہد'' کو چیرا تھا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

چچا حفیظ سے ملاقات ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کے بہت سے مزید بال سفید ہو گئے تھے اور وہ اپنی عمر سے آٹھ دس سال بڑے دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ مجھ سے لپٹ گئے اور دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ ان کا گھرانا اجڑ گیا تھا۔ وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کرتے تھے۔ ان کا واحد سہارا جیل میں تھا۔ میرے اور چچا کے درمیان قریباً ڈیڑھ گھنٹا بات چیت ہوئی۔ میں نے ان سے کہا۔ ''چچا! آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔''

انہوں نے وہی جواب دیا جس کی اُن سے توقع تھی۔ بولے۔ ''شاہ زیب پتر! یہاں ہمارے بزرگوں کی قبریں ہیں، میں ان سے دور جانا نہیں چاہتا۔ اب تو پتا نہیں کس گھڑی اللہ کا بلاوا آ جائے۔''

''نہیں چچا! عمر کے اس حصے میں آپ کو بہت آرام اور سکون کی ضرورت ہے اور یہ سکون آپ کو ملنا چاہیے۔ آپ کی زندگی پہلے بھی میری ہی دشمنی کی وجہ سے اجڑی ہے اور اب بھی ایسے بہت سے خطرات موجود ہیں۔''

وہ اپنے بوڑھے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام کر بولے۔ ''ایسا مت کہو شاہ زیب! یہاں جو کچھ ہوا، اس میں بھلا

تمہارا کیا قصور تھا۔ تم تو ہم سے ملنے آئے تھے۔ جو کچھ کیا یہاں کے لوگوں نے کیا۔ ان بدکار پولیس والوں نے کیا جو بندے کو بندہ نہیں سمجھتے اور پالتو درندوں کی طرح اپنے مالک کے حکم پر کمزوروں کو چیرنے پھاڑنے میں لگ جاتے ہیں۔"

"ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں چچا جان بلکہ ان سے بھی زیادہ بُرے اور وہ ہمارے آس پاس ہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب آپ کو کسی طرح کی گرم ہوا بھی نہ لگے۔"

میں لگا رہا اور میری کوشش کامیاب رہی۔ میں نے چچا کو عارضی طور پر مراد پور چھوڑنے اور اپنے ساتھ چلنے پر راضی کرلیا۔

☆☆☆

داؤد بھاؤ کے تعاون سے چند گھنٹوں کے اندر ہی لاہور کی ایک الگ تھلگ سوسائٹی میں ایک پُرسکون جگہ پر دس مرلے کا ایک گھر دستیاب ہوگیا۔ ایک دن کے اندر ہی یہاں ضرورتِ زندگی کی ہر شے فراہم کر دی گئی اور ایک نہایت قابلِ بھروسا، چاق و چوبند ملازم بھی جو ہر وقت چچا حفیظ کا خیال رکھ سکے۔

اس کے بعد میں اپنے چچا زاد ولید سے ملنے کے لیے کوٹ لکھپت جیل پہنچا۔ میرے اور شکیل داراب میں ہونے والے معاہدے کے بعد ولید کو جیل میں بی کلاس تو شروع میں ہی مل گئی تھی۔ داؤد بھاؤ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اسے دیگر سہولیات بھی ملتی رہتی تھیں۔ پھر بھی جیل تو جیل ہوتی ہے۔ ولید جلد باہر آنا چاہتا تھا، اپنی ماں اور بہن کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنا بھی اس کا اہم ترین مشن تھا اور وہ جتنا جذباتی اور غصے والا تھا...... میرے خیال میں فی الحال اس کا جیل میں رہنا ہی بہتر تھا۔

درحقیقت فائزہ اور چچی آمنہ کے قتل کا سب سے بڑا مجرم لالہ نظام تو اپنے کیے کی سزا پا چکا تھا۔ اسے میں نے ہی ہیوی لوڈر کے نیچے کچل کر جہنم واصل کیا تھا۔ اس "المناک حادثے" میں انسپکٹر قیصر چودھری بھی شدید زخمی ہوا تھا اور میری اطلاعات کے مطابق وہ اب تک صاحبِ فراش تھا۔ رہ گیا شکیل داراب تو وہ بھی میری ہٹ لسٹ پر تھا۔ ان دو افراد کو ہلاک کیے بغیر تو شاید مجھے موت بھی نہ آتی۔ اگر ٹیکساری گینگ یہاں لاہور میں وارد نہ ہوتا تو عین ممکن تھا کہ اب تک شکیل داراب سے میرے دو دو ہاتھ ہو چکے ہوتے۔

ولید سے ملنے اور اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد میں نے خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اس روز میں نے ڈنمارک میں اپنے ایک پرانے دوست کے ذریعے اپنے والدین کی خیر خیریت بھی دریافت کی اور اسے ان کے بارے میں ضروری ہدایات دیں۔ میں انہیں ملنے کی شدید خواہش رکھتا تھا مگر فی الحال خود ان سے رابطہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی میں ان کی بھلائی تھی اور میری بھی۔

رات تک میں ذہنی طور پر اس کام کے لیے تیار ہو چکا تھا جس کا خاکہ پچھلے کئی دنوں سے میرے اندر ترتیب پا رہا تھا۔ میں ٹیکساری گینگ کے بدترین خوف کے سائے میں وقت گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ جان ڈیرک نے ڈیتھ اسکواڈ کا شیطانی ٹولا مجھ پر اسی طرح چھوڑا تھا جیسے کسی جانور پر خونخوار شکاری کتوں کا غول چھوڑا جاتا ہے۔ انہوں نے لاہور میں مجھے پالیا تھا لیکن میں لاہور میں ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا...... اور ان کے سامنے نکلنا چاہتا تھا۔

داؤد بھاؤ میرا رمز شناس ہوتا جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔ میں اس سے کہتا تو وہ خطرناک گینگسٹرز بیسیوں کی تعداد میں میرے لیے مہیا کر دیتا مگر مجھے صرف دس بارہ نڈر شوٹرز درکار تھے۔ داؤد بھاؤ نے چند گھنٹوں کے اندر میرے مطلوبہ لوگ مہیا کر دیے۔ ان میں خود جھارا بھی شامل تھا (یہی جھارا تھا، جس نے یہاں سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور لالہ موسیٰ کے قریبی گاؤں سکھیرا میں سیف مرحوم سے بھی دشمنی بنا رکھی تھی، بہرحال، فی الوقت وہ میرا ساتھی تھا)

داؤد بھاؤ کے اسنوکر کلب کے زیریں تہ خانوں میں ناجائز اسلحے کی کمی نہیں تھی۔ ایک طرح سے یہ اسلحے کا گودام تھا۔ نیا اور پرانا اسلحہ تہ خانوں میں اوپر تک بھرا ہوا تھا۔ ان میں آٹومیٹک اور سیمی آٹومیٹک رائفلوں کے علاوہ ہینڈ گرینیڈ اور چھوٹے راکٹ لانچر تک موجود تھے۔ ایمونیشن کی پیٹیاں ایک علیحدہ تہ خانے میں بھری تھیں اور ان پر باقاعدہ لیبل لگے ہوئے تھے جو "کیلے بر" اور تعداد کی نشاندہی کرتے تھے۔ شام تک میرے درجن بھر ساتھی کیل کانٹے سے لیس ہو چکے تھے۔ وہ سب پُرجوش تھے...... اور ان میں سب سے زیادہ پُرجوش مختار جھارا تھا۔ بظاہر اس سوکھے سڑے بندے کے اندر بے پناہ آگ چھپی ہوئی تھی۔ درحقیقت ان سب "قریباً ایک درجن بندوں" کا شمار داؤد بھاؤ کے مانے ہوئے شوٹرز میں ہوتا تھا۔ ان میں دو بندے سابقہ پولیس اہلکار تھے اور اپنی سروس کے دوران میں ان کاؤنٹرز کے ماہر جانے جاتے تھے۔ دو شوٹرز کا تعلق انڈیا سے تھا۔ ان میں سے ایک کا نام واصف خاں تھا اور وہ عرصے سے انڈین

پولیس اور بی ایس ایف کو مطلوب تھا۔ یہ سب لوگ داؤد بھاؤ کو اپنا بگ بس مانتے تھے۔

داؤد بھاؤ نے ان سب کو بتا دیا تھا کہ ان کا واسطہ کن لوگوں سے پڑنے والا ہے اور انہیں کس طرح سے ہینڈل کرنا ہے۔ میرے اندر بھڑکی ہوئی آگ نے بھی ان شوٹرز کو اعتماد بخشا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ داؤد بھاؤ نے انہیں جس شخص کی کمان میں دیا ہے، وہ ایسی معرکہ آرائیوں اور ایسے میدانوں کا پرانا کھلاڑی ہے۔ مجھے افسوس صرف ایک بات کا تھا۔ انیق کہیں نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی اس سے رابطہ ہو سکا تھا۔

☆☆☆

شام چھ بجے کے بعد ہم لاہور کی سڑکوں پر نکل کھڑے ہوئے۔ میں اپنی سوزوکی سوئفٹ میں اکیلا ہی سوار تھا۔ میرے ساتھیوں کی گاڑیاں مجھ سے کچھ فاصلے پر تھیں، وہ مجھ پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھے۔ سیل فون پر دونوں گاڑیوں سے میرا رابطہ تھا۔ وائرلیس ائرفون میرے کان میں تھا اور میں اپنے ہاتھوں کو استعمال کیے بغیر اپنے شوٹرز کے علاوہ داؤد بھاؤ سے بھی رابطہ رکھے ہوئے تھا۔

''اس وقت کہاں ہو شاہی؟'' داؤد بھاؤ کی پاٹ دار آواز میرے کان میں گونجی۔

''میکلوڈ روڈ سے گزر رہا ہوں۔ یہاں سے دائیں ٹرن لوں گا تو شاید شاہراہ قائداعظم آجائے گی۔''

''ہاں ایسا ہی ہے مگر لکشمی چوک کی طرف نہیں جانا، وہاں ٹریفک جام مل سکتا ہے۔ وہ ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''لکشمی چوک وہی ہے ناں، جہاں بہت سے سینماز ہیں؟''

''بالکل، وہاں اس وقت شوز ٹوٹتے ہیں اور گھڑمس (ہجوم) ہو جاتا ہے۔ مجھے اس بے ڈھنگے پر غصہ آرہا ہے۔ پتا نہیں کہ کہاں دفان ہو گیا ہے۔ اس وقت اسے تمہارے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔'' بے ڈھنگے کا لقب داؤد بھاؤ، انیق کے لیے استعمال کرتا تھا۔

''وہ بھاگنے والا تو نہیں ہے داؤد بھاؤ۔ مجھے فکر ہے کہ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔''

''آخری بار کب ملا تھا تمہیں؟''

''جب میں مراد پور جا رہا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ چلو میرے ساتھ مگر کنی کترا گیا۔ کہہ رہا تھا کہ ایک ضروری کام ہے۔''

''جب اسے کوئی بہانہ کرنا ہو تو ضروری کام فوراً اس پر نازل ہو جاتا ہے۔ آکر تمہیں بتائے گا کہ اس کی ایک نانی لاہور میں رہتی ہے، وہ بیمار تھی اس کی تیمارداری کرنے گیا تھا۔ حالانکہ یہ نانی پہلے بھی کئی بار شدید بیمار ہو چکی ہے اور دو تین دفعہ مر بھی چکی ہے۔'' داؤد بھاؤ کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''داؤد بھاؤ! شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے میں دیکھ لیا جاؤں تو بہتر ہے۔ ورنہ مشکل ہو جائے گی۔''

''یار! لاہور جاگتا ہوا شہر ہے۔ رات ڈیڑھ دو بجے تک بھی بعض علاقوں میں رونق رہتی ہے...... میرا تو یہی اندازہ ہے کہ آج تم لوگوں کی مڈبھیڑ ہو ہی جائے گی۔''

''اللہ کرے۔'' میں نے گاڑی کو شاہراہ قائداعظم کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''جو بلٹ پروف جیکٹ میں نے تمہیں دی ہے، یہ میرے ذاتی استعمال کی ہے۔ بڑے کمال کی جیکٹ ہے۔ باڈی کو نیچے تک ڈھانپتی ہے۔ ایل ایم جی، ایم ایم جی اور کلاشنکوف وغیرہ کو آسانی سے جھیل لیتی ہے۔'' داؤد بھاؤ نے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سائز میں کھلی تو نہیں؟'' داؤد بھاؤ نے پوچھا۔

''نہیں، ٹھیک ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

درحقیقت جیکٹ میرے پاس تھی ہی نہیں۔ جو شوٹرز داؤد بھاؤ نے میرے ساتھ بھیجے تھے، ان میں سے ایک کی جیکٹ اتنی تنگ تھی کہ وہ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی والی جیکٹ اسے پہنا دی تھی اور رازداری کا پابند بھی کر دیا تھا۔

داؤد بھاؤ کی کال ختم ہوئی تو پیچھے آتے ہوئے مختار جھارا سے رابطہ ہو گیا، وہ ذرا ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''ماسٹر شاہ زیب! ایک اسٹیشن وین پیچھے آرہی ہے۔ نیلا رنگ ہے۔ لاہور کا نمبر ہے۔ لگتا ہے کہ ان لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔''

میں نے عقب نما آئینے میں نگاہ دوڑائی۔ نیلی اسٹیشن وین کی جھلک دکھائی دی۔ وہ گاڑیوں میں سے راستہ بناتی نزدیک پہنچ رہی تھی۔ اگر یہ واقعی وہی تھے تو میں ایک بار پھر بھری پُری سڑک پر تھا...... یعنی ایک نامناسب جگہ پر۔

میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ میرے رگ و پٹھے تن گئے۔ دھڑکن بڑھ گئی۔ میری ... بظاہر عام سی نظر آنے والی گاڑی عام نہیں تھی۔ اس میں موجود جدید اسلحے نے اسے عام نہیں رہنے دیا تھا۔ ایک امریکن ایل ایم جی میری نشست

کے نیچے موجود تھی اور ایک چھوٹی نال کی روسی رائفل نشست کے عقب میں کارپٹ کے نیچے اس طرح چھپائی گئی تھی کہ ایک کھٹکا دباتے ہی وہ میرے ہاتھوں میں پہنچ سکتی تھی۔ بائیں طرف والی نشست کے اندر ایمونیشن بھرا ہوا تھا۔ دونوں رائفلوں کے کم از کم چودہ بھرے ہوئے میگزین اس نشست کے اندرونی خلا میں چھپائے گئے تھے۔ گولیوں کے دو علیحدہ ڈبے بھی گاڑی میں موجود تھے۔

میں نے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور نہر کی طرف جانا شروع کر دیا۔ ابھی میں قریباً ایک کلومیٹر ہی آگے گیا تھا کہ نیلی اسٹیشن وین نے موڑ کاٹا اور فاطمہ جناح روڈ کی طرف مڑ گئے۔ جھارے کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''نہیں ماسٹر شاہ زیب! شک درست نہیں تھا، گاڑی دوسری طرف چلی گئی ہے۔''

''ہاں، میں نے دیکھ لیا ہے۔ پوری طرح الرٹ رہو۔ میں اب یوٹرن لے کر جیل روڈ کی طرف نکل رہا ہوں۔ وہاں کسی مصروف جگہ رکوں گا اور گاڑی کا بونٹ اٹھا کر پندرہ بیس منٹ گاڑی سے باہر ہی گزاروں گا۔''

''او کے ماسٹر! ہم آپ کے آس پاس موجود ہیں۔'' مختار جھارے کی تیز تیکھی آواز آئی۔

''انیق کی طرف سے تو کوئی رابطہ نہیں ہوا؟''

''نہیں جی، میں خود بھی کئی بار کوشش کر چکا ہوں۔ وہ کسی مشکل میں نہ پڑ گیا ہو۔''

اگلے قریباً دو گھنٹے لاہور کی مختلف سڑکوں پر ہی گزرے میں نے کئی بارونق جگہوں پر گاڑی روکی بھی۔ مختلف بہانوں سے پیدل بھی گھوما پھرا لیکن وہ مقصد حاصل نہیں ہوا جس کے لیے میں یہ سب کچھ کر رہا تھا۔

داؤد بھاؤ نے مجھے لاہور کی دو تین ایسی جگہوں کا بتایا ہوا تھا جہاں عموماً جرائم پیشہ افراد کی آمدورفت ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک تو لاہور کا معروف ریستوران تھا جہاں دیسی گھی میں پکا ہوا مٹن بڑے اہتمام سے سرو کیا جاتا تھا۔ ایک جوا خانہ تھا اور پھر بادشاہی مسجد کا ایک نواحی علاقہ تھا جہاں بڑے عالی شان چوباروں میں نہایت ''ہائی کلاس'' بدمعاشوں کی آمدورفت ہوتی تھی۔

معروف ریستوران کے اوپن ائیر پورشن میں ڈنر کے بعد میں ایک بار پھر اپنے غیر ملکی دشمنوں کو دعوتِ مبارزت دینے نکل کھڑا ہوا۔ کل تک میرا اور داؤد بھاؤ کا خیال بھی یہی تھا کہ وہ لاہور میں جگہ جگہ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے اور میں جونہی اپنی زیرِزمین پناہ گاہ سے نکلوں گا، وہ مجھ پر جھپٹ پڑیں گے مگر آج صورتِ حال کا ایک اور نقشہ سامنے آرہا تھا۔ ابھی تک کوئی ری ایکشن نہیں ہوا تھا۔

داؤد بھاؤ کی آواز میرے ہی فون میں گونجی۔ ''کہیں ایسا تو نہیں شاہی کہ وہ لاہور سے جا چکے ہوں؟''

''نہیں داؤد بھاؤ! وہ اتنی جلدی تو جان چھوڑنے والے نہیں۔''

''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ جان چکے ہوں کہ تم اکیلے نہیں ہو۔'' داؤد بھاؤ نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں بھاؤ! وہ کمینے ان باتوں کو خاطر میں لانے والے بھی نہیں۔'' میں نے گاڑی کو لاہور کی معروف شاہراہ ڈیوس روڈ کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ اب رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہوا میں ہلکی خنکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔

میں ایک پولیس ناکے کے پاس سے گزرا۔ وہاں سے گزرتے ہی نگاہوں میں وہ مناظر تازہ ہو گئے جب چند روز پہلے ایک ایسے ہی بے ہودہ ناکے کی وجہ سے مجھے اپنا رخ سنسان علاقے سے گنجان علاقے مغل پورہ کی طرف کرنا پڑا تھا اور نتیجے میں بیس سے زائد بے گناہ شہری ڈیتھ اسکواڈ کی اندھی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ رگوں میں ایک بار پھر خون کھول کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اغوا شدہ اداکارہ کا تصور بھی ذہن کو کچوکے لگانے لگا۔

گاڑی کا ریڈیو آن تھا۔ وقتاً فوقتاً نیوز بلیٹن بھی براڈ کاسٹ ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی بلیٹن میں چند روز پہلے ہونے والے قتلِ عام کا ذکر بھی ہوا۔ خبروں میں ابھی تک اس خونی واقعے کی بازگشت موجود تھی، پولیس ترجمان کی طرف سے کہا جا رہا تھا۔ ''ہم ذمے داروں تک پہنچنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ متعلقہ سفارت خانوں سے بھی رابطہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ کھوج لگانے کی کوشش بھی ہو رہی ہے کہ یہ غیر ملکی جن مقامی لوگوں پر حملہ آور ہوئے، وہ کون تھے۔ کچھ ایسی اطلاعات ملی ہیں کہ ان مقامی لوگوں کا تعلق زیرِزمین سرگرم گروہوں سے ہے۔ اس حوالے سے ایک دو مقامی گینگسٹرز کے نام بھی سامنے آرہے ہیں۔ تفتیش کار اس معاملے کا کوئی پہلو بھی نظرانداز نہیں کر رہے۔''

نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''ایک خبر یہ بھی ہے کہ غیر ملکی قاتل جس بندے کو نشانہ بنانا چاہتے تھے، یہ وہی شاہ زیب نامی شخص ہے جس پر کچھ عرصہ پہلے دہشت گردی کا ایک کیس بنا تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دراصل ایم ایم اے کا معروف کھلاڑی ایسٹرن ہے اور بدلے ہوئے بھیس

میں یہاں موجود ہے۔''

یہ سب رسمی باتیں تھیں اور لگی بندھی اطلاعات تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے لوگوں سے ٹکرانا، کم از کم مقامی پولیس کے بس کا روگ نہیں۔ قانون نافذ کرنے والے دیگر اداروں کی کارکردگی میرے علم میں نہیں تھی۔ ان غیر ملکی قاتلوں کا طریقہ کار بے حد مختلف تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ جنونی پیشہ ور تھے۔

اچانک میرے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ میں چونک گیا، یہ انیق کا نمبر تھا جو مسلسل بند جا رہا تھا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کی۔ ائرفون کے ذریعے میرے کان میں انیق کی آواز گونجی۔ ''کہاں ہیں شاہ زیب بھائی؟''

''اپنا سر پیٹ رہا ہوں گاڑی میں بیٹھ کر اور تمہاری جان کو رو رہا ہوں۔ کہاں دفع ہو گئے ہو؟''

''آپ ہی کے لیے دفع ہوا تھا اور آپ ہی کے لیے واپس آیا ہوں۔ کچھ سن تو لیں مجھ ناہنجار کی۔''

''سناؤ۔'' میں نے گاڑی کو ایک راؤنڈا باؤٹ پر موڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا داؤد بھاؤ کہاں ہیں؟'' اس نے دبے لہجے میں پوچھا۔

''انہوں نے تمہارے وارنٹ نکالے ہوئے ہیں۔ بے نقط کی سنا رہے ہیں تم کو۔''

''مگر پاس تو نہیں ہیں ناں؟''

''نہیں، تم بکو۔''

''انشاء اللہ ابھی آپ کو اپنے یہ الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔ بڑی دھانسو اطلاع ہے آپ کے لیے۔ فلم مغلِ اعظم میں ایک ایسی ہی اطلاع ایک خادم نے جہانگیر کو دی تھی اور جہانگیر نے اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا تھا۔ بعد میں سنسر بورڈ والوں نے یہ سین ہی نکلوا دیا......''

''اچھا ٹرٹر بند کرو، کیا اطلاع ہے؟''

''آپ کے دشمنوں کا کھوج لگا لیا ہے میں نے۔ اس سے پہلے کہ وہ آپ کو ڈھونڈتے، میں نے انہیں ڈھونڈ لیا ہے۔ آپ فوراً پی سی ہوٹل پہنچیں۔ میں آپ سے ساری معلومات شیئر کرتا ہوں لیکن آپ بالکل اکیلے آئیں...... اور بھاؤ جی کو تو بالکل پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ ''دیکھو انیق! کوئی اونگی بونگی نہ مارنا۔ یہ بڑا اسیریس معاملہ ہے۔''

''سیریس کیوں نہیں جی۔ ہمارے بیس شہری جاں بحق ہوئے ہیں۔ درجنوں زخمی ہیں۔ خون کی ہولی کھیلی گئی ہے۔''

''تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟''

''زیادہ دور نہیں ہوں آپ سے۔ بس آپ دیر نہ کریں۔ فوراً پہنچ جائیں۔'' انیق کے لہجے میں ہیجانی کیفیت تھی۔

اب انیق کے لب و لہجے کو میں بڑی اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اس کے اندر سے ایک نہایت سنجیدہ انسان بولتا تھا۔ جیسے کہ اب بول رہا تھا۔ اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں نے مختار جھارا سے رابطہ کیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

وہ بولا۔ ''آپ کے پیچھے ہی آ رہے ہیں ماسٹر۔''

''میرا خیال ہے کہ آج کی سڑک پیمائی اب ختم کر دیں۔ کافی ٹائم ہو گیا ہے۔ کل پھر کوشش کرلیں گے۔''

جھارے نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ ''جیسے آپ کی مرضی ماسٹر۔''

''ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ داؤد بھاؤ کو میں خود بتا دیتا ہوں۔''

جھارے سے بات کرنے کے بعد میں نے داؤد بھاؤ سے رابطہ کیا اور اسے بھی آگاہ کر دیا کہ اب ہم گھومنا پھرنا ختم کر رہے ہیں۔ میں تھوڑی دیر میں واپس کلب پہنچ جاتا ہوں۔''

میں اس وقت کینال بینک روڈ سے گزر رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار پہلے تیز اور پھر آہستہ کرنے کے بعد میں نے تسلی کر لی کہ مختار جھارا اپنے شوٹرز سمیت واپس اسنوکر کلب پہنچ چکا ہے، تب میں نے سوزوکی سوئفٹ کا رخ پی سی ہوٹل کی طرف موڑ دیا۔

☆☆☆

قریباً بیس منٹ بعد میں اور انیق پی سی ہوٹل کے بخارا ہال میں ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ انیق نے کہا۔ ''قدرت کبھی کبھی اپنے ہونے کے بڑے ٹھوس اور واضح ثبوت دیتی ہے۔ کسی بندے کے سر میں تین گولیاں لگیں اور چوتھی سینے پر، وہ پھر بھی زندہ رہے۔ کیسی بات ہے؟''

''کس فلم کی بات کر رہے ہو؟''

''حقیقت بیان کر رہا ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ ہائی وے پولیس کا ایک سارجنٹ فیروز خاں ہے۔ اچھی شہرت کا مالک نہیں۔ وہ اپنی ہیوی موٹر سائیکل پر تھا۔ کسی نے اس کا پیچھا کر کے اسے پانچ فائر مارے، جن میں سے چار اسے لگے۔ وہ لوگ اسے مردہ چھوڑ کر چلے گئے لیکن وہ اب تک زندہ ہے بلکہ اپنا بیان بھی قلمبند کرا چکا

ہے۔''

''ڈیتھ اسکواڈ والے معاملے سے اس کا کیا تعلق؟''

''اسی سے تو تعلق ہے حضور والا۔ فیروز خاں ان افسروں میں شامل تھا جو راشی گردانے جاتے ہیں اور وہ واقعی رشوت خور بھی ہے، لیکن پرسوں رات اس نے جو کچھ کیا، وہ سننے کے لائق ہے اور قابلِ قدر ہے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ چند دن پہلے لاہور کے معروف علاقے میں قتلِ عام کرنے والے غیر ملکی ہمیں کہاں مل سکتے ہیں اور ان کے ارادے کس طرح کے ہیں۔''

''شروع سے بتاؤ گے تو کچھ پتا چلے گا۔''

جواب میں انیق نے مختصر الفاظ میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ پرسوں رات کو دریائے راوی کے پل کے قریب ایک ایسا ٹرک پکڑا گیا جس میں بظاہر تو بجری بھری ہوئی تھی مگر بجری کے نیچے بھاری مقدار میں اسلحہ اور بارودی سامان موجود تھا۔ اس ٹرک کو جن دو سارجنٹس نے چیک کیا، ان کے نام فیروز خاں اور شوکت واہلہ تھے۔ دونوں ہی مک مکا کے ماہر تھے۔ موقع پر شوکت واہلہ موجود تھا۔ اس نے اتنے خطرناک اور قیمتی سامان سے نظر پوشی کرنے کے لیے بھاری رشوت موقع پر ہی وصول کر لی۔ یہ ڈالرز کی شکل میں تھی۔ اسی دوران میں واہلہ کا ''کرپٹ'' ساتھی فیروز خاں بھی پہنچ گیا۔ ٹرک کے ساتھ ایک لگژری جیپ بھی تھی۔ مک مکا کرنے والے افراد اسی جیپ میں موجود تھے۔ جب جیپ اور ٹرک لاہور میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھے تو فیروز خاں پر انکشاف ہوا کہ انہیں ڈالرز کی شکل میں تقریباً 20 لاکھ روپے کی خطیر رقم دینے والوں میں دو غیر ملکی بھی ہیں، اس کا دھیان فوراً چند دن پہلے مغلپورہ کے علاقے میں ہونے والے خونی واقعے کی طرف چلا گیا جس میں بیس شہری جان سے گئے تھے۔ اس کو شک ہوا کہ کہیں ان لوگوں کا تعلق اسی گردہ سے نہ ہو۔ اس کے علاوہ فیروز خاں کو جس چیز نے سب سے زیادہ تکلیف دی، وہ ایک پرانے فقرے کی بازگشت تھی۔ امریکی زبان درازوں کی طرف سے کہا جانے والا یہ وہ فقرہ ہے جو بے شمار لوگوں کے دلوں میں زہریلے خنجر کی نوک سے کندہ ہو چکا ہے۔ افغان امریکا جنگ کے دوران میں اپنے مطلوبہ لوگوں کو تلاش کرتے ہوئے کسی بدبخت امریکی نے مقامی مسلمانوں اور قبائلیوں کے حوالے سے یہ کہا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو پیسے کے لیے اپنی ماؤں تک کو بیچ دیتے ہیں۔ یہ فقرہ فیروز خاں کے دل دماغ پر آتشیں حروف میں نقش تھا۔ بے شک اس کا ضمیر نیم مردہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو بے دردی سے لوٹتا تھا لیکن جب اس کے ہاتھ میں ایک غیر ملکی کی دی ہوئی رشوت کے ڈالرز آئے تو اس کے اندر آگ بھڑک گئی۔ اس نے اپنے پارٹنر سارجنٹ شوکت واہلہ سے کہا کہ وہ لاہور میں اس ٹرک کی آمد کی اطلاع حکامِ بالا تک پہنچائے گا۔ ہاں کچھ لمحے ایسے ہی ''کایا پلٹ'' ہوتے ہیں۔ دونوں دوستوں میں اس معاملے پر شدید تکرار ہو گئی۔ اس تکرار کے دوران میں ہی فیروز خاں نے سفید جیپ اور بجری والے ٹرک کے پیچھے اپنی بائیک لگا دی۔ جلد ہی اس نے دونوں گاڑیوں کو لوئر مال روڈ پر جا لیا۔ سارجنٹ واہلہ بھی اپنی سرکاری موٹر بائیک پر مسلسل اس کے ساتھ تھا اور اسے اس ''حرکت'' سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا...... ساتھ ساتھ اسے ماں بہن کی گالیاں بھی دے رہا تھا۔ یہ رات کے دو بجے کا عمل تھا جب یہ لوگ سفید جیپ کا تعاقب کرتے اس نالے کے کنارے جا رہے تھے جو شاہراہ قائدِ اعظم کو جیل روڈ سے ملاتا ہے اور سنسان علاقے سے گزرتا ہے، سارجنٹ واہلہ نے فیروز خاں کو اپنے 38 بور پستول سے شوٹ کر دیا۔ بعد ازاں صرف دس فٹ کے فاصلے سے اس کے سر اور سینے میں مزید تین گولیاں اتار دیں۔ وہ اسے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا لیکن یہاں ایک کرشمہ ہوا۔ سر میں تین گولیاں لگنے کے باوجود فیروز خاں زندہ رہا۔

انیق نے کہا۔ ''پرسوں رات ڈھائی بجے کے لگ بھگ میرے ایک پرانے ساتھی شاہد بٹ کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ اسے جیل روڈ کی بغلی سڑک پر نالے کے کنارے جھاڑ جھنکاڑ میں ایک زخمی پولیس والا شدید زخمی حالت میں ملا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اسے کسی سرکاری اسپتال میں نہ لے جایا جائے کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ میرے کہنے پر شاہد بٹ جو ایک سیاسی ورکر بھی ہے، مضروب سارجنٹ کو ایک پرائیویٹ کلینک میں لے گیا۔ اب سارجنٹ بے ہوش ہو چکا تھا۔ تب تک کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس معاملے کا تعلق آپ والے ڈیتھ اسکواڈ سے نکل آئے گا۔''

''کیا فیروز خاں نے کوئی بیان دیا ہے؟''

''بالکل دیا ہے جی...... اور میرے پاس ریکارڈ شدہ موجود ہے۔ یہ بیان میں نے کل ریکارڈ کیا تھا اور اس کے فوراً بعد مجھے امید پیدا ہو گئی تھی کہ میں آپ کو کوئی تہلکہ خیز خبر مہیا کر سکوں گا۔''

''اور وہ خبر کیا ہے؟''

''خبر یہ ہے کہ آپ کے پیچھے ڈنمارک سے یہاں پہنچنے والا وہ شیطانی ٹولا اس وقت اٹلی کے ایک سابق قونصلیٹ کی

نجی رہائش گاہ پر موجود ہے، وہاں دو چار اور پرانے ڈپلومیٹس بھی موجود ہیں۔ دراصل کل دوپہر فیروز خاں کچھ دیر کے لیے ہوش میں آیا تھا اور اس نے ہمیں نہ صرف سفید لگژری جیپ کا نمبر بھی مہیا کر دیا تھا بلکہ اس مختصر علاقے کی نشاندہی بھی کردی تھی جہاں وہ جیپ پائی جاسکتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ پولیس کو ''انوالو'' کیے بغیر میں اور میرے ساتھی اس جیپ تک اور جیپ والوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔''

انیق نے ایک نگاہ اپنی رسٹ واچ پر ڈالی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''سابق قونصلیٹ جواب لاہور میں ایک کاروباری شخص کی حیثیت سے موجود ہے، اپنے بارہ کینال کے شاندار گھر میں پایا جارہا ہے۔ میری اطلاعات کے عین مطابق آج رات اس وسیع گھر میں کوئی تقریب بھی ہورہی ہے۔''

''کیسی تقریب؟''

''غالب گمان یہی ہے کہ کوئی سالگرہ قسم کی تقریب۔ لاہور کی ایک مہنگی ترین بیکری سے ایک بڑا کیک بن کر اس چار دیواری میں گیا ہے یا جانے والا ہے۔ میں نے جو مخبر چھوڑ رکھے تھے انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر یہ معلومات اکٹھی کی ہیں جناب۔''

''بات تو تم واقعی بہت بڑی کر رہے ہو لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ اسلحے والا ٹرک اس کوٹھی میں گیا اور ڈیتھ اسکواڈ کے شوٹر بھی وہاں موجود ہیں۔''

''سو میں سے چورانویں پچانویں نمبر کم نہیں ہوتے جناب! اور مجھے پچانویں فیصد یقین ہے کہ وہ دس پندرہ غیر ملکی قاتل بھی اس وقت اسی چار دیواری میں موجود ہیں۔ اسلحے کی موجودگی کے بارے میں یقین کی شرح کچھ کم ہے مگر پھر بھی ستر پچھتر فیصد سے کم نہیں۔'' انیق کی آواز میں جوش تھا۔ اس نے عمارت کا نمبر 18-A بتایا۔

انیق کسی تقریب کی بات کر رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اسی خاص تقریب کی وجہ سے آج ہمیں تلاش کرنے والے لوگ ''فیلڈ'' میں نہ ہوں...... یا دوسرے لفظوں میں چھٹی منا رہے ہوں۔ ورنہ جس طرح میں پچھلے چھ سات گھنٹوں سے مسلسل کھلے عام شہر میں گھوم رہا تھا کہیں نہ کہیں میرا اٹا کرا، میرا کھوج لگانے والوں سے ہو جانا چاہیے تھا۔

اسی دوران میں انیق کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کا کوئی مخبر ہی تھا۔ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے انیق نے کہا۔ ''کب ہوا یہ؟''

دوسری طرف کا جواب سننے کے بعد وہ بولا۔ ''دیکھو اس معاملے کا داؤ د بھاؤ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے ان کو کسی طرح کی خبر نہیں ہونی چاہیے...... او کے...... او کے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ میری طرف ذرا اداسی سے دیکھ کر بولا۔ ''فیروز خاں نے دم توڑ دیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ جاتے جاتے وہ اپنے بہت سے گناہوں کا کفارہ ادا کر گیا ہے۔''

''اب کیا کرنا ہے انیق؟'' میں نے بھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کو بتانا ہے۔''

''کیا ہمیں پولیس وغیرہ کو 'انوالو' کرنا چاہیے؟''

''آپ اب پاکستان میں کوئی نئے نئے نہیں ہیں۔ یہاں کی پولیس کا حال آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ پولیس کو اطلاع دینے سے تو بہتر ہے کہ پھر داؤ د بھاؤ کو انفارم کر دیا جائے اور ہاؤس نمبر اٹھارہ پر زوردار چڑھائی کر دی جائے چالیس پچاس لوگوں کے ساتھ۔''

''لیکن بات تو پھر وہی مارا ماری اور خونریزی کی آجائے گی۔ جیسا کہ تم بتا رہے ہو، وہ ایک رہائشی علاقہ ہے پاس ہی ایک اولڈ ہاؤس بھی ہے۔''

''تو پھر کیا کہتے ہیں آپ...... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں۔ زیادہ ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔''

میری نگاہوں میں ایک بار پھر ان بیس بے گناہوں کی خونچکاں لاشیں آگئیں جنہیں ویک اینڈ کی ایک سہانی شام میں گولیوں سے بھون ڈالا گیا تھا اور پھر وہ خوبرو اداکارہ جو جرم بے گناہی میں بدترین صورتِ حال کا شکار ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں کہ زندہ بھی تھی یا نہیں۔ اخبارات میں اور میڈیا پر اس کے بارے میں بہت شور تھا۔ اس شور کی وجہ سے اس سارے واقعے کی اہمیت کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ میں نے وہیں پی سی ہوٹل کے ہال میں انیق کے سامنے بیٹھے بیٹھے براہِ راست ایکشن کا فیصلہ کیا اور اپنے پلان کو حتمی شکل دینے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں نے جلدی سے پھر اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ آج جون کی 10 تاریخ تھی...... ایک دھندسی تھی جو چھٹ گئی۔ مجھے یہ تاریخ اچھی طرح یاد تھی۔ یہ میرے اولین دشمن جان ڈیرک کی سالگرہ کا دن تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ سالگرہ جان ڈیرک رات گئے چار بج کر پچیس منٹ پر مناتا تھا۔ یہی وہ شبھ گھڑی تھی جب یہ شخص اپنی تمام تر نحوست لے کر اس دنیا میں آیا تھا۔ اب مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے انیق

نے جس خاص قسم کے کیک کا ذکر کیا ہے، وہ کس ٹائپ کا ہے اور اس میں کیا ہوگا۔

میں نے انیق کی طرف دیکھا، وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میرے ذہن کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہا ہو، میں نے کہا۔ ''انیق ایک کام کرو جس انفارمر نے تمہیں سالگرہ کے کیک کے بارے میں اطلاع دی ہے، اس سے رابطہ کرو۔ اس سے پوچھو کہ وہ کیک ڈلیور ہو چکا ہے یا نہیں......''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو...... جلدی۔'' میں نے تحکم سے کہا تو انیق فوراً نمبر ملانے میں مصروف ہوگیا۔

میری ہدایت پر اس نے اپنے مخبر سے بات کی اور اسے کیک کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا۔

قریباً پانچ منٹ بعد اس شخص کی کال آگئی۔ میرے کہنے پر انیق نے سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا تاکہ میں بھی... سن سکوں۔

اس شخص کا نام ماجد تھا اور وہ لب و لہجے سے چوکس نظر آتا تھا۔ معروف بیکری میں اس کا کوئی دوست کک تھا جس سے وہ معلومات حاصل کر رہا تھا۔ مخبر ماجد نے انیق کو بتایا۔ ''میں نے پتا کیا ہے بھائی، کیک بن چکا ہے لیکن ابھی گھر پر پہنچایا نہیں گیا۔ بس بیس تیس منٹ میں روانہ ہو جائے گا۔ اس کے لیے ڈیڈ لائن 3:30am ہے۔''

''کیا بہت بڑا کیک ہے؟'' انیق نے پوچھا۔

''بہت بڑا تو نہیں بھائی لیکن چھوٹا بھی نہیں۔ چھ فٹ ضرب ڈیڑھ دو فٹ سائز ہوگا۔''

''کیا کسی خاص ''شیپ'' میں ہے؟'' انیق نے دریافت کیا۔

''اس کا تو پتا نہیں چل سکا۔ عام ورکرز سے چھپا کر بنایا گیا ہے۔ شاید خریدار کی طرف سے ہدایت تھی۔''

میں نے سرگوشی میں انیق سے کہا۔ ''اس سے پوچھو کیک بھیجا کیسے جائے گا؟''

جب انیق نے یہی سوال اپنے انفارمر ماجد سے کیا تو اس نے بتایا کہ بیکری کی ائرکنڈیشنڈ ڈلیوری وین خود لے کر جائے گی۔ جونہی کال ختم ہوئی، میں نے انیق سے کہا۔ ''اٹھو، ہمیں ابھی چلنا ہے۔''

''کہاں؟'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''اس بیکری پر پہنچنا ہے۔ زیادہ دور تو نہیں ہے؟''

''نہیں، یہاں سے تو بمشکل دس منٹ کا راستہ ہے لیکن پلان کیا ہے؟''

میں نے اسے مختصر الفاظ میں پلان سے آگاہ کیا۔ خطرناک منصوبہ بندی تھی، اس کے باوجود انیق کی آنکھوں میں جوش نظر آیا۔ عام قد کاٹھ کے اس اول جلول سے لڑکے کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کے اندر ایک نہایت قوی اور نڈر شخص چھپا بیٹھا ہے۔ وہ یوں ہی تو داؤ دبھاؤ کی آنکھوں میں تارا بن کر نہیں چمکتا تھا۔ بلا کا ذہین، بے شمار زبانیں جاننے والا، ایک گینگسٹر کا دستِ راست ہونے کے باوجود وہ شراب، سگریٹ پان حتیٰ کہ عورت سے بھی کوسوں دور تھا۔ اپنے ارگرد اس کی موجودگی مجھے ہمیشہ توانائی بخشتی تھی۔

میں پارکنگ میں موجود اپنی سوزوکی کار تک پہنچا جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ اسلحے اور ایمونیشن کا گودام بنی ہوئی تھی۔ میں نے اس میں سے چھوٹی نال کی نہایت طاقتور آٹومیٹک روسی رائفل نکالی۔ ساتھ میں دو کولٹ پسٹل لیے...... ان میں سے ایک پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ ایک دندانے دار خنجر میں نے اپنی پنڈلی سے منسلک کر لیا تھا۔

''یہ دیکھیں جی۔ یہ دو تین ''رک سیک'' بھی پڑے ہوئے ہیں۔'' انیق نے پچھلی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بے شک ان کی ضرورت ہے۔'' میں نے ایک ''رک سیک'' اپنی جھولی میں رکھتے ہوئے کہا۔ یہ نیلے رنگ کا مضبوط کینوس کا بنا ہوا تھا۔

میں نے رک سیک میں اپنی رائفل اور کولٹ پسٹلو کے قریباً تین سو فالتو راؤنڈز اور اضافی میگزین رکھے۔ اس کے علاوہ دو ہینڈ گرینیڈز بھی گھسا لیے۔

''چلو تم بھی راشن لے لو۔'' میں نے انیق سے کہا۔ راشن سے میری مراد اسلحہ ہی تھا۔

انیق نے بھی ضروری چیزیں اپنے ''رک سیک'' میں بھر لیں۔ ایک گارڈ ٹہلتا ہوا ہماری طرف آیا۔ گاڑی کے اندر جھانکا اور مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ گاڑی کے اندر کس قسم کا سامان ہے اور کیا تیاری ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے اسی گاڑی میں لاہور کے اندر کئی پولیس ناکوں پر سے بھی ''ہنسی خوشی'' گزر گیا تھا۔ قریباً پندرہ منٹ بعد ہم اس معروف بیکری کے سامنے کچھ فاصلے پر موجود تھے جہاں سے وہ خاص قسم کا کیک گلبرگ تین کے علاقے میں ہاؤس نمبر اٹھارہ میں ڈلیور ہونا تھا۔ انیق کا مخبر ساتھی ماجد پہلے سے ہی بیکری کے اندر موجود تھا اور انیق سے اس کا ٹیلی فونک رابطہ تھا۔ بیکری کا عظیم الشان کچن بیکری کے عقب میں

موجود تھا اور وہیں پر ساری پیکنگ وغیرہ ہوتی تھی۔

ہم دونوں انیق کی کورے گاڑی پر یہاں پہنچے تھے، اسلحے والے سوزوکی سوئفٹ میں نے پی سی ہوٹل کی پارکنگ میں ہی کھڑی رہنے دی تھی۔ پروگرام کے مطابق اسے بعد میں داؤد بھاؤ کے کسی کارندے کو وہاں سے لے جانا تھا۔

ہم بیکری سے قریباً نصف کلومیٹر دور سڑک کے ایک نسبتاً سنسان حصے میں موجود تھے۔ اب رات کے قریباً دو بج چکے تھے۔ ٹریفک ویسے بھی بہت کم ہو چکی تھی۔ اسی دوران میں انیق کے فون پر کال آئی۔ یہ ماجد ہی تھا اس نے بتایا۔ ''انیق بھائی، کیک کی ڈلیوری روانہ ہو رہی ہے۔ سفید رنگ کی وین ہے۔ نمبر 1920 ہے۔ بس نکل رہے ہیں وہ۔''

''کتنے بندے ہیں؟''

''دو...... ایک ڈرائیور، دوسرا ڈلیوری مین۔''

''او کے...... ہم دیکھ لیتے ہیں۔'' انیق نے کہا اور کال ختم کر دی۔

ڈلیوری وین کو اسی سڑک پر آنا تھا۔ تین چار منٹ بعد اس کی جھلک دکھائی دی۔ تیز روڈ لائٹس میں اس کی ساخت اور اس کا رنگ صاف پہچانے جا رہے تھے۔ وہ قریب پہنچی تو انیق نے عین اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کا راستہ روک لیا۔ اس کا انداز بڑا مصیبت زدہ تھا۔ اس نے اپنا بایاں بازو اس طرح تھام رکھا تھا جیسے کوئی شدید چوٹ لگی ہو۔ جونہی وین کی رفتار کم ہوئی اور ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے پی کیپ والے شخص نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارا، میں نے لپک کر دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا یا کر پاتا میرے ہاتھ کی نہایت جچی تلی ضرب اس کی کنپٹی پر لگی۔ یہ ضرب اسے آدھ پون گھنٹے کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے کے لیے کافی تھی۔

دوسری طرف انیق بھی ڈرائیور کے ساتھ اس سے ملتا جلتا سلوک کر چکا تھا۔ اس نے پستول کے دستے سے دو کراری ضربیں ڈرائیور کے سر پر لگائی تھیں اور اسے لمبا لٹا دیا تھا۔ تب اس نے ڈرائیور کو دھکیل کر ایک سائڈ پر کیا اور اسٹیئرنگ سنبھال کر وین کو آگے بڑھا دیا۔ یہ سارا عمل بمشکل سات آٹھ سیکنڈ کے اندر انجام پا گیا تھا۔ کچھ آگے جا کر ہم نے وین کو سڑک سے ہٹا کر ایک منی مارکیٹ کی پارکنگ میں کھڑا کر دیا۔ رات کے اس پہر مارکیٹ کی ساری پندرہ بیس دکانیں بند تھیں۔ ڈرائیور کے علاوہ ڈلیوری مین بھی بیکری کی مخصوص وردی میں تھا۔ سفید اپر، ہلکی براؤن پینٹ اور سفید پی کیپ۔ وین کا ڈرائیور مکمل سفید یونیفارم میں تھا۔ ہم نے ان دونوں کے جسموں پر صرف انڈرویئر رہنے دیے، باقی کپڑے اتار لیے۔ پہلے میں وین کے عقبی حصے میں گیا اور ڈلیوری مین والا لباس پہن کر سر پر پی کیپ سجالی۔ لباس تھوڑا سا تنگ تھا مگر گزارا ہو گیا۔

وہ لمبوترا باکس ائرکنڈیشنڈ وین میں موجود تھا جس میں اسپیشل کیک کی ''ہوم ڈلیوری'' کی جارہی تھی۔ نفیس گتے کے باکس کی لمبائی قریباً سات فٹ اور چوڑائی دو فٹ ہوگی۔ میں نے اسے کھولنے کا سوچا مگر پھر دیکھا کہ اسے باقاعدہ اسٹیکر لگا کر سیل کیا گیا تھا اور مہر وغیرہ لگائی گئی تھی۔ میں بہت حد تک جانتا تھا کہ اس باکس میں کیا ہوگا اس لیے زیادہ تجسس پیدا نہیں ہوا۔

میرے بعد انیق نے ڈرائیور والا لباس پہنا اور واپس کیبن میں آ گیا۔ بیکری کے دونوں ملازمین کے پاس ان کے شناختی اور سروس کارڈز موجود تھے، وہ ہم نے نکال کر اپنی جیبوں میں رکھ لیے۔ ڈرائیور نے کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ انیق نے اس کے منہ میں ٹشو پیپر کے کئی گولے گھسیڑ کر اوپر ٹیپ چپکا دی، اسی طرح اس کے ہاتھ پاؤں بھی پلاسٹک ٹیپ سے جکڑ دیے۔ دونوں افراد کو گارڈنیا کی ایک اونچی باڑ کے پیچھے اوجھل کر کے ہم دوبارہ وین میں آ گئے۔

میں نے انیق سے کہا۔ ''اپنا راشن نشست کے نیچے گھسیڑ دو۔ داخل ہوتے وقت چیکنگ ضرور ہوگی۔'' راشن سے میری مراد اسلحہ ہی تھا۔

انیق نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے بھی رائفل اور دونوں پسٹل عقبی نشست کے ایک خلا میں پہنچا دیے۔ ایمونیشن والا رک سیک میں پہلے ہی محفوظ کر چکا تھا۔

دل کی دھڑکن بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے پہلا مرحلہ کامیابی سے مکمل کر لیا تھا، اب دوسرا اور اہم ترین مرحلہ آ رہا تھا۔ ہم لاہور کی تقریباً خالی سڑکوں سے گزرتے ہوئے کچھ ہی دیر میں گلبرگ تین کے ہاؤس نمبر اٹھارہ کے سامنے پہنچ گئے۔ درختوں میں گھری ہوئی تقریباً آٹھ فٹ اونچی چار دیواری ہمارے سامنے تھی۔ ایک جہازی سائز کا گیٹ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ایک پولیس موبائل بہت دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی ہمارے قریب سے گزر گئی۔ میرے اشارے پر انیق نے وین کا ہارن بجایا۔ کسی نے گیٹ کے ایک چوکور خلا سے باہر جھانکا اور پھر چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ یہ ہاؤس نمبر اٹھارہ کا مسلح گارڈ تھا۔ شاید کوئی سابق فوجی۔ میں نے ڈلیوری مین کا نظر والا چشمہ لگا لیا۔

ڈرائیور کی یونیفارم انیق کو ذرا کھلی تھی مگر انیق نے

اسے اس طرح اپنی بغلوں اور رانوں کے نیچے دبایا ہوا تھا کہ وہ جسم سے پیچ کر گئی تھی۔ ہاں انیق کو وین سے نیچے اترنا پڑتا تو پھر یہ یونیفارم مشکوک ٹھہر سکتی تھی۔ چوکس گارڈ نے انیق سے سوال جواب کیے۔ اس کا سروس کارڈ دیکھا۔ وین کے کیبن پر طائرانہ نظر دوڑائی اور پھر اندر موجود گارڈز کو اشارہ کیا۔ انہوں نے جہازی سائز گیٹ ہمارے داخلے کے لیے کھول دیا۔

ایسی کشادہ عمارتوں میں عموماً اصل عمارت احاطے کے درمیان ہوتی ہے اور عمارت کے اردگرد اوپن ایریا چھوڑ دیا جاتا ہے مگر یہاں عمارت درمیان کے بجائے عقبی چار دیواری کے ساتھ تھی اور سامنے وسیع وعریض احاطہ تھا جسے کئی حصوں میں تقسیم کر کے اس میں گھاس کے قطعے بنائے گئے تھے۔ جگہ جگہ سایہ دار اور پھل دار درخت بھی دکھائی دیتے تھے۔ ''ڈرائیووے'' خاصا طویل تھا۔ یہاں بھی اِکا دُکا گارڈز نظر آرہے تھے۔

''بڑا سناٹا ہے۔ کوئی مر تو نہیں گیا۔'' انیق نے کہا۔

''غور سے سنو۔ موسیقی کی ہلکی آواز آرہی ہے۔''

انیق نے دھیان دیا اور اثبات میں سر ہلایا۔ یہ آواز عمارت کے کسی اندرونی حصے سے بلند ہو رہی تھی۔

''میری پنڈلیوں میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا ہے جی۔'' انیق نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''سنسنی اور تجسس کی وجہ سے۔ میرے لیے یہ خیال بڑا ''تھرلنگ'' ہے کہ ٹیکساری گینگ کا خطرناک ترین ٹولا اس وقت اس چار دیواری میں موجود ہے...... اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ تجسس کی وجہ سے تو دل دھڑکتا ہے، میری پنڈلیوں میں درد کیوں ہو رہا ہے۔ دراصل خطرے کے وقت میری ساری حسیات سمٹ کر پنڈلیوں میں چلی جاتی ہیں۔ یہ بیماری میرے ننھیال کی طرف سے مجھ میں آئی ہے۔''

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تمہیں ''ننھیال'' یاد آگیا ہے تو نانی بھی یاد آجائے گی۔ بس ذرا چھری تلے سانس لو۔''

''آپ نے نانی کہاں ہے تو مجھے کرمانی یاد آگیا ہے۔ یہ پہلوان حشمت کے بڑے بھائی کا نام تھا۔ بچپن میں پہلوان سے بہت لڑتا تھا۔ پہلوان نے اس کے متعلق ایک بڑا مزیدار قطعہ کہا ہوا ہے۔

بات بات پر وہ مجھ کو جھاڑتا ہے
کبھی اپنے اور کبھی میرے کپڑے پھاڑتا ہے
وہ گوشت خور تو ہرگز نہیں ہے لیکن
لڑائی میں بڑے زور کی دندی واڈتا ہے۔''

(میں نے جواب میں کڑی نظروں سے اسے گھورا تو اسے سنجیدہ ہونا پڑا)

یہ واقعی بڑے سنگین لمحات تھے۔ اگر جان ڈیرک کی سالگرہ کا کیک جارہا تھا تو پھر اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ وہ خود بھی یہاں موجود ہوگا۔ یورپ کے چند خطرناک ترین گینگسٹرز میں سے ایک۔ جس کی رگوں میں خون کی جگہ زہر اور تیزاب دوڑتا تھا۔ وہ اور اس کا منحوس باپ ''ڈیتھ اسکواڈ'' کے خالق تھے۔ انہوں نے ایک ایسے شیطانی ٹولے کو وجود دیا تھا جو صرف مرنے اور مارنے کے لیے اس زمین پر دندناتا پھرتا تھا۔

ہم طویل ڈرائیووے سے گزر کر رہائشی عمارت کے کشادہ پورچ میں پہنچ گئے۔ یہاں کئی لگژری گاڑیاں موجود تھیں۔ ملازمین کی آمدورفت بھی دکھائی دیتی تھی۔ موسیقی کی آواز قدرے نمایاں ہوگئی تھی۔ یہ بہت ہیجان خیز قسم کی موسیقی تھی جس میں ڈرم کی دھنا دھن سب سے بلند ہوتی ہے۔

میں اپنی سفید پی کیپ درست کرتا ہوا وین سے اتر آیا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، نظر کی عینک اور پی کیپ وغیرہ نے میرا حلیہ کافی حد تک کیموفلاج کر رکھا تھا۔ کیک وصول کرنے کے لیے ایک صحت مند خانساماں اور چار پانچ ملازم پہلے سے یہاں موجود تھے۔ گارڈز بھی کچھ فاصلے پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

خوب صورت لیمی نیشن بورڈ پر رکھے گئے اس لمبوترے کیک کو کسی اسٹریچر ہی کی طرح وین سے اتارا گیا۔ ہیڈ خانساماں نے اس کا باکس چیک کیا۔ میں نے رسید پر وصولی کے دستخط لیے۔ اصل رسید خانساماں کے حوالے کر کے ڈپلی کیٹ اپنے پاس رکھ لی۔ ہمارے درمیان چند رسمی فقروں کا تبادلہ بھی ہوا پھر میں واپس وین میں آبیٹھا۔ یہ بات غنیمت تھی کہ انیق کو ڈرائیونگ سیٹ چھوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

ہم واپس روانہ ہوئے اور ڈرائیووے پر آگئے۔ ابھی ہم مین گیٹ سے کافی دور تھے کہ ہماری گاڑی خراب ہوگئی۔ یہ ''خرابی'' ہماری پلاننگ کے مطابق ہوئی تھی۔ انیق نے ڈیش بورڈ کے نیچے دو تار اس طرح کھینچے تھے کہ اب انجن آسانی سے اسٹارٹ نہیں ہوسکتا تھا۔ جونہی گاڑی رکی اور اس

کی ہیڈ لائٹس آف ہوئیں دو وین مسلح گارڈز درختوں کے پیچھے سے نکلے اور ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ''کیا ہوا ہے؟'' ایک موچھیل نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

انیق سیلف پر سیلف مارتا چلا جا رہا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے بولا۔ ''کرنٹ تو آرہا ہے لگتا ہے کہ فیول لائن میں کوئی نقص ہے۔''

میں نے اس کی ہدایت پر پیچھے جا کر انجن کا کور اٹھایا اور مختلف تاروں اور کیبلز کو چیک کرنے لگا۔ انیق گاہے بگاہے سیلف بھی اپلائی کر رہا تھا۔ انجن ''اسٹارٹ'' ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گارڈز نے دھکا لگا کر وین کو ڈرائیو وے کے ایک کنارے پر کر دیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور یہ ہم دونوں کے لیے اچھی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ فیول پمپ کا مسئلہ ہے۔'' انیق نے کہا۔

گارڈز کی نظر بچا کر اپنی یونیفارم کو سمیٹتا ہوا وہ وین کے عقبی حصے میں انجن کے سامنے بیٹھ گیا اور یونہی کل پرزوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ ایک گارڈ ''تعاون'' کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر چلا گیا اور انیق کی ہدایت پر وقفے وقفے سے سیلف مارنے لگا۔

نقص ''ذرا لمبا'' نظر آرہا تھا۔ موچھیل گارڈ ہمارے پاس ہی رہا اور باقی دو اپنی پوزیشنوں پر چلے گئے۔ ہم کسی ایسے ہی وقت کے انتظار میں تھے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کی طرف گیا۔ موچھیل گارڈ وین کے اسٹارٹ نہ ہونے پر بیزار نظر آرہا تھا۔ شاید وہ مجھے کوئی جلی کٹی سناتا لیکن اس سے پہلے ہی اسے رات میں کئی سورج دکھائی دے گئے ہوں گے۔ میرے کولٹ پسٹل کے دستے نے اس کی کنپٹی کے عین درمیانی حصے کو نشانہ بنایا مگر بندہ سخت جان تھا۔ گھٹنوں کے بل گرا ضرور مگر لڑھکا نہیں۔ میں نے ایم اے کا ممنوعہ وار کیا اور اس کی گردن کو ایک مخصوص جھٹکا دے کر اسے بے جان کر ڈالا۔ اب یہ اس کی قسمت پر منحصر تھا کہ وہ ہوش میں آتا ہے یا نہیں۔

ہم دونوں نے اسے پھرتی کے ساتھ گھسیٹ کر وین کے عقبی حصے میں ڈال دیا اور لاک کر دیا۔ ''ٹھیک ہے انیق! میں جا رہا ہوں۔ تم یہاں رکنے کی کوشش کرو۔ اگر نہ رک سکو تو نکل جاؤ اور بلڈنگ کے پچھواڑے کی سڑک پر پہنچو۔''

''نہیں بھائی! میں رکوں گا...... ہم یہاں سے......''

''دیکھو انیق! جو کچھ طے ہوا ہے اس کے مطابق چلو۔'' میں نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔ ''تم کو وین کے پاس رہنا ہے اور اسے اسٹارٹ رکھنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ واپسی کے وقت مجھے تمہارے کور کی ضرورت پڑے۔ تمہاری رائفل بالکل تیار ہونی چاہیے۔ فون بھی آن رکھو۔'' میرے لہجے نے اسے سمجھا دیا تھا کہ میں اس کی کوئی بات نہیں سنوں گا۔ اسے خدا حافظ کہتا ہوا میں اشوکا کے لمبے گھنے پودوں کے پیچھے چلا گیا۔ تاہم وین چھوڑنے سے پہلے میں نے نشستوں کے نیچے سے اپنے تینوں ہتھیار نکال لیے تھے اور رک سیک بھی کمر پر کس لیا تھا۔ یہ ایکشن کا وقت تھا اور میں خود کو اس کے لیے بالکل تیار پاتا تھا۔

عمارت کے احاطے میں روشنی کا معقول انتظام تھا لیکن احاطہ اتنا وسیع اور پھیلا ہوا تھا کہ کئی حصے اب بھی نیم تاریک یا تاریک تھے۔ میں ایسی ہی جگہوں سے فائدہ اٹھاتا ہوا رہائشی حصے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کئی جگہ مجھے رکوع کی حالت میں اور کہیں کہیں رینگ کر آگے بڑھنا پڑا۔ ایک دو جگہ گارڈز سے مڈبھیڑ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ چھوٹی نال کی روسی رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور ایک سیکنڈ کے نوٹس پر آگ اگل سکتی تھی۔ میں رہائشی عمارت کے پہلو میں پہنچ چکا تھا۔ ایک تنومند گارڈ گشت کرنے والے انداز میں ایک بغلی دروازے کے سامنے چکرا رہا تھا۔ میں گارڈنیا کی ایک اونچی باڑ کے عقب میں تھا۔ میں نے گارڈ کے گشت کا انداز دیکھا...... جونہی میری طرف اس کی پشت ہوئی، میں دروازے کی طرف لپکا۔ اگر دروازہ اندر سے لاک ہوتا تو، میرا گارڈ کی نگاہ میں آنا یقینی تھا۔ ایسی صورت میں مجھے رائفل کا منہ کھولنا پڑتا۔ تاہم خیریت گزری۔ میں نے لکڑی کے منقش دروازے کے سامنے پہنچ کر اس کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے گھماتا ہوا اندر چلا گیا۔ دروازہ بھڑا تو سامنے سیڑھیاں نظر آئیں، اس کے ساتھ ہی ایک سی سی ٹی وی کیمرا بھی دکھائی دیا جو نیم دائرے میں حرکت کر رہا تھا جب میں اندر داخل ہوا تو خوش قسمتی سے اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ میں نے خود کو ایک گول ستون کی اوٹ میں کیا اور جونہی کیمرے کا رخ سیڑھیوں کی مخالف سمت میں ہوا، میں لپک کر زینے چڑھ گیا۔

میوزک کا شور اب بہت بلند ہو چکا تھا۔ بدمست مرد و زن کی دور افتادہ آوازیں بھی کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ جیسے بھٹکی ہوئی بد روحیں تھیں جو عالم نشاط میں چلا رہی تھیں۔ میں سیڑھیوں کے بالائی سرے پر کھڑا تھا۔ ایک کوریڈور میں سے دو ویٹر نما افراد ہاتھوں میں طشتریاں لیے گزرے مگر مجھ پر ان کی نگاہ نہیں پڑی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں جب راست

اقدام اٹھائے جاتے ہیں اور نتائج کی پروا نہیں کی جاتی تو حالات بھی ساتھ دینا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ عمارت بہت زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن نئی بھی نہیں تھی۔ شاید 80 کی دہائی میں تعمیر ہوئی ہو۔ بڑی اعلیٰ درجے کی آرائش تھی۔ آبنوسی دروازے، منقش چھتیں اور قالین پوش راہداریاں، اکثر کمرے بند تھے۔ میں ایک دروازے کے پاس سے گزرا تو ٹھٹک گیا۔ اندر سے ایک نسوانی کراہ سنائی دی۔ میں گھوم کر کمرے کی سائڈ پر پہنچا تو ایک ادھ کھلی کھڑکی دکھائی دی۔ اندر کی طرف گرل اور پردہ تھا۔ سرخ پردے میں جھری سی نظر آرہی تھی۔ کمرے میں روشنی اور کوریڈور میں نیم تاریکی تھی۔ میں نے کھڑکی سے آنکھ لگائی اور پردے کی جھری سے دیکھا۔ ایک بیڈ پر مجھے کسی کے پاؤں نظر آئے۔ نہایت گورے چٹے زنانہ پاؤں۔ ایک پاؤں پر گہرا نیلگوں نشان بھی دکھائی دے رہا تھا اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ پاؤں، ٹخنوں کے پاس سے ایک اسٹریپ میں جکڑے ہوئے تھے۔

”خدا کے لیے بس کرو۔ فار گاڈ سیک مجھے جانے دو۔“ ایک بار پھر کراہتی ہوئی سی آواز ابھری۔

میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مغویہ اداکارہ کا کھوج اتنی جلدی لگ جائے گا۔ یقیناً یہ وہی تھی۔ نوے فیصد امکان تھا کہ یہ وہی ہے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کراہ تو رہی ہے مگر کمرے میں اس کے سوا شاید اور کوئی نہیں۔

میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا، وہ اندر سے بند تھا۔ ہینڈل سے پکڑ کر میں نے اسے ایک دو بار ہلایا تو کھٹکے کی مدھم آواز آئی اور وہ اچانک کھل گیا۔ دراصل اسے اوپر کی طرف عمودی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ دروازے کو ہلانے سے چٹخنی خود بخود گر گئی تھی۔ میں رائفل سونتے اندر پہنچا تو سنسنی خیز منظر دکھائی دیا۔ بے شک یہ وہی فلمی ہیروئن تھی۔ جب چند روز پہلے میں نے اسے شادی ہال کی شوٹنگ میں دیکھا تھا تو وہ ایک جھلملاتا خوش رنگ ستارہ تھی لیکن آج ایک اجڑی پچڑی خستہ حال عورت دکھائی دیتی تھی۔ میک اپ کی غیر موجودگی نے بھی اس کی ”ہیئت کذائی“ میں کردار ادا کیا تھا۔ اس کے جسم پر ایک ہلکے پھلکے سلیپنگ گاؤن کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پنڈلیوں کے علاوہ اس کی کلائیاں بھی ان اسٹریپس میں جکڑی ہوئی تھیں جو بیڈ کے ساتھ ہی منسلک تھے۔

مجھے دیکھ کر اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنا کھلا ہوا منہ بند کر لیا۔ آنکھوں میں کئی سوال امڈ آئے۔

میں نے سب سے پہلے تو دروازے کو اندر سے لاک کیا پھر پردے کی اس جھری کو ختم کیا جہاں سے میں اندر جھانکنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کے بعد میں اداکارہ کے بالکل قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، واش روم میں پانی گرنے کی آواز آئی۔

”کون ہے اندر؟“ میں نے اداکارہ سے سرگوشی میں پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ روہانسی آواز میں بولی۔ ”مجھے نہیں پتا کون ہے...... یہاں بہت سارے سؤر ہیں۔ یہ مار ڈالیں گے مجھے......“ وہ سسکیوں سے رونے لگی۔

وہ موزوں جسم کی مالک تو تھی مگر اس کی عمر 35 سے کم نہیں تھی۔ اپنی موجودہ خستہ حالی کے سبب عمر سے چار پانچ سال بڑی دکھائی دیتی تھی۔ اس سے پسینے اور تیل کی بو آرہی تھی۔ چہرے اور جسم کے کئی حصوں پر گہرے نیل اور خراشیں تھیں۔ بال جھاڑ جھنکاڑ نظر آتے تھے۔ اس حال میں اسے اس کے پرستار دیکھ لیتے تو شاید آئندہ اس کی فلمیں دیکھنے سے توبہ کر لیتے۔ میں نے تیزی سے کہا۔ ”میرے پاس وقت کم ہے۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گا مگر ابھی تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔“

”تت...... تم...... کون ہو؟ کسی...... بیکری سے...... آئے ہو؟“

”جو کوئی بھی ہوں، تمہارا ہمدرد ہوں۔“

”میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گی...... جو تم کہو گے۔“ اس کا انداز فلمی تھا۔

”اوکے، لیکن ابھی تھوڑی دیر صبر کرنا ہوگا۔ کہو تو میں تمہاری یہ بندشیں کھول دیتا ہوں۔“

”ہاں کھول دو۔“ میرے ہاتھ سن ہو رہے ہیں۔“ وہ کراہی لیکن پھر ٹھٹک کر واش روم کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”لیکن اسے پتا چل جائے گا۔“

”اس کا علاج بھی کر لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

اداکارہ کی بری حالت دیکھ کر دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ عورت پر اس طرح کا تشدد کرنے والے اکثر ایک گناہِ بے لذت کے سوا کچھ حاصل نہیں کر پاتے۔ صنفِ نازک کو پھول سے تشبیہ دی جاتی ہے اور پھول کی خوشبو لطف اندوز ہونے کے لیے ہوتی ہے۔ کوئی جانور اسے چبا جائے تو اسے ایک ناچیز لقمے کے سوا کیا ملتا ہے۔

میں نے پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں لیا تو اداکارہ کی بلوری آنکھوں میں حیرت کی یلغار ہوئی۔ میں اس

کی طرف توجہ دیے بغیر واش روم کی طرف بڑھا۔ انگلی کی پشت سے دروازے پر مدھم دستک دی۔ اندر جو کوئی بھی تھا یقیناً بری طرح بدکا ہوگا۔ اس بدحواسی میں اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور یہی لمحہ اس کے لیے قیامت بن گیا۔ یہ فربہ جسم والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ میرا گھونسا سیدھا اس کی موٹی ناک پر پڑا۔ وہ الٹ کر واش روم کے وسط میں جا گرا۔ میں نے پھرتی سے اندر گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ وہ مادرزاد برہنہ گوشت کا ڈھیر، دہشت زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاور چل رہا تھا اور اس کے زیریں جسم پر ابھی تک صابن لگا ہوا تھا۔ اس نے چلّانے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی میں نے اس کے ہونٹ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ دیے اور دوسرے ہاتھ سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی۔ دندانے دار خنجر کی دھار بے مثال تھی۔

بالکل جانور کے ذبح ہونے والا منظر تھا۔ ایک سیکنڈ میں واش روم کے چکنے فرش پر خون کا ریلا بہہ گیا۔ اس کے بے ڈھنگے جسم کو نیلی ٹائیلوں کے فرش پر پھڑکتا چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔

''کیا ہوا اسے؟'' اداکارہ نے لرزاں سرگوشی میں پوچھا۔

''کچھ نہیں، بے ہوش ہوا ہے۔'' میں نے اسے مزید خوف زدہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اندر فربہ شخص کی تڑپ ختم ہو چکی تھی اور اگر نہیں بھی ہوئی تھی تو کوئی آواز باہر نہیں آرہی تھی۔ میں نے اداکارہ کی بندشیں کھول دیں۔ اس کا جسم بہ زبانِ حال پکار کر کہہ رہا تھا کہ اسے تختۂ مشق بنایا گیا ہے اور بہت بری طرح بنایا گیا ہے۔ اس حال میں بھی اس کے گلے میں قیمتی موتیوں کا ایک ہار نظر آرہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، اغوا کے وقت وہ شوٹنگ میں مصروف تھی اور ایک ''جنگلی دوشیزہ'' کے روپ میں ایک پنجرے میں بند تھی۔ اس وقت تو ایسا ہار اس کے گلے میں نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ یقیناً اسے کسی نے یہیں پر اپنی من مرضیاں کرنے کے بعد عطا کیا تھا۔ اس حوالے سے میرے اور اس اروشا نامی اداکارہ کے درمیان دو چار فقروں کا تبادلہ ہوا اور میرے خیال کی تصدیق ہوئی۔

میں نے اس سے کہا۔ ''میرے جاتے ہی اندر سے دروازہ بولٹ کرلو۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں فائرنگ وغیرہ بھی ہو۔ خوف زدہ نہیں ہونا اور نہ کسی کے لیے دروازہ کھولنا۔ میں دروازے کے بالکل نچلے حصے پر تین چار بار ''ناک'' کروں گا۔ میری بات سمجھ رہی ہو؟''

اس کا رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے بے طرح ڈانٹ دیا اور کہا کہ وہ وہی کرے جو میں کہہ رہا ہوں۔

اس کمرے میں واش روم کے مقتول کا لباس بھی ایک ہینگر میں جھول رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ فربہ اندام شخص اس ہاؤس نمبر اٹھارہ کے مالک سابق قونصلیٹ کا کوئی مقامی دوست ہے اور ایک بڑے ہوٹل کا منیجر ہے۔

''م...... مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔'' اداکارہ نے فریاد کی۔

''تم بھی میری ہدایت پر عمل کرنا اور اسی بیڈ پر چپ چاپ لیٹی رہنا۔''

وہ اسی وقت لیٹ گئی۔ میں نے اس بات کی تسلی کی کہ پردے کے پیچھے کھڑکی پوری طرح بند ہے۔

کمرا چھوڑنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر واش روم میں جھانکا۔ ادھیڑ عمر، سانولی رنگت والا سانڈ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ کے شیطانوں سے رہائی پانے کے بعد یہ اداکارہ یہاں موجود دیگر افراد کے تصرف میں آگئی تھی۔ اس مقتول ہوٹل منیجر کے لیے بھی یقیناً خوب صورت لڑکیوں کی کمی نہیں ہوگی مگر ایک معروف ہیروئن کی قربت کا مزہ چکھنے کے لیے وہ یہاں اس کمرے میں پایا جارہا تھا۔ میں نے واش روم کا دروازہ باہر سے لاک کر کے چابی اپنی پاکٹ میں ڈال لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اداکارہ تجسس سے مجبور ہوکر واش روم میں جھانکے اور اپنی بے ہوشی کے اسباب پیدا کرلے۔

میں نے دروازہ کھول کر جھری میں سے باہر جھانکا۔ موسیقی کی دھنا دھن کچھ اور بڑھ چکی تھی۔ کوریڈور کا یہ حصہ خالی تھا۔ میں باہر نکل آیا۔

اس کمرے میں گھسنے اور باہر نکل آنے کا سارا عمل قریباً سات آٹھ منٹ میں مکمل ہوگیا تھا اور اب میں اس مرکزی حصے کی طرف جانا چاہتا تھا جہاں میرے خیال کے مطابق ٹیکساری گینگ کا روحِ رواں جان ڈیرک اپنے ڈیتھ اسکواڈ کے ساتھ موجود تھا۔ موسیقی...... بلکہ بے ہنگم موسیقی کا شور اور بدمست آوازیں میری رہنمائی کررہی تھیں۔ مطلوبہ جگہ تک پہنچنے کے لیے مجھے جس دشواری اور کوفت کا سامنا کرنا پڑا، اس کی تفصیل کافی لمبی ہوجائے گی۔ وہ بڑے سنسنی خیز لمحے تھے۔ میں اس بدبخت گروہ سے قریب تر ہوتا جارہا تھا جس کے ارکان انسانوں سے زیادہ حیوانوں سے قریب تر تھے۔ ایک شیطانی فیکٹری میں تیار کیے ہوئے گوشت پوست کے ایسے روبوٹ جو عیاری، مکاری اور درندگی میں لاثانی تھے۔

میری اوران کی جنگ پرانی تھی اور آج اس جنگ میں ایک نیا موڑ آیا تھا۔ میں ہر نتیجے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔

جس طرح میرے خنجر سے لہو ٹپک رہا تھا اسی طرح میرے دل سے بھی ٹپک رہا تھا۔ ان لوگوں نے لاہور کے بیس بے گناہ شہریوں کو گولیوں سے چھلنی کیا تھا اور ابھی مزید لوگ ان کے نشانے پر آسکتے تھے۔ وہ میرے گلی کوچوں میں گھسنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور اب اس کامیابی کا خراج وصول کیے بغیر وہ یہاں سے جا نہیں سکتے تھے۔

قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ بالآخر میں ایک ایسی جگہ پر پہنچ گیا جہاں سے میں ''سب سے بڑے شیطان'' کی منحوس سالگرہ کی تقریب دیکھ سکتا تھا...... یہاں تک پہنچنے کے لیے میرے خنجر کی دھار نے دو اور افراد کے خون کا ذائقہ چکھا تھا اور میں نے بلاتردد یہ کام کیا تھا۔ یہ دونوں بھی بلڈنگ کے گارڈز میں سے تھے۔ ان دونوں کی لاشیں ایک اسٹور روم کی تاریکی میں بند ہو چکی تھیں۔

میں فرسٹ فلور کے ایک بالکل تاریک کمرے میں موجود تھا۔ یہ دراصل ایک پروجیکٹر روم تھا۔ جس طرح سینما ہالز کے عقب میں پروجیکٹر رومز ہوتے ہیں اور وہاں چلنے والی فلم کا عکس سامنے اسکرین پر نظر آتا ہے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وڈیو چلانے کے جدید طریقے آنے کے بعد یہ پروجیکشن روم کبھی کبھار ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں دو قیمتی پروجیکٹرز موجود تھے اور دیگر لوازمات بھی تھے مگر ہر شے گرد آلود تھی۔ ایک دیوار میں وہ دو چوکور خلا تھے جہاں سے پروجیکٹر کی لائٹ اسکرین کی طرف جاتی ہے۔ میں نے ایک سوراخ کا کھٹکا ہٹا کر دیکھا اور چودہ طبق روشن ہو گئے۔ موسیقی اور شور کی آواز فلک شگاف ہو گئی۔ گراؤنڈ فلور پر ایک وسیع ہال کا منظر دکھائی دیا اور وہ اسکرین بھی دکھائی دی جس کا تعلق ان دو پروجیکٹرز سے تھا مگر وہ اسکرین فی الحال ایک جہازی سائز کے پردے میں چھپی ہوئی تھی اور کسی دیوار کا حصہ ہی محسوس ہوتی تھی۔

وسیع ہال کا منظر ششدر کرنے والا تھا۔ ڈیتھ اسکواڈ کے قریباً پندرہ زہریلے شیطان اور درجنوں دیگر مہمان یہاں موجود تھے۔ ڈیتھ اسکواڈ کے لوگ اپنے نہایت چست بلکہ بے ہودگی کی حد تک چست لباسوں اور منڈے ہوئے سروں کی وجہ سے علیحدہ سے پہچانے جاتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی بغل میں کوئی نہ کوئی خوش شکل لڑکی تھی۔ وہ شراب پانی کی طرح بہا رہے تھے...... کچھ ایسے بھی تھے جو پینے کے ساتھ ساتھ اپنے اور اپنی پارٹنرز کے اوپر انڈیل رہے تھے۔

یہ تقریباً سب مقامی لڑکیاں تھیں...... غالباً اعلیٰ سوسائٹی کی کال گرلز۔ عین ممکن تھا کہ انہیں ان کی بے خبری میں یہاں لایا گیا ہو۔ یعنی یہ بتائے بغیر کہ وہ فی الوقت کہاں اور کن لوگوں کے درمیان ہیں۔

میرے ائرفون پر کال کے سگنل آئے۔ دوسری طرف انیق ہی تھا۔ ''کہاں ہیں شاہ زیب بھائی؟''

''سمجھو ان جنگلی سؤروں کی شہ رگ کے قریب ہوں اور تم کہاں ہو؟''

''مجھے یہ جگہ چھوڑنا پڑی ہے۔ بھانڈا پھوٹنے والا تھا، میں وین سمیت باہر آگیا ہوں...... اور آپ کے حکم کے مطابق بلڈنگ کے پچھواڑے والی سڑک پر ہوں۔ مجھے یہاں سے بالائی منزل کی کچھ روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔''

''نکلتے وقت گارڈز نے نوٹ نہیں کیا کہ وین میں ایک سواری کم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''داؤد بھاؤ کا اور آپ کا شاگرد ہوں۔ چکما دے کر نکل آیا ہوں۔ ابھی تک تو خیریت ہے۔ آگے کا پتا نہیں۔ ویسے آپ کو جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کریں۔ میں نے وین کے پیچھے جا کر دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے جس گارڈ کی گردن آپ نے مروڑی تھی، اس نے دنیا سے ہی منہ ''مروڑ'' لیا ہے۔''

''یہاں بھی ایک دو کی گردن پر چھری چلی ہے۔ بس تم پوری طرح الرٹ رہو۔ ایکشن کسی بھی وقت شروع ہو سکتا ہے۔'' میں نے ماؤتھ پیس میں سرگوشی کی۔

میں نے پروجیکٹر کے لیے بنائے گئے مختصر خلا کے کور کو پھر سرکایا۔ ہال کا منظر ہیجان خیز ہو چکا تھا۔ ایک ٹرالی کے ذریعے برتھ ڈے کا اسپیشل کیک مرکزی میز تک پہنچا دیا گیا تھا۔ میری نظریں جس خبیثِ اعظم کو ڈھونڈ رہی تھیں وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک اسپیکر پر کسی کی مخمور آواز ابھری اور پورے ہال میں سنائی دی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ڈیتھ اسکواڈ کی ہی کسی آفت زادی کی آواز تھی۔ وہ انگلش میں بولی۔ ''ہم گریٹ باس کی غیر موجودگی میں ان کی برتھ ڈے کا کیک کاٹ رہے ہیں لیکن لگتا ایسے ہی ہے جیسے وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔''

''گریٹ باس...... گریٹ باس۔'' ڈیتھ اسکواڈ کے ارکان نے ایک ساتھ نعرہ بلند کیا اور ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر رقص کرنے لگے۔ ان کے لباس اتنے چست تھے کہ جسم کا حصہ ہی معلوم ہوتے تھے۔

اسپیکر پر لڑکی کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''باس اٹلی میں

بہت مصروف ہیں لیکن وہ دو چار دن میں ہمارے درمیان ہوں گے۔ وہ اس ٹاسک کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں...... بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ آج بھی وڈیولنک کے ذریعے ہم سے بات کریں۔"

"ہُرّے ہُرّے کے نعرے بلند ہوئے...... اور چست لباس والے شیطان زادوں نے کئی بے ہودہ حرکات کیں۔ ان کے انگ انگ سے جیسے شرارت مکاری اور سفاکی ٹپکتی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کھانا ہو، عورت ہو، شراب ہو یا قتل وغارت، وہ ہر معاملے میں حدوں سے آگے نکلتے تھے۔

ان کی حرکات وسکنات دیکھ کر ان کی ساتھی عورتیں واضح طور پر بے چین اور ہراساں نظر آتی تھیں۔ ابھی "اصل پارٹی" شروع نہیں ہوئی تھی مگر ان میں سے کئی ایک ابھی سے کڑی "دست درازی" برداشت کررہی تھیں۔ وہ جس نائیکا یا ایجنٹ کے ذریعے یہاں پہنچی ہوں گی، اس نے اپنی جیبوں میں تو بے تحاشا نوٹ ٹھونسے ہوں گے مگر ان "سیکس ورکروں" کو بے تحاشا خطرے کے حوالے کردیا تھا۔ یہ خطرہ ان کے بدترین خدشات سے بھی زیادہ تھا۔

اسی دوران میں کیک کا "کارڈبورڈ" والا بکس کھولا جا چکا تھا۔ یہ خوش رنگ کیک ایک خوبرو لڑکی کی شکل میں تھا۔ نیلی آنکھیں نیلم کی طرح دمک رہی تھیں، شب رنگ بال، سرخ وسپید جسم، جس پر لباس کا تکلف نہیں تھا، نئی تکنیک کے مطابق یہ کیک، چاول کے آٹے پر، پرنٹنگ کے ذریعے بڑی نفاست سے بنایا گیا تھا لڑکی کے خدوخال یوں واضح نظر آتے تھے جیسے وہ سچ مچ سامنے لیٹی ہو۔

میں اس لڑکی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ کبھی جان ڈیرک کی سویٹ ہارٹ تھی۔ اس کی رگِ جاں سے بھی قریب پھر اس نے ڈیرک کے ہی ایک نوجوان دستِ راست ترکی نژاد آذر سے تعلقات قائم کرلیے اور استنبول میں جاکر چھپ گئی۔ وہ تو استنبول تھا، ڈیرک ان دونوں کو زمین کی ساتویں تہ سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔ اس نے ڈھونڈ لیا اور دونوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن سوزی نامی اس اطالوی لڑکی اور اس کے غم کو وہ کبھی بھی دل سے نکال نہ سکا۔ وہ ایسا ہی کینہ توز اور عداوت پسند تھا۔ اب بھی وہ اپنی ہر سالگرہ کے موقع پر اس لڑکی کے جسم سے اس کی بے وفائی کا انتقام لیتا تھا۔ ڈیرک کی زندگی ایسی کج رویوں سے بھری ہوئی تھی۔

اسپیکر پر لڑکی کی آواز ابھری۔ "گریٹ باس کی طرف سے وائلڈون سالگرہ کا کیک کاٹے گا۔"

تالیاں سنائی دیں...... اور منڈے ہوئے سر والا لمبا تڑنگا شیطان زادہ آگے آیا۔ میں اسے بھی جانتا تھا۔ یہ گوشت پوست کا انہی خطرناک "روبوٹس" میں سے ایک تھا، تاہم ان کی قیادت بھی کرتا تھا۔ جیسے بھائیوں میں سے کوئی ایک بھائی زیادہ ذہین اور توانا ہوتا ہے۔ وائلڈون بھی آؤٹ اسٹینڈنگ تھا۔ اس کے شانے غیر معمولی چوڑے اور آنکھوں میں مکاری کے کوندتے ہوئے لشکارے دوسروں سے زیادہ تھے۔

انسانی شکل کے کیک پر موم بتیاں روشن ہوئیں اور لمبا تڑنگا وائلڈون چھری بدست آگے بڑھا۔ موم بتیاں بجھانے کے بعد اس نے کیک کے درمیان میں کٹ لگایا اور اس کے ساتھ ہی ہال چلانے کی ایک دردناک آواز سے گونج اٹھا۔ یہ آواز کریم سے ڈھکے ہوئے کیک کے اندر سے آئی تھی۔ کیک کے اندر کوئی اسپیکر رکھا گیا تھا۔ اس اسپیکر کا کنٹرول قریب ہی کھڑے کسی شخص کے ہاتھ میں تھا۔ جونہی وائلڈون نامی شیطان زادے نے کیک پر چھری چلائی تھی، ریموٹ کنٹرول کے ذریعے "کیک" کو چلانے پر مجبور کردیا گیا تھا۔ بالکل یہی لگا تھا جیسے لڑکی کے جسم پر کٹ لگایا گیا ہے اور اس نے درد سے بے قرار ہوکر آہ وفغاں بلند کی ہے۔

"ہیپی برتھ ڈے" کی آوازوں سے ہال گونج اٹھا۔

تب ایک اور شیطان زادہ آگے بڑھا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی پلیٹوں میں سے ایک پلیٹ اٹھائی اور لڑکی کی شکل والے کیک کے پہلو سے ایک ٹکڑا کاٹا۔

لڑکی کی شکل والا کیک ایک بار پھر دردناک انداز میں چلایا۔ بالکل یہی لگا جیسے لڑکی کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا علیحدہ کیا گیا ہو۔

ڈیتھ اسکواڈ کے شیطان زادوں نے پُرمسرت آوازے بلند کیے۔ ان میں سے چند ایک نے جوش کے عالم میں اپنی ساتھی لڑکیوں کو اٹھایا اور ناچنے لگے۔

سب شیطان زادوں کے قدکاٹھ اور ان کی شکلیں قریباً ایک جیسی تھیں۔ مضبوط جسم، صفاچٹ کھوپڑیاں، اور آنکھوں میں ناچتی ہوئی کمینگی اور مکاری۔

ان میں سے ایک نے لڑکی کی ران میں سے ٹکڑا کاٹا۔ کیک ایک بار پھر کربناک آواز میں رونے چلانے لگا۔ اس کیک میں اسٹابری کا سیرپ بھرا جاتا تھا اور جب ٹکڑا کاٹا جاتا تھا، وہ سیرپ بھی جھلک دکھاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ زخم میں سے خون رس رہا ہو۔ یہ عجیب تماشا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پہلے بھی سنا ہوا تھا لیکن دیکھ آج رہا تھا۔

ران سے ٹکڑا لینے والے شخص کو اس کے ایک ساتھی نے پکارا۔ ''برادر! ایک میرے لیے بھی۔ لیکن ذرا اوپر سے...... اور مزے دار سا......''

اس شخص نے دوسری پلیٹ اٹھائی اور چھری سے لڑکی کے بالائی جسم کو نشانہ بنایا۔ نازک حصے کا ٹکڑا پلیٹ میں آیا تو ''لڑکی نما کیک'' نے دہائی مچادی...... اس کی بلند آہ وبکا سے در و دیوار گونج گئے۔

پُرمسرت شیطانی قہقہے بلند ہوئے۔ اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ شیطان زادوں کی حرکات وسکنات شدید ہوتی جارہی تھیں۔ دوسری طرف سوزی کے رخسار کاٹے جارہے تھے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں کیک کا بیشتر حصہ پلیٹوں میں پلیٹوں سے پیٹوں میں پہنچ گیا۔ کیک کے اندر چھپے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کا تماشا بھی جاری رہا۔ جب جب چھری چلی، رونے پیٹنے کی لرزہ خیز آوازیں بلند ہوئیں۔

میں نے اپنی روسی رائفل کے ساتھ 38 گولی والا میگزین اٹیچ کر رکھا تھا اور انگلی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی۔ میں خود کو ایک ایسے فٹ بالر کی طرح محسوس کر رہا تھا جو مخالف ٹیم کے سارے فل بیکس کو چکما دے کر گول کرنے کی بہتر پوزیشن میں پہنچ چکا ہو اور اب کسی بھی وقت بال کو کک لگا سکتا ہو۔

جان ڈیرک تو اپنی خوش قسمتی کے سبب یہاں موجود نہیں تھا۔ اب میرے نزدیک سب سے ہائی ویلیو ٹارگٹ اس شیطانی ٹولے کا انچارج وائلڈون تھا۔ میں پہلا فائر اسی کی کھوپڑی میں اتارنا چاہتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ بھی دوسرے ساتھیوں کی طرح لڑکیوں میں الجھا ہوا تھا۔ میں کسی غیر متعلقہ کو نشانہ بنانا نہیں چاہتا تھا۔ میں اگر رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کرتا تو تین چار افراد سے زیادہ کو نشانہ نہ بنا سکتا...... اگر برسٹ چلاتا تو کوئی غیر متعلق بھی نشانہ بنتے۔

میں اسی کشمکش میں تھا جب مشکل آسان ہوتی نظر آئی۔ کسی شخص نے اعلانیہ انداز میں کہا۔ ''کھانا لگ گیا ہے۔ میز پر تشریف لے آئیں۔''

ایک بڑا ریشمی پردہ اپنی جگہ سے سرک گیا۔ اس کے عقب میں ایک طویل دیدہ زیب ڈائننگ ٹیبل نظر آئی جو انواع واقسام کے کھانوں سے اٹی ہوئی تھی۔ میں فاصلے سے بھی دیکھ سکتا تھا مینیو میں پاکستان کا قومی جانور مارخور سالم روسٹ کی شکل میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ پرندوں کے گوشت اور سی فوڈ کی بھرمار تھی۔ جہاں تک میری معلومات تھیں، ڈیتھ اسکواڈ کے یہ خاص ہرکارے کچا قیمہ بھی بڑی رغبت سے کھاتے تھے...... ان کے ہر مینیو میں خاص طریقے سے تیار کیے گئے کچے قیمے کی ڈشز بھی موجود ہوتی تھیں۔ ان کا آنجہانی باپ ''ایول'' بھی کچے قیمے سے خاص رغبت رکھتا تھا (اور شاید اسی وجہ سے اس میں حیوانی صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں)

جب ڈیتھ اسکواڈ کا دستہ کھانے کی میز کی طرف بڑھا تو خود بخود ہی ایک طرح کی ڈویژن ہوگئی۔ وہ پندرہ سولہ افراد ایک قطار میں بیٹھ رہے تھے۔ میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ آج ایک اچھا دن تھا...... یا یوں کہا جائے کہ ایک اچھی رات تھی۔ بہت سی باتیں میرے حق میں جارہی تھیں۔ دل کی دھڑکن میری کنپٹیوں میں گونجنے لگی۔

میں سب سے پہلے وائلڈون کو ہلاکت سے سرفراز کرنا چاہتا تھا۔ میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کیا۔ اس خبیث نے ابھی تک ایک کال گرل کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا مگر اب زیادہ انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بالفاظ دیگر اب گیند کو گول کی طرف روانہ کرنا ضروری تھا...... اور کبھی کبھی گیہوں کے ساتھ گھن تو پستا ہی ہے۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ گولیوں کی پہلی بوچھاڑ نے ابلیسی ٹولے کے لیڈر وائلڈون اور اس کے دائیں بائیں بیٹھے تین چار ساتھیوں کو چھلنی کردیا۔

فائرنگ نے ایک سیکنڈ کے اندر ہال میں کہرام سا مچا دیا۔ میں نے بلاتوقف دوسرا برسٹ چلایا۔ کرسیاں الٹ کر اٹھنے والے کئی شتونگڑے، بھاگنے سے پہلے ہی شکار ہوئے اور اچھل اچھل کر گرے۔

میں جس تاریک کمرے میں بیٹھا تھا۔ دفعتاً وہ روشنی میں نہا گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، تین چار افراد جھپٹ کر آئے اور انہوں نے اپنی آٹومیٹک رائفلوں کے سرد بیرل میرے سر اور سینے سے لگا دیے۔ یہ کایا پلٹ بمشکل دو تین سیکنڈ میں ہوگئی تھی۔ میں نے اپنی رائفل دیوار کے چوکور خلا میں گھسا رکھی تھی اس لیے اسے فوری طور پر موڑ بھی نہیں سکا۔

''خبردار...... خبردار......''

''ہاتھ اوپر اٹھادو......''

''نیچے لیٹ جاؤ...... خبردار...... گولی ماردیں گے۔''

کئی جنونی آوازیں بلند ہوئیں۔

میں نے رائفل چھوڑ کر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ایک طوفانی ٹھوکر میرے منہ پر لگی۔ کوئی زہریلے ناگ کی طرح پھنکارا۔ ''اچھا...... تو یہ تم ہو......'' اس کے ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ میرے کانوں میں پڑی۔

چند مزید مسلح افراد بھرّا مار کر اندر گھس آئے۔ مجھے

اوندھا لٹا کر میری گردن پر پاؤں رکھ دیا گیا۔ پروجیکٹر روم کے آٹھ انچ مربع کے خلا میں سے قیامت کا شور اندر آرہا تھا۔ یہ شور وسیع ہال کمرے سے اُمڈ رہا تھا جہاں کئی لاشیں گر چکی تھیں اور بہت سے زخمی ہو چکے تھے۔ مجھے گن پوائنٹ پر رکھنے والے دو تین افراد اتنے مشتعل تھے کہ شاید مجھے اسی جگہ چھلنی کر ڈالتے لیکن ایک دو سینئر افراد نے انہیں بمشکل روکا...... اور غلط روکا کیونکہ چند سیکنڈ بعد ہی مجھے وہ موقع مل گیا جس کا میں متلاشی تھا۔

افراتفری میں میری تلاشی لے کر مجھے پانچ چھ رائفلوں کے نرغے میں ساتھ والے کمرے لے جایا جا رہا تھا۔ میرا ایک کولٹ پسٹل ابھی تک میری کمر پر تھا اور پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر بھی چرمی غلاف کے اندر موجود تھا۔ ساتھ والے کمرے میں لے جا کر یقیناً ایک بار پھر میری مکمل تلاشی ہونا تھی اور مشکیں کس دی جانا تھیں، میں اس نوبت سے پہلے ہی کچھ کرنا چاہتا تھا اور...... میں نے کیا۔

میں برق کی رفتار سے نیچے بیٹھا تھا۔ میرے عقب میں آنے والے افراد میں سے دو کی انگلیاں بے ساختہ ٹریگرز پر دب گئیں۔ آگے جانے والا ایک شخص گھائل ہوا، میں نے تڑپ کر گھائل کو اپنی گرفت میں لیا اور پلٹ کر اپنے سامنے کر لیا۔ اب وہ میرے لیے ڈھال کی صورت تھا۔

کم از کم دو برسٹ اور چلے اور یہ میری ''فربہ اندام ڈھال'' نے سہے۔ ایک سیکنڈ میں اس کے جسم میں درجن بھر سوراخ ہو گئے۔ ایک گولی میرے بازو میں بھی لگی۔ میں اپنی ڈھال سمیت دو تین قدم پیچھے کی طرف گیا اور پشت کے بل ایک کھڑکی سے ٹکرایا۔ کھڑکی چکنا چور ہوئی اور میں اپنی ڈھال، یعنی فربہ اندام شخص سمیت ایک کمرے میں جا گرا۔

''مار دو جانے نہ پائے۔'' ایک وحشی آواز گونجی۔ یقیناً یہ ٹیکساری گینگ کا کوئی انگلش اسپیکنگ شوٹر ہی تھا۔

اب مجھے تین چار فٹ اونچی دیوار کی آڑ میسر آ چکی تھی۔ سنسناتی گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزریں۔ میری ڈھال یعنی فربہ اندام شخص وہی تھا جس نے چند سیکنڈ پہلے تلاشی کے دوران میں میری روسی رائفل مجھ سے جدا کی تھی۔ یہ رائفل اب تک اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ میں نے رائفل اس کے کندھے سے اتاری اور فوراً جوابی برسٹ چلایا۔ یہ برسٹ بے حد ضروری تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ ٹیکساری گینگ کے شوٹر ٹوٹی ہوئی کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں کود جاتے۔

میں نے رائفل کو چھوٹے برسٹ پر سیٹ کیا اور جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ ہر طرف چنگاریاں بکھرنے لگیں۔ میرے اردگرد کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے تھے اور شیشے کے ان ٹکڑوں پر گولیوں کے گرم خول بکھر رہے تھے۔ اب ڈیتھ اسکواڈ کے تین چار سفاک قاتل بھی موقع پر پہنچ چکے تھے اور مجھ پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک جنونی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''یہ ایسٹرن ہے۔ زندہ پکڑو اس باسٹرڈ کو۔''

''گیس پھینکو۔'' ایک دوسری آواز نے پکار کر کہا۔

میں جانتا تھا یہ لوگ ''اِن کاؤنٹرز'' میں مفلوج کرنے والی گیس کے شیل بھی استعمال کرتے ہیں۔ ضروری تھا کہ میں یہ جگہ چھوڑ دیتا۔ میں ایک بغلی دروازے سے نکلا اور ایک تنگ کوریڈور میں بھاگتا ہوا عمارت کے پہلو کی طرف بڑھا۔ بھاگتے بھاگتے ہی میں نے اپنے بازو کے زخم کا معائنہ کیا۔ گولی کلائی اور کہنی کے درمیان سے گوشت کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زخم سنگین نہیں تھا۔

چست لباس والا ایک سرمنڈا شیطان میرے سامنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں نائن ایم ایم کا مشین پسٹل تھا۔ ''رک جاؤ۔'' وہ دھاڑا۔

میں نے اس پر فائر کیا۔ وہ فائر ہونے سے پہلے ہی ناقابلِ یقین پھرتی سے نیچے جھک چکا تھا۔ برسٹ کی چار گولیاں اسے چھوئے بغیر ہی گزر گئیں۔ وہ توپ کے گولے کی طرح مجھ سے ٹکرایا۔ وہ میری ناف پر فائر کر کے مجھے زخمی کرنا چاہتا تھا لیکن میں اسے زخمی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا میں نے سیدھا سر پر برسٹ چلایا۔ چار گولیوں نے اس کی کھوپڑی توڑ کر رکھ دی۔

اس دوران میں ایک دوسرا شیطان مجھ سے لپٹ چکا تھا۔ یہ وہ زندہ روبوٹس تھے جو صرف مرنے اور مارنے کے لیے ہی پروان چڑھائے گئے تھے۔ اس کا لباس وہسکی سے تربتر تھا اور اس چست گیلے لباس کے نیچے اس کا فولادی جسم تھا۔ اس نے میری رائفل پر اپنی آہنی گرفت قائم کی اور اپنی صفاچٹ سر کی شدید ضرب میری پیشانی پر لگائی۔ وہ جانتا تھا کہ اس تنگ کوریڈور میں اس کا پالا ایسٹرن سے پڑا ہے، اس کے باوجود وہ اپنی طاقت اور سفا کی آزمانا چاہتا تھا۔ اس نے خود کو غلط آزمائش میں ڈالا تھا۔ میری کہنی کی ضرب نے اس کی بائیں جانب کی کئی پسلیاں توڑ ڈالیں۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح میرے قدموں میں گرا۔ میں اسے پھلانگتا ہوا، چھت کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

''پکڑو، جانے نہ پائے۔'' سامنے سے للکارا بلند ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میری ٹانگوں پر فائر ہوئے۔

یقیناً آج ایک خوش قسمت رات تھی میرے لیے۔ میں محفوظ رہا اور ایک سی سی ٹی وی کیمرے کو چکنا چور کرتا ہوا ایک اور کمرے میں گھس گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ ڈیتھ اسکواڈ کے کسی شیطان زادے کے استعمال میں ہے۔ وہ شاید افراتفری میں تیار ہو کر تقریب میں جانے کے لیے نکلا تھا۔ حشیش اور الکحل کی ملی جلی بُو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔ یہاں وہاں عریاں تصویروں والے پوسٹرز نظر آرہے تھے۔ یہاں تک کہ بیڈشیٹ پر بھی ایک عریاں ڈانسر پرنٹ تھی۔

میں اس کمرے میں مورچا بند ہو گیا اور کھڑکی میں سے جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ ٹیکساری گینگ کے کسی بدمعاش کی للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، وہ اپنے کسی ساتھی سے مخاطب تھا۔ اسے گالی دے کر بولا۔ ''تم حرامی اس کو زندہ پکڑتے رہنا اور وہ تمہاری لاشیں بچھاتا جائے گا۔ مار دو......'' اس سے آگے گالیوں کی بوچھاڑ تھی۔

میں نے رک سیک میں سے تین بھرے ہوئے میگزین نکالے۔ ایک رائفل سے اٹیچ کر لیا اور دو پاس رکھ لیے۔

فون کال کے سگنل آئے۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ائرپیس میں انیق کی ہیجانی آواز گونجی۔ ''شاہ زیب بھائی! فائرنگ کی آوازیں آرہی ہیں۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟''

''ابھی تک تو بالکل ٹھیک ہوں۔''

''کیا میری ضرورت ہے؟''

''بالکل ہے، مگر وہیں پر جہاں تم ہو۔ وین کو اسٹارٹ رکھو اور ایسی پوزیشن پر رکھو کہ کسی بھی وقت یہاں سے نکلا جا سکے۔''

''دو گاڑیاں بلڈنگ سے نکلی ہیں جی اور بڑی تیزی سے بڑی سڑک کی طرف گئی ہیں۔ شاید زخمیوں کو طبی امداد کے لیے لے جایا جارہا ہے۔''

''ابھی اور بھی نکلیں گی۔ او کے خدا حافظ۔'' میں نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

کافی عرصے بعد میں خود کو پوری فارم میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اس بات کی تسلی تھی کہ میں ڈیتھ اسکواڈ کے سرخیل وائلڈ ون کو ہٹ کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ کم از کم سات آٹھ مزید شیطان زادے بھی جہنم واصل ہو چکے تھے۔ میری اولین فائرنگ سے ''جامِ ہلاکت'' نوش کرنے والوں کی مجموعی تعداد پندرہ بیس سے کم نہیں تھی اور ایک طرح سے یہ چند دن پہلے مغلپورہ کے علاقے میں ہونے والی خونریزی کا اچھا انتقام تھا۔ اب ڈیتھ اسکواڈ کے ابلیس زادے اور ٹیکساری گینگ کے دیگر خونخوار شوٹر، آتشیں بگولوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ میں ان کے گھیرے میں تھا مگر خبر نہیں کیوں میرے دل میں کہیں بھی خوف و ہراس کی کیفیت نہیں تھی۔ ایک تسلی سی تھی کہ میں اس گھیرے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پوری عمارت میں کہرام کا سماں تھا اور شوٹرز کی دہاڑیں گونج رہی تھیں۔ میرے گرد حصار تنگ ہوتا جارہا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ کسی بھی وقت حواسوں کو شل کرنے والی گیس بھی استعمال ہو سکتی ہے۔

میں نے اپنے ''رک سیک'' میں ہاتھ گھمایا۔ دو دستی بم بھی میرے پاس موجود تھے اور انہیں استعمال کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک بم استعمال کیا۔ بند جگہوں پر ایسے ہتھیار کا استعمال زبردست ''امپیکٹ'' پیدا کرتا ہے۔ در و دیوار تھرا گئے...... کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ زبردست شعلے کے فوراً بعد دھواں پیدا ہوا۔ میں فائرنگ کرتا اور دوڑتا ہوا ایک خالی کوریڈور میں آ گیا۔ یکا یک مجھے اندازہ ہوا کہ میں اس کمرے سے زیادہ دور نہیں جہاں میں اس اروشا نامی اداکارہ کو چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اپنا رخ پھیرا اور اس سمت میں بڑھا۔

دستی بم کے زوردار دھماکے نے کچھ دیر کے لیے میرے مقابل شوٹرز کو ٹھٹکا دیا تھا۔ دھواں بڑی تیزی سے پھیلا تھا اور انہیں کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میں کس راہداری میں گھسا ہوں۔ میں نے اپنے عقب میں ایک سلائڈنگ دروازے کو بند کر کے اس کے کنٹرول پر دو فائر مارے اور اسے ناکارہ کر دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد میں اس دروازے پر دستک دے رہا تھا جس میں اداکارہ موجود تھی۔ وہ جیسے پہلے ہی دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

''کون؟'' اس نے لرزاں آواز میں تصدیق چاہی۔

''دروازہ کھولو۔'' میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا۔ ''اپنا برا بھلا سوچ لو۔ گولیاں چل رہی ہیں۔ رسک ہے۔''

''میں جانا چاہتی ہوں۔'' وہ مصمم ارادے سے بولی اور باہر نکل آئی۔

میں اس کا ہاتھ تھام کر عمارت کے عقبی حصے کی طرف دوڑا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں چھوٹے بیرل والی طاقتور روسی رائفل تھی۔ میں نے انگلی ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی اور بلا تردد شوٹ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

یہ مرنے یا مار دینے والی لڑائی تھی۔ وہ میرے ساتھ

بھاگی آرہی تھی۔ اس کا گاؤن گھٹنوں سے اوپر تک اٹھ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بلڈنگ کے عقب میں نکاسی کا راستہ موجود ہے۔ نکل جانے یا پکڑے جانے کا امکان ففٹی ففٹی تھا۔

''وہ جارہے ہیں، پکڑو ان کو۔'' عقب سے للکارتی ہوئی آواز آئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مسلح افراد کی ایک ٹولی ہمارے پیچھے لپک رہی تھی۔ میں اداکارہ اروشا سمیت ایک لابی میں گھس گیا۔ دو ملازم جن کے چہرے پہلے ہی ہلدی ہورہے تھے سکتہ زدہ نظروں سے ہمیں دیکھتے رہ گئے۔

ہم ایک اور کمرے میں پہنچے۔ میں بے طرح ٹھٹک گیا۔ یہاں مجھے اسلحے کا انبار نظر آیا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے ریکس تھے۔ ان میں ہر طرح کے ہتھیار اور پیٹی بند ایمونیشن رکھا تھا۔ یہ سارا اسلحہ ہی نہایت خطرناک تھا۔ مجھے بجری کا وہ ٹرک یاد آیا جو چند دن پہلے راوی کے پل سے گزرا تھا اور جس میں اسلحہ و گولا بارود چھپا تھا۔ بعد میں اس حوالے سے فیروز خاں نامی سارجنٹ کو اپنی جان کی قربانی دینا پڑی تھی۔

تو کیا یہ وہی اسلحہ تھا؟

سوال جتنی تیزی سے ذہن میں ابھرا تھا، جواب بھی اسی تیزی سے آیا۔ یقیناً یہ وہی تھا اور یہی وہ اسلحہ تھا جس کی وجہ سے ہمارے پیچھے آنے والی ٹولی ہم پر گولی نہیں چلا رہی تھی۔

غور کرنے یا سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔ اس وقت تو واحد مقصد یہاں سے بچ کر نکلنا تھا۔ تعاقب میں آنے والے بالکل قریب آچکے تھے۔ ہم اس اسلحہ گودام کے عقبی دروازے سے نکل گئے۔ ایک بار پھر قسمت نے ساتھ دیا۔ عقبی دروازے کو باہر سے لاک کیا جاسکتا تھا...... اور چابی ہضمی قفل میں موجود تھی۔ میں نے یہ مضبوط آبنوسی دروازہ لاک کردیا۔

''آؤ اروشا۔'' میں اداکارہ کو ساتھ لے کر بھاگا۔

وہ چند قدم بھاگ کر رکی اور پلٹ گئی۔ اس کے گلے میں موجود اور یجنل موتیوں کا ہار ٹوٹ کر دروازے کے پاس ہی گر گیا تھا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکی۔ یہی وقت تھا جب اندر موجود کسی شخص نے بدحواسی میں دروازے کا لاک توڑنے کے لیے گولی چلادی۔ اسے بدحواسی کہنا شاید غلط ہے، یہ تو ایک سنگین ترین بلنڈر تھا۔ فائرنگ سے پیدا ہونے والی کسی چنگاری نے بارود کو جا پکڑا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ دھماکا اتنا بڑا اور سماعت شکن تھا کہ یقیناً ہاؤس نمبر اٹھارہ کے اردگرد کا پورا علاقہ تھرا اٹھا ہوگا۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد رہا کہ میری آنکھوں کے سامنے نہایت تیز چمک پیدا ہوئی اور میرے قدم جیسے فرش پر سے اٹھ گئے۔

میرے حواس قدرے بحال ہوئے تو مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی لوڈر نما گاڑی پر ہوں...... اور کسی نرم شے پر پڑا ہوں۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ایک سماعت شکن دھماکے نے مجھے اٹھا کر کہیں دور پھینک دیا ہے۔ دھماکے کے وقت میں باؤنڈری وال کے بالکل قریب تھا۔ یہ عمارت کا وہ حصہ تھا جو باؤنڈری وال سے تقریباً ملا ہوا تھا۔ بلاسٹ کے زبردست پریشر نے مجھے اچھالا تھا...... میں نے غور کیا میری روسی رائفل بھی میرے ساتھ نہیں تھی۔

میرے کان جیسے بند ہوچکے تھے۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہاں یہ احساس ضرور ہوا کہ میں جس لوڈر نما گاڑی کی چھت پر پڑا ہوں وہ تیزی سے رواں ہے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ میری براؤن پتلون گھٹنوں کے نیچے سے سلامت نہیں تھی۔ پنڈلیوں پر بھی خون کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ ایک بوٹ بھی ندارد تھا اور تب یہ انکشاف ہوا کہ رک سیک بھی میری کمر پر موجود نہیں ہے۔

اداکارہ اروشا کہاں تھی؟ کیا وہ بھی دھماکے کی نذر ہوچکی تھی؟ مجھے یاد آیا وہ اپنا گرا ہوا ہار اٹھانے کے لیے پلٹی تھی۔ میں نے اسے روکا تھا...... اور پھر آنکھوں کو خیرہ کرنے والی وہ چمک۔

دوسرا سوال جو ذہن میں ابھرا، وہ انیق کے حوالے سے تھا۔ وہ کہاں تھا؟

میں نے اپنے ''ہینڈ فری'' یعنی ہیڈ فون کو ٹٹولا۔ ہیڈ فون موجود نہیں تھا اور نہ ہی معروف بیکری کے مونوگرام والی وہ سفید کیپ تھی جس کے ساتھ میں نے ہیڈ فون کو اٹیچ کر رکھا تھا۔

مجھے ایمبولینسز کے سائرن سنائی دیے اور پولیس موبائلز کے ہوٹر بھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سماعت آہستہ آہستہ بحال ہورہی ہے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا لوڈر کی سائڈ پر گولڈن ٹینٹ سروس کے الفاظ لکھے تھے۔ میں قناتوں کے ایک ڈھیر کے اوپر پڑا تھا۔ پچھلے پہر کی تاریکی میں وہ لوڈر غالباً گلبرگ کی مین بلیوارڈ پر بھاگا جارہا تھا۔ پھر وہ ایک مارکیٹ میں رک گیا۔ ڈرائیور اور پانڈی لوڈر میں سے اترے اور ہراساں لہجوں میں کسی سے باتیں کرنے لگے۔ ایک شخص جو غالباً ڈرائیور تھا، کانپتی آواز میں بولا۔ ''بہت وڈا

دھماکا ہوا ہے جی...... لگتا ہے پوری بلڈنگ اُڑ گئی ہے۔ اللہ سوہنے نے بال بال بچایا ہے۔''

''تم کہاں تھے؟'' ایک بھاری آواز نے پوچھا۔

''چودھری رفاقت کے بنگلے نمبر چھبیس میں مہندی کا فنکشن تھا، وہاں سے سامان لینے گئے تھے۔ ابھی تھوڑا سا سامان باقی ہے، پر دھماکا ہوتے ہی بھاگ نکلے ہیں وہاں سے۔'' وہ ہانپتی آواز میں بولا۔

''دھماکا تو واقعی بہت بڑا ہوگا۔ یہاں تک آواز آئی ہے۔'' ایک اور آواز ابھری۔

''آگ لگ گئی ہے جی...... شعلے اوپر تک جا رہے ہیں۔'' ڈرائیور بولا۔

پانڈی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''چودھری رفاقت صیب کے بنگلے کے سارے شیشے ٹوٹ گئے ہیں لگتا ہے کہ آلے دوالے کے گھروں میں بھی کافی نقصان ہوا ہو گا۔''

چند اور افراد بھی لوڈر کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ موضوعِ سخن وہی خوفناک بلاسٹ تھا جس نے ایک قریبی علاقے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ بہت سے سوال جواب ہو رہے تھے۔ کیا یہ خودکش دھماکا ہے؟ خودکش دھماکا ہے تو اس طرح کے رہائشی علاقے میں کیوں ہوا ہے؟ کیا یہ گیس سلنڈرز کا دھماکا ہے جو اس عمارت میں اسٹور کیے گئے تھے؟ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں اور میں قناعتوں کے ڈھیر پر پڑا سوچ رہا تھا کہ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے۔

پھر مجھے موقع مل گیا۔ کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے اور لوڈر سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر جا کر باتیں کرنے لگے جہاں لوڈر کھڑا تھا وہاں نیم تاریکی تھی۔ میں پھسل کر نیچے اترا...... خوش قسمتی سے ایک آٹو رکشا پر نظر پڑی۔ وہ کچھ دور مارکیٹ کے ایک خالی برآمدے میں کھڑا تھا۔ ڈرائیور موجود تھا اور شاید اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا تھا۔

میں نے پچھلی نشست پر بیٹھنے کے بعد اسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ مچی مچی آنکھوں سے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

''جی صیب جی۔'' اس نے ٹھیٹ پنجابی لہجے میں پوچھا۔

''اسٹیشن جانا ہے...... بس اسٹیشن۔''

''اوہو، بس اڈے کہو ناں جی۔ بادامی باغ کہ یتیم خانے؟''

''یتیم خانے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

چونکہ میں نے کرائے وغیرہ کی بات نہیں کی تھی لہٰذا اس نے بھی طے کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ رکشا اسٹارٹ کیا، اللہ کا نام لیا اور چل پڑا۔

راستے میں جب اس نے چند ایمبولینس اور پھر ایک فائر بریگیڈ کی گاڑی دیکھی تو بولا۔ ''یا اللہ خیر، لگتا ہے کوئی آگ شاگ لگی ہے سویرے سویرے۔''

''ہاں یہی لگ رہا ہے۔''

''بس جی شہروں میں تو قیامت ہی مچی رہتی ہے۔ ہم گاؤں میں رہنے والے لوگ پیٹ کی خاطر مجبوراً یہاں آتے ہیں۔ نہیں تو جو سکون پنڈ دیہاتوں میں ہے یہاں کہاں۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک طرف سے بال چرمر ہو گئے تھے...... اور رخسار پر دھوئیں کی سیاہی کے علاوہ تھوڑا سا خون بھی رِسا ہوا تھا۔ شکر تھا کہ نیم تاریکی کی وجہ سے رکشا ڈرائیور نے میرے حلیے کا بغور جائزہ نہیں لیا تھا۔

میں نے ٹانگوں کی حالت دیکھی۔ براؤن پتلون بس گھٹنوں تک ہی سلامت رہی تھی۔ پنڈلیوں سے خون رس رہا تھا۔ سفید رنگ کا اپر بھی ایک دو جگہ سے پھٹ چکا تھا اور وہاں جسم پر ہلکی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ ایک جوتا بھی ندارد تھا۔ غنیمت تھا کہ ٹیکساری گینگ کے شوٹر کی گولی کلائی کے گوشت کو چھید کر گزری تھی۔ کوئی نس وغیرہ نہیں کٹی تھی اور خون تقریباً بند ہو چکا تھا۔ میں نے پتلون کی ایک دھجی اس زخم پر باندھ لی۔ اتنے شدید دھماکے میں میرا بچنا اور ہوا میں اچھل کر لوڈر پر جا گرنا کسی کرشمے سے کم نہیں تھا۔ مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ میرے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنے والی اداکارہ اروشا زندہ بچی ہوگی۔ یقیناً ان آٹھ دس مسلح افراد کے پرخچے بھی فوراً ہی اُڑ گئے ہوں گے جو اس وقت اسلحے کے اسٹور میں موجود تھے۔

مجھے سب سے پہلے اپنا حلیہ درست کرنے کی ضرورت تھی تاکہ میں کسی کے سامنے جانے کے قابل ہو سکوں۔ مجھے اس کا موقع جلد ہی مل گیا۔ رکشا ڈرائیور مزنگ چونگی سے سمن آباد کی طرف جانے کے لیے میانی صاحب کے قبرستان کے پاس سے گزر رہا تھا۔ سنسان سڑک تھی۔ اردگرد شہرِ خموشاں کی تاریکی میں کہیں کہیں کوئی روشنی ٹمٹماتی تھی۔ شاید پاس کی کسی مسجد سے فجر کی اذان بھی بلند ہو رہی تھی۔ میں رکشا ڈرائیور کے قدوقامت کا اندازہ لگا چکا تھا اور یہ بھی سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں اسے زیادہ تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا مگر تکلیف پہنچائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

''ذرا رکو ایک منٹ۔'' میں نے اچانک کہا۔

اس کا پاؤں بے ساختہ بریک پیڈل پر دب گیا اور رکشا سڑک کے کنارے جنتر کی گھنی جھاڑیوں کے نیچے رک گیا۔

چند ہی سیکنڈ بعد رکشا ڈرائیور، ڈیش بورڈ پر اوندھا پڑا تھا۔ میں نے اس کی توانا گردن پر ایک نہایت محتاط اور نپی تلی ضرب لگائی تھی۔ رکشا کو ڈرائیور سمیت دھکیل کر جھاڑیوں کے اندر پہنچانے میں مجھے زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے کپڑے اتارے اور ڈرائیور کی سفید شلوار قمیص پہن لی۔ وہ کھلے ہاتھ پاؤں کا شخص تھا۔ اس کے کپڑے مجھے تقریباً پورے ہی آگئے۔ آستینیں کچھ چھوٹی تھیں، وہ میں نے اڑس لیں اور شلوار تھوڑی سی نیچے کھسکا لی۔

رکشا ڈرائیور کے جسم پر اب صرف ایک میلا سا انڈرویئر تھا۔ اسے اسی حالت میں چھوڑنا میری مجبوری تھی۔ میں اسے اپنے والے کپڑے نہیں پہنا سکتا تھا۔ رکشے کے اندر سے ہی مجھے ایک نیلا شاپر مل گیا۔ بڑا شاپر تھا۔ میں نے اس میں بیکری ملازم والی کٹی پھٹی خون آلود یونیفارم اور اپنا اکلوتا جوتا گھسیڑ لیا۔ جس جس جگہ میرے فنگر پرنٹس کا امکان تھا، وہ ساری جگہیں بھی صاف کر دیں۔

وہ قابلِ رحم حالت میں کچی زمین پر پہلو کے بل لیٹا تھا۔ آدھ پون گھنٹے سے پہلے اسے ہوش نہیں آنا تھا۔ اس کے گلے میں تعویذ تھا اور ایک بازو پر دیہاتی انداز کا ٹیٹو بھی بنا ہوا تھا۔ اس کی جیب سے شناختی کارڈ کے علاوہ ایک جواں سال عورت اور بچی کی تصویر بھی ملی تھی۔ کسی گاؤں کے کسی کچے گھر میں رہنے والے وہ لوگ جنہوں نے اپنے گھر کے سربراہ کو روزی روٹی کے لیے خود سے جدا کر کے خطرناک مشینی شہر کے حوالے کیا ہوا تھا۔ بے شک مجھے اپنے وطن کے یہ مشینی شہر بھی پیارے تھے مگر مجھے اپنے وطن کی اصل خوشبو تو یہاں کے کھیتوں کھلیانوں، باغوں، نہروں اور کچے گھروں سے ہی آتی تھی۔ میری جیب میں ہزار ہزار کے دس بارہ نوٹ اب بھی موجود تھے' چار نوٹ رکھ کر میں نے باقی اس محمد رمضان نامی رکشا ڈرائیور کے نیکر نما انڈرویئر میں اُڑسے۔ قریب ہی موجود سنگِ مرمر کی دو قبروں کے پاس پانی کی ایک سبیل نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنا چہرہ دھویا، بال درست کیے۔ گیلے کپڑے سے اپنی خون آلود پنڈلیاں پونچھیں اور کسی سواری کی تلاش میں سڑک پر آ گیا۔

☆☆☆

اسٹیشن کے پاس ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرا کرائے پر لینے میں مجھے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ میرے پاس رکشا ڈرائیور محمد رمضان والا شناختی کارڈ موجود تھا بوقتِ ضرورت کام آ گیا۔

اب دن چڑھ آیا تھا۔ دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ چائے اور حلوہ پوری وغیرہ کی خوشبو آ رہی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں برا بھلا سا ٹی وی بھی موجود تھا۔ میں نے ٹی وی آن کیا۔ فوراً ہی مجھے ایک نیوز چینل مل گیا اور وہ نیوز بھی جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ نیوز کاسٹر ہیجانی لہجے میں بول رہی تھی۔

''یہ بہت بڑا واقعہ ہے جو لاہور میں ہوا ہے بلکہ ایسے علاقے میں جو نہایت محفوظ علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق ہلاکتوں کی تعداد تیس ہو چکی ہے لیکن کوئی بھی حتمی ''فگر'' بیان کرنا ممکن نہیں کیونکہ بیشتر لاشیں شدید آتش زدگی میں راکھ ہو چکی ہیں۔ زخمیوں کی تعداد پچاس سے کم نہیں ہے۔''

پھر نیوز کاسٹر نے اپنے فیلڈ رپورٹر کو لائن پر لیا۔ ''ہاں فواد! آپ موقع پر موجود ہیں۔ بتائیں اب کیا صورتِ حال ہے؟''

فیلڈ رپورٹر نے سیل فون کے ذریعے بتایا۔ ''پورے علاقے کو سیکیورٹی فورسز نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے اس عمارت میں اٹلی کے سابق قونصلیٹ کی رہائش تھی لیکن وہ خود آج کل یہاں موجود نہیں ہیں۔ یہاں ان کے کچھ غیر ملکی مہمان رہائش پذیر تھے۔ ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے لیکن کچھ باوثوق ذرائع یہ انکشاف کر رہے ہیں کہ دھماکے میں مارے جانے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے چند دن پہلے لاہور ہی کے ایک علاقے میں اندھا دھند فائرنگ کر کے بیس سے زائد افراد کو ہلاک کر دیا تھا...... اگر ہم غور کریں تو......''

نیوز کاسٹر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''فواد فائرنگ والے اس واقعے میں شاہ زیب نامی شخص کا نام بھی لیا گیا تھا۔ وہی جسے فارمر چیمپئن بتایا جاتا ہے اور جس پر دہشت گردی کا ایک مقدمہ بھی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اس آج والے واقعے میں بھی اس شخص کا کوئی کردار ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ اس کے ڈانڈے شاہ زیب اور ان غیر ملکیوں کے درمیان موجود کسی پرانی دشمنی سے ملا رہے ہیں؟''

''جی ابھی اس بارے میں کوئی ٹھوس شہادت تو سامنے نہیں آئی لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہاؤس نمبر اٹھارہ میں کل رات کوئی برتھ ڈے پارٹی ہو رہی تھی۔ اس پارٹی کے لیے جس معروف بیکری سے کیک بنوایا گیا اس میں بھی ایک پُراسرار واقعہ ہوا ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ اس بیکری کے جو دو ملازم

کیک کی ہوم ڈلیوری کے لیے وین پر ''ہاؤس نمبر اٹھارہ'' جا رہے تھے، راستے میں انہیں روکا گیا۔ ایک منی مارکیٹ کے قریب انہیں شدید زخمی کر کے گارڈ نیا کی ایک باڑ کے عقب میں ڈال دیا گیا اور ان کے کپڑے اتار لیے گئے۔''

''اس واقعے سے کیا اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے؟'' نیوز کاسٹر نے پوچھا۔

''یہ عین ممکن ہے کہ بیکری ملازمین کے روپ میں ہاؤس نمبر اٹھارہ میں گھسنے والے وہی لوگ ہوں جن کے ساتھ چند روز پہلے غیر ملکی گینگسٹرز کا خونی ٹاکرا ہوا تھا...... یعنی شاہ زیب اور اس کے ساتھی......''

ابھی فیلڈ رپورٹر کی بات جاری ہی تھی کہ بریکنگ نیوز کے بڑے بڑے سرخ الفاظ اسکرین پر ابھرے اور نیوز کاسٹر نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''ناظرین...... یہاں ہم آپ کو ایک نہایت اہم خبر دے رہے ہیں جس شبہے کا اظہار پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں سے کیا جا رہا تھا، وہ بالآخر سچ ثابت ہو گیا ہے۔ اس بات کی تصدیق ہو رہی ہے کہ شاہ زیب المعروف ایسٹرن دھماکے کے وقت اسی ہاؤس نمبر اٹھارہ میں موجود تھا...... اور وہ بھی جاں بحق ہونے والوں میں شامل ہے۔''

نیوز کاسٹر کی آواز ایک دم مزید بلند ہو گئی۔ ''یہ دیکھیں ناظرین...... یہ اسکرین پر آپ کو موقع واردات کی ایک جھلک نظر آ رہی ہے۔ یہ جو ''رک سیک'' فرش پر پڑا ہے، اس کا تعلق شاہ زیب سے ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ اداکارہ اروشا کی طرح شاہ زیب بھی دھماکے کے وقت عین اس جگہ پر موجود تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ جاں بحق ہونے والے تیس پینتیس افراد میں یہ دونوں بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ آپ کو پہلے بتایا جا چکا ہے بدقسمت اداکارہ اروشا کا ایک بازو اور جسم کے کچھ حصے ایک قریبی چھت سے دستیاب ہوئے ہیں۔ غالباً اسی طرح شاہ زیب کا یہ نیلا رک سیک اور سفید ٹوپی بھی دھماکے کی جگہ سے دس پندرہ میٹر دور پائی گئی ہیں۔''

نیوز کاسٹر مشینی رفتار سے بول رہی تھی اور واقعات کی مختلف کڑیاں جوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اروشا کی موت کی تصدیق نے مجھے دلی صدمہ پہنچایا۔ شاید درست ہی کہتے ہیں کہ زیورات عورت کی اہم ترین کمزوریوں میں شامل ہوتے ہیں۔ بدترین حالات میں بھی یہ کمزوری سامنے آئی تھی۔ اروشا اپنی قیمتی مالا اٹھانے کے لیے واپس دروازے تک گئی تھی اور اجل کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

میں نے ایک اور چینل دیکھا۔ اس پر بھی یہ اہم نیوز موجود تھی۔ تبصرہ نگار کہہ رہا تھا...... واقعات کا تسلسل ظاہر کر رہا ہے کہ شاہ زیب اور اس کے ساتھیوں نے پہلے بیکری کی ڈلیوری وین کو ہائی جیک کیا پھر بیکری ملازمین کا روپ دھارا اور سابق قونصلیٹ کی رہائش گاہ میں گھس گئے۔ یہاں غیر ملکی ''گھس بیٹھیوں'' کے ساتھ ان کا دوبدو مقابلہ ہوا اور ایمونیشن کے اسٹور میں آگ لگنے کے سبب زبردست بلاسٹ ہو گیا۔

نیوز چینلز پر مختلف سوال اٹھائے جا رہے تھے۔

یہ غیر ملکی تربیت یافتہ افراد یہاں کیسے پہنچے ہیں؟

ایم ایم اے کے سابق چیمپئن شاہ زیب المعروف ایسٹرن سے ان لوگوں کی کیا دشمنی تھی؟

کیا شاہ زیب سے کوئی پرانا بدلہ چکانے کے لیے ہی وہ لوگ یہاں پہنچے تھے؟

کیا ان لوگوں سے چھپنے کے لیے ہی شاہ زیب یعنی ایسٹرن ایک بالکل مختلف روپ میں یہاں پاکستان میں موجود تھا؟

ایک چھوٹا چینل بیکری کی وہ وین دکھا رہا تھا جو دھماکے کی جگہ سے قریباً نصف کلومیٹر دور ایک ذیلی سڑک پر کھڑی ملی تھی اور جس کے اندر سے ایک مقامی گارڈ کی لاش بھی بازیاب ہوئی تھی۔ نیوز کاسٹر نے ایک ماہر سیکیورٹی ایجنٹ کو لائن پر لیا ہوا تھا۔ ایجنٹ اس سارے معاملے کے ڈرامائی پہلو پر اظہارِ خیال کر رہا تھا۔

وہ اپنا گنجا سر سہلا کر بولا۔ ''میں ایک بار پھر کہوں گا کہ یہ سب کچھ ڈرامیٹک ہے اور کسی ہالی ووڈ فلم کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔ ایک ہی طرح کے لوگ...... ایک جیسے قد کاٹھ اور شکلیں بھی بہت زیادہ ملتی ہوئی۔ زیادہ لاشیں تو جل کر خاکستر ہو گئی ہیں۔ عمارت کے بڑے ہال سے جو دو لاشیں ملی ہیں، وہ بھی بالکل ایک جیسی ہیں۔ جیسے جڑواں بھائی ہوں۔ فقط آنکھوں کے رنگ اور پیشانی کی بناوٹ میں تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے۔ بڑی بڑی جوائنٹ فیملیز میں اس طرح کی مثالیں نظر آتی ہیں کہ کزنز کی صورتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں لیکن اتنی زیادہ تعداد میں لوگوں کا اس قدر مشابہ ہونا ایک معما ہے۔ ایک خیال یہ بھی پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں ماضی میں کسی جرائم پیشہ تنظیم کی طرف سے کوئی ''ٹیسٹ ٹیوب بے بیز'' جیسا تجربہ تو نہیں کیا گیا......''

اینکر پرسن نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''قادر خاں صاحب! آپ کا کیا اندازہ ہے۔ اب باقی ماندہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ چند ملازمین کے

سوا اب وہاں اور کوئی موجود نہیں۔ کئی لاشوں کے علاوہ زخمیوں کو بھی وہاں سے اٹھالیا گیا ہے۔''

سیکیورٹی ایجنٹ کا رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔ اینکر پرسن ''ہیلو...... ہیلو'' کرنے لگا۔ میں نے ٹی وی آف کردیا۔

سنسنی خیز خبریں تھیں اور سب سے سنسنی خیز خبر یہ تھی کہ میں دارِ فانی سے کوچ کر چکا تھا...... کم از کم فی الوقت تو میں مرحومین کی صف میں شامل تھا۔ یکا یک مجھے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ میرے ''انتقال'' کے بعد وہ اب تک خاموش کیوں تھا۔ سب سے پہلے تو انیق نے ہی مجھ سے عالمِ بالا کا حال احوال پوچھنا تھا۔ اس کے بعد داؤد بھاؤ تھا۔ مختار جھارا تھا اور کچھ دیگر ''لواحقین'' تھے جن کے پاس میرا یہ فون نمبر موجود تھا۔

میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں، فون تو موجود تھا مگر اس کی چارجنگ ختم ہوچکی تھی۔ میں نے بیرے سے ایک چارجر منگوا کر فون کو چارجنگ پر لگایا۔ ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ پہلی کال آگئی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ انیق یا داؤد بھاؤ کی طرف سے ہوگی مگر غیر متوقع طور پر یہ سجاول سیالکوٹی کی طرف سے تھی۔

مجھے یقین تھا کہ وہ سب سے پہلے میرے ''انتقالِ پُرملال'' کی بات ہی کرے گا لیکن جب رابطہ ہوا تو چند سیکنڈ میں پتا چل گیا کہ وہ ابھی اس سنسنی خیز خبر سے آگاہ نہیں ہوا۔ وہ اپنے ہی کسی چکر میں تھا، بولا۔ ''کہاں ہو شاہ زیب؟''

''تم کہاں ہو جنابِ عالی؟''

''میں لاہور میں ہوں۔ ابھی ابھی جیپ پر لاہور پہنچا ہوں۔ موٹروے پر تمہارا فون نہیں مل رہا تھا۔''

''خیریت تو ہے؟''

''ہے بھی اور نہیں بھی۔ تمہیں آکر بتاتا ہوں۔ تم بتاؤ کہاں آنا ہے مجھے؟''

میں نے کہا۔ ''خبروں کے مطابق تو تمہیں ''اگلے جہان'' میں آنا چاہیے...... ویسے میں یہاں اسٹیشن کے پاس ایک ہوٹل میں ہوں۔''

سجاول عجلت میں تھا۔ اس نے میرے فقرے کے پہلے حصے پر زیادہ غور نہیں کیا اور بولا۔ ''ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر وغیرہ بتاؤ۔''

میں نے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اسے بتا دیا۔ اس کے فوراً بعد میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور میں نے اپنا فون پھر آف کردیا۔ اس خیال کا ذکر میں آگے چل کر کرتا ہوں۔

وہ صرف آدھ پون گھنٹے میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے حلیے میں بس یہ تبدیلی کی تھی کہ اپنے اصل لباس شلوار قمیص کے بجائے پینٹ شرٹ میں تھا۔ داڑھی صاف تھی۔ مونچھ تو اس نے جاماجی میں ہی بہت چھوٹی کردی تھی، اب کچھ اور بھی چھوٹی نظر آرہی تھی۔ اس نے مڈل ایسٹ والے اسٹائل میں ایک ڈبی دار رومال چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ یقیناً اس کے قد کاٹھ کی وجہ سے لوگ اسے چونک کر دیکھتے تھے۔

وہ گلے ملا اور میرا حلیہ دیکھ کر کچھ ٹھٹکا بھی۔ میں رکشا ڈرائیور والی شلوار قمیص میں تھا۔ چھوٹتے ہی بولا۔ ''کیا شہر میں کوئی دھماکا ہوگیا ہے۔ سنا ہے کافی نقصان ہوا ہے۔ جگہ جگہ ناکے بھی لگے ہوئے ہیں۔''

''ہاں کافی نقصان ہوگیا ہے...... بلکہ...... ایک افسوسناک خبر تمہارے لیے بھی ہے۔ تمہارا یہ یار بھی 'مارا' گیا ہے۔'' میں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ مزید چونکا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال بتانا مناسب سمجھی۔ وہ حیرت سے گنگ سنتا گیا۔ ٹیکساری گینگ کے خطرے کا علم تو اسے پہلے سے تھا لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ یہاں پاکستان پہنچتے ہی یہ خطرہ پوری شدت سے مجھے آن دبوچے گا۔

اس نے کہا۔ ''تمہارا وہ نکو شہزادہ تو خیریت سے ہے ناں؟''

''خیریت سے ہی ہوگا لیکن ابھی اس سے میرا رابطہ نہیں ہوا۔''

''کیوں؟''

''فون کام نہیں کررہا۔'' میں نے اس سے جھوٹ بولا۔ دراصل میرے ذہن میں ایک اور خیال پنپ رہا تھا اور یہ بڑا سنسنی خیز تھا۔

میں نے موضوع بدلا اور سجاول سے پوچھا۔ ''ہاں، تمہارا کیا مسئلہ ہے۔ کیوں اس طرح بھاگے پھر رہے ہو؟''

اس نے گہری سانس لی۔ اس کا صندوق جیسا سینہ کچھ اور بھی پھیل گیا۔ اس نے پتلون کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس کی شرٹ پتلون سے باہر تھی۔ لفافہ نکالتے ہوئے اس کی شرٹ تھوڑا سا اوپر اٹھی اور مجھے اس کے پیٹ کے ساتھ گولیوں والی بیلٹ نظر آئی۔ یقیناً اس نے پتلون کے عقب میں اپنا کولٹ پسٹل بھی اُڑس رکھا تھا۔ بڑے ڈیل ڈول کی وجہ سے پینٹ شرٹ اس کے جسم پر زیادہ جچتی نہیں تھی مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ مضحکہ خیز لگتا ہو۔

یہ ٹی سی ایس کا لفافہ تھا۔ اس پر اردو میں کوٹلی کے ایک گاؤں کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ بھیجنے والے کا پتا لاہور کا تھا، نام احمد سلیم لکھا ہوا تھا۔

''یہ احمد سلیم کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا کوئی ماموں زاد ہے۔ کراچی میں رہتا ہے اور کام کے لیے لاہور آتا رہتا ہے۔'' سجاول نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''اس'' سے سجاول کی مراد خورسنہ ہی تھی۔

''کیا کہتا ہے؟'' میں نے خط کی تہیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

''جاماجی میں وہ اور اس کا بچہ کسی مصیبت میں ہیں۔''

میں نے خط پڑھا۔ یہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ احمد سلیم نامی اس شخص نے اس خط کے ذریعے خورسنہ کا حوالہ دیا تھا اور سجاول کو بتایا تھا کہ وہ جاماجی میں ایک بڑی مشکل کا شکار ہوگئی ہے۔ احمد سلیم نے خط کے آخر میں اپنا ایڈریس تحریر کیا تھا اور سجاول سے کہا تھا کہ اگر وہ لاہور آسکے تو وہ فوری طور پر اس سے کچھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔ خط کی پشت پر خورسنہ کے اس ماموں زاد نے اپنا فون نمبر بھی لکھا تھا۔

خط کو دوبارہ دھیان سے پڑھنے کے بعد میں نے سجاول سے کہا۔ ''کہیں یہ کوئی چال وغیرہ تو نہیں...... تم نے اس فون نمبر پر رابطہ کیا ہے؟''

''قریباً پندرہ بیس دفعہ۔ شروع میں ایک دو بار بیل گئی، پھر وہ بھی نہیں گئی۔''

''یہ کوٹلی کا ایڈریس خورسنہ یا اس کے ماموں زاد کے پاس کیسے ہوسکتا ہے۔ تم نے ہی دیا ہوگا؟''

''ہاں، میں نے ہی ایک مرتبہ خورسنہ کو دیا تھا۔''

''کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ اس ماموں زاد نے خط پر اپنا فون نمبر تو لکھا، لیکن پھر کال اٹینڈ نہیں کی...... اور...... اگر کوئی ایسی ہی خطرناک سچویشن تھی یا ارجنٹ بات تھی تو پھر یہ شخص تمہیں لاہور بلانے کے بجائے خود بھی کوٹلی آسکتا تھا۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ خود بھی کسی مشکل میں پڑ گیا ہو؟''

میں نے ایک بار پھر لاہور کا ایڈریس پڑھا۔ یہ کوئی گھر یا فلیٹ وغیرہ نہیں تھا۔ ایک گیسٹ ہاؤس تھا ڈیفنس کے علاقے میں۔ روم نمبر بھی درج تھا۔ بعض لوگ جو اکثر کسی شہر میں جاتے رہتے ہیں، وہاں کسی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں مستقل بنیاد پر کمرا بک کرا لیتے ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ایسا ہی سلسلہ تھا۔

''اب کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے سجاول سے پوچھا۔

''جا کر دیکھنا تو پڑے گا۔'' اس نے اپنی نہایت چوڑی اور کھردری ٹھوڑی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''میرا جانا ضروری ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہ جاؤ، میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔'' وہ ذرا تیکھے لہجے میں بولا پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''تم کسی چکر میں لگ رہے ہو...... دھماکے والا اتنا بڑا واقعہ ہوگیا ہے پر لگتا ہے کہ تم نے اپنا فون بند کیا ہوا ہے۔ انیق تک سے رابطہ نہیں کیا ہے......؟''

میرے ذہن میں جو خیال گھوم رہا تھا، وہ اب پختہ ہوتا جارہا تھا۔ یہ بڑا عجیب خیال تھا اور اس کے نتائج دوررس ہوسکتے تھے۔ خوفناک دھماکے میں مجھے مردہ تصور کیا جارہا تھا۔ کئی ٹھوس ثبوت بھی مہیا ہوگئے تھے۔ دھماکے کے بعد اتنی شدید آگ بھڑکی تھی کہ دو درجن کے قریب لاشیں خاک ہوگئی تھیں۔ شاید ڈی این اے ٹیسٹ بھی ساری لاشوں کی نشاندہی نہ کرسکتا۔ ٹیکساری گینگ ایک خوفناک بلا کا نام تھا اور ڈیتھ اسکواڈ اس بلا کا سب سے خوفناک ہتھیار تھا۔ یہ ہتھیار اپنی تمام تر ہلاکت خیزی کے ساتھ میری شہ رگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری زندگی ایک مہلک ترین نشانے پر تھی۔ کیا موجودہ صورتِ حال مجھے کچھ عرصے کے لیے...... یا پھر مستقل طور پر ٹیکساری گینگ کے گھیرے سے نکال سکتی تھی؟

''کس سوچ میں گم ہوگئے ہو۔ کوئی وڈی پریشانی ہے تو میں اکیلا چلا جاتا ہوں۔'' سجاول سیالکوٹی دبنگ انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

میں نے اسے پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔ اور اسے بتایا کہ میڈیا پر کیا خبریں چل رہی ہیں اور اس حوالے سے میں کیا چاہ رہا ہوں...... بات اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، جو کچھ تم کہہ رہے ہو...... وہ ہو تو سکتا ہے مگر سب سے بڑی شرط تو رازداری ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سجاول! ابھی تک تمہارے سوا کسی کو یہ پتا نہیں کہ میں زندہ سلامت یہاں اس ہوٹل میں موجود ہوں۔''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر جب تک تم کہو گے یہ بات ہم دونوں کے درمیان رہے گی۔'' وہ حلفیہ انداز میں بولا۔

''وعدہ؟''

''لوہے توڑ وعدہ۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

اس حوالے سے ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو

مزید ہوئی اور پھر ہم ڈیفنس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

سجاول چند سال پرانے ماڈل کی ٹویوٹا جیپ پر کوٹلی سے اکیلا ہی لاہور پہنچا تھا۔ جیپ کے شیشے ٹنٹڈ تھے۔ میرے باہر نکلنے میں تھوڑا بہت رسک تو تھا مگر سجاول جیسے یار کی خاطر یہ رسک لیا جا سکتا تھا۔ ہم گیسٹ ہاؤس کی وسیع پارکنگ میں پہنچے تو میں نے اپنے چرمی بٹوے میں سے وہ ننھا سا اسپائی کیمرا نکال لیا جو جاماجی میں بھی بے مثال ثابت ہوا تھا۔ سجاول کے گلے میں ایک تعویذ تھا اور یہ تقریباً کیمرے کا ہم رنگ ہی تھا۔ میں نے چنے کی دال کے دانے جتنا کیمرا سجاول کے تعویذ پر عین درمیان میں چپکا دیا۔ وہ تعویذ کا حصہ ہی معلوم ہونے لگا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ بولا۔

''میں یہاں گاڑی میں ہی رہوں گا۔ تم اندر جاؤ۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو مجھے پتا چل جائے گا لیکن بھائی میرے! طیش میں نہ آنا۔ فی الوقت مارا ماری ہم بالکل افورڈ نہیں کر سکتے۔''

''زیادہ ہدایت اللہ خاں نہ بنو۔ مجھے پتا ہے کیا کرنا ہے اور کہاں تک رہنا ہے۔'' اس نے کمر کی طرف اُڑسا ہوا اپنا لوڈڈ پستول نکالا اور اسے چیک کیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عقابی چمک نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اپنا سیل فون نکالا۔ اس کی ''سم'' علیحدہ کی اور پھر اسے آن کر کے اس ایپلی کیشن میں چلا گیا جو فون کی اسکرین کو اسپائی کیمرے کے ریسیور میں بدل دیتی تھی۔ تھوڑی سی کوشش سے مجھے کامیابی ہو گئی۔

سجاول کے باہر نکلنے کے بعد میں نے نشست کو اسٹریچ کیا اور نیم دراز ہو کر فون کی اسکرین پر نگاہ جما دی۔

سجاول مین دروازے سے گزر کر استقبالیہ کاؤنٹر تک پہنچ گیا۔ خوش شکل لڑکی نے پوچھا۔ ''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

سجاول نے اپنا مدعا بیان کیا۔ لڑکی نے انٹرکام اٹھایا اور کسی سے بات کرنے کے بعد اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سجاول کے ڈیل ڈول اور لب و لہجے سے مرعوب نظر آتی تھی اور ذرا ٹھٹکی ہوئی بھی۔ سجاول قالین پوش سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور پر پہنچا اور پھر ایک کوریڈور سے گزر کر مطلوبہ کمرے تک پہنچ گیا۔ اب میرا تجسس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر واقعی وہاں خورسنہ کا ماموں زاد احمد سلیم موجود تھا تو اسے دیکھنا اور اس کی بات سننا میرے لیے اہم تھا۔

سجاول نے بزر بجایا۔ چند لمحے بعد اندر سے بولٹ گرنے کی مدھم آواز آئی لیکن دروازہ کھلا نہیں۔ سجاول نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ اسپائی کیمرے نے ایک پُرآسائش کمرے کا منظر دکھایا مگر سجاول کے سامنے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ کیمرے کی مومنٹ سے اندازہ ہوا کہ سجاول دائیں بائیں دیکھ رہا ہے پھر اچانک محسوس ہوا کہ کوئی عقب سے سجاول سے لپٹ گیا ہے۔ مجھے اس لپٹنے والے کے صرف ہاتھ ہی ایک لمحے کے لیے دکھائی دیے۔ مجھے لگا کہ یہ نسوانی ہاتھ ہیں۔

تب ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ دلکش آواز خود خورسنہ کی تھی۔

''السلام علیکم'' اس نے سجاول کی پشت سے چپکے چپکے کہا تھا۔ یقیناً سجاول بھی کچھ دیر کے لیے سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ تب اس نے خورسنہ کو گھما کر اپنے سامنے کر لیا۔ اسپائی کیمرے نے خورسنہ کو دکھایا۔ موسم کے لحاظ سے اس نے گلابی رنگ کی ہلکی پھلکی شرٹ پہن رکھی تھی۔ نیچے نیلی جین تھی۔ بال جوڑے کی صورت بندھے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند اور جاذب نظر دکھائی دیتی تھی۔

سجاول کی بھاری آواز سیل فون کے اسپیکر پر ابھری۔ ''یہ..... تم نے کیا کیا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ..... تم یہاں ہو۔'' سجاول کی آواز میں لرزش تھی۔

''کیسا لگا سرپرائز؟'' وہ سجاول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے گداز ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں نمی۔

''تم..... بہت عجیب ہو خورسنہ۔'' سجاول نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

ایک دم اسکرین تاریک ہو گئی۔ یوں لگا جیسے کیمرے کو کسی نے ڈھانپ لیا ہو۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ سجاول کے گلے لگ گئی ہے۔

''میں نے تمہیں پریشان کیا ناں سجاول، بہت دکھ دیا ناں؟''

''ہوں۔'' سجاول نے مختصر جواب دیا۔

''شاید..... تم آخر وقت تک میرا انتظار کرتے رہے کہ میں آ جاؤں گی۔''

''ہوں۔'' سجاول نے دوبارہ ہنکارا بھرا۔

''انتظار لمبا تھا لیکن بے کار تو نہیں گیا ناں؟''

سجاول خاموش رہا۔ وہ اس کے گلے لگے لگے بولی۔

''جواب دو ناں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''
''میں بھی...... تمہیں یاد کرتی رہی ہوں...... ایک پل بھی...... ذہن سے نکال نہیں سکی۔'' وہ اٹک اٹک کر کہہ گئی۔
''وہ...... ذیشان کہاں ہے؟'' سجاول نے موضوع بدلا۔
اس موقع پر دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ کیمرا ایک بار پھر خورسنہ کو دکھانے لگا۔ اس کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں اشک مسکرا رہے تھے۔ خورسنہ نے کہا۔ ''ذیشان جاماجی میں ہی ہے۔ اپنے ایک ماموں کے پاس۔ بہت پیار ہے دونوں میں۔ وہ ان کے پاس ہفتوں رہ سکتا ہے.... وہی احمد سلیم جن کے نام سے میں نے تمہیں خط بھیجا۔'' اس کے لہجے میں دبی دبی شوخی تھی۔
سجاول کے لہجے میں ذرا اداسی آ گئی، اس کا مطلب ہے کہ تم...... عارضی طور پر آئی ہو؟''
وہ مسکرا کر بولی۔ ''آ تو گئی ہوں ناں، اب تم جیسا کہو گے، ویسا ہو جائے گا۔''
وہ شاید ایک بار پھر گلے لگ گئی تھی کیونکہ میرے سیل فون کی اسکرین تاریک ہو گئی تھی۔ بس سانسوں کی سرسراتی ہوئی آواز ابھر رہی تھی۔ میں نے سوچا اس موقع پر انیق ہوتا تو ضرور اپنا سر پیٹ لیتا۔
سجاول اور خورسنہ کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی۔ کیمرے کا اینگل بار بار بدل رہا تھا، کبھی خورسنہ کی صرف ٹانگیں نظر آتی تھیں، کبھی کندھا اور کبھی چہرہ۔ وہ جاماجی اور برونائی میں پروان چڑھی تھی۔ وہاں کی آب و ہوا نے اس کے اندر ایک خاص قسم کی دلکشی بھر دی تھی۔ وہ نوخیز شباب کی عمر سے تو گزر چکی تھی۔ تاہم کوئی بھی مرد پہلی نظر میں اس پر فدا ہو سکتا تھا۔ اور وہ فدا ہوئی تھی آزاد کشمیر کی پہاڑیوں میں اُگے ہوئے ایسے کڑوے خاردار درخت پر جس کے قریب سے گزرنے والا بھی لہولہان ہو جاتا تھا۔ واہ ری محبت تو کیسے کیسے تماشے دکھاتی ہے۔
کچھ دیر بعد سجاول ذرا ہانپا ہوا سا ٹویوٹا جیپ میں واپس آ گیا۔ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟''
میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اب تو جو کچھ کرنا ہے، شیر نے ہی کرنا ہے۔ ویسے بڑی جراُت دکھائی ہے اس نے بھی۔ اتنی دور سے اکیلی چلی آئی......''
سجاول نے نشست سے ٹیک لگا کر ایک لمبی سانس لی۔ غالباً اسے سوچنے کے لیے سگریٹ اور وہسکی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جیپ کی نشست کے نیچے کسی خفیہ خانے میں ہاتھ گھمایا اور ایک ''ولایتی کوارٹر'' نکال کر تین چوتھائی غٹاغٹ چڑھا گیا پھر سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''کوئی مشورہ دو اب۔''
''وہ کیا کہتی ہے؟''
''وہ تو کہتی کہ کہیں بھی لے جاؤ۔ تم نے بھی سن ہی لیا ہو گا...... لیکن......''
''لیکن کیا؟''
''یہ تو پکی بات ہے کہ میں اسے اپنے ڈیرے پر نہیں لے جا سکتا اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہوں کہ میں کیا کرتا ہوں۔''
''تو پھر؟''
''ابھی ایک دو دن سوچتا ہوں یہاں رہ کر۔''
''یہاں رہ کر؟ یعنی اس گیسٹ ہاؤس میں؟''
''ہاں۔'' سجاول نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس نے یہ کمرا میرے ہی نام سے بک کروایا ہے بلکہ یہ دو کمرے ہیں۔ چھوٹی سی گیلری (بالکونی) بھی ہے۔''
''تمہارے نام سے کیسے کرا دیا؟ تمہارے نام کا شناختی کارڈ تھا اس کے پاس؟''
''نہیں، اس نے کہا سجاول احمد میرے شوہر کا نام ہے۔ وہ ایک دو دن میں پہنچ رہے ہیں...... اور کمرا بک کرا لیا۔''
''لگتا ہے کافی چوکس بھابی ملنے والی ہے ہمیں۔ لیکن اب تمہیں یہاں شناختی کارڈ دکھانا پڑے گا۔''
''یہ زیادہ مشکل کام نہیں۔ محمد سجاول...... سجاول احمد...... سجاول شاہ کے نام سے کئی شناختی کارڈ پڑے ہیں میرے پاس۔''
''لیکن تم زیادہ دن یہاں رہ تو نہیں سکو گے، نظر میں آنے کا خطرہ ہو گا۔''
''وہ تو اب بھی ہے۔'' سجاول نے دور کھڑی ایک پولیس موبائل پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔
''اور یہی خطرہ میرے لیے بھی ہے یہاں۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے واپس اپنے ہوٹل پہنچ جانا چاہیے۔''
''ٹھیک ہے، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں مگر ہمارا رابطہ ہر صورت رہنا چاہیے۔''
''پھر اس کے لیے ہمیں راستے میں چند منٹ کے لیے رکنا ہو گا۔ مجھے ایک نیا موبائل اور نئی سم چاہیے ہو گی۔''
''ٹھیک ہے۔'' سجاول نے کہا اور اپنے گلے کے

تعویذ سے چپکا ہوا کیمرا اتار کر میرے حوالے کر دیا۔

میں نے شک بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تو اس نے برا سا منہ بنایا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ راستے میں ہماری گفتگو کا موضوع یہی دونوں سنسنی خیز واقعات رہے۔ پہلا واقعہ جو دھماکے کے حوالے سے تھا اور جس نے شہر میں ہلچل مچا رکھی تھی اور دوسرا خورسنہ کی ڈرامائی آمد کا واقعہ۔ راستے میں ٹنٹڈ شیشوں والی جیپ کے اندر بیٹھے بیٹھے ہی ہم نے ایک موبائل سیٹ اور ایک سم بھی خرید لی۔ اس کی ادائیگی سجاول نے کی۔

☆☆☆

میں واپس ریلوے اسٹیشن کے قریبی ہوٹل میں پہنچ چکا تھا۔ سجاول واپس گیسٹ ہاؤس چلا گیا تھا۔ ایک گرم سہ پہر ..... کے بعد شام کے سائے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ الیکٹرانک میڈیا پر ابھی تک علی الصبح پیش آنے والے واقعے کی گونج تھی۔ ہلاکتوں کی تعداد بڑھ چکی تھی۔ جو خبر سب سے زیادہ دلچسپی اور حیرت سے سنی جا رہی تھی، وہ یہی تھی کہ غیر ملکی حملہ آوروں کی شکلیں غیر معمولی حد تک ایک دوسرے سے ملتی تھیں اور ان کے قد کاٹھ بھی تقریباً ایک جیسے تھے۔ سگے بھائی...... یا قریبی کزن...... یا پھر ایک ہی برادری کے لوگ؟ اس طرح کا واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔

میں نے ٹی وی کی آواز تھوڑی سی اونچی کی۔ ایک نیوز چینل پر میری دلچسپی کی خبر چل رہی تھی۔ اینکر نے تجزیہ نگار سے پوچھا۔ ’’اس واقعے میں شاہ زیب المعروف ایسٹرن اور اداکارہ اروشا کے جاں بحق ہونے کی تصدیق ہو چکی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، شاہ زیب جس پر دہشت گردی کا مقدمہ بھی درج تھا، وہاں ہاؤس نمبر اٹھارہ میں کیوں موجود تھا؟‘‘

تجزیہ نگار نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگانے کے بعد کہا۔ ’’جہاں تک دہشت گردی کے مقدمے کا تعلق ہے اس کے درست یا غلط ہونے کے بارے میں فی الحال ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ انسپکٹر قیصر چودھری کے ذاتی عناد کا نتیجہ تھا۔ لیکن موجودہ واقعے میں شاہ زیب کا کردار مثبت رنگ میں سامنے آیا ہے۔ یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ غیر ملکی گھس بیٹھیوں کی طرف سے بیس شہریوں کے قتلِ عام کا بدلہ چکانے کے لیے اٹھارہ نمبر گھر میں داخل ہوا اور وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہا۔‘‘

اینکر نے کہا۔ ’’گرفتار ہونے والے کچھ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ دھماکے کے وقت شاہ زیب اور اروشا غیر ملکی شوٹرز کے نرغے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہ زیب اداکارہ اروشا کو بچانے کے لیے ہی گھر میں داخل ہوا ہو؟‘‘

’’ایسا کہنا قرینِ قیاس نہیں۔‘‘ تجزیہ نگار نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’ہاں یہ ممکن ہے کہ مارا ماری کے دوران میں اس کی نظر اروشا پر پڑ گئی ہو اور اس نے اروشا کی مدد کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے لیا ہو۔‘‘

’’داؤد بھاؤ کا نام بھی اس حوالے سے لیا جا رہا ہے۔ اس سارے واقعے میں داؤد بھاؤ کا کردار کیا ہو سکتا ہے؟‘‘

’’داؤد بھاؤ اور اس کے دو تین قریبی ساتھی ایک بار پھر منظر سے اوجھل ہیں مگر یہ شواہد تو بہر حال مل رہے ہیں کہ شاہ زیب اور داؤد بھاؤ میں لنک موجود تھا۔ اگر......‘‘

میں نے ٹی وی آف کر دیا۔ میری ’’موت‘‘ کی خبر پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے کسی اور کی تو نہیں مگر اپنے والدین کی فکر تھی۔ عین ممکن تھا کہ یہ خبر ان کے کانوں تک رسائی حاصل کر چکی ہو یا کرنے والی ہو۔ میں کم از کم انہیں ضرور یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ ان کا ناہنجار فرزند تادمِ اطلاع حیات ہے۔

میں نے اپنا پرانا نمبر تو بند کر دیا تھا۔ نئے نمبر کو ’’ایکٹی ویٹ‘‘ کرنے کے بعد میں نے قریباً آدھ گھنٹا کوشش کی اور والد صاحب تک ایک ’’وائس میسج‘‘ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میسج میں، میں نے انہیں اطلاع دی کہ میں خیر خیریت سے ہوں...... اگر ان تک میرے بارے میں کوئی بری خبر پہنچے تو وہ جھوٹ ہو گی۔ ساتھ ہی میں نے والد صاحب کو تاکید کی کہ میری آئندہ سلامتی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ میری موجودہ سلامتی کو مکمل راز رکھیں۔

فوراً ہی والد اور والدہ کی طرف سے ٹیکسٹ میسج موصول ہو گیا۔ اس میسج سے اندازہ ہوا کہ ابھی ان تک لاہور میں ہونے والے المناک واقعے کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایک بار یہ باتیں شروع ہوئیں تو پھر شاید کئی دن بھی ختم نہ ہو سکیں۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر انہیں ٹیکسٹ میسج بھیجا کہ فی الوقت میرے لیے بات کرنا کسی طور ممکن نہیں۔ میرے لیے دعا کرتے رہیں۔‘‘

اس میسج کے بعد میں نے یہ نیا فون بھی آف کر دیا۔

مجھے پتا تھا کہ چچا حفیظ اور ولید وغیرہ کے لیے بھی یہ خبر بڑی دلدوز ثابت ہوگی۔ چچا حفیظ کے پاس میرا فون نمبر موجود تھا اور یقینی بات تھی کہ وہ اب تک درجنوں بار مجھ سے

رابطہ کرنے کی کوشش کر چکے ہوں گے۔ اس حوالے سے ایک اور نام بھی میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ یہ تاجور کا نام تھا۔ بے شک وہ ایک دور دراز گاؤں میں تھی مگر یہ عین ممکن تھا کہ یہ خبر اس تک بھی پہنچ جاتی۔ میں اس ردِعمل کے بارے میں سوچنے لگا جو اس خبر کے بعد اس پر ظاہر ہو سکتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور میں بری طرح چونک گیا۔ یوں لگا کہ ایک ہی لحظے میں دماغ کے اندر دس ہزار واٹ کا بلب روشن ہو گیا۔ اور اس کی روشنی نے حقیقت اور تصور کے ہر منظر کو بدل ڈالا ہے۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ دل و دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ نہایت بے قراری سے میں نے کمرے کے اندر ہی ایک چکر لگایا اور دوبارہ بیٹھ گیا۔ جو خیال پچھلے کئی گھنٹوں سے پنپ رہا تھا، وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

میری زندگی کا سب سے بڑا روگ یہ ٹیکساری گینگ تھا اور میں ان کے لیے ''مر'' گیا تھا۔ اسی نوے فیصد تو مر گیا تھا۔ میرے ''چیتھڑے'' اُڑے تھے اور میں درجنوں دوسرے لوگوں کے ساتھ راکھ ہو گیا تھا۔ تو کیا...... تو کیا؟ میرے لیے ایک نئی زندگی کا راستہ کھل سکتا تھا۔ ایسی زندگی جس کو ٹیکساری گینگ کا کینسر لاحق نہ ہو۔ کیا اس سلسلے میں ڈاکٹر احرار میرے کسی کام آ سکتا تھا۔ کرنل ڈاکٹر احرار جو جاماجی سے میرے ساتھ ہی جہاز میں یہاں پہنچا تھا۔ وہ ایک مانا ہوا پلاسٹک سرجن تھا۔ وہ میرے چہرے کو تھوڑا بہت تو تبدیل کر ہی سکتا تھا۔ وہ کرشمہ کار تھا۔ میں نے جاماجی میں اس کے دو تین ماسٹر پیس دیکھے تھے۔ وہ ''سلی کون'' اور دیگر ٹشوز کی مدد سے حیرت انگیز نتائج پیدا کرتا تھا۔

میں اس حوالے سے سوچتا چلا گیا اور میرے اندر کچھ نئی راہیں کھلنے لگیں۔ ایک عجیب سی ترنگ تھی جو لہو سے اٹھ رہی تھی اور آہستہ آہستہ میرے رگ و پے میں پھیل رہی تھی۔

پورے چوبیس گھنٹے میں اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر سوچتا رہا اور غور کرتا رہا۔ گاہے بگاہے میں ٹی وی آن کر کے پرسوں والے واقعے کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ کل سارا دن تو ہر چینل پر اسی خبر کا چرچا رہا تھا لیکن اب وقت گزرنے کے ساتھ دیگر خبریں حاوی ہو رہی تھیں۔ اس کے باوجود ہاؤس نمبر اٹھارہ کے واقعے کی بازگشت کہیں کہیں موجود تھی اور تبصرے بھی ہو رہے تھے۔

شام کے وقت میں نے ٹی وی آن کیا تو اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی، اینکر نے کہا۔ ''اب یہ بات تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے اور یہ یورپ کے انڈر ورلڈ کے خطرناک ترین گینگس میں سے ایک ہے۔ شاہ زیب المعروف ایسٹرن کے ساتھ اس گینگ کی دشمنی بھی اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ اب آپ کا کیا خیال ہے، کیا یہ لوگ واقعی مطمئن ہیں کہ شاہ زیب پرسوں رات والے واقعے میں ختم ہو چکا ہے اور اب انہیں مزید مہم جوئی کی ضرورت نہیں؟''

تبصرہ نگار نے کہا۔ ''اس کا دارومدار تو ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹس پر ہوتا تھا مگر مسئلہ یہ ہے کہ بیشتر لاشیں جل کر راکھ ہو چکی ہیں اگر کچھ باقیات مل بھی جاتی ہیں تو پھر انہیں میچ کرنے کے لیے سیمپل کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں رکاوٹ یہ ہے کہ شاہ زیب کے ڈی این اے کا سیمپل موجود نہیں، اس کے والدین حیات ہیں لیکن ایک عرصے سے اُن کا کچھ اتا پتا نہیں۔''

اینکر بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ شاہ زیب نے گینگ سے اپنی خطرناک دشمنی کی وجہ سے ہی انہیں کہیں چھپا رکھا ہو؟''

''آپ نے بالکل بجا کہا۔ یہی بات شاہ زیب کے چچا محمد حفیظ صاحب کے بارے میں کہی جاتی ہے۔ وہ چند روز پہلے تک مراد پور میں اپنی رہائش گاہ میں موجود تھے لیکن اب وہ بھی اوجھل ہیں۔ ایسے شواہد ملے ہیں کہ کچھ روز پہلے شاہ زیب مراد پور گیا اور اپنے چچا کو اپنے ساتھ لے گیا......''

''ممکن ہے کہ اس نے یہ احتیاط ٹیکساری گینگ کی یہاں آمد کے بعد کی ہو؟''

''یقیناً ایسا ہی ہے۔'' تبصرہ نگار نے تائید کی اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زیب کا ایک چچازاد ولید آج کل کوٹ لکھپت جیل میں موجود ہے ممکن ہے کہ اس کے ذریعے ڈی این اے کا عمل آگے بڑھ سکے۔ تاہم اس سلسلے میں ماہرین ہی اصل بات بتا سکتے ہیں۔''

اینکر بولا۔ ''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شاہ زیب کی ہلاکت کا سو فیصد یقین ہونے تک گینگ کے لوگ واپس نہیں جائیں گے......؟''

''نہ صرف واپس نہیں جائیں گے بلکہ اس امر کا خدشہ بھی ہے کہ مزید لوگ آ جائیں اور شاہ زیب کی ''موت'' کے حوالے سے اپنا ہر شک رفع کرنے کی کوشش کریں۔ ان لوگوں کی یہاں موجودگی بہت خطرناک ہے اور انتظامیہ کو اس حوالے سے بہت چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔''

اینکر پرسن نے اپنے ہاتھوں میں بال پوائنٹ کو گھماتے ہوئے کہا۔ ''اب میں اس موضوع کے دوسرے اور زیادہ تحیر خیز پہلو کی طرف آتا ہوں۔ ایسی خبریں ہم تک پہنچ رہی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ٹیکساری گینگ کا یہ ڈیتھ اسکواڈ خاص الخاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان لوگوں کے ہم شکل ہونے کے پیچھے ایک حیرت ناک کہانی ہے...... یہ وہی معاملہ ہے جس کا شبہ کل بھی ہمارے چینل پر معروف گائنا کالوجسٹ ڈاکٹر صدیقی نے کیا تھا۔ ٹیسٹ ٹیوب ''بے بیز'' اور کرائے کی کوکھ کا تصور اب......''

اس بور بحث سے بچنے کے لیے میں نے چینل بدل دیا۔ یہاں ایک خوبرو لڑکی چند بزرگ سیاست دانوں کے درمیان بیٹھی، بریک لینے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی اور بزرگ اتنے گرم تھے کہ لگتا تھا، ابھی ایک دوسرے پر پل پڑیں گے۔

اسی دوران میں کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں کمرے سے بالکل نہیں نکل رہا تھا اور کھانا بھی کمرے میں ہی منگواتا تھا۔ میں نے اپنا پسٹل کمر کی طرف اپنے نیفے میں اُڑسا اور دروازے کے سامنے پہنچ کر کہا۔ ''کون؟''

''میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔'' سجاول کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔

میں نے دروازہ کھولا، وہ اندر آ گیا۔ کافی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا، خیریت تو ہے ناں؟''

''خیریت ہی ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا اور صوفے پر ڈھے گیا۔ اس کے وزن سے صوفے کی ''کراہیں'' نکل گئیں۔

''وسکی ہو گی؟'' اس نے پوچھا۔

''توبہ توبہ کرو۔ تمہیں پتا ہے چھوڑ چکا ہوں۔''

اس نے شرٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک ہی کش میں ایک چوتھائی سگریٹ رگڑ گیا۔ ''تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ حالانکہ تمہیں بہت خوش نظر آنا چاہیے تھا۔''

''خوشی گئی چولہے میں۔''

''کیا ہونے والی بھابی سے کوئی اَن بن ہوئی ہے؟''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''ان زنانیوں کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ان کے دل دماغ وکھرے، ان کی سوچیں وکھری، ان کا پیار محبت وکھرا......''

''پیار محبت وکھرا؟ کیا مطلب؟ پیار محبت تو ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہر جاندار میں اور ہر نر مادہ میں ہوتا ہے۔''

وہ میرے فقرے کی لطافت کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''اب دیکھو اس کو، یہ وہاں سے کس لیے آئی ہے؟ سیر سپاٹے اور گھومنے پھرنے کے لیے تو نہیں آئی ہے نا؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو سجاول؟''

''شاہ زیب! میں بالکل سیدھا صاف بندہ ہوں۔ مجھے یہ چاؤ چوچلے اور دل فریب نہیں آتے یا تو وہ میرے ساتھ ہے...... یا نہیں ہے۔ میں نے اسے ایک بالکل سیدھی آفر کی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ہم نکاح کر لیتے ہیں۔''

میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ ''اور وہ کیا کہتی ہے؟''

''کہتی ہے کہ وہ اتنی جلدی اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں نے کہا تو پھر یہاں آنے کا مقصد؟ وہ بولی کہ یہاں رہنا چاہتی ہے۔ میرے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتی ہے۔ پاکستان کے پہاڑی علاقے دیکھنا چاہتی ہے...... پہاڑی علاقے۔'' وہ غصے سے بڑبڑایا اور سگریٹ کا خالی پیکٹ دیوار پر دے مارا۔

میں اب تک سجاول کو بہت اچھی طرح جان چکا تھا۔ وہ سونے کا دل رکھتا تھا مگر اس کا مزاج آہنی تھا۔ اس کا غصہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ مجھے جاماجی کا وہ سین بھی یاد تھا جب اس نے مایوسی کے عالم میں اپنے فولادی مُکے کی ضرب سے تاج محل کا خوب صورت ماڈل توڑ پھوڑ دیا تھا اور ساتھ ہی وہ میز بھی جس پر ماڈل رکھا تھا۔ وہ ماڈل خورسنہ نے ہی اسے گفٹ کیا تھا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سجاول! شاید تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ عورت اور مرد کے پیار محبت میں فرق ہوتا ہے۔ مرد کی محبت میں جسم کے ملاپ کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے جبکہ عورت کی محبت میں سوچ اور خیال کو زیادہ جگہ ملتی ہے۔ وہ مرد سے دور رہ کر اس کو اپنی محبت کے گھیرے میں رکھنا چاہتی ہے جبکہ مرد اس کے قریب ہو کر محبت کو عملی شکل دینا چاہتا ہے......''

''یار! یہ پروفیسروں والی باتیں میرے ساتھ نہ کرو۔ یہ تو کوئی بات نہیں کہ کسی کے ساتھ رہنا بھی چاہو...... اور رہو بھی نہ۔ اس کو ستاؤ...... پریشان رکھو...... اور خود بھی پریشانی میں رہو۔ اٹھتے بیٹھتے ''ہوکے'' بھرتے رہو اور پھر اسی ''اکھ مچولی'' میں کوئی ایسا کام ہو جائے کہ کھوتا ہی کھوہ

میں جا گرے۔"

میں نے کہا۔ "سجاول! شاید اس معاملے میں، میں تم سے تھوڑا زیادہ جانتا ہوں۔ اگر خورسنہ تمہارے لیے تمہارے پیچھے یہاں آئی ہے تو یہ اس بات کا پکا ثبوت ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے...... اور تمہاری ہر بات مان بھی سکتی ہے۔ بس تحمل رکھو اور اسے تھوڑا سا وقت دو۔ مجھے یقین ہے سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔"

"یار! وہ کوئی کالج کی کڑی نہیں ہے۔ چنگی بھلی سمجھ دار ہے۔"

"تم بھی کوئی کالج کے منڈے نہیں ہو۔ چنگے بھلے سمجھ دار ہو اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تھوڑا صبر کرو۔ اگر کہتے ہو تو میں بھی اس سے تھوڑی بہت بات کرتا ہوں۔"

"تو کرو۔"

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اس سے کیا کہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اپنے رہن سہن کے بارے میں...... یہ جو پنجاب کی آدھی پولیس تم اپنے پیچھے لگائے پھرتے ہو، اس کے بارے میں خورسنہ کو کچھ پتا ہے یا نہیں؟"

"یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ اس بارے میں، میں اسے کچھ نہیں بتا سکتا۔ ہاں، اتنا ضرور کروں گا کہ اسے اس سارے ماحول سے بالکل الگ رکھوں گا۔ اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا اُس پر۔"

"تمہارے روزگار اور خاندان کے بارے میں اسے کیا پتا ہے؟"

"میں نے اسے جاماجی میں بتایا تھا کہ آزاد کشمیر میں کچھ زمینیں میں نے بیچی تھیں جن کی رقم میرے پاس ہے۔ آزاد کشمیر میں میری "پرانی دشمنی" چل رہی ہے جس کی وجہ سے میں وہاں سے نکل آیا ہوں اور اکیلا رہ رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "وہ کتنے دن کے لیے آئی ہے؟"

"کوئی چھ ہفتے کے لیے۔ لیکن جو کچھ وہ چاہتی ہے، وہ میں نہیں کر سکتا۔ کیا میں اسے اپنے ساتھ لے کر انارکلی یا مال روڈ پر شاپنگیں کرا سکتا ہوں یا پھر مری اور نتھیا گلی میں چہل قدمیاں کر سکتا ہوں؟"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ سجاول سیالکوٹی سے پالا پڑا ہے اس کا۔ مگر ایک بات کا خیال تم بھی کرو۔ وہ یہاں کی نہیں ہے۔ وہ برونائی اور جاماجی میں پلی بڑھی ہے، اس کا اپنا رہن سہن ہے۔ وہ خود کو تمہارے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے گی اور شاید کر بھی رہی ہے مگر بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے، جلدی نہ کرو۔ ایسے رشتے فولاد کی طرح پکے ہوتے ہیں اور دھاگوں کی طرح کچے بھی۔"

"چلو دیکھتے ہیں، دو چار دن میں کیا ہوتا ہے لیکن تم اگر اس سے بات کرو تو کسی طرح کا منت ترلا نہیں کرنا نہ اپنی طرف سے نہ میری طرف سے۔ میں نے سب کچھ اس کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب فیصلہ اسے ہی کرنا ہے۔"

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میں نے خورسنہ کو بتا دیا ہے کہ دو تین روز تک آؤں گا۔"

"واپس ڈیرے پر جا رہے ہو؟"

"ہاں، تمہاری ہی ڈالی ہوئی مصیبت ہے۔ میری بھتیجی مائی کو تو اب یقین ہو گیا ہے کہ تم اب واپس نہیں آؤ گے۔ وہ تقریباً نارمل ہو گئی ہے مگر تمہارے نہ آنے سے ماں جی کے دل پر گہرا اثر ہوا ہے۔ گرمیوں میں ویسے بھی ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ لاہور سے ایک ڈاکٹر کو لے کر جا رہا ہوں ڈیرے پر۔"

میں جانتا تھا کہ باہر سے جن لوگوں کو سجاول سیالکوٹی اپنے ڈیرے پر لے جاتا ہے سفر کے آخری مراحل میں ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔

میں نے کہا۔ "سجاول! اب تو تم میرے بارے میں سب کچھ جان ہی چکے ہو۔ میری وجہ سے مائی اور ماؤ جی کو جو مایوسی ہوئی ہے اس کے لیے میں تم سے اور ان دونوں سے بھی معافی مانگتا ہوں۔"

اس حوالے سے میرے اور سجاول کے درمیان مزید چند منٹ گفتگو ہوئی۔ پھر سجاول واپس چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر اسے تاکید کر دی تھی کہ میری "زندگی" اور اس ہوٹل میں میری موجودگی کے حوالے سے وہ اپنے ہونٹوں کو بالکل سی کر رکھے گا۔ وہ بھی اس معاملے کی غیر معمولی نزاکت کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھے پوری تسلی دی۔

سجاول کے جانے کے بعد بیرا تازہ اخبار لے آیا۔ میں نے اخبار پر نگاہ دوڑائی۔ ہاؤس اٹھارہ والا واقعہ کل کے اخباروں میں تو نہیں آ سکا تھا مگر آج پوری تفصیل موجود تھی۔ وہ چیز بھی موجود تھی جس سے میں ڈرتا تھا۔ یعنی میری تصویر۔ مگر یہ تصویر ایسٹرن کنگ والے روپ میں تھی۔ لمبے جٹاؤں جیسے بال، لمبی داڑھی اور نہایت گھنی مونچھیں۔ مجھے اس تصویر سے کچھ زیادہ خطرہ نہیں تھا پھر بھی میں کمرے سے نہ نکلنے کو ترجیح دے رہا تھا۔

ہاؤس نمبر اٹھارہ کے ہولناک دھماکے کی خبروں کی نسبت سے ایک بیان شکیل داراب کا بھی چھپا تھا۔ اس نے

میرا تذکرہ ایم ایم اے کے ایک بڑے چیمپئن کی حیثیت سے کیا تھا اور میری بے وقت 'موت' پر افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس نے کہا تھا بے شک شاہ زیب پر دہشت گردی کا ایک مقدمہ بنا...... مگر چونکہ یہ معاملہ عدالت میں ہے اس لیے وہ اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرے گا۔

شکیل داراب نے یہ بھی کہا۔ ''میں ذاتی حیثیت سے شاہ زیب کا بالکل فیئر ٹرائل چاہتا تھا اور اس کے چچازاد ولید کو بھی قانونی معاونت فراہم کرنے کا حامی تھا۔ دیگر باتوں سے قطع نظر میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاہ زیب نے غیر ملکی حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور معروف فلم ٹی وی آرٹسٹ اروشا کو بھی جنونی قاتلوں سے بچانے کی اپنی سی کوشش کی۔ تاہم بہتر ہوتا کہ وہ اس سلسلے میں انتظامیہ کی مدد لیتا۔ چونکہ وہ پولیس کو مطلوب تھا لہٰذا وہ ایسا نہ کرسکا۔ اس نے دلیری سے لڑتے ہوئے جان دی ہے۔''

شکیل داراب دو چہرے والا شخص تھا اور اس کا یہ اخباری بیان اس امر کی تصدیق کرتا تھا۔ اس نے میرے اور اپنے حوالے سے بہت سی باتیں چھپا رکھی تھیں۔

ہر گزرنے والی گھڑی کے ساتھ میرے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اگر میں ''وفات'' پاچکا ہوں تو پھر مجھے ''مرحوم'' ہی رہنا چاہیے۔ کرنل ڈاکٹر احرار کا نام بھی میرے ذہن میں بار بار ایک روشن لکیر کی طرح چمک رہا تھا۔ یہ جدید دور تھا۔ نئی تکنیکس کے تحت اب بہت کچھ حقیقی زندگی میں ممکن ہو چکا تھا۔

شام کو میں نے سوچا کہ خورسنہ سے ٹیلی فونک رابطہ کروں۔ وہ گیسٹ ہاؤس میں ہی مقیم تھی۔ پچھلے دو تین گھنٹے سے میں تذبذب میں تھا۔ جاماجی کے بہت سے دیگر لوگوں کی طرح میں اس کے لیے بھی ''ہیرو'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک ایسا سخت جان چیمپئن جس نے امریکن ایجنسی کا ناقابلِ بیان ٹارچر برداشت کر کے بھی اپنی زبان بند رکھی اور لوگوں کے نیم مردہ سینوں میں زندگی دوڑا دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری بات دھیان سے سنے گی اور میں سجاول کے حوالے سے جو کچھ کہوں گا، وہ اسے اہمیت دے گی لیکن مسئلہ پھر وہی تھا۔ ابھی تک سجاول کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں ہاؤس نمبر اٹھارہ کے ہولناک بلاسٹ میں بچ گیا ہوں۔ سجاول تو باقاعدہ حلف اٹھا چکا تھا کہ اس نے یہ بات اپنے تک رکھنی ہے مگر...... خورسنہ کے بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا۔ بے شک وہ ایک دانا اور مضبوط خاتون تھی مگر بہت سے سوالات بھی موجود تھے......

بالآخر میں نے ارادہ ترک کر دیا اور مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔

اگلے روز صبح نیند سے جاگتے ہی تاجور کی صورت نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ جلد یا بدیر میری 'موت' کی خبر سے آگاہ ہو جائے گی۔ اس کی کیفیت کا سوچ کر میرا دل کٹ سا گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی تڑپ غیر معمولی ہوگی۔ دل چاہا ابھی پرانا نمبر آن کروں اور اسے بھی ویسا ہی ایک میسج بھیج دوں جیسا اپنے والدین کو بھیجا تھا لیکن یہ صرف خیال تھا۔ اس کو عملی جامہ پہنانا میرے لیے کسی صورت ممکن نہیں تھا۔

ٹی وی کھولا تو وہاں دو تین نیوز چینل پر ایک اور ہی طرح کی ہلچل نظر آئی۔ غیر متوقع طور پر یہ ہلچل میرے حوالے سے ہی تھی۔ ایک چینل نے وڈیو لنک کے ذریعے جاماجی سے ایک جرنلسٹ کو آن لائن لیا ہوا تھا۔ گفتگو انگلش میں ہو رہی تھی۔

جرنلسٹ دل گرفتہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''یہاں بہت سے لوگوں کو ابھی تک یقین نہیں ہے۔ وہ توقع کر رہے ہیں کہ شاید کوئی برعکس خبر آ جائے۔ آپ لوگ تصور نہیں کر سکتے کہ یہاں اس جزیرے میں مسٹر شاہ زیب کی کیا حیثیت تھی۔ کل رات بھی بہت سے لوگ جاماجی کی سڑکوں پر نکل آئے اور اپنے غم زدہ جذبات کا اظہار کیا۔ کچھ زاروقطار رو رہے تھے۔''

اسٹوڈیو سے اینکر پرسن بولی۔ ''آپ نے ابھی ایک تصویر کا ذکر کیا ہے جو کچھ عرصہ پہلے ایک ٹارچر سیل سے لیک ہو کر خاص و عام میں مقبول ہوئی اور جس نے جزیرے میں ایک انقلابی فضا پیدا کی۔ کیا آپ وہ تصویر ہم سے شیئر کر سکتے ہیں؟''

اس شخص نے میری ٹمپریچر سیل والی تصویر کا ایک پوسٹر اٹھا کر اس پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور پھر اسے کیمرے کے سامنے کر دیا۔

وہ نمناک آواز میں بولا۔ ''یہ چند ماہ پہلے عزت مآب ریان فردوس کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ اگر ان کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ آئے...... انہوں نے دیکھا اور چھا گئے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر دل ہول جاتا ہے کہ یہ اب ہم میں نہیں رہے......''

سوچی سوچی آنکھوں والے ایک دوسرے ملائیشین نے پاکستانی اینکر سے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے کہ ڈی این اے کی رپورٹ کب تک آ جائے گی؟''

ایسٹر نے مصنوعی دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ’’ہمیں جو اطلاعات مل رہی ہیں، ان کے مطابق مسٹر شاہ زیب کی ’موت‘ کی تصدیق ہو چکی ہے۔ ان کے لواحقین سے رابطہ کرنے کی بھرپور کوششیں جاری ہیں۔ ان کوششوں کا نتیجہ آنے کے بعد ہی ’’تجہیز و تکفین‘‘ کا مرحلہ آئے گا۔‘‘

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں یہاں اس درمیانے درجے کے ہوٹل میں بیٹھا دودھ پتی پی رہا تھا اور اُدھر میری ’موت‘ کی تصدیق ہو چکی تھی۔ شاید کسی تابوت میں کچھ راکھ اور ناقابلِ شناخت ہڈیاں رکھ کر سرد خانے میں پہنچا دی گئی ہوں اور اوپر میرے نام کا اسٹیکر چسپاں کر دیا گیا ہو۔ پتا نہیں کتنے ڈی این اے اسی طرح سے انجام پا جاتے تھے۔ اب تو شاید میں خود بھی اعلان کرتا کہ میں بقیدِ حیات ہوں تو مجھ سے ٹھوس ثبوت مانگے جاتے۔ چلو اچھا ہے خس کم جہاں پاک...... میں نے دل ہی دل میں کہا۔

☆☆☆

اگلے قریباً دو دن بھی اسی غیر یقینی کیفیت میں گزرے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اچانک مجھے حاذق ذکری کا وہ خط یاد آیا جو جاماجی سے رخصت کے وقت انہوں نے مجھے دیا تھا اور دھیان سے پڑھنے کو کہا تھا۔ وہ خط ایک چھوٹی نوٹ بک اور چند رسیدوں سمیت سکھیر اگاؤں میں چودھری دین محمد کے ڈیرے پر ہی رہ گیا تھا۔ مجھے اس کا قلق ہوا۔ تاہم امید تھی کہ وہ محفوظ ہوگا۔

میں اپنی آئندہ پلاننگ کو مسلسل ٹھوس شکل دے رہا تھا...... خورسنہ کا فون نمبر میرے پاس موجود تھا مگر اسے فون کرنا کسی طور ٹھیک نہیں تھا۔ میں سجاول کو فون کرتا رہا۔ اس کے سگنل ہی نہیں مل رہے تھے ایک دو بار بیل گئی لیکن فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سجاول اور خورسنہ کے معاملے کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

یہ تیسرے روز شام کی بات ہے سجاول ایک بار پھر میرے کمرے میں وارد ہو گیا۔ اس کی شیو کچھ بڑھ گئی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر ہی جان گیا کہ وہ ابھی گیسٹ ہاؤس میں خورسنہ سے مل کر آیا ہے۔ شاید پھر کوئی بحث مباحثہ ہوا تھا۔ باہر لُو چل رہی تھی۔ میں نے اسے ٹھنڈا پانی پلایا اور پنکھا تیز کر دیا۔ ’’تمہارا بلڈ پریشر پھر ہائی لگ رہا ہے سجاول۔‘‘

’’کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ یہاں نہ ہی آتی۔ کم از کم پردہ تو رہتا، بھرم تو رہتا۔‘‘

’’اب کیا ہوا ہے؟‘‘

’’دیکھو شاہ زیب، میں بالکل اور طرح کا بندہ ہوں۔ لمبے روگ خود سے نہیں چمٹا سکتا۔ میں اس کے لیے بہت کچھ کھونے کو تیار ہوں مگر اسے بھی کچھ نہ کچھ تو کھونا ہی پڑے گا ورنہ......‘‘ میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ’’ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔‘‘

عجیب مایوسی کے عالم میں اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے منہ سے الکحل کی باس آرہی تھی۔ میں نے اس کے لیے شکنجبین منگوائی تاکہ اس کی طبیعت کچھ بحال ہو سکے۔ اس نے دو گھونٹ لے کر گلاس ایک طرف رکھ دیا اور آنکھیں پھر بند کر لیں۔ شاید وہ اونگھنے لگا تھا یوں لگا تھا جیسے وہ اور خورسنہ پھر ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں۔ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے چونک کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف خورسنہ ہی تھی۔ سجاول کے گندمی چہرے پر سرخی لہرا گئی۔ گہری سانس لے کر اس نے کال ریسیو کی اور بوجھل آواز میں بولا۔ ’’ہیلو۔‘‘

’’ہیلو سجاول کہاں ہو؟‘‘

’’یہیں ایک دوست کے پاس۔‘‘ سجاول نے کہا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر فون کا اسپیکر آن کر دیا۔

’’تمہارے قریب کوئی ہے؟‘‘ خورسنہ نے پوچھا۔

سجاول نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ دوسری طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ ایک گمبھیر سناٹا۔ ایسا سناٹا جو کسی نہایت اہم بات سے پہلے سنائی دیتا ہے۔ جو کسی طوفان...... یا ہلچل کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

’’تو تمہاری یہی شرط ہے؟‘‘ خورسنہ نے پوچھا۔

’’شرط نہیں۔ ایک درخواست تھی۔‘‘ سجاول نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

’’کوئی رعایت نہیں ہو سکتی؟‘‘ خورسنہ نے دریافت کیا۔

وہ خاموش رہا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ فیصلے کا لمحہ ہے۔ خورسنہ حتمی بات کرنے والی ہے۔ سجاول کو ہاں یا نہ کہنے والی ہے۔ یہ بڑے تناؤ بھرے لمحے تھے۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

ثبوت

محمد یاسر اعوان

وقت کی طنابیں بہت سخت اور مضبوط تر ہوتی ہیں...ان سے فائدہ اور نقصان اٹھانا انسان کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا ہے... بروقت کیے گئے فیصلے اور عملی کارروائی بعض اوقات ایک بڑی تباہی سے بچا لیتی ہے... ایک ایسے ہی شخص کی بازیابی کا سنسنی خیز ماجرا... اس کی زندگی پر سب کی زندگی کا دارومدار تھا...سیاست کے میدان میں آستین کا سانپ بن جانے والے دوستوں کی مداوتیں...

سنسنی، تجسس کے لبادے میں لپٹی حال و مستقبل سے وابستہ داستان

امریکی بحریہ کا جنگی جہاز پُرسکون سمندر کی سطح پر تیرتا ہوا ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا جو اب زیادہ دور نہیں رہا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ متعدد چھوٹے چھوٹے اور بڑے تجارتی جہازوں کے ساتھ ماہی گیروں کی کشتیاں اور موٹر لانچیں لنگرانداز تھیں۔ پس منظر میں دکھائی دینے والے شہر کی عمارتوں کے خاکے میں سب سے نمایاں قدیم تاریخی حیثیت

کا حامل وہ قلعہ تھا، جو اب ایوانِ صدر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ فصیل کے مشرقی اور مغربی کناروں پر واقع دو سربلند برج ایک سو سال سے سمندر کی موجوں کے تھپیڑے برداشت کر رہے تھے مگر ابھی تک پانی ان کی بنیادوں کو ہلا نہیں سکا تھا۔ لیفٹیننٹ کمانڈر رافیل نے برسوں پہلے ان بنیادوں کو دیکھا تھا، تب بھی ان کی قدامت کے پُروقار حسن کا یہی انداز تھا اور آج بھی ان کا نظارہ پُرکشش تھا لیکن عرشے پر کھڑے ہوئے کمانڈر رافیل نے چشمِ تصور سے اس عہد گزشتہ کو دیکھنے کی کوشش کی جب ان میناروں سے زیرِ زمین اترنے والے پُرپیچ راستوں کو طے کرنے والے پابہ زنجیر مجرم، سنگ و آہن سے تراشے ہوئے قید خانوں تک پہنچائے جاتے تھے اور زندہ انسانوں کی دنیا سے بہت نیچے تاریکی، نمی، حبس اور تعفن کی فضا میں گھٹ گھٹ کر اور سسک سسک کر دم توڑنے کے لیے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ یہ سزائے موت سے کہیں زیادہ سخت عذاب کی موت ان کا مقدر ہوتی تھی جو بغاوت اور سرکشی کے مرتکب ہوتے تھے، جابر حکمرانوں کے خلاف کلمۂ حق کہنے کی جرأت کرتے تھے یا ظلم کے خلاف انصاف کا نعرہ لگانے کے مجرم بنتے تھے یا کسی طرح بھی شاہی عتاب کو دعوت دینے کی مہلک غلطی کرتے تھے۔

جب رافیل نے پہلی بار نیچے جا کر ان ویران اور آسیب زدہ نظر آنے والے زنداں خانوں کو دیکھا تھا تو دیواروں سے پیوست سلاسل کے ساتھ اسے دیواروں پر لہو کی وہ تحریر نظر آئی تھی جس کا کوئی وجود نہ تھا اور اس کے کانوں نے درد و کرب میں ڈوبی ہوئی ظلم سہنے والوں کی وہ صدائیں سنی تھیں جو بہت پہلے ختم ہو چکی تھیں۔

رافیل کو یوں لگا تھا جیسے سو سال بعد بھی اس خون کی مہک فضا میں موجود ہے اور ان جگر خراش آوازوں کی بازگشت کسی بدروح کی طرح قید خانے میں ہی بھٹک رہی ہے۔

کئی سال بعد لیفٹیننٹ کمانڈر رافیل پھر جنوبی امریکا میں واقع اس چھوٹی سی ریاست کے ساحل پر قدم رکھنے والا تھا، جہاں وہ چار سال تک امریکی سفارت میں ملٹری اتاشی کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ اسے دوبارہ یہاں بھیجنے کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ اس خطے کے لوگوں سے، یہاں کی زبان سے اور اس ریاست کے تاریخی و سیاسی پس منظر سے بخوبی آشنا تھا۔ ابھی چند روز پہلے اسے واشنگٹن طلب کیا گیا تھا اور فرداً فرداً صدر کے دفاعی امور کے مشیر اور امورِ خارجہ کے ڈائریکٹر سے ملاقات کے بعد انٹیلی جنس کے سربراہ نے کہا تھا۔ ”رافیل! اب تک صورتِ حال تم پر واضح ہو جانی چاہیے۔ ہم تمہیں ایک ایسے مشن پر بھیج رہے ہیں جس میں طاقت سے زیادہ ذہانت کا استعمال بین الاقوامی سطح پر ہماری سیاسی پوزیشن کی ساکھ برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم طاقت کے استعمال سے گریز کرنا چاہتے ہیں، تاوقتیکہ حالات ہمیں مجبور نہ کر دیں، اور ہمارے لیے فوجی مداخلت کے سوا مسئلے کا کوئی حل باقی نہ رہے لیکن اس سے پہلے مسئلے کو سمجھنا ضروری ہے۔ اب تک ملنے والی خبریں اور افواہیں تشویشناک ہیں اور تمہیں یہ دیکھنا ہے کہ ان میں کس حد تک صداقت ہے اور پھر یہ طے کرنا ہے کہ کوئی ناخوشگوار قدم اٹھائے بغیر حالات پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ تمہیں امریکی حکومت کی مکمل حمایت حاصل ہے اور بحری جہاز میں موجود فوجی تمہارے اشارے پر حرکت کے لیے تیار ہوں گے مگر اس کی نوبت نہ آئے تو اچھا ہے، تمہیں وہاں بھیجنے کی دو اہم وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت کو تمہاری ذہانت اور صلاحیت پر اعتماد ہے اور یقین ہے کہ تم غلط فیصلہ نہیں کرو گے۔ دوسری زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ تم اس ریاست سے بہت اچھی طرح واقف ہو اور ضرورت پڑنے پر مقامی حالات کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے فیصلہ کر سکتے ہو۔ ہمیں خونریزی نہیں کرنا ہے اور اس حلیف ریاست سے دستبردار بھی نہیں ہونا ہے...... سارا مسئلہ یہی ہے۔“

اگرچہ یہ مسئلہ اتنا آسان اور سیدھا نہیں تھا مگر رافیل اس مشن پر تن تنہا آ کر پشیمان نہیں تھا۔ یہاں اس کے بہت سے رازدار دوست تھے، جو وقت پڑنے پر ہر طرح سے اس کی مدد کر سکتے تھے اور رافیل کا خیال تھا کہ برسوں بعد اگر وہ نہ ملے تو شاید اس کا کام بہت مشکل ہو جائے گا۔ لیکن وہ ناامید نہیں تھا، ان میں سے کچھ یقیناً زندہ ہوں گے اور وفاداری کے پرانے رشتوں کا پاس رکھیں گے۔

جہاز اب لنگر انداز ہو چکا تھا اور اسے ساحل تک لے جانے والی چھوٹی کشتی قریب آ رہی تھی۔ رافیل نے وہ بریف کیس اٹھا لیا، جس میں امریکی حکومت کے متعدد اعلیٰ حکام کے مراسلے تھے اور وہ احکامات تھے جو ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے دیے گئے تھے۔ اس نے ایڈمرل ٹانسن سے اجازت لی اور کشتی میں اتر گیا۔ اس کی بے داغ سفید وردی پر ابھی تک پانی کا ایک چھینٹا نہیں پڑا تھا۔ طویل سفر کے باوجود اس کی صورت پر تھکن کے آثار مفقود تھے اور

اس کے کلین شیو چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو اعتماد کے ساتھ انکسار کی مظہر لگتی تھی اور ہر جگہ اس کو دوست بنا دیتی تھی۔

چالیس سال کی عمر میں بھی وہ اتنا ہی صحت مند، چاق و چوبند اور اسمارٹ تھا، جتنا چودہ سال قبل نیوی میں اپنے کیریئر کا آغاز کرتے وقت تھا۔ یہ بڑا قابلِ فخر زمانہ تھا جس میں رافیل اپنی ذہانت کا بہترین استعمال کرتے ہوئے مسلسل ترقی اور کامیابی کی راہ پر گامزن رہا تھا اور بدنامی کے ہر داغ سے مبرا کیریئر نے اس کے لیے ایک درخشاں مستقبل کے راستے کھول دیے تھے۔

اس کا دوست لیفٹیننٹ جیک جیپ لے کر اس کا منتظر کھڑا تھا۔ انہوں نے بے تکلفی سے مصافحہ کیا۔ ''مجھے تمہارا پیغام موصول ہو گیا تھا۔'' جیک نے کہا جو عمر میں دس سال کم ہونے کے باوجود احساسِ فرض شناسی اور ذمے داری میں رافیل کی توقع پر پورا اترتا تھا۔ ''تمہارے پانچ چھ پرانے دوستوں کو خبر مل چکی ہے اور وہ مزید لوگوں سے رابطہ قائم کر رہے ہیں۔'' اس نے جیپ کا دروازہ رافیل کے بیٹھنے تک تھامے رکھا۔ پھر گھوم کر ڈرائیور کی جگہ آ بیٹھا۔ رافیل نے دیکھا کہ ساحل سے دور بہت سے تماشائی حیرت اور تجسس کی تصویر بنے کھڑے ہیں اور پولیس کے اہلکار ڈنڈے گھماتے ہوئے انہیں اپنی حدود اور اوقات میں رہنے کی عملی تلقین کر رہے ہیں۔ رافیل نے خوش دلی سے ان سب کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ جواب میں اس نے متعدد ہاتھوں کو جھنڈے کی طرح بلند ہوتے اور لہراتے دیکھا پھر جیپ نے موڑ کاٹا اور بندرگاہ کا پورا منظر اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

''حالات کی رپورٹ کیا ہے؟'' رافیل نے موقع پاتے ہی سوال کیا اور اپنی سگریٹ جلانے لگا۔

''حالات یہ ہیں کہ آج سفارت خانے میں ایک ضیافت ہے۔'' جیک نے نظر سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''جنرل کارٹر کے اعزاز میں، جو صدر کی پُراسرار علالت کے دوران صدر کے فرائضِ منصبی سرانجام دے رہا ہے۔ ضیافت میں امریکی سفیر اور اس کے معزز مہمان کو یعنی تمہیں بھی مدعو کیا گیا ہے۔ وہاں تمہیں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

رافیل نے بے خیالی میں سر ہلایا۔ اس کا ذہن برسوں پرانی یادوں میں گم تھا۔ وہ پرانے راستوں پر اجنبی نشانیاں تلاش کر رہا تھا۔ مگر یوں لگتا تھا یہاں وقت بدستور تھما ہوا ہے۔ جو چیز جہاں تھی، جیسی تھی اب بھی وہیں اور ویسی ہی تھی۔ تبدیلی جو وقت کے ساتھ آدمی کی جدوجہد کے آگے بڑھنے کی علامت ہوتی ہے کہیں نظر نہ آتی تھی۔ سوچ کی بلندی کی جانب سفر کے ساتھ ساتھ گرمی کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تھا اور ہوا کی رطوبت کے باعث جسم سے خارج ہونے والا پسینا خشک ہونے کے بجائے کپڑوں کو تر کرتا جسم پر بہنے لگا تھا۔

جیپ ایک نسبتاً صاف ستھری اور نئی دکان کے سامنے رکی، تو رافیل نے پرانے بار کے نئے شوخ رنگ کو دلچسپی سے دیکھا۔ ائرکنڈیشنڈ بار میں موسم بالکل مختلف تھا۔ دروازے کے اوپر لگا ہوا روم ائرکنڈیشنر کسی محافظ کی طرح باہر کی بدتمیز گرمی کو اس مہذب ماحول میں گھسنے نہیں دے رہا تھا۔ ان کے ساتھ ہی دبلا پتلا، کٹیلی مونچھوں والا دراز قد شخص بھی اندر آ گیا تھا۔ رافیل نے اس کی صورت کو بندرگاہ کے ہجوم میں شناخت کر لیا تھا۔ چنانچہ صاف ظاہر تھا کہ وہ ان کا تعاقب کرتا ہوا پہنچا ہے پھر ایک ویٹر جو شاندار وردی پہنے ہوئے تھا، ظاہری اندازِ بے نیازی سے آگے بڑھا۔ بیئر کا آرڈر لینے کے بعد اس نے تعظیم سے سر جھکایا اور زیرلب کہا۔ ''آج رات آٹھ بجے سینور......! جانسن کا وہی پرانا گھر۔''

''تھینک یُو......'' رافیل نے یوں کہا جیسے ویٹر نے آرڈر لینے کے بعد کچھ اور حاضر کرنے کی پیشکش کی تھی، جسے اس نے مسترد کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ تازہ دم ہو کر بار سے باہر نکلے تو گرمی کی شدت پوری قوت سے ان پر حملہ آور ہوئی۔ جیپ شکستہ سڑک پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھنے لگی۔ سڑک پر اتنی بار پیوندکاری کی گئی تھی کہ اب اس کی سطح پر دھبے دھبے دکھائی دیتے تھے جن کے درمیان اکھڑ جانے والے پیوند پرانے زخم کی طرح نمودار ہو گئے تھے۔ کبھی کبھار کوئی پرانی کار کھڑکھڑاتی گزر جاتی تھی یا کوئی ٹیکسی چیختے چلاتے مسافروں سے لدی پھندی نظر آ جاتی تھی۔ بے فکروں اور بے روزگار لوگوں کے غول ہر جگہ انہیں گھورتے دکھائی دے رہے تھے۔ لمبی نکیلی مونچھیں رکھنے کا فیشن بھی نہیں بدلا تھا۔ خواتین حسبِ سابق موٹی تازی تھیں۔ بدذائقہ اور غلیظ چیزوں کو آواز لگا کے بیچنے والے بھی وہی تھے۔

رافیل کو یوں لگا جیسے وہ درمیانی وقفے میں امریکا گیا ہی نہیں اور اب بھی ملٹری اتاشی ہے۔ اس کے خیالات کی رو اس وقت ٹوٹی جب ان کی جیپ امریکی سفارت خانے میں

داخل ہو کے ایک جانب صف بستہ درجن بھر شاندار کاروں کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ جدید ترین ماڈل کی یہ امریکن کاریں اس سترہویں اٹھارویں صدی جیسے ماحول میں بڑی اجنبی لگ رہی تھیں۔ اب ایک باڈی گارڈ آگے بڑھا۔

''میں صدر مملکت کی جانب سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔''

''کیا حال ہے صدر محترم ڈان کارلس کا؟'' رافیل نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہت عرصے بعد ان سے ملاقات ہوگی۔ شاید تمہیں نہیں معلوم...... میں چار سال تک یہاں ملٹری اتاشی رہ چکا ہوں...... مسٹر ڈان کارلس۔''

''آئی ایم سوری سینور......'' شائستہ لہجے میں انگریزی بولنے والے نوجوان محافظ نے کہا۔ ''ان سے آپ کی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ وہ علیل ہیں اور اپنے گاؤں کے پُرفضا ماحول میں زیرِ علاج ہیں مگر ابھی تک بہتری کے آثار نظر نہیں آتے۔ ان کی جگہ جنرل کارٹر تشریف لائے ہیں۔'' وہ معزز مہمانوں کی حیرانی سے لاتعلق آگے آگے چلتا ہوا، انہیں ایک کمرے تک لے گیا، جو دوسری منزل پر واقع تھا۔ اپنا حلیہ درست کر کے وہ دوسرے راستے سے نیچے اترے اور اس ہال میں جا پہنچے جہاں ضیافت کا اہتمام تھا۔

ایک نظر میں ہی رافیل نے جنرل کارٹر کو دیکھ لیا۔ وہ امریکی سفیر کے ساتھ کھڑا وزیروں، سفیروں اور سیاست دانوں سے ملکی مسائل پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

بلحاظ عہدہ، وہ ابھی تک مسلح افواج کا کمانڈر انچیف اور نائب صدر تھا، جسے آئین کی رو سے صدر کی عدم موجودگی یا علالت کے دوران صدر کے فرائض سنبھالنے کے اختیارات حاصل تھے۔ شاہانہ طرز پر سجے ہوئے ہال میں اعلیٰ فوجی عہدیدار اپنی وردیوں پر تمغے اور میڈل سجائے موجود تھے۔ معززین شہر بہترین سوٹ پہن کر آئے تھے۔ خواتین میں ہر رنگ، عمر اور وضع کی عورتیں جدا، جدا فیشن اور میک اَپ کیے آئی تھیں۔

رافیل نے فوراً اندازہ کر لیا کہ اس ضیافت میں جنرل کارٹر سب کی توجہ کا مرکز ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی بہانے اس کے قریب جا کے اور اس سے مل کر اس کی باتیں سننا چاہتا ہے۔ لوگ اس کی موجودگی سے نفسیاتی طور پر کشیدگی کا شکار، مرعوب اور کسی حد تک خائف نظر آتے تھے۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے قد کا تندرست اور وجیہہ مرد تھا جس کی عمر قابلِ رشک صحت کے باعث پچاس کے بجائے چالیس سال لگتی تھی۔ اس کی گہرے نیلے رنگ کی یونیفارم بہت شاندار تھی جس پر سنہرے فیتے، ربن اور میڈل بڑے سلیقے اور خوب صورتی سے ٹنکے ہوئے تھے۔

''یور ایکسی لینسی......'' رافیل نے جنرل کارٹر کی آواز سنی۔ ''امریکی حکومت سے تعلقات کو مزید دوستانہ بنانا میری عین خواہش ہے لیکن...... لیکن، میں کچھ کر نہیں سکتا۔'' اس نے اپنی مجبوری کا بھرپور تاثر دیا۔ پھر کسی نے اس سے کچھ پوچھا اور وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''بھئی، آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کریں...... جب تک صدر اس قابل نہ ہو جائیں......''

''لیکن یہ تو ممکن ہے کہ ہم خود صدر کی خدمت میں حاضر ہو جائیں...... چند منٹ کے لیے ہی سہی۔'' امریکی سفیر نے کہا۔

''دیکھیے، میں اس ملک کا نائب صدر ہوں۔'' جنرل کارٹر نے کہا۔ ''لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں۔ میں ان سے کسی کی ملاقات کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ مسٹر ڈان کارلس چند مخصوص لوگوں کے سوا کسی سے ملتے ہی نہیں...... ان کی صحت روز بروز...... خیر، میں تشویش نہیں پھیلاؤں گا۔ موجودہ حالات میں ان سے ملاقات کا کوئی سوال نہیں۔''

رافیل نے اندازہ لگایا کہ جنرل بہت عیار ہے، اس نے بڑے سلیقے سے واضح کر دیا تھا کہ کوئی اس کی مرضی کے بغیر ڈان کارلس کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ اس نے بیماری کی نوعیت نہیں بتائی تھی اور اس بات کو گول کر دیا تھا کہ موجودہ صورتِ حال کتنا عرصہ برقرار رہے گی۔

رافیل نے سامنے آئے بغیر جنرل کو متعدد سوالوں کے جواب دیتے سنا مگر لوگوں کی طرح اسے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

امریکی سفیر کے سامنے جا کر جنرل کارٹر سے تعارف کا اعزاز حاصل کرنے سے قبل رافیل نے پرانے دوستوں اور شناسائی کا رشتہ رکھنے والوں سے ملاقات کی اور اس طرح جنرل کے اردگرد ہی گھومتا رہا۔ اچانک کسی نے اس کا راستہ روک لیا۔ ''کمانڈر انچیف! تم یہاں کیسے؟'' اس کے لہجے میں حیرانی کا عنصر بڑا غیر حقیقی تھا۔

''کرنل شیراڈ!'' رافیل نے گول بچوں جیسے چہرے والے ادھیڑ عمر اور پستہ قد شخص سے مصافحہ کیا۔ ''دنیا گول ہے، مخالف راستوں پر چلنے والے پھر کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔ تم سناؤ کیا حال ہے۔ ابھی تک پولیس کے چیف ہو

یا......؟''

شیراڈ کی سانپ جیسی گول آنکھیں رافیل پر جمی رہیں۔ ''میں اب وزیرِ داخلہ ہوں...... تمہارا قیام عارضی ہے یا......؟''

رافیل کو اس کے اتنی دیر تک پلک نہ جھپکنے پر تعجب ہوا۔ ''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' رافیل نے نامکمل جملے کا مطلب سمجھ کے کہا۔ ''میں امریکی حکومت کا نامہ بر ہوں۔ چند اہم مراسلات لے کر آیا ہوں...... ان کا جواب ملنے پر میرے قیام کی مدت کا انحصار ہے۔''

''کمانڈر! اب حالات پہلے جیسے نہیں ہیں۔'' کرنل شیراڈ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''میرا مطلب ہے ان دنوں یہاں ایک وبا پھیلی ہوئی ہے۔ ایک خطرناک متعدی مرض سمجھ لو۔ میں نہیں چاہتا کہ خدانخواستہ تم بھی اس کی لپیٹ میں آجاؤ۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ مراسلات کے جواب تمہیں جلد از جلد مل جائیں۔''

''کیا صدر ڈان کارلس بھی اس متعدی مرض کا شکار ہیں؟'' رافیل نے بالکل انجان بن کے پوچھا۔

''بہت سی باتیں سرِعام پوچھنا بھی اتنا ہی غلط ہوتا ہے، جتنا ان کا جواب دینا۔'' کرنل شیراڈ نے ناگواری سے کہا۔ ''تمہارا قیام کم ہو یا زیادہ۔ میرا ایک مشورہ ہے...... غیر ضروری تجسس سے گریز کرو گے تو پھر آفت سے محفوظ رہو گے۔'' وہ راستہ کاٹ کر نکل گیا۔

رافیل سوچتا رہا کہ کیا ان الفاظ کو دھمکی سمجھ جا سکتا ہے؟ کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیراڈ کو اس کی آمد کے اصل مقاصد کا علم ہو چکا ہے؟ اور کیا اس وارننگ کے بعد اسے اپنے لائحہ عمل میں ردوبدل کرنا ہوگا؟ وہ ابھی کچھ طے نہیں کر پایا تھا کہ ہال کے ایک گوشے میں ہونے والی گڑبڑ نے اسے متوجہ کر لیا۔ ایک نازک اندام، خاصے دلکش خطوط کی مالک نوجوان لڑکی مجمع کو چیر کر آگے آنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ صدارتی باڈی گارڈ کے دستے کا کوئی رکن نیلی یونیفارم پہنے، اسے سمجھا بجھا رہا تھا۔ وہ اسے ایک طرف لے جانے کی کوشش میں مصروف تھا مگر لڑکی اسے دھکیلتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پل بھر کے لیے رافیل کو اس کی صورت کی ایک جھلک نظر آئی۔ اس نے سفیدی مائل گندمی رنگ، بیضوی چہرے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی ''الیگزا'' کو فوراً شناخت کر لیا۔ اس کے سیاہ بال منتشر ہو گئے تھے اور وہ نوجوان باڈی گارڈ کی مداخلت پر برہم تھی، جو اس کی راہ میں حائل تھا مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنا فرض نہیں پورا کر رہا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اس کمزور لڑکی کو اٹھا کے باہر لے جا سکتا تھا، لیکن وہ انتہائی عاجزانہ انداز میں اس سے درخواست پر اکتفا کر رہا تھا اور ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ الیگزا ملک کے صدر ڈان کارلس کی بیٹی تھی جس کے ساتھ زبردستی اندر گھس آنے والے گداگر جیسا سلوک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رافیل اسے آواز دیتے دیتے رہ گیا۔ آدابِ محفل کا خیال نہ ہوتا تو وہ دوڑ کر اس کے سامنے چلا جاتا اور کہتا۔ ''الیگزا! تم نے مجھے پہچانا؟ میں رافیل ہوں۔ تمہیں یاد ہے جب میں ملٹری اتاشی تھا تو تمہارے والد سے میرے مراسم کتنے دوستانہ تھے اور کتنی بار ہم رات گئے تک تمہارے گھر کے باہر پھولوں کے کنج میں بیٹھے رہے تھے اور کیا تمہیں علم ہے کہ جب میرے کان تمہارے والد کی آواز پر لگے ہوئے ہوتے تھے تو میری آنکھیں کیا دیکھتی رہتی تھیں؟''

''جنرل!'' الیگزا کی آواز نے رافیل کو چونکا دیا۔ ہر نظر گھوم کر الیگزا پر مرکوز ہو گئی۔ ہال میں ایک اعصاب شکن سکوت طاری ہو گیا۔ الیگزا اب ملک کے نائب صدر کے سامنے انتہائی سرکشی سے نظریں اٹھائے کھڑی تھی۔ ''مجھے کچھ پوچھنا ہے۔''

''میں حاضر ہوں خاتون......'' جنرل کارٹر نے انتہائی نرم اور شائستہ لہجے میں کہا۔

''میں یہ بات سب لوگوں کے سامنے پوچھنا چاہتی تھی جنرل......!'' الیگزا نے بے خوفی سے کہا۔ ''میرے والد کہاں ہیں؟''

''سینوریتا...... معلوم ہوتا ہے تم ہوش میں نہیں ہو۔'' جنرل کارٹر نے اسی شفقت آمیز لہجے میں کہا پھر وہ امریکی سفیر سے مخاطب ہوا جو خود بھی الیگزا کے سوال کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھا۔

''یہ بے چاری لڑکی اعصابی کشیدگی کے باعث ذہنی مریض بن گئی ہے، میرا خیال ہے اس کی تربیت صحیح نہیں ہوئی۔ ڈان کارلس نے اسے حد سے زیادہ آزادی دے کر سخت غلطی کی۔''

''جنرل کارٹر! میں اپنا سوال دہراتی ہوں۔'' الیگزا نے چیخ کر کہا۔ ''مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرو...... یہ تمہارا ایوانِ صدر نہیں ہے، یہاں مجھے سفارتی تحفظ حاصل ہے...... مجھے بتاؤ، میرا باپ کہاں ہے؟ ان سب کے سامنے۔''

''کرنل شیراڈ!'' جنرل کارٹر نے چٹکی بجائی۔ ''دیکھو

سفارت خانوں میں ہنگامہ نہیں ہونا چاہیے...... یہ ہماری ذمے داری ہے......لڑکی کو باہر لے جاؤ۔''

''آئی ایم سوری، یور ایکسی لینسی۔'' وہ امریکی سفیر سے معذرت کرتے ہوئے بولا۔ اس کے پُرسکون انداز اور اعتماد میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا اور اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اتنے بڑے مجمع کی نظریں کیا کہہ رہی ہیں۔

''میں پاگل نہیں ہوں۔'' الیگزا چلائی۔ ''تم میرے سوال کا جواب دینا نہیں چاہتے کیونکہ......''

کرنل شیراڈ نے آگے بڑھ کر ہسٹریا میں مبتلا الیگزا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے کھینچ کر لے جانے لگا مگر الیگزا...... تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔

''کیونکہ......تم نے......تم نے میرے باپ کو قتل......'' وہ گرفتاری کے لیے آگے بڑھنے والوں سے ڈرتے ڈرتے چیخی...... سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ دو نوجوان پولیس آفیسرز، اب کرنل شیراڈ کی مدد کے لیے آئے تھے اور الیگزا کا منہ بند کرکے اسے زینے کے راستے اوپر لے جارہے تھے۔ اچانک وہ نوجوان باڈی گارڈ، جو پہلے منت سماجت سے الیگزا کا راستہ روکنے کی ناکام کوشش کرچکا تھا۔ تلوار میان سے نکال کے کرنل شیراڈ پر حملہ آور ہوا۔ شیراڈ نے بڑی پھرتی سے خود کو بچالیا، مگر الیگزا اس کی گرفت سے نکل گئی۔ رافیل اتنی دیر میں ہجوم سے گزر کر الیگزا کے پاس جا پہنچا۔ ''الیگزا......'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''پاگل مت بنو......اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا، زینے سے اوپر چلی جاؤ۔''

الیگزا نے پلٹ کر دیکھا اور کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ کرنل شیراڈ پر حملہ کرنے والا نوجوان باڈی گارڈ اب جنرل کارٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ تلوار اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

''تم نے الیگزا کے سوال کا جواب نہیں دیا ہے جنرل۔'' وہ بولا۔ پھر اس کا الٹا ہاتھ گھوم کر جنرل کے گال پر پڑا۔ مکمل خاموشی میں اس کے تھپڑ کی آواز کسی پٹاخے کی طرح گونجی۔ کارٹر کا چہرہ غصے اور احساسِ ذلت سے زرد پڑ گیا۔ ''اس......اس بے ہودہ کو لے جاؤ۔'' جنرل نے بمشکل کہا۔ کرنل شیراڈ کے ساتھ تین چار محافظ اس کی طرف لپکے۔

''خبردار! جو کوئی میرے قریب آیا۔'' نوجوان نے تلوار سونت لی مگر کرنل نے اس کے سر پر بھاری پستول کا دستہ مارا۔ نوجوان کے حلق سے ایک کراہ نکلی، سنبھلنے سے پہلے محافظوں نے اسے تھام لیا اور گھسیٹ کر باہر لے گئے۔

رافیل نے محسوس کیا کہ اس وقت ہر نگاہ نوجوان پر ہے جو اس ضرب کے باوجود بے ہوش نہیں ہوا تھا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کررہا تھا، موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رافیل ایک بغلی دروازے سے نکل گیا۔ وہ ایک اسٹور روم سے گزر کر راہداری میں پہنچا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں ایک دھماکے اور ایک چیخ کی دبی دبی آواز پہنچی۔

وہ دوڑتا ہوا، راہداری کے آخری حصے میں نظر آنے والے دروازے کو کھول کر عقبی باغ میں نکلا تو اسے وہی باڈی گارڈ زمین پر بے حس و حرکت الٹا پڑا نظر آیا۔ اس کے سینے کے شگاف سے بہنے والا خون سرخ بجری پر پھیلتا جارہا تھا، جو راستے پر بچھائی گئی تھی۔ اسے گھسیٹ کر لانے والے چند قدم کے فاصلے پر حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ رافیل کو دیکھتے ہی ان کی صورت پر نظر آنے والے نفرت اور حقارت کے جذبات یک لخت حیرت اور صدمے کی کیفیت میں بدل گئے۔

''بے وقوف آدمی......'' ان میں سے ایک نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ ''ایک عورت کے پیچھے مرگیا۔''

''تمہارا مطلب ہے، کسی نے اسے مارا نہیں ہے؟'' رافیل نے طنزآمیز حیرانی سے پوچھا۔

''نو سر، مارنے کا مطلب تو ہے قتل۔'' دوسرے نے کہا۔ ''اور وہ بھی ایک سفارت خانے میں؟''

''ہم قانون کا پورا احترام کرنا جانتے ہیں جناب۔'' تیسرے نے ہمنوائی کی۔ ''ہمیں اس کو سزا دینی ہوتی تو اس پر مقدمہ چلاتے۔''

''اور یہ خودکشی نہ کرتا تو اس پر مقدمہ ضرور چلتا۔'' دوسرے نے تائید میں سر ہلا کے کہا۔

''لیکن خودکشی نہ کرتا تو بے چارہ کیا کرتا......'' تیسرے نے پھر بات آگے بڑھائی۔ ''اپنی محبوبہ کا ذہنی توازن بگڑ جانے سے یہ بہت مایوس اور دل شکستہ تھا۔''

''اور اس کی منگیتر کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ اس کے دماغ کا خلل دور نہیں ہوسکتا۔'' پہلے نے باری آتے ہی کہا۔

وہ تینوں کسی ڈرامے کے کرداروں کی طرح مسلسل مکالموں کی ادائیگی میں مصروف تھے اور رافیل کو سوال کرنے کا موقع دیے بغیر جوابات فراہم کردینا چاہتے تھے۔ کرنل شیراڈ کسی کامیاب ہدایت کار کی طرح مطمئن کھڑا تھا۔

''یہ واقعہ امریکی سفارت خانے کی حدود میں پیش آیا ہے۔'' رافیل نے سکون سے کہا۔ ''کرنل شیراڈ...... تم اس وقت امریکی زمین پر کھڑے ہو اور میں اس حکومت کا نمائندہ ہوں...... میں مطالبہ کرتا ہوں کہ سفیر محترم کو مطلع کیا جائے، تحقیقات ہم خود کریں گے۔''

شیراڈ نے بُرا سا منہ بنایا مگر یہ بین الاقوامی ضابطوں کی بات تھی، جسے ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے جاتے ہی رافیل گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ قاتل مطمئن تھے کہ انہوں نے اپنا فرض ادا کردیا ہے مگر رافیل نے نوٹ کر لیا تھا کہ ابھی اس نوجوان میں زندگی کی رمق موجود ہے وہ مرنے والا تھا مگر مرا نہیں تھا۔ رافیل کو دیکھ کر اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔

''الیگزا...... الیگزا کو...... اسے بتادینا......'' وہ بمشکل تمام بولا۔ اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ رافیل کو جھک کر اپنے کان اس کے لبوں سے لگانے پڑے، تب بھی چند ہی الفاظ اس کی سمجھ میں آئے۔ ''قلعہ...... زیرزمین...... قید خانہ......'' وہ خون اگلتے ہوئے بڑبڑایا...... پھر لبوں سے پھوٹنے والے الفاظ لہو کے بلبلے بن گئے اور اس کا سر نیچے جا لگا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ رافیل کچھ دیر ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ جب وہ اٹھا تو اسے کرنل شیراڈ نظر آیا جو اس منظر کو بڑی حقارت آمیز، بے رحمی اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ تھی۔

''کمانڈر رافیل! کیا اس نے تم سے کوئی بات کی ہے؟'' شیراڈ بولا۔ ''مرنے سے پہلے اگر کوئی بیان دے تو اس کی صداقت کو قانون بھی چیلنج نہیں کرتا...... بشرطیکہ مرنے والے کا ذہنی توازن درست ہو اور جو کچھ اس نے کہا ہو، بقائمی ہوش وحواس کہا ہو۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' رافیل نے بے اعتنائی سے کہا۔

''مگر مرجانے کے بعد لوگ بیان نہیں دے سکتے۔''

''ویسے بھی اس لڑکی کے عشق اور عشق کے صدمات نے اسے پاگل کر رکھا تھا۔'' شیراڈ بولا۔ ''خودکشی دیوانے ہی کرتے ہیں۔'' یہ بات اس نے جنرل کارٹر اور امریکی سفیر کو سنانے کے لیے بھی کہی تھی جو اندر سے ایک ساتھ باہر آگئے تھے۔

''مجھے اس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگتی ہے۔'' امریکی سفیر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم نے اسے میرے ساتھ دیکھا ہوگا۔'' جنرل کارٹر نے کہا۔ ''یہ میرا ایڈی کانگ تھا۔ کیپٹن رول...... اس کے گھر والوں کو بڑا دکھ پہنچے گا۔ وہ پہلے ہی کم پریشان نہ تھے...... اچھا بھلا لڑکا ایک ایسی لڑکی کے چکر میں پڑگیا تھا جو پیدائشی طور پر ذہنی مریض ہے۔''

رافیل کے لیے جنرل کارٹر کے منہ پر تھپڑ مارنا ممکن نہیں تھا، ورنہ وہ بتادیتا کہ الیگزا کتنی تعلیم یافتہ، ذہین اور باشعور لڑکی ہے اور اس کے ساتھ کتنی خوب صورت شاموں کی یاد وابستہ ہے، جب وہ گھنٹوں باتیں کرتے تھے اور ایک دوسرے سے ذہنی مطابقت کے احساس پر شاداں رہتے تھے۔ واقعات کی صحیح تصویر رافیل کے سامنے تھی۔ الیگزا، اپنے باپ کے سیاسی منظر سے اچانک غائب ہوجانے سے زیادہ اس کی گمشدگی پر پریشان تھی۔ نوجوان ایڈی کانگ کے لیے ایک طرف محبت کی آزمائش تھی تو دوسری طرف فرض شناسی کے تقاضے تھے۔ جیت بالآخر محبت کی ہوئی تھی مگر اسے اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑا تھا۔

''الیگزا کہاں ہے؟'' جنرل کارٹر نے یک لخت سوال کیا۔ ''یہ نہ ہو، وہ بھی کوئی حماقت کربیٹھے۔''

''میں دیکھتا ہوں سر۔'' رافیل نے کسی کے جواب دینے سے پہلے کہا اور اندر گھس گیا۔ زینے کے اوپر ایک خادم دست بستہ کھڑا تھا جس نے رافیل کے پوچھنے پر اسی کمرے کی طرف اشارہ کیا، جہاں رافیل نے اپنا سامان رکھا تھا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا، لیکن تکیے پر کاغذ کا ایک پرزہ پڑا تھا۔ پنسل سے چند سطریں گھسیٹنے کے بعد اسے پنسل سے ہی دبا کر رکھ دیا گیا تھا۔ الیگزا نے لکھا تھا۔ ''میں یہاں ٹھہرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی، یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میرا باپ اپنے آبائی گاؤں والے گھر میں موجود نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ زندہ ہو لیکن کسی اور جگہ قید ہو...... خدا کے لیے اس کا سراغ لگانے کے لیے میری مدد کرو...... تمہیں اس نیکی کا اجر ملے گا...... الیگزا......''

رافیل نے کاغذ کے پرزے کو سگریٹ لائٹر سے جلا دیا اور اس کی راکھ کو اپنے جوتوں سے مسل ڈالا۔

☆☆☆

کوبالٹم کے قدیم گرجے کا نواحی علاقہ غربت زدہ لوگوں کی بستی تھی۔ ایک گمنام سی گلی کے ایک خستہ حال مکان میں جو باہر سے مقفل اور غیر آباد نظر آتا تھا، دو افراد بند کھڑکی سے لگے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک رافیل تھا جس نے قلعے اور ایوان صدر کے گارڈ دستے کے افسر کی وردی پہن

رکھی تھی۔ دوسرا وہی ویٹر تھا جس نے بار میں رافیل کو آٹھ بجے اس جگہ پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ ”حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں...... سینور۔“ ویٹر نے کہا۔ ”ملک کے اندر بدنظمی اور انتشار ہے، کسی کی جان و مال اور آبرو کو تحفظ حاصل نہیں رہا۔ لوگ ایک دوسرے سے بات کرتے ڈرتے ہیں کیونکہ حکومت کے جاسوس قدم قدم پر بھیس بدلے پھرتے ہیں اور یہ غدار انعام کے لالچ میں پل پل کی خبر آگے پہنچاتے ہیں۔ آئے دن لوگوں کے دوست، رشتے دار غائب ہو جاتے ہیں اور کوئی نہیں بتاتا کہ وہ کہاں ہیں جس پر شبہ ہوا، اسے راتوں رات اٹھا لیا جاتا ہے۔ پولیس اپنی لاعلمی ظاہر کرتی ہے۔ عدالت انصاف کے تقاضے کیسے پورے کرے، جب ملک میں قانون کے سرپرست خود ہی لاقانونیت سے دہشت کی فضا قائم کیے ہوئے ہوں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ہزاروں لاشیں جلا دی گئی ہیں یا گمنام قبروں میں اکٹھی دفن کر دی گئی ہیں۔ میں خود اپنے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ کل تک زندہ رہوں گا یا نہیں...... کیا خبر کرنل شیراڈ کے کسی نمک خوار نے مجھے یہاں آتے دیکھ لیا ہو، لوگ یہ کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، تو غلط نہیں کہتے...... شیراڈ سب کچھ سن لیتا ہے۔“

”چینل...... یہ سب کچھ صدر ڈان کارلس کو بدنام کرنے اور اس کی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑکانے کی سازش ہے۔“ رافیل نے کہا۔ ”کرتا سب جنرل کارٹر ہے مگر الزام ڈان کارلس کو دیا جاتا ہے، حالانکہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ کتنا شریف النفس اور اصول پرست انسان ہے...... وہ اپنے عوام اور ملک کے مفاد کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

”یہ بات لوگ بھی سمجھتے ہیں۔“ چینل نے کہا۔ ”ڈان کارلس یہاں کے عوام میں بے حد مقبول تھا لیکن اب کیا ہو رہا ہے، امریکی حکومت سے ہمارے تعلقات اس حد تک کشیدہ ہیں کہ جنگی جہاز ہمارے ساحل پر لنگر انداز ہیں۔ ذرا سی چنگاری بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے ملک کو اڑانے کے لیے کافی ہو گی۔ ہم امن پسند لوگ ہیں اور ہمارے چھوٹے سے ملک کا امریکا جیسی طاقت سے کیا مقابلہ۔ ہمارے کھیت بمباری سے تباہ ہو جائیں گے اور ہمارے مویشی مر جائیں گے تو ملک میں قحط پڑ جائے گا اور آدمی کو آدمی کھا جائے گا۔ بھوک اور بیماری یہاں پہلے ہی کم نہیں ہے۔ جنگ سے ہمیں کیا ملے گا سینور...... یہ اقتدار پرستوں کی عیاشی ہے جس کے متحمل غریب عوام نہیں ہو سکتے۔“

”اگر میں صرف آدھے گھنٹے کے لیے ڈان کارلس سے ملاقات کر لیتا تو سارے معاملات ٹھیک ہو جاتے۔“ رافیل نے کہا۔ ”لیکن اب کون جانے وہ اس ملک میں ہے بھی یا نہیں۔“

”وہ ملک میں ہی ہے...... سینور......“ چینل بولا۔ ”آخری بار وہ دو ماہ قبل عوام کے سامنے آیا تھا، اس کے بعد اگر وہ باہر گیا ہوتا تو مجھے معلوم ہو جاتا...... ہر جگہ ہمارے مخبر موجود ہیں جو بندرگاہ اور ہوائی اڈے کی دن رات نگرانی کرتے ہیں۔“

”تم نے اور میرے سب پرانے دوستوں نے جس طرح میری مدد کی ہے، وہ قابلِ قدر ہے۔“ رافیل بولا۔ ”خدا کرے ہم سب کی کوشش بارآور ثابت ہو...... اگر دونوں ملکوں کے پرانے دوستانہ روابط کسی خون ریزی کے بغیر برقرار رہیں تو بہت اچھا ہے، کیونکہ جنگ ہم بھی نہیں چاہتے۔ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ڈان کارلس جیسا بااصول آدمی موجودہ تعلقات میں کشیدگی کا ذمے دار ہو سکتا ہے۔ جنرل کارٹر اس کے نام پر یہ خرابی پھیلا رہا ہے۔ اگر ہم سب مل کر ڈان کارلس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے تو حالات پھر معمول پر آ جائیں گے۔“

”ہم سب خلوصِ نیت سے یہی کوشش کر رہے ہیں سینور! کہ صدر ڈان کارلس کا پتا چلا جائے۔“ چینل بولا۔ ”اب میں اجازت چاہتا ہوں...... جیسے ہی کوئی کارآمد بات معلوم ہو گی، میں بتا دوں گا۔“

وہ پچھلے حصے کے صحن کی دیوار پھاند کر گلی میں اُتر گیا جس میں دور دور تک کوئی نہیں تھا اور اسٹریٹ لائٹ صرف چاند کی روشنی فراہم کر رہی تھی۔

رافیل کمانڈر کو اب آخری آدمی کا انتظار تھا۔ تمام پرانے ایجنٹ اپنی اپنی رپورٹ دے کر اور ہدایت لے کر جا چکے تھے اور رافیل کے لیے یہ بات بڑے اطمینان کا باعث تھی کہ ان سب نے وفاداریوں کے معیار اور پیمان برقرار رکھے تھے۔

آخر میں آنے والا ایک نوجوان شرنیو تھا جو رشتے میں چینل کا چچازاد بھائی بھی تھا اور وہ سرکاری فوج کا ایک معمولی سا افسر تھا۔ اسی نے رافیل کے لیے یہ وردی فراہم کی تھی اور اب اسی کی معلومات پر رافیل کی قلعے کے زمین دوز زنداں تک رسائی کا انحصار تھا۔ قلعے کے حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے اور قواعد و ضوابط اور طریقۂ کار کی

پابندی کیے بغیر اندر قدم رکھنا محال تھا مگر شرنیو نے وعدہ کیا تھا کہ وہ سب معلوم کر کے رافیل کو بتا دے گا۔ آگے رافیل کی تقدیر۔ اندر داخل ہو جانے کے بعد بھی ہر قدم پر جان لیوا مرحلے تھے جن سے رافیل کو تنہا ہی گزرنا تھا۔ قلعے کے راستے رافیل کے ذہن میں تھے اور وہ جانتا تھا کہ زیرِ زمین قید خانے کا راستہ جنوبی کونے کے برج سے نیچے جاتا ہے۔

کمرے میں صرف ایک موم بتی جل رہی تھی مگر اس کی روشنی باہر نہیں جا سکتی تھی، کیونکہ تمام کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری سیاہ پردے پھیلا دیے گئے تھے۔ رافیل بے چینی سے کمرے کے اندر ٹہلتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ اس کی نظر بار بار گھڑی پر جاتی۔ آخر شرنیو اب تک کیوں نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ وقت کی پابندی کرنے والا شخص تھا مگر اب مقررہ وقت سے ایک گھنٹا اوپر ہو چکا تھا۔ رافیل کو تشویش ہونے لگی تھی اور اس کا ذہن وسوسوں کا شکار ہو رہا تھا۔ اس نے طے کیا کہ اگر مزید پندرہ منٹ کے بعد بھی شرنیو نہ پہنچا تو انتظار بے سود ہوگا پھر اسے معلوم کرنا پڑے گا کہ شرنیو کسی ناگہانی آفت کا شکار تو نہیں ہو گیا۔

اسی وقت دیوار پر ایک سایہ سا دکھائی دیا اور چینل خاموشی سے اندر آیا۔ موم بتی کی روشنی میں رافیل نے دیکھا کہ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑا ہوا ہے۔

''سینور...... ! وہ...... شرنیو......'' اس نے رندھے ہوئے انداز میں گلے سے چند الفاظ ادا کیے اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے رونے کی آواز بلند نہ ہونے پائے۔

''چینل!'' رافیل نے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کر لینے کے باوجود چینل کے کندھے پر شفقت اور محبت سے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے چینل! کیا ہوا شرنیو کو؟''

''انہوں نے...... انہوں نے سینور...... شرنیو کو...... گولی...... گولی مار دی ہے۔'' وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' رافیل نے اسے تسلی دے کر چپ کرانے کے بعد پوچھا۔

''مجھے اس کے ایک دوست نے بتایا ہے کہ وہ اپنے طور پر قلعے کے تہ خانے کا راستہ دیکھتا پھر رہا تھا۔'' چینل بولا۔ ''اور اس نے کسی پہرے دار سے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کی تھی کہ تہ خانوں میں کتنے قیدی ہیں اور ان میں کوئی مشہور شخصیت بھی ہے یا نہیں؟ کسی نے اس کی باتیں سن لیں یا خود پہرے دار نے بتا دیا۔ وہ قلعے کے صحن سے گزر رہا تھا تو نہ جانے کس نے اسے شوٹ کر دیا۔''

''شرنیو کو یہ باتیں پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟'' رافیل نے رنج سے کہا۔

''شاید اس نے سوچا ہوگا کہ وہ اس طرح آپ کو زیادہ کارآمد معلومات فراہم کر سکے گا۔'' چینل نے کہا۔

ہر نیا کارندہ اور نوآموز ایجنٹ اگر ضرورت سے زیادہ مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے تو اسی طرح مارا جاتا ہے۔ رافیل نے افسوس سے سوچا۔ یہ ناتجربے کار لوگ احکامات کی حد تک پابند رہیں تو اپنے لیے اور دوسروں کے لیے خطرے کی کوئی بات نہ ہو...... مگر خطرات اور غیر متوقع حادثات اس پیشے کا ایک جزو تھے جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

''اس کے ماں باپ بوڑھے ہیں۔'' چینل نے دردناک لہجے میں کہا۔ ''اس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔''

''ہم اس کے وارثوں کو جانبازی کا معقول کفارہ ادا کریں گے۔'' رافیل نے کہا۔ ''اتنا کہ وہ مالی مشکلات کا شکار نہ ہوں۔''

''سینور! کیا آپ واقعی قلعے کے زنداں میں اترنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' چینل نے مطمئن ہو کر پوچھا۔ ''یہ بہت خطرناک کام ہے۔''

''اس کے بغیر چارہ نہیں چینل......'' رافیل نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے، اب ہم دونوں کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ الگ الگ راستوں پر روانہ ہو گئے۔ آدھے گھنٹے بعد کمانڈر رافیل قلعے کی بیرونی فصیل کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس فصیل میں متعدد دروازے تھے، جن پر مسلح پہرے دار ہر وقت موجود رہتے تھے، اس کے بعد فصیل کے اندر کی چار دیواری تھی، جس میں گزرنے کا صرف ایک راستہ تھا۔ اندر داخل ہونے والے کو باہر ہی اپنی شناخت کرانے کے علاوہ یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ اس کا تعلق ڈیوٹی پر مامور عملے سے ہے۔ فوج کا عام افسر خواہ اس کا عہدہ کچھ بھی ہو، بلاضرورت اندر داخل ہونے کا مجاز نہ تھا۔ محافظ ہر روز بدل جاتے تھے اور قلعے کے منتظم ہر صبح ڈیوٹی سنبھالنے والوں کو نیا کوڈ پاس جاری کرتے تھے۔ غیر متعلق اور مبہم الفاظ پر مبنی کوئی جملہ، جس سے ظاہر ہو جائے کہ اندر جانے والا آج ڈیوٹی دینے والوں میں شامل ہے

اور گزشتہ ہفتے اگر کسی نے سازباز کر کے قلعے اور زنداں کا بھید پالیا ہو تو وہ نئے کوڈ پاس سے ناواقفیت کے باعث پھر اندر نہ گھس سکے۔ ہر روز نیا کوڈ پاس بتانے سے پہلے نئے محافظوں سے رازداری کا حلف لیا جاتا تھا اور انہیں افشائے راز کے ہولناک نتائج سے آگاہ کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ رافیل کے لیے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ وہ آج کے کوڈ پاس کے الفاظ کیسے معلوم کرے جو شرنیو بتانے والا تھا۔ اگر وہ صلاحیت اور کارکردگی کا غیر معمولی مظاہرہ کرنے کے چکر میں نہ پڑتا تو خود بھی زندہ ہوتا اور رافیل کے لیے بھی کوئی مسئلہ نہ چھوڑ جاتا۔ وہ بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ پہرے پر کھڑے ہوئے ہر سپاہی کے سیلوٹ کا جواب اشارے سے دیتا ہوا چلا گیا جو صرف اس کی وردی دیکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ پہرے داروں کو یا حفاظتی انتظامات کو چیک کرنے نکلا ہے۔ اس نے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چنانچہ ابھی تک کوڈ پاس کے الفاظ دہرانے کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ مختلف دروازوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے یہ دیکھتا جا رہا تھا کہ کون پہرے دار کتنا مستعد ہے اور کس پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ ابھی تک اس نے کسی کو غافل نہیں پایا تھا اور آہستہ آہستہ وہ مایوسی کا شکار ہونے لگا تھا۔ شاید اسے اپنے مشن کو التوا میں رکھنا پڑے گا۔ خطرہ مول لینے میں کوئی ہرج نہیں مگر خودکشی کا کوئی فائدہ نہیں۔

ابھی وہ یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر نے پانچویں دروازے پر متعین محافظ کو دیکھا۔ وہ مشین گن کا بوجھ دیوار کے ساتھ رکھے، بند دروازے پر ٹیک لگائے سو رہا تھا یا آنکھیں بند کیے کھڑا تھا۔ غالباً وہ حد سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔ دن کو آرام نہیں کر پایا ہوگا کہ ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا تھا یا پھر نشے کا عادی تھا۔ رافیل نے دبے پاؤں قریب جا کے اس کی مشین گن اٹھالی اور پھر آہستہ سے دستہ اس کے سینے پر مارا۔ سپاہی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اور اپنی گن ایک افسر کے ہاتھ میں دیکھ کر اس کی سٹی گم ہوگئی۔ اس نے بوکھلا کر سیلوٹ کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

''یہ ڈیوٹی دے رہے تھے تم؟'' رافیل نے سخت لہجے میں کہا اور مشین گن کا رخ سپاہی کی طرف کر دیا۔

سپاہی کی گھگی بندھ گئی۔ ''خدا کے لیے سر...... مجھے معاف کر دیں۔ میں...... میں دو دن سے...... خدا کی قسم میری بیوی سخت بیمار ہے...... میں کئی دن کا جاگا ہوا ہوں، مجھ سے غلطی ہوگئی۔''

''اس غلطی کی سزا کیا ہے؟'' رافیل نے نرمی سے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے؟''

''میں جانتا ہوں سر۔'' سپاہی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے شوٹ کر سکتے ہیں...... آپ رپورٹ کر سکتے ہیں اور کورٹ مارشل کے بعد مجھے سزائے موت ہو سکتی ہے، میں مر گیا تو میری بیوی بھی مر جائے گی۔''

''بکواس بند کرو۔'' رافیل نے گرج کر کہا۔ ''یہ اداکاری ہے...... تم نشے میں ہو...... جھوٹ بول رہے ہو۔''

سپاہی نے قسمیں کھانا شروع کیں۔ ''خدا کی قسم، یسوع کی قسم، میں نے زندگی میں کبھی نشے کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

''ابھی معلوم ہو جائے گا۔'' رافیل نے طنز آمیز تلخ لہجے میں کہا۔ ''آج کا پاس ورڈ یاد ہے تمہیں؟''

''یس...... یس سر...... کیا آخری اسٹاپ آگیا ہے۔''

سپاہی کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے زیادہ جوش و خروش سے منت ساجت شروع کی کہ اسے بخش دیا جائے، وہ اپنے دردناک حالات بیان کرتا رہا کہ وہ رحم کا مستحق ہے اور وعدہ کرتا رہا کہ آئندہ اس کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوگا...... بالآخر رافیل نے گن اس کے حوالے کر دی۔

''یہ لو، آج میں ترس کھا کر تمہیں معاف کر رہا ہوں۔'' رافیل نے دروازہ کھول کر اندر جاتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھو، دوسرے آفیسر اتنے رحم دل نہیں ہوتے۔ وہ چیک کرنے آئیں گے اور تمہیں سوتا دیکھیں گے تو کچھ پوچھے بغیر گولی مار دیں گے۔''

سپاہی نے جان بچنے پر خدا کا شکر ادا کیا اور اس فرشتہ صفت افسر کے اندر جاتے ہی اسٹین گن لے کر اٹینشن ہو گیا۔ رافیل اطمینان سے اندرونی فصیل کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ قلعے میں داخل ہونے کا واحد راستہ اب اس کے سامنے تھا اور وہاں باقاعدہ چیک پوسٹ قائم تھی۔ دروازے پر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ''کیا آخری اسٹاپ آگیا ہے؟'' اس نے بیزار لہجے میں بے نیازی سے کہا۔ مختصر کمرے کی کھڑکی میں ایک سپاہی کا چہرہ نظر آرہا تھا۔

''یس سر۔'' سپاہی نے سیلوٹ کے بعد جواب دیا اور مقفل دروازے کو چابی لگا کر کھول دیا۔ اندر دائیں بائیں دو اور محافظ کھڑے تھے۔ رافیل نے اسی بے اعتنائی والے انداز سے سوال دہرایا، سیلوٹ کا جواب دیا اور آگے چل پڑا۔

یہ اس کے دیکھے بھالے راستے تھے۔ چنانچہ اسے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔ قلعے کی فصیل کے اندر ایک پوری بٹالین موجود تھی۔ وسط میں ایک خیمہ نصب تھا اور

اردگرد بہت سے فوجی وردیاں پہنے پھر رہے تھے۔ ایک طرف فوجی ٹرک کھڑے تھے جن کے پیچھے رافیل کو بکتر بند گاڑیاں بھی دکھائی دیں، اس تمام ہلچل کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ سب فوجی کسی یلغار کے احکام کے منتظر ہیں۔ جنوبی حصے میں برج کے دروازے پر سرچ لائٹس کی روشنی میں سخت ترین حفاظتی انتظامات کا اندازہ ہوتا تھا، چنانچہ اس راستے سے زمین دوز تہ خانے میں اترنے کی کوشش کرنا حماقت تھی۔

رافیل نے قلعے کے اندر سے زنداں میں پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں سے گزرا اور ذہن میں موجود نقشے کے مطابق مختلف کمروں اور راہداریوں سے ہوتا ہوا اس دروازے تک آگیا جہاں سے ایک زینہ قید خانے کی گہرائی تک جاتا تھا۔ یہ راستہ عام لوگوں کے لیے نہیں تھا۔ قید خانے کے حکام اور محافظ دوسرا راستہ استعمال کرتے تھے جو صحن میں جنوبی برج سے شروع ہوتا تھا۔

ابھی تک کسی نے رافیل کو نہیں ٹوکا تھا۔ قلعے کے اندر مختلف راستوں پر اسے صدارتی عملے کے ارکان، ویٹر، خادم، صفائی کرنے والے، شوفر اور کچن کے ملازم وغیرہ ملے تھے جو اس کی طرف دیکھے بغیر گزر گئے تھے۔ مسلح فوجی اور سادہ کپڑوں میں پھرنے والے حفاظتی عملے کے ارکان نے رافیل کے پُراعتماد انداز اور اس کی یونیفارم دیکھ کر کسی شبہے کے بغیر سیلوٹ کیا تھا۔ ایک بار اس نے سامنے سے کسی سینئر افسر کو آتے دیکھ کر ایک تاریک گوشے میں پناہ لی۔ دوسری بار غیر متوقع طور پر ایک بند کمرے سے کوئی معزز صورت شخص نکل آیا تھا مگر اس کے ساتھ ایک عورت تھی اور وہ دونوں نشے میں تھے اور لڑکھڑاتے، ہنستے وہ چند قدم چل کر دوسرے کمرے میں گھس گئے تھے۔

رافیل جانتا تھا کہ وہ کتنے بڑے خطرے سے دوچار ہے، اس کے چاروں طرف دشمن تھے اور ذرا سا شک اس کی موت کا سامان بن سکتا تھا مگر ایک بار اس راہِ پُرخطر پر قدم رکھنے کے بعد موت کا خوف خود بخود ختم ہوگیا تھا اور اب کمانڈر رافیل کی تمام ذہنی و جسمانی صلاحیت منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے وقف ہو چکی تھی۔

اس نے دروازے کو آہستہ سے کھولا اور بند کر دیا۔ مختصر سے کمرے میں ایک تابوت نما صندوق رکھا تھا جسے دیکھتے ہی رافیل کو خیال آیا کہ یہ ڈان کارلس کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی۔ بائیں جانب ایک کھڑکی تھی مگر اس کے سامنے پردے پھیلے ہوئے تھے۔

ایسے ہی پردے دائیں جانب بھی تھے مگر رافیل جانتا تھا کہ اس کے مقابل کی دیوار کا دروازہ زینے کا راستہ ہے۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ آگے قدم بڑھائے یا چھپ کر انتظار کرے کہ اسے کسی کے زینے کے راستے اوپر آنے کی آہٹ سنائی دی۔ وہ لپک کر دائیں ہاتھ والے دروازے کے پردے کی اوٹ میں ہو گیا۔ پردے کی جھری سے اس نے کرنل شیراڈ کو اوپر آتے دیکھا۔ شیراڈ نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے ایک پٹ کھولا اور نیچے جھانک کر دیکھنے کے بعد اطمینان کے طور پر سر ہلایا پھر وہ تابوت کی طرف بڑھا۔ اس نے ڈھکنا کھول کر خالی تابوت میں ایک سرسری نظر ڈالی۔ وہ ڈھکنا بند کر کے سیدھا بھی نہ ہو پایا تھا کہ رافیل پردے کے پیچھے سے نکل آیا۔ کرنل شیراڈ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور اس کا ہاتھ بے اختیار ریوالور کی طرف بڑھا، مگر رافیل نے اسے آواز تک نکالنے کی مہلت نہ دی۔ اس نے دوبار کھڑی ہتھیلی سے بھرپور وار کیا اور شیراڈ ریت کی دیوار کی طرح منہدم ہو گیا۔

رافیل نے پردے پھاڑ کے شیراڈ کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھے اور ایک کپڑا اس کے منہ میں ٹھونسا پھر اسے گھسیٹ کر ایک تاریک کونے میں ڈال دیا، جہاں کسی گزرنے والے کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی، کیونکہ اس گوشے کے سامنے لکڑی کی الماری کھڑی تھی جو شاید اسی گوشے میں نصب کرنے کے لیے لائی گئی تھی۔

نیچے جانے والا دروازہ کسی قفل کے بغیر یوں بند تھا، جیسے سپاٹ دیوار کا ایک حصہ ہے مگر قدیم شاہی زنداں کے یہ اسرار رافیل پر بہت پہلے کھل چکے تھے۔ اس نے دہلیز کے ایک کونے میں نظر نہ آنے والے چوکور حصے کو دبایا اور دروازہ کسی آواز کے بغیر کھل گیا۔ رافیل کے اندر قدم رکھتے ہی اس کے دونوں پٹ جو دیوار میں گھس گئے تھے پھر آپس میں مل گئے۔ رافیل نے زینے کے بعد چکردار ڈھلوان راستے پر چلنا شروع کیا۔ اندر نمی تھی اور دیواروں میں اتنی سیلن تھی کہ سہارا لینے سے ہاتھ گیلے ہو جاتے تھے مگر زمین کی اتنی گہرائی میں بھی گھٹن نہیں تھی۔ ایک موڑ پر رافیل نے لوہے کی موٹی سلاخوں والے روشن دان دیکھے جو اس کے سر سے بہت اوپر تھے، ان میں سے ستاروں بھرے آسمان کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ایک اور دروازے جتنے شگاف سے سمندر کی موجوں کا شور صاف سنائی دیتا تھا اور اس کی دیواروں سے ٹکرانے والے پانی کی آواز آتی تھی۔ زنداں کی فضا میں سمندر کی مخصوص بو بس گئی تھی اور رافیل کو تعجب تھا

کہ اس قید خانے میں جہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں اور ہوا میں اتنی رطوبت ہے، لوگ کئی سال کیسے زندہ رہ لیتے ہیں۔ وہ آگے بڑھتا گیا، اب اس کے کانوں میں قیدیوں کے کراہنے کی آہ و بکا اور ان کی درد بھری اذیت ناک فریاد کی آوازیں آنے لگی تھیں، مگر وہ دل کو اس زنداں کی دیواروں کی طرح پتھر کیے چلتا رہا۔ اسے صرف ایک آدمی کی تلاش تھی جس کی رہائی باقی سب اسیروں کی رہائی کی ضمانت بن سکتی تھی۔ وہ ایک آدمی اس زنداں کی کلید تھا اور اس کی زندگی پر سب کی زندگی کا دارومدار تھا۔ رافیل کو یقین تھا کہ کارٹر نے صدر ڈان کارلس کو سب سے الگ رکھا ہوگا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ملک کا صدر تھا بلکہ اسے قید تنہائی کا عذاب دینے اور دوسروں سے بات کر کے ان کے ذہنوں کو مسموم کرنے کا موقع نہ دینے کے لیے۔

راستہ اچانک ختم ہو گیا اور رافیل نے اپنے سامنے ایک ایسا آہنی دروازہ دیکھا، جسے بند کرنے کے لیے چوڑائی کے رخ پر لوہے کی تین پٹیاں تھیں۔ ہر پٹی کم از کم آدھا انچ موٹی تھی اور اس کا آخری کنارہ پتھر کی دیوار میں لگے ہوئے ہک سے مل جاتا تھا۔ ہر ہک میں کئی پونڈ وزنی ایک تالا تھا۔

رافیل سلاخوں کو تھامے کھڑا رہا۔ اس کے لیے سلاخوں یا پٹیوں کو کاٹنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا تالوں کو توڑنا۔ قید خانے کو تعمیر کرنے والے اناڑی نہیں تھے۔ انہوں نے آخری مرحلے کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا۔

مکمل خاموشی میں جسے سمندر کی آواز بھی منتشر نہیں کرتی تھی، رافیل نے کسی کے زیرلب گفتگو کرنے کی آواز سنی۔ کوئی آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ آواز کو پہچان کے رافیل کا دل تیزی سے دھڑکا۔ یہ صدر ڈان کارلس تھا، جو دعا مانگ رہا تھا۔ دعا کے الفاظ رفتہ رفتہ واضح ہونے لگے۔ بوڑھا اور نیک دل کارلس خدا سے صرف یہ التجا کر رہا تھا کہ اگر اس کی زندگی اس ملک اور عوام کی فلاح و بہبود کے کام آ جائے تو اسے یہ حقیر نذرانہ دے کر خوشی ہوگی۔

وہ آواز دے کر ڈان کارلس کو متوجہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے کوئی اس پر توپ کے گولے کی طرح آ پڑا۔

رافیل حملہ آور کے ساتھ ہی نیچے گرا۔ اس کی زندگی خطرات سے کھیلتے گزری تھی، جو متوقع بھی ہوتے تھے اور غیر متوقع بھی، اور وہ ناگہانی آفات کا مقابلہ اپنی حیوانی جبلت سے کرتا تھا، جو بوقتِ ضرورت اسے بلا سوچے سمجھے ایک خودکار عمل کے ذریعے مقابلے کی صلاحیت کو بروئے کار لانے کا حوصلہ عطا کر دیتی تھی۔

گرتے گرتے بھی اس نے پیچھے کی طرف ایک زبردست دولتی جھاڑی اور حریف کو کراہتے سنا۔ گر کر کروٹ لینے اور گھٹنوں کے بل اٹھ جانے میں اس نے اتنی پھرتی کا مظاہرہ کیا کہ خنجر جو اس کے سینے میں پوست ہو سکتا تھا، وہ اس کی ران کے گوشت کو چھیلتا ہوا گزر گیا۔ رافیل نے بائیں ہاتھ سے وار کیا اور ضرب دشمن کے سینے پر پڑی، دشمن لڑکھڑا گیا۔ رافیل کا ہاتھ پسٹل نکال چکا تھا اور نادیدہ شخص کا نشانہ لینے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ دشمن نے چلا کر محافظوں کو پکارا اور رافیل نے جنرل کارٹر کی آواز پہچان لی۔ پلک جھپکتے ہی قید خانے کی فضا بھاری بوٹوں کی دھمک سے گونجنے لگی۔ رافیل نے پستول جیب میں ڈالا اور زقند لگا کر نکل گیا۔ مقابلے کا مطلب خودکشی تھا اور وہ موت جس کی خبر اس کے ساتھ ہی اس تہ خانے میں دفن ہو جاتی، لیکن فرار کی کوشش کے کامیاب ہونے کی صورت میں وہ اپنی پہلی کامیابی کے نتائج سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ مشن پر روانہ کرنے والوں کو مطلع کر سکتا تھا کہ ڈان کارلس کہاں قید ہے۔ جنرل کارٹر کو دھمکی دے سکتا تھا کہ ڈان کارلس کی رہائی کے لیے طاقت کا استعمال بعیداز قیاس نہیں اور الیگزا کو خوش خبری سنا سکتا تھا کہ اس کا باپ زندہ ہے۔ بصورتِ دیگر کسی کو کبھی معلوم نہ ہو پاتا کہ وہ لیفٹیننٹ کمانڈر جو بخیر و عافیت اس ملک کے ساحل پر اترا تھا، کسی وجہ کے بغیر کہاں غائب ہو گیا اور کیوں غائب ہو گیا۔

وہ اندھیرے میں بے تحاشا بھاگا۔ خون کی ایک دھار اس کی ران کے زخم سے بہتی جا رہی اور یہ خون اس کے جوتے میں جمع ہو رہا تھا لیکن ابھی زخم کی ٹیس شدید نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں اب اندھیرے کی اس حد تک عادی ہو گئی تھیں کہ نشیبی راستے کا ہر موڑ دیکھ سکتی تھیں۔ کارٹر ابھی چلا رہا تھا مگر خود رافیل بھی مخالف سمت سے آنے والوں کو چیخ چیخ کر ہدایت دیتا جا رہا تھا۔ محافظ دوڑتے دوڑتے لحہ بھر کے لیے رکتے تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں اپنے سامنے ایک آفیسر کو دیکھتے تھے اور سیلوٹ کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے تھے۔

''میرا منہ مت دیکھو، آگے جاؤ، دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے۔''

رافیل گرج کر کہتا تھا۔ ''تم سب نااہل ہو...... حرام خور...... وہ تمہارا باپ آخر اندر کیسے گھس آیا۔'' محافظ بوکھلا کر آگے بھاگتے تھے اور پریشان ہو کر سوچتے تھے کہ نہ جانے ان سے کیا کوتاہی سرزد ہوئی ہے اور اب اس کا کیا خمیازہ

بھگتنا ہوگا۔ افراتفری کے عالم میں وہ طے نہ کر پاتے تھے کہ آگے جائیں یا پیچھے۔

کارٹر چلا رہا تھا کہ ”اندھے کے بچو! تمہارا باپ تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو رہا ہے، اسے پکڑلو۔“ وہ پیچھے دیکھتے تو انہیں دوسرا آفیسر نظر آتا تھا جو گالیاں دیتا انہیں آگے جانے کا حکم دے رہا تھا۔ وہ دشمن جیسے دونوں طرف سے ان کا باپ کہا جارہا تھا محافظوں کو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رافیل نے اسپرنگ والا دروازہ کھول کر کمرے میں قدم رکھا پھر دوسرا دروازہ کھول کے باہر آیا تو اسے خطرے سے وقتی طور پر تحفظ کا احساس ہوا مگر...... وہ پوشیدہ راستوں سے گزرتا گیا۔ اس نے اوپر سے جھانک کر دیکھا کہ کھڑکی کے عین نیچے ایک کار موجود ہے۔ کرنل شیراڈ نے تابوت والے کمرے کی کھڑکی سے اسی کار کو دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کار کسی خاص مقصد کے لیے لائی گئی تھی۔

تابوت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ شاید ڈان کارلس کو تابوت میں اور تابوت کو کار میں قلعے سے باہر نکال کر کسی نامعلوم مدفن تک منتقلی کے انتظامات میں کرنل شیراڈ اور جنرل کارٹر برابر کے شریک تھے، شاید اب وہ فوری طور پر اس پروگرام پر عمل درآمد نہ کرسکیں۔ ڈان کارلس کی بیٹی نے سرعام یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس کے باپ کو قتل کردیا گیا ہے۔

اب اس کے علاوہ کمانڈر رافیل نے ڈان کارلس کو قید خانے میں زندہ دیکھ لیا تھا، چنانچہ کارٹر کے لیے یہ قتل پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔ امریکی سفیر کی معرفت امریکی حکومت ڈان کارلس کی پُراسرار گمشدگی پر اظہارِ تشویش کے بعد مطالبہ کرسکتی تھی کہ اگر صدر بیمار ہے تو امریکا کے ماہرین پر مشتمل ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کو اس کا معائنہ کرنے کی اجازت دی جائے یا اسے اخباری نامہ نگاروں کے سامنے پیش کرکے اس کے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا جائے۔

جنرل کارٹر اس بات کو غیراہم سمجھ کر نظرانداز نہیں کرسکتا تھا کہ رافیل نے ڈان کارلس کا سراغ لگا لیا ہے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن تھا کہ جنرل کارٹر سوچے سمجھے بغیر اور انجام کی پروا کیے بغیر انتہائی قدم اٹھالے، جس کا نتیجہ فوج کشی اور خونریزی کی صورت میں برآمد ہو، جو واشنگٹن میں اعلیٰ حکام کے نزدیک ایک مشکل سیاسی صورتِ حال سے نمٹنے کا آخری ناقابلِ قبول اور ناپسندیدہ حل تھا۔

باہر آتے ہی اس نے کار کو اسٹارٹ ہوتے دیکھا۔ اس کے سیڑھیوں سے اترتے ہی کار کا اگلا دروازہ کھل گیا اور وہ سیٹ پر گر گیا۔ ''چلاؤ...... گاڑی چلاؤ......'' اس نے اپنا تحکمانہ انداز برقرار رکھا۔ ''جلدی سے نکل چلو۔''

ڈرائیور نے سر ہلایا اور نئی طاقتور کار کا انجن کسی وحشی درندے کی طرح غرایا۔ کار ایک جست لگا کر آگے بڑھی مگر اسی وقت رافیل نے اپنے سر کے پیچھے کسی سخت اور سرد چیز کا دباؤ محسوس کیا۔

''جلد بازی ہمیشہ بُری ہوتی ہے کرنل۔'' شیراڈ کی آواز آئی۔ ''جلدی میں تم نے میرے ہاتھ پیر ٹھیک طرح سے نہیں باندھے تھے اور ان پرانے پردوں کا کپڑا بھی زیادہ مضبوط نہیں تھا۔''

رافیل نے سر گھما کر پیچھے دیکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ شیراڈ نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ کار کو گھما کر واپس وہیں لے چلے۔

''ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا...... ہوسکتا ہے انہیں ہماری ضرورت محسوس ہو۔'' شیراڈ نے کہا مگر کار اتنی دیر میں دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ رافیل منجمد بیٹھا تھا اور اس کا ایک ہاتھ ابھی تک دروازے کے ہینڈل پر تھا۔ فیصلہ کن لمحہ گزرنے والا تھا۔ رافیل کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا، جہاں موت یقینی ہو، وہاں زندگی کے ایک فیصد امکان پر جوا نہ کھیلنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس نے بلا تذبذب دروازہ کھولا اور کار میں سے باہر لڑھک گیا۔ شیراڈ کے لیے یہ حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ اسے چونک کر سنبھلنے اور فائر کرنے میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر ہوگئی۔ نشانہ خطا گیا اور رافیل نے اٹھ کر دروازے کی جانب دوڑ لگائی۔

''دروازہ بند کرو۔'' وہ گلا پھاڑ کے چیخا۔ ''اس کار میں ایک قیدی فرار ہورہا ہے۔''

پیچھے آنے والی کار رک گئی تھی اور گالیاں بکتا کرنل شیراڈ پچھلے دروازے کو کھول کر باہر آنے کی جدوجہد کررہا تھا۔ دروازے پر موجود گارڈ نے احکامات کی تعمیل میں دروازہ بند کردیا تھا اور اب تین محافظ بندوقیں اٹھائے کار کی جانب لپک رہے تھے۔

رافیل باہر نکل جانے کے باوجود محفوظ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چند منٹ میں محافظوں کو سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ یہ بھی کہ کار میں قیدی نہیں، وزیر داخلہ بنفسِ نفیس موجود ہے، یہ بھی کہ فرار وہ شخص ہوا ہے جس نے فوجی آفیسر کی وردی پہن کر انہیں بے وقوف بنا دیا تھا اور یہ بھی کہ وہ اس جعلی فوجی آفیسر کو نہ پکڑ سکے تو کرنل شیراڈ خود انہیں شوٹ کر دے گا۔

رافیل اب بیرونی فصیل کے اسی دروازے کی جانب جارہا تھا، جہاں اس نے پہرے پر سو جانے والے سپاہی کو اس کی نوکری اور زندگی بخش کر اپنا احسان مند بنا لیا تھا۔ شکر گزارانہ انداز میں کیے جانے والے سیلیوٹ کا جواب سر کی جنبش سے دینے کے بعد وہ ساحل کی طرف جانے والی سڑک سے ہٹ کر دوڑنے لگا۔ اسے اندازہ تھا کہ بحری جہاز سے ساحل تک لانے والی کشتی کہاں لنگر انداز ملے گی، مگر یہ فاصلہ کم نہ تھا۔ اگر دشمن کے تعاقب میں آنے سے پیشتر وہ کشتی لے کر نکل جانے میں کامیاب ہوجاتا تو بحری جہاز تک چند منٹ میں پہنچ سکتا تھا اور کنارے سے گولیاں برسانے والوں کی کامیابی کے امکانات بہت کم رہ جاتے۔ کیونکہ متلاطم سمندر میں رواں کشتی کا نشانہ لینا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ رافیل کے لیے غوطہ مار کے پانی میں نیچے ہی نیچے تیر کر نکل جانا بھی ممکن تھا مگر...... سر گھما کر دیکھنے سے رافیل کو یقین آیا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی، مسلح محافظ اب بیرونی فصیل کے دوسرے دروازے سے کرنل شیراڈ کی کار میں سوار ہوکر نکلے تھے اور کار طوفانی رفتار سے سڑک پر دوڑتی ہوئی آرہی تھی۔ رافیل نے موڑ کاٹا اور چوک سے گزر کر ایک گلی میں داخل ہوگیا۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے کار کی ہیڈ لائٹس نے گلی روشن کردی۔ رافیل نے کرنل شیراڈ کے چلانے کی آواز صاف سنی۔

اچانک سامنے سے ایک اور کار نمودار ہوئی اور رافیل نے خود کو محصور پا کر اسے ہاتھ کے اشارے سے روکنا چاہا مگر کار سیدھی گزر گئی۔ کار کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں، لیکن رافیل نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان لیا تھا، وہ چینل تھا۔ اندھی کار پوری رفتار سے دوڑتی ہوئی اس کار میں گھس گئی جو رافیل کے تعاقب میں آرہی تھی۔ دھماکا اتنا زبردست تھا کہ رافیل رک کر دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ پرانی خستہ حال کار تباہ ہوگئی تھی مگر اس نے شیراڈ کی نئی دیو پیکر کار کا حلیہ بھی بگاڑ دیا تھا اور اس کا راستہ روک کر شیراڈ کی کامیابی کو پل بھر میں ناکامی سے دوچار کردیا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کی پیش قدمی رک گئی تھی اور اب وہ اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے، مگر رافیل ان کی زد سے نکل چکا تھا۔ ایک پرانے وفادار دوست چینل نے اپنی جان دے کر اس کی جان بچالی تھی اور حقِ دوستی یوں ادا کیا تھا کہ رافیل کو اپنی

زندگی پر شرمندگی ہونے لگی تھی۔ چپنل کے بچنے کا کوئی امکان نہ تھا اگر وہ اس ٹکراؤ کے بعد بچ بھی گیا ہوگا تو اس کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا ہوگا۔

پانچ منٹ بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھا تو اس نے چپنل کی آواز سنی۔ رات کی خاموشی میں یہ بازگشت بالکل واضح تھی جو اس کے ذہن سے اٹھی تھی۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی چپنل نے کہا تھا۔ ''خود میں اپنے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کل تک زندہ رہوں گا یا نہیں......'' اور وہ واقعی صبح کا سورج دیکھنے سے پہلے مرگیا تھا۔

☆☆☆

ایڈمرل ٹانسن کا کمرا مختصر اور زیادہ آراستہ نہیں تھا، مگر اس کی سادگی میں نفاست تھی۔ وہ تینوں ایک سینٹرل ٹیبل کے گرد کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ رافیل کی ران کا زخم سطحی تھا اور مرہم پٹی کے بعد درد کے احساس کو مٹانے والی دوا کے استعمال نے کسی زخم کی موجودگی کا خیال بھی مٹا دیا تھا۔ وہ اب پورے اعتماد کے ساتھ اپنی کارگزاری کا خلاصہ پیش کر رہا تھا مگر ایڈمرل اور امریکی سفیر کی صورت پر تذبذب کے آثار تھے۔

''میں تسلیم کرتا ہوں رافیل! کہ تم نے فیصلے میں غلطی نہیں کی۔'' سفیر نے کہا۔ ''لیکن تمہارا فیصلہ اندازے پر مبنی تھا۔ تم نے دیکھا کچھ نہیں...... صرف آوازیں سنی ہیں۔''

''اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ ڈان کارلس کی آواز تم نے کئی سال بعد سنی تھی۔'' ایڈمرل نے کہا۔

''وہ بھی ایک قید خانے میں اور خود تمہارے کہنے کے مطابق وہ سرگوشی میں دعا مانگ رہا تھا۔''

''غالباً نقاہت کے باعث وہ اونچا نہیں بول سکتا تھا۔'' رافیل نے کہا۔

''پھر تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ڈان کارلس ہی تھا؟'' امریکی سفیر نے کہا۔ ''اس بات کا کیا ثبوت ہے؟''

''مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔'' رافیل نے برہمی سے کہا۔ ''عرصہ کم یا زیادہ ہونے سے آواز یا لب و لہجہ نہیں بدلتا...... اور کئی سال گزر چکے ہیں تو کیا، تم یہ بھی تو ذہن میں رکھو کہ میں نے صدر ڈان کارلس سے گھنٹوں بہت قریب رہ کر گفتگو کی ہے۔ چار سال تک میں وہ آواز مسلسل سنتا رہا تھا۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مجھ سے اس آواز کی شناخت میں غلطی ہوجائے؟''

''ٹھیک ہے...... مگر ہم کسی ثبوت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔'' سفیر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''کیا تم ثابت کرسکتے ہو کہ جنرل کارٹر نے ڈان کارلس کو قلعے میں اسیر کر رکھا ہے؟ کوئی شہادت، کوئی دستاویز لاسکتے ہو؟''

''لاسکتا ہوں۔'' رافیل نے چیلنج قبول کرنے کے انداز میں کہا۔ ''مگر تاخیر کا نتیجہ ڈان کارلس کی موت کی صورت میں نکلا تو اس کا ذمّے دار کون ہوگا مسٹر؟ جنرل کارٹر اس کی جان لینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔''

''کارٹر کوئی دہشت پسند نہیں ہے۔'' امریکی سفیر نے کہا۔ ''وہ کارلس کے ساتھ بھی نائب صدر تھا اور کسی احمقانہ اقدام کے نتائج کا بخوبی اندازہ کرسکتا ہے۔ اس کے خلاف طاقت کے استعمال سے گریز ہماری پالیسی ہے۔''

''یہی پالیسی اس کی حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔'' رافیل بولا۔ ''تعلقات کی کشیدگی کو بڑھانے کے لیے ہر قدم خود کارٹر اٹھاتا ہے مگر احکامات پر دستخط کس کے ہوتے ہیں؟ ڈان کارلس کے...... اب امریکی حکومت کے احتجاجی مراسلے کا جواب خود کارٹر لکھوائے گا، مگر یہ جواب امریکی حکومت کو موصول ہوگا تو اس پر ڈان کارلس کے دستخط ہوں گے۔ بالآخر امریکی حکومت سے تعلقات کی خرابی اس انتہا کو پہنچ جائے گی جہاں طاقت کے استعمال کے سوا چارہ نہ ہوگا مگر خون ریزی کا ذمے دار کون ٹھہرے گا؟ ڈان کارلس۔ اس کے اپنے ساتھی، اس کے حامی اور ہم وطن اس کے خلاف ہوجائیں گے۔ جنرل کارٹر اقتدار پر قابض ہوجائے گا اور پھر ڈان کارلس سامنے آیا بھی تو کسی کورٹ مارشل میں غدار اور وطن دشمن کے روپ میں آئے گا۔ ظاہر ہے، اس کی سزائے موت کا فیصلہ سماعت کے ڈرامے سے قبل ہی کرلیا جائے گا۔ کیا امریکی حکومت جانتے بوجھتے ان حقائق سے روگردانی کرسکتی ہے؟''

''کمانڈر رافیل...... یہ تمام صورتِ حال ہمارے سامنے ہے۔'' سفیر نے ناگواری سے کہا۔ ''میں اس مسئلے کے ہر پہلو پر واشنگٹن کے اعلیٰ حکام سے تفصیلی گفتگو کرچکا ہوں۔ سرِدست ہمارے پاس کارٹر کے خلاف کوئی الزام نہیں اور ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ آئینی طور پر اقتدار سنبھالے تو اس کی حیثیت کو تسلیم کرلیں تاکہ کشیدگی اور نہ بڑھے۔ طاقت کے استعمال کا ایک منفی ردِعمل بھی ہوسکتا ہے جو زیادہ خطرناک ہے...... ہاں، تم ثابت کرسکو کہ کارٹر نے واقعی ملک کے آئینی صدر کو قید خانے میں ڈال رکھا ہے تو کارٹر مجرم ہوجاتا ہے۔ ہمارے لیے ہی نہیں، اس ملک کے عوام اور قانون کی نظر میں بھی...... اس ثبوت کے بغیر ہم

کارٹر کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ڈان کارلس کو امریکی ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رکھے یا اخباری نامہ نگاروں کے سامنے پیش کرے۔ یہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت سمجھی جائے گی۔''

رافیل خاموشی سے ہونٹ کاٹتا رہا۔ اس کے پاس وہ احکامات تھے جو ہنگامی ضرورت سے نمٹنے کا آخری موثر حربہ بن سکتے تھے جن کی مدد سے وہ ایڈمرل یا سفیر کو قائل کیے بغیر اپنی مرضی کے مطابق صرف تعمیل پر مجبور کر سکتا تھا مگر اسے ہدایت تھی کہ وہ حتی الامکان ان احکامات سے حاصل ہونے والے اختیارات کو کام میں نہ لائے۔

''میں دستاویزی ثبوت فراہم کروں گا۔'' رافیل نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔ ''لیکن مجھے تھوڑے سے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ ایک تو یہ کہ بحری جہاز کو جنوبی ٹاور کے قریب ترین حصے میں لنگر انداز کیا جائے۔ میں آج رات کسی وقت وائرلیس پر جو پیغام دوں، اس پر عمل کیا جائے، ظاہر ہے یہ پیغام گولہ باری شروع کرنے کے لیے نہیں ہوگا۔ اس کے لیے مجھے پورٹیبل وائرلیس سیٹ فراہم کیا جائے اور ایک کیمرا، جو اندھیرے میں بھی تصویر اتار سکے۔''

''یہ تعاون کوئی مسئلہ نہیں۔'' ایڈمرل نے کہا۔ ''جہاز پہلے ہی ساحل سے زیادہ دور نہیں۔ اس کا رخ تھوڑا سا بدلنا ہوگا۔ لیکن اس وقت اتفاق سے ہمارے پاس اندھیرے میں تصویر اتارنے والا کیمرا نہیں ہے۔ اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین ہے، وائرلیس سیٹ البتہ مل جائے گا۔''

☆☆☆

یہ رات بھی گزشتہ رات کی طرح سنسان اور اندھیری تھی، سمندر کے متلاطم سینے پر چیونٹی کی طرح رینگنے والی کشتی قلعے کی جنوبی دیوار کے قریب پہنچتی جا رہی تھی۔ رافیل نے دوربین کو آنکھوں سے لگا کر دیکھا۔ رات کی سیاہی میں وہ قلعہ یوں نظر آنے لگا، جیسے چودھویں کے چاند کا اجالا پھیلا ہو۔ رافیل نے کشتی کا رخ بدلنے کا اشارہ کیا۔ کشتی چلانے والا بہت محتاط تھا اور اس کی پوری کوشش تھی کہ چپو چلانے سے پانی میں آواز پیدا نہ ہو۔

ایک گھنٹے میں انہوں نے تیسری بار رخ بدل کے جنوبی برج کے سمندر کی جانب کھلنے والے تیسرے روزن کا جائزہ لیا تھا۔ ہر روزن میں آدمی کی کلائی سے موٹی آہنی سلاخیں نصب تھیں۔ ہر روزن سطح سمندر سے بہت اوپر تھا اور ہر روزن سے تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اردگرد کے سمندر میں چٹانیں تھیں، چنانچہ کسی کے جنوبی برج سے سمندر میں چھلانگ لگا کر فرار ہونے کا قطعی کوئی امکان نہیں تھا۔ رافیل نے ذہن میں وہ نقشہ رکھا جس کے مطابق چل کر وہ گزشتہ شب ڈان کارلس کے قید خانے تک پہنچا تھا۔ سمت کا تعین کیا اور کشتی کو ایک چٹان کے قریب روک لینے کا حکم دیا جو برج کے دامن میں تھی۔ چٹان پر قدم جما کے اس نے تینوں چیزوں کو سنبھالا جو اس کے گلے میں آویزاں تھیں۔ یعنی وہ کیمرا جو اس نے اپنی مدد آپ کے تحت حاصل کیا تھا، دوربین اور وائرلیس سیٹ، پھر اس نے کشتی میں سے رسی طلب کی اور اس کا پھندا بنا کے اوپر کی جانب پھینکا، چوتھی کوشش میں رسی نے ایک سلاخ کو گرفت میں لے لیا۔ رافیل نے اس کی مضبوطی کو آزمایا اور کشتی کو چٹان سے دور طے شدہ مقام پر لے جانے کی ہدایت دے کر اوپر چڑھ گیا۔ ''گڈ لک سر۔'' کشتی کے ملاح نے آہستہ سے کہا اور رافیل کو سرکس کے بازی گر کی طرح قلعے کی پرانی دیوار پر چڑھتے دیکھتا رہا پھر اس نے کشتی کا رخ پلٹا اور اسے آہستہ آہستہ دھکیلتا ہوا سو گز دور لے گیا۔

رافیل نے روشن دان تک پہنچ کر احتیاط سے رسی کو کمر کے گرد لپیٹا اور اس کے دوسرے سرے کو دوسری سلاخ کے ساتھ یوں باندھ دیا کہ وہ خود ایک جھولے میں روشندان کے سامنے فٹ ہو گیا۔

اس نے دوربین لگا کے دیکھا۔ زنداں کے اندر کا پورا منظر اس کے سامنے پھیل گیا۔ وہ بالکل ٹھیک جگہ پہنچا تھا۔ ٹھیک بیس فٹ نیچے وہ راستہ تھا جس کا اختتام ڈان کارلس کے زنداں پر ہوتا تھا۔ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور انتظار کرنے لگا۔ اس انتظار کی کوئی حد نہ تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ساری رات بے مصرف گزر جائے، اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کرنل شیراڈ یا جنرل کارٹر، رات کو کسی وقت بھی اسے دستاویزی ثبوت حاصل کرنے کا موقع فراہم کر دیں۔ وہ اپنے انتظامات سے مطمئن تھا اور اب اسے فکر تھی تو صرف یہ کہ کہیں وقت پر کیمرا یا وائرلیس سیٹ جواب نہ دے جائیں۔ اس نے دونوں چیزوں کو آزما لیا تھا، مگر مشینی نظام کبھی اور کہیں سو فیصد قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔

قید خانے میں اسیروں کی دبی دبی فریاد و فغاں کا ملا جلا شور تھا۔ پہرے داروں کی آوازیں تھیں، جو ایک دوسرے کو 'سب ٹھیک ہے' کا سگنل دیتے تھے یا کسی قیدی کو غیر ضروری ہنگامہ آرائی سے روکنے کے لیے گالیوں اور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

دھمکیوں سے کام لیتے تھے۔ ڈان کارلس کی کوٹھری رافیل کے سامنے تھی، مگر خود کارلس شاید کسی گوشے میں پڑا تھا کہ نظر نہیں آتا تھا۔ رافیل کو اس کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی، چنانچہ وہ اس اندیشے کا شکار بھی تھا کہ کہیں گزشتہ رات ہی کارٹر نے اس کا کام تمام کر کے، تابوت کے ذریعے باہر تو نہیں نکال دیا تھا۔ بیک وقت قید سے اور قیدِ حیات سے رہائی کے سوا سابق صدر کے لیے باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

دو گھنٹے بعد اس کی مایوسی یک لخت نئی امید میں ڈھل گئی۔ اس نے جنرل کارٹر کو آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ تین محافظ بھی تھے جنہوں نے بھاری بھر کم چابیوں سے تینوں تالے کھولے اور پیچھے ہٹ گئے۔

رافیل اب پوری طرح مستعد ہو چکا تھا۔

''بڈھے خبیث......'' کارٹر نے دیوار پر لگے ہوئے بٹن کو دبا کر وہ بلب روشن کرتے ہوئے کہا، جس کی روشنی لالٹین سے زیادہ نہ تھی۔ ''تو زندہ ہے ابھی تک...... بہت بے غیرت ہے...... میں نے تجھے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تھی...... کچھ فیصلہ کیا ہے تو نے یا نہیں؟''

بائیں ہاتھ کی جانب ڈان کارلس بالکل مقابل کی دیوار پر زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کے گرد آہنی حلقے تھے اور ان حلقوں سے پیوست زنجیریں الگ الگ اور مخالف سمت میں جا کر دیوار میں پیوست ہو جاتی تھیں۔

''میں ہر روز یہاں کتے کی طرح بھونکنے نہیں آتا۔'' کارٹر نے پوری قوت سے ڈان کارلس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔ اس کی آواز کوٹھری میں پٹاخے کی طرح گونجی۔

تصویر اتارنے کی خواہش کو زیادہ مناسب وقت تک ملتوی کرنے کے لیے رافیل کو ضبط سے کام لینا پڑا۔ ''میں آخری بار پوچھ رہا ہوں ڈان کارلس۔'' کارٹر کی آواز پھر آئی۔ ''کیا تجھے سب کے سامنے خرابیٔ صحت کی بنا پر استعفا دینا منظور ہے؟''

''نمک حرام...... میں...... میں اس طرح...... اس طرح کبھی مستعفی نہیں ہو سکتا۔'' ڈان کارلس نے بمشکل تمام کہا۔ کارٹر نے اس کے منہ پر دوسرا تھپڑ مارا...... مگر وہ بولتا رہا۔ ''کارٹر! میں اس ملک کا صدر ہوں...... میں آخری...... آخری سانس تک...... عوام کی خدمت...... اپنے ملک کی خدمت...... کروں گا...... یا...... جب تک لوگ...... لوگ مجھے خود نہیں ہٹاتے۔''

رافیل نے دیکھا کہ کارٹر نے میان سے خنجر نکال لیا ہے۔ اس نے کیمرے کو فوکس کیا اور وائرلیس کو آن کر دیا۔ کارٹر نے خنجر کی نوک ڈان کارلس کے سینے پر رکھ دی تھی۔ ''ڈان کارلس، میں نے تجھے جینے کا موقع فراہم کیا ہے...... اسے نہ گنواؤ۔''

''کتے...... مجھے اس زندگی...... سے کوئی...... کوئی پیار نہیں...... جو کسی...... کسی کے کام...... کام نہ آئے۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

یک لخت کارٹر کا ہاتھ بلند ہوا اور خنجر ڈان کارلس کے سینے میں اتر گیا۔ کیمرے کی فلیش لائٹ نے بروقت اس منظر کو محفوظ کر لیا۔ اس چکاچوند نے کارٹر کو دہشت زدہ کر دیا۔ اس کا دوسری بار اٹھنے والا ہاتھ اٹھا رہا۔ کیمرے کی روشنی میں یہ منظر بھی ریکارڈ پر آ چکا تھا۔ اسی وقت کارٹر گلا پھاڑ کر چلایا۔ ''یہ کون ہے؟'' اس نے محافظوں کو پکارنا شروع کیا۔ مگر...... رافیل اس وقت تک وائرلیس پر بحری جہاز سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔ جواب میں چند سیکنڈ بعد جہاز کی خیرہ کن سرچ لائٹس نے جنوبی برج کا احاطہ کر لیا۔ یہ روشنی ہر روزن سے قید خانے میں داخل ہو گئی۔ کارٹر حواس باختہ ہو کے بھاگا۔ رافیل نے پھر تصویر اتاری...... رسی کی گرہ کھولی اور نیچے پھسلنے لگا۔

بحری جہاز کی باقی سرچ لائٹس اس کی ہدایت کے مطابق برج کے اوپر پڑ رہی تھیں اور محافظوں کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس تیز روشنی نے ان کو اندھا کر دیا تھا۔ یوں...... جیسے بیک وقت ان کے سامنے کئی سورج طلوع ہو گئے ہوں۔ کارٹر کی تعمیل میں وہ فائر کر رہے تھے مگر انہیں اپنے نشانے کا علم نہیں تھا۔

رافیل نے نیچے اُتر کر چٹان پر قدم جمائے اور تیرتا ہوا کشتی کی طرف بڑھنے لگا

☆☆☆

صبح ہونے کو تھی جب بحری جہاز کے ڈارک روم سے فوٹوگرافر نے فلمیں دھونے کے بعد پرنٹ بنا کے پیش کیے۔ ہر تصویر میں وہ لمحہ تمام درد و کرب کے ساتھ اتر آیا تھا۔ جب دستِ قاتل نے خنجر سے رشتۂ جسم و جاں منقطع کیا تھا۔ ہر تصویر زبانِ خنجر بن کے پکارتی تھی کہ کس کی آستین پر کس کا لہو ہے اور ہر تصویر ایک فردِ جرم تھی۔ ان منجمد لمحوں کے وجود سے انکار ناممکن تھا جو ڈان کارلس کی زندگی کی بھینٹ لے کر گزر گئے تھے مگر اپنا نقش چھوڑ گئے تھے کہ سند رہے، اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔

ایڈمرل ٹانسن اور امریکی سفیر اس ناقابلِ تردید شہادت پر حیرت زدہ اور شرمندہ و افسردہ تھے۔

"غالباً اب شکوک کے امکانات باقی نہیں رہے؟" رافیل نے طنز سے کہا۔ "اگر میری شہادت پہلے ہی قبول کر لی جاتی، تو ہم یقیناً کارلس کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے، خیر! اب ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ اس قاتل کو منصبِ صدارت پر فائز نہ ہونے دیں۔"

"ہاں۔" امریکی سفیر نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہونا چاہیے مگر رافیل! جنرل کارٹر مسلح افواج کا کمانڈر انچیف بھی ہے۔ اسے عہدے سے ہٹانے کے لیے واحد طریقہ فوج کشی کا ہے۔ وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گا اور فوجی کارروائی سے بہت کشت و خون ہو گا۔ میں اس کی ذمے داری قبول نہیں کر سکتا۔ مجھے واشنگٹن سے احکامات لینے ہوں گے۔"

"مجھے ڈر تھا کہ سرخ فیتے کی کارروائی مکمل کیے بغیر تم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔" رافیل نے برہمی سے کہا۔ "حالانکہ وقت بہت کم ہے۔ کارٹر اب صدر ڈان کارلس کی طبعی موت کا اعلان کر دے گا اور آئینی طور پر وہ خود ہی صدر بن جائے گا۔ وہ ڈان کارلس کے لیے سرکاری سوگ کا اعلان کرے گا اور اس کی آخری رسوم بھی پورے تزک و احتشام سے ادا کی جائیں گی۔ اس وقت ہمارے لیے کچھ کرنا ناممکن ہو گا، کیونکہ ایک طرف کارٹر ثابت کر چکا ہو گا کہ ڈان کارلس کی غلط پالیسی ملک کو نقصان پہنچا رہی تھی، تو دوسری طرف وہ ایک مقبول صدر کے غم میں عوام کی طرح شرکت کا ڈھونگ رچا کے عوام کی حمایت بھی حاصل کر چکا ہو گا۔ آخری رسومات کے دوران نہ تو پوسٹ مارٹم کا مطالبہ کر سکیں گے اور نہ لشکر کشی...... انتظار بے سود ہے۔"

"ہمارے پاس اس کے سوا کوئی صورت نہیں رافیل!" سفیر نے کہا۔ "ہم مجبور ہیں۔"

"اچھا۔" رافیل نے تصویریں سمیٹ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر میں مجبور نہیں ہوں...... میرے پاس ایک صورت اور بھی ہے۔"

☆☆☆

شام کا سورج ڈھلنے لگا تھا کہ مشتعل ہجوم نے ایوانِ صدر کو گھیر لیا۔ کارٹر نے آخری وقت میں جان بچانے کے لیے فرار ہونے کی کوشش کی مگر کچھ لوگوں نے اسے بدلے ہوئے بھیس میں بھی شناخت کر لیا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑے۔ کارٹر نے گلیوں سے گزر کر بندرگاہ تک پہنچنے کی راہ اختیار کی، مگر ہجوم اس کے پیچھے لپکا اور آہستہ آہستہ کارٹر کے لیے فرار کے تمام راستے بند ہونے لگے۔ وہ ساحل تک پہنچا ہی تھا کہ مشتعل ہجوم نے اسے آلیا۔ اگر اسے چند منٹ کی بھی مہلت مل جاتی تو وہ ساحل پر لنگرانداز تیز رفتار لانچ میں بیٹھ کر فرار ہو جاتا اور اس قاتل ہجوم کی دسترس سے دور چلا جاتا۔ مگر ڈان کارلس کے قتل کا کفارہ ادا کرنے کا وقت آچکا تھا۔

جب بالآخر ہجوم منتشر ہوا تو ساحل پر ایک مسخ شدہ لاش پڑی تھی جس کا حلیہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ اس کی شناخت ناممکن تھی۔ ہجوم نے جنرل کارٹر کی ہڈیوں کا سرمہ کر دیا تھا اور اس کی لاش کا قیمہ بنا دیا تھا۔ ہر شخص نے اس کارِثواب میں حصہ لیا تھا اور جو مرے کو مارنے کے قائل نہ تھے، وہ لاش پر تھوک کر چلے گئے تھے۔

بہت سے افراد بحری جہاز کے عرشے پر دوربین لگائے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں ایڈمرل ٹانسن اور سفیر کے علاوہ الیگزا بھی تھی اور رافیل بھی تھا، جو سارا دن غائب رہا تھا۔ تھکن سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"مبارک ہو سفیر محترم......" رافیل نے طنز سے کہا۔ "آپ کو اعلیٰ حکام سے اجازت نہیں لینا پڑی...... ڈان کارلس کے وفادار عوام نے خود قاتل سے انتقام لے لیا۔"

"لیکن، رافیل۔" الیگزا بولی۔ "یہ ہوا کیسے؟"

"یہاں کے لوگ اگر سیاسی ریشہ دوانیوں کو نہیں سمجھتے تو کیا ہوا۔" رافیل بولا۔ "تصویر کی زبان تو سمجھتے ہیں۔" اور تصویر دیکھنے کے بعد کسی تقریر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میں نے ان تصویروں کے پرنٹ بنوائے اور سارے شہر میں بانٹ دیے۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ ان کے اور پرنٹ بنا کے آگے پہنچا دیے جائیں۔ تم نے جنگل کی آگ پھیلنے کا محاورہ سنا ہے۔ یہ شہر کی آگ تھی جس نے شام تک پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انجام تمہارے سامنے ہے۔ بلکہ عوام تو تمہیں آئندہ صدر بھی منتخب کر چکے ہیں، نتیجہ بہت جلد سامنے آجائے گا۔"

الیگزا تشکر آمیز نگاہوں سے کمانڈر رافیل کو دیکھ رہی تھی اور اس کے خوب صورت چہرے پر حزن و ملال کے کئی رنگ بکھرے پڑے تھے۔

سفید لکیر

تنویر ریاض

جذبات و احساسات کسی کی میراث نہیں ہوتے... یہ کسی بھی وقت کہیں بھی اپنے دل کی راہ بدل سکتے ہیں... جب ان جذبات میں طغیانی آجائے تو انسان کا خود پر کوئی اختیار نہیں رہتا... وہ صاحبِ حیثیت تھا... دولت سے ہر شے کو خرید سکتا تھا... مگر بیوی اس کی دسترس سے باہر تھی...

دوہرے قتل کی سنگین واردات کا قضیہ......

مجرم ہونے کے باوجود وہ گرفتاری سے دور تھا......

چند روز قبل میں اپنے دفتر میں بیٹھا دو نارنجی مائل نیلے رنگ کے پرندوں کو دیکھ رہا تھا جو کھڑکی کے باہر چھجے پر بیٹھے آپس میں چہلیں کر رہے تھے۔ مجھے یہ نظارہ اتنا اچھا لگا کہ میں انہیں قریب سے دیکھنے کے لیے کھڑکی کے پاس چلا گیا لیکن وہ میری آہٹ کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ہی اڑ گئے۔ تبھی میری نظر ایک کار پر گئی جو نیچے سڑک پر آ کر رک گئی

تھی، وہ ایک کریم کلر کی رولس رائس تھی۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایسی قیمتی کار کا اس علاقے میں کیا کام ہوسکتا ہے۔ وہ میری پرانی گرے رنگ کی ڈی سوٹو کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس میں سے شوفر کی وردی میں ملبوس ایک طویل قامت شخص برآمد ہوا اور اس نے پیچھے کا دروازہ کھول دیا جس میں سے تقریباً اسی کے قد کے برابر ایک اور شخص باہر آیا۔ اس نے سلور کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

شوفر نے کار کا دروازہ بند کیا اور سوٹ والے کو لے کر میری عمارت کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اپنی میز پر آکر بیٹھ گیا۔ تبھی مجھے شیشے کے دروازے کے پیچھے دو سائے نظر آئے۔ دروازہ کھلا اور شوفر نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کی نظر مجھ پر گئی تو وہ ایک طرف ہو گیا اور اس نے اپنے ساتھ آنے والے شخص کو راستہ دے دیا۔ سلور کلر سوٹ والا اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

قریب آنے پر میں نے دیکھا کہ اس کا سوٹ قیمتی سلک کا تھا اور جوتے پالش سے چمک رہے تھے۔ وہ چھ فٹ دو انچ کا طویل قامت شخص تھا اور اس کے بال بھی میری طرح ڈارک براؤن تھے۔ البتہ ان کے درمیان ایک سفید لکیر نظر آرہی تھی۔ میری عمر اڑتیس سال تھی جبکہ وہ مجھ سے دس سال بڑا نظر آرہا تھا۔

شوفر نے پوچھا۔ ''تم سراغ رساں ہو؟''

میرے ہاں کہنے پر سوٹ والے نے اپنے کوٹ کے بٹن ڈھیلے کیے اور میرے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ شوفر اپنے مالک کے پیچھے ہی کھڑا رہا۔ سوٹ والے نے سنہری سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

''معاف کرنا، یہاں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں۔ میری مالکہ بہت ظالم ہے۔''

اب بھی اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں سبز، ناک پتلی اور گال پچکے ہوئے تھے۔ اس نے سگریٹ واپس کیس میں رکھا اور بولا۔

''میرا نام فرینکلن فورٹ ہے اور میں ایک تحقیقات کے سلسلے میں تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور شوفر نے ایک سفید لفافہ اسے تھما دیا۔ فرینکلن نے وہ لفافہ میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''میری بیوی کا چھ ماہ قبل آٹھ جنوری کو قتل ہو گیا تھا۔ شاید تم نے اس بارے میں اخبارات میں پڑھا ہو۔ وہ اپنے محبوب کے ساتھ قتل کر دی گئی۔ اخبارات نے اسے میگنولیا مرڈرز کا نام دیا تھا۔''

مجھے بات کو سمجھنے میں چند سیکنڈ لگے۔ ''ایک منٹ۔ تمہاری بیوی اپنے محبوب کے ساتھ قتل کر دی گئی۔ کیا پولیس نے تمہیں گرفتار نہیں کیا؟''

اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے گرفتار نہیں کیا گیا۔ یہ مقدمہ گرانڈ جیوری کے سامنے پیش ہوا۔ وہاں مجھ پر کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکا۔''

مجھے اخبارات میں شائع ہونے والی خبر یاد آگئی جس میں اس قتل کو ناجائز تعلق کا شاخسانہ قرار دیا گیا تھا۔

''میں نے یہ قتل نہیں کیا۔'' فورٹ نے کہا۔ ''اور میں چاہتا ہوں کہ تم قاتل کا پتا چلاؤ۔''

اس نے لفافے پر انگلی ماری اور اس کے شوفر نے لفافہ اٹھا کر مجھے پکڑا دیا۔ وہ لفافہ عمدہ کاغذ کا بنا ہوا تھا اور اس پر FFVII کے حروف ابھرے ہوئے تھے۔ اس کے اندر میں نے ایک بزنس کارڈ اور ایک ہزار ڈالر کا چیک دیکھا۔ بزنس کارڈ پر فرینکلن کا مکمل پتا اور فون نمبر درج تھا اور اس کے مطابق وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتا تھا۔

''تم کیا چیزیں امپورٹ اور ایکسپورٹ کرتے ہو؟''

میں نے محسوس کیا کہ اسے اس سوال کی توقع نہیں تھی لیکن اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر کیمرون ہم چینی، کاٹن، تمباکو اور لکڑی برآمد کرتے ہیں جبکہ ہماری درآمدات میں کافی، ٹیکسٹائل اور پھل شامل ہیں۔''

میں نے اپنا نوٹ پیڈ اور بال پوائنٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کیس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔''

''لاشیں آڈیوبون پارک میں دو میگنولیا درختوں کے درمیان ایک راہ گیر نے دیکھیں۔ دونوں کو دو دو گولیاں لگی تھیں جبکہ میری بیوی کی گردن پر ایک زخم بھی تھا۔''

اس نے اپنی گردن کی بائیں جانب اشارہ کیا اور لفافے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کارڈ پر میرا نمبر درج ہے۔ اگر کوئی پیش رفت ہو تو تم مجھے فون کر سکتے ہو۔''

جب وہ جانے لگے تو میں نے پوچھا۔ ''تم نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟''

وہ جاتے جاتے رک گیا اور مڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

''تمام بڑی سراغ رساں ایجنسیاں سینٹرل بزنس ڈسٹرکٹ میں ہیں۔ تمہارے دفتر کے بالکل قریب پھر مجھے ہی کیوں چنا؟''

اس نے ایک بار پھر اپنا کوٹ درست کیا اور بولا۔

"میں تمہارے متعلق اخبارات میں پڑھتا رہتا ہوں اور تمہارے کئی کارناموں سے واقف ہوں۔"

وہ جانے کے لیے واپس مڑا۔ "اس کیس کے بارے میں ضروری معلومات پولیس سے حاصل کرسکتے ہو۔"

یہ کہہ کر وہ دفتر سے باہر چلا گیا۔ اس نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ میں ضروری معلومات پولیس سے حاصل کر لوں۔ اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ پولیس پرائیویٹ سراغ رسانوں کو کبھی تمام معلومات فراہم نہیں کرتی۔ خاص طور پر جب کیس کی نوعیت اتنی سنگین ہو۔ یہ شخص مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میرے کئی لوگوں سے رابطے ہیں۔ میں نیواورلینز پولیس ڈپارٹمنٹ میں رہ چکا تھا اور کئی سراغ رساں میرے دوست تھے۔

میں سب سے پہلے پولیس ہیڈ کوارٹر گیا لیکن بدقسمتی سے میرا بہترین دوست وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے لیفٹیننٹ فرنچی کے لیے پیغام چھوڑا اور واپس اپنی کار کی طرف آیا۔ اس میں سے کاغذ کی تھیلی میں لپٹی ہوئی جانی واکر کی بوتل نکالی اور ایک چکر لگا کر عمارت کی دوسری جانب کورونر آفس میں چلا گیا۔

سراغ رساں ناتھن اسٹیک مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیلی پر نظر ڈالی اور بولا۔ "کیا چاہیے؟"

"میگنولیا مرڈر کے مقتولین کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو۔ مجھے ان کے نام بتاؤ؟"

"مسز فرینکلن فورٹ۔ اس کا قتل اس سال آٹھ جنوری کو ہوا۔ وہ ایک شخص کے ساتھ تھی۔ اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ تم نے میگنولیا مرڈرز کے بارے میں نہیں سنا؟"

"جنوری میں ہم لوگ یہاں نہیں تھے۔ میں نے بیوی کے ساتھ پہلے پندرہ دن کی ویسٹ میں گزارے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں بہت سی فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ چالیس منٹ بعد جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو میرے پاس مطلوبہ کاغذات کی نقول موجود تھیں۔ کورونر آفس سے نکلنے کے بعد میں نے ایک بار پھر ہیڈ کوارٹر میں جھانکا۔ فرنچی ابھی تک نہیں آیا تھا پھر میں کیمپ اسٹریٹ کی طرف چل دیا جہاں چار اخبارات کے دفاتر تھے۔ وہاں میری دو دوستوں سے ملاقات ہوئی لیکن میری پسندیدہ رپورٹر ایولین، کرانیکل کے دفتر میں موجود نہیں تھی۔

کھانے کے وقفے تک میں واپس دفتر آچکا تھا۔ میں نے ہلکا سا لنچ کیا اور اس دوران اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور مضامین سے نوٹس لیتا رہا۔ روایتی طور پر یہ خبریں کوئی مستند ذریعہ نہیں تھیں لیکن ان سے مجھے کام شروع کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔

ایگل کے پہلے صفحے پر شائع ہونے والی خبر میں لکھا تھا۔ "دو افراد کی لاشیں ملی ہیں جن میں ایک عورت اور ایک مرد ہے۔ عورت کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان جبکہ مرد کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہے۔ یہ دونوں لاشیں آڈیوبون پارک میں دو میگنولیا درختوں کے درمیان پڑی ہوئی تھیں جو چیسٹ نٹ اور وال نٹ اسٹریٹ کے چوراہے سے پچاس گز کے فاصلے پر ہے۔ لاشیں زیادہ پرانی نہیں ہیں اور نہ ہی اس قتل کا کوئی عینی شاہد ہے۔

اگلے دن کے اخبار اسٹیٹس، نے یہ سنسنی خیز سرخی لگائی۔ "لاشوں کی شناخت ہو گئی۔ دونوں ممتاز شخصیات ہیں۔ ایک کا تعلق مشہور سیاسی خاندان سے ہے اور دوسرا کلیسا کا رکن ہے۔ رپورٹر کے مطابق ان دونوں میں معاشقہ چل رہا تھا۔ یہ خبر ایک گھٹیا ناول کے مانند لگ رہی تھی جس میں محبت بھرے خطوط کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔

پولیس کو عورت کے شوہر پر شبہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ مجھے اس حوالے سے شائع ہونے والی خبریں یاد آگئیں۔ میں نے انہیں دوبارہ پڑھا تو مجھے ان دونوں پریمیوں پر افسوس ہوا۔ اخبارات فرینکلن فورٹ کے بارے میں احتیاط سے کام لے رہے تھے لیکن اس خبر میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے جس کا میں نے تصور نہیں کیا تھا۔

اس کیس کے بارے میں ایک چھوٹی سی خبر دو ماہ قبل سنڈے کرانیکل کے صفحہ دو پر شائع ہوئی۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے پولیس سے تمام معلومات اکٹھی کرنے کے بعد گرینڈ جیوری کے سامنے پیش کیں جو کسی کو بھی اس کیس میں موردِ الزام نہ ٹھہرا سکی۔

اس کے بعد میں نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ دیکھے۔ دونوں میں موت کی وجہ گولی سے لگنے والا زخم بتائی گئی تھی اور یہ واضح طور پر قتل تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی معمول کے مطابق تمام تفصیلات مہیا کی گئی تھیں۔ اس کے مطابق ایلس فورٹ کی عمر چھبیس برس، قد پانچ فٹ دو انچ، وزن ایک سو چالیس پونڈ، سنہرے بال اور اس کی آنکھ پر ایک نشان تھا۔ ایک گولی اس کے سینے پر لگی جس سے اس کی شہ رگ جدا ہو گئی۔ دوسری گولی اس کے بائیں گال سے ہوتی ہوئی گردن کے

پچھلے حصے میں گھس گئی۔

ریورنڈ ایڈمنڈ بسوان کی عمر اکیاون سال، قد پانچ فٹ سات انچ، وزن دو سو چالیس پونڈ اور سر پر گنج کے آثار تھے۔ اس کے سینے پر دو گولیاں لگیں۔ ان میں سے ایک اس کے دل کے بائیں خانہ جبکہ دوسری دائیں پھیپھڑے میں گھس گئی۔ دونوں نے قتل سے کچھ دیر پہلے بھنا ہوا گوشت اور انڈے کھائے تھے۔ اعشاریہ اڑتیس کے چار خول ملے جو پولیس کو دے دیے گئے۔ اس کے علاوہ کوئی زخم نہیں تھا جبکہ فورٹ نے گلے کے زخم کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے اس تضاد کو نوٹ کرلیا۔

میں ایک بار پھر فرنچی سے ملنے گیا۔ مجھے یوں لگا کہ اس کے دفتر میں آگ لگ گئی ہے۔ میں نے دونوں بازو ہلا کر دھوئیں کے پار دیکھا۔ وہ اپنی میز پر پاؤں اوپر اٹھائے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا چاہتے ہولڑ کے؟''

''ایک بار پھر تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پندرہ منٹ بعد عدالت پہنچنا ہے۔''

میں نے اپنی آواز نیچی کرلی کیونکہ وہاں دوسرے سراغ رساں بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ''میں میگنولیا مرڈرز کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہوں۔ تمہارے پاس جو بھی معلومات ہیں، مجھے ان کی ضرورت ہے۔''

فرنچی عام طور پر کبھی غصہ نہیں کرتا لیکن اس وقت اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے سگریٹ زمین پر پھینک کر بجھا دیا اور بولا۔ ''میرے ساتھ چلو۔''

اس نے میز پر سے ایک فائل اٹھائی اور دفتر سے باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ''تم جانتے ہو کہ ہم نے قاتل پکڑ لیا تھا لیکن ڈسٹرکٹ اٹارنی نے اسے جانے دیا۔''

''وہ میرا انٹوکل ہے۔''

وہ چلتے چلتے رک گیا اور مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں کوئی عجیب الخلقت مخلوق ہوں۔ ''اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس کا پیٹ پھاڑ دیتا۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اگر تمہیں اتنا ہی یقین ہے کہ وہ قتل اس نے کیے تھے تو میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ اس پر کیوں پریشان ہو۔ تم ہمیشہ یہی کہتے ہو کہ میں ایک سراغ رساں نہیں صرف پرائیویٹ جاسوس ہوں۔''

اس نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا اور غراتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

میں رات کو کھانے کے بعد موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ فرنچی سیڑھیوں کے پاس کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے بغل میں ایک فائل دبا رکھی تھی۔ اندر آنے کے بعد اس نے کچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کھانے کے لیے کچھ ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے فائل کافی کی میز پر رکھی اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے فریج میں سے کھانا نکال کر اس کے سامنے رکھا تو وہ فائل پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

''ہمارے پاس جو کچھ تھا، میں نے ان سب کی کاپیاں نکلوا لی ہیں تاکہ کوئی اہم چیز نہ رہ جائے۔ اس نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس ہو تو یہ سوچ لینا کہ میں نے اس کیس پر کام نہیں کیا تھا۔''

☆☆☆

''میں نے اب تک جتنے پولیس والے دیکھے ہیں، تم ان میں سب سے زیادہ خوش شکل ہو۔'' للی جیفرسن نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی جو مقتول پادری کے پڑوس میں تھا۔

''پرائیویٹ سراغ رساں کو خوش شکل ہونا چاہیے۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے تم سے باتیں کرنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اپنے پڑوسی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ کسی پادری کے برابر میں خاموشی سے رہنا پڑتا ہے۔ ہم اونچی آواز میں موسیقی نہیں سن سکتے اور نہ ہی گھر پر پارٹیاں کرسکتے ہیں۔ مجھے واقعی یہ معلوم نہیں کہ اس کا کسی سے ناجائز تعلق تھا۔'' پھر وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

''کیا تم شادی شدہ ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں میڈم۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''اب میں چلوں گا۔''

میں واپس اپنی کار کی طرف آیا جو وال نٹ اور پٹ اسٹریٹ کے کونے پر کھڑی ہوئی تھی۔ مقتول پادری اور اس کی محبوبہ کے گھروں کے درمیان دو بلاک سے بھی کم کا فاصلہ تھا جبکہ یہ جگہ پادری کے چرچ سے چھ بلاک دور تھی۔

سراغ رساں ٹیڈ تھیوڈورو نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ کسی نے کچھ نہیں دیکھا اور نہ ہی ان دونوں کے میل جول کے بارے میں کوئی اندازہ تھا۔ کبھی کسی نے انہیں اکٹھا نہیں

دیکھا۔ میں نے ایک طویل جمائی لی اور جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

پارک میں پانچ میگنولیا درخت ایک قطار میں کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے والی گھاس حال ہی میں کاٹی گئی تھی۔ درختوں کے تنوں کے گرد گرے ہوئے پتوں کا قالین بچھا ہوا تھا۔ گیلی جگہ ہونے کے باوجود وہاں کسی کے قدموں کے نشان نہیں تھے۔ پولیس رپورٹ کے مطابق لاشیں دوسرے اور تیسرے درخت کے درمیان پائی گئی تھیں۔ پولیس کی لی گئی تصویروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں لاشیں برابر پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں نے پورے کپڑے اور اوورکوٹ پہن رکھے تھے۔ یہ جگہ فورٹ مینشن سے تین بلاک کے فاصلے پر تھی۔

میں پیدل چلتا ہوا ایک قریبی پے فون پر پہنچا جو میگزین کارنر پر واقع ایک گروسری اسٹور کے باہر نصب تھا۔ ابتدائی پولیس رپورٹ میں لکھا ہوا تھا کہ پولیس کو موصول ہونے والی گمنام کال کسی عورت نے صبح چھ بج کر بتیس منٹ پر کی تھی۔ ایک بھاری بھرکم شخص سفید ایپرن پہنے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے فریزر سے ایک جوس کا پیکٹ نکالا اور اسے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بولا۔

”کیا پولیس نے تم سے جنوری میں ہونے والے قتل کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی؟“

”ہاں مگر تم کون ہو؟“

میں نے اپنا کارڈ کاؤنٹر پر رکھا اور پوچھا۔ ”کیا تم اس روز صبح کام پر آئے تھے؟“

”میں روزانہ ہی آتا ہوں۔“

اس شخص کے منہ سے کچھ اگلوانا آسان نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ کسی نے اس سے قتل کے بارے میں بات نہیں کی البتہ اسے اخبار سے معلوم ہوا تھا۔ میں نے اس سے مستقل گاہکوں کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

”میں اپنے گاہکوں کے بارے میں بات نہیں کرتا۔“

”کوئی ایسا شخص جو یہاں چکر لگاتا رہتا ہو؟“

”ہم نے بلیک لیڈی کے علاوہ کسی آوارہ گرد یا سیلانی شخص کو یہاں نہیں دیکھا۔“

”بلیک لیڈی کون ہے؟“

”وہی جس نے پولیس کو فون کیا تھا۔“

”تم یہ بات کیسے جانتے ہو؟“

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”میں نے بھی سنا تھا۔“

بلیک لیڈی کے بارے میں مزید معلوم کرنا انتہائی مشکل ثابت ہوا۔ بس اتنا بتا سکا کہ وہ ایک سفید فام عورت تھی جو ہمیشہ سیاہ لباس پہنتی اور چڑیا گھر کے عقب میں بنے ہوئے چھوٹے مکانوں میں سے ایک میں رہتی تھی۔

میگزین اسٹریٹ سے دریا کی طرف جانے والی چھوٹی سڑک پر لکڑی کے تین مکان تھے لیکن کسی پر بھی پتا درج نہیں تھا۔ ایک پر تازہ تازہ زرد رنگ ہوا تھا جبکہ دوسرے کا نیلا اور تیسرے کا رنگ سبز تھا۔ سبز رنگ کے مکان کے باہر آٹھ نو سال کی ایک بچی اپنے ہاتھوں میں بلی کا بچہ لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بلیک لیڈی کہاں رہتی ہے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی پرچھائیاں دیکھیں تو سوچا کہ وہ ڈر کے مارے بھاگ جائے گی مگر وہ کھڑی رہی۔

”تمہاری بلی کا نام کیا ہے؟“

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ہار...... ہارڈ ہیڈ۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”اولیو۔“

میں نے آگے بڑھ کر اس کی بلی کے سر پر تھپکی دی اور اس سے ایک بار پھر بلیک لیڈی کا پتا پوچھا۔

اس نے نیلے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ ہمیشہ پارک جاتی ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور نیلے مکان کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے ایک تیز زنانہ آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”میں ایک سراغ رساں ہوں۔“

وہ اسکرین ڈور پر آکر رک گئی اور بولی۔ ”پولیس؟“

”میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔“

”کیا چاہتے ہو؟“

”میں اس عورت سے بات کرنا چاہتا ہوں جس نے گزشتہ جنوری میں پولیس کو دو افراد کے قتل کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ کچھ یاد آیا؟“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے ہی پولیس کو فون کیا تھا؟“

اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا اور میں اس کے پیچھے چلتا ہوا ایک چھوٹے ہال میں پہنچا جس کا ایک دروازہ کچن میں کھلتا تھا۔ اس نے مجھے کچن ٹیبل پر بٹھایا اور کافی بنانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

''ایلویرا ہیرس۔''

میں نے اپنی نوٹ بک اور پین نکالتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے وہ لاشیں کب دیکھیں، تم اتنی صبح پارک میں کیوں گئی تھیں؟''

اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا پاس ایک میٹل ڈیٹکٹر ہے۔ اس کے ذریعے میں وہ سکے تلاش کرتی ہوں جو پارک میں چہل قدمی کے دوران لوگوں کی جیبوں یا پرس سے گر پڑتے ہیں۔ بعض اوقات مجھے ایک دو یا تین ڈالر کی چینج بھی مل جاتی ہے۔''

''تم ہمیشہ اتنی صبح ہی جاتی ہو۔ پولیس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت چھ بج کر تیس منٹ ہوئے تھے۔''

''بکریوں کو چارا دینے کے بعد میں نکل جاتی ہوں۔ بعض اوقات ان میں سے ایک میرے ہمراہ ہوتی ہے۔ اس روز میں نے سیلی کو ساتھ لیا۔ ابھی ہم نے چلنا شروع کیا ہی تھا کہ اس کی نظر لاشوں پر گئی۔ وہ بھاگتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کافی پریشان ہے۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے اردگرد کسی اور شخص کو تو نہیں دیکھا یا گولی چلنے کی آواز تو نہیں سنی؟''

اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں سے بکری کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

''تمہیں جو سکے ملتے ہیں، ان سے گزارہ ہو جاتا ہے؟''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ مجھے سوشل سیکیورٹی بھی ملتی ہے۔''

''تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟''

''ہاں، میں اور میری بکریاں۔''

''یہ گھر تمہارا ہے؟''

''ہاں، میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ یہیں گزارا ہے۔ مسٹر ہیرس کا انتقال دس سال پہلے ہو چکا ہے۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے پہلے بھی مقتول جوڑے کو پارک میں چہل قدمی کرتے دیکھا تو اس کا کہنا تھا کہ وہ اکثر وہاں کئی جوڑوں کو دیکھتی ہے لیکن اس نے کبھی مقتولین کو غور سے نہیں دیکھا۔

''میں ان لاشوں کے قریب نہیں گئی تھی۔ خون دیکھتے ہی میں سیلی کو لے کر وہاں سے چلی آئی۔''

میں نے کافی اور معلومات فراہم کرنے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اپنی جیب سے کچھ سکے نکالے اور انہیں میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''انہیں آج کی آمدنی میں شامل کر لو۔''

دفتر واپس آ کر ایک بار پھر پولیس فائل پر نظر ڈالی اور گیارہ محبت بھرے خطوط پڑھے۔ کسی پر بھی تاریخ درج نہیں تھی۔ ان میں سے ایک خط کا متن کچھ یوں تھا۔

''ڈارلنگ! میں تم سے اتنی زیادہ محبت کرتا ہوں کہ کسی اور بات پر دھیان دینا مشکل ہے یہاں تک کہ اپنے فرائض بھی پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ میری راتیں تمہارے تصور میں گزرتی ہیں۔ میں تمہیں بہت یاد کرتا ہوں۔ تمہارے بغیر رات گزارنا مشکل ہے۔ تمہارا ڈوڈ۔''

محبوبہ نے جواب میں لکھا۔ ''جب ہم جدا ہوتے ہیں تب بھی ہماری محبت موجود رہتی ہے۔ میں تمہارے بغیر نامکمل ہوں اور تم سے ملنے کے لیے بے تاب رہتی ہوں۔ تمہاری بوبو۔''

یہ خطوط ان کی شدید محبت کا آئینہ دار تھے۔ ان میں عبارت آرائی نہیں بلکہ بے ساختہ جذبات کا اظہار تھا۔ انہیں دوبارہ پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ انہیں کسی نوعمر جوڑے نے تحریر کیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہونے کے لیے بے چین تھے اور موت نے انہیں یکجا کر دیا۔

فرنچی میری کچن ٹیبل پر بیٹھا ہوا سینڈوچ کے مزے لے رہا تھا جو میں اس کے لیے میڈیسن اسٹریٹ پر واقع ایک کیفے سے لے کر آیا تھا۔

''کیا اس کیس میں کوئی پیش رفت ہوئی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ مچھلی جال میں کیوں نہیں پھنس رہی۔''

''کیا؟''

''جب مشتبہ شخص نے جرم نہ کیا ہو تو سراغ رساں دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں جب تک کہ انہیں اصل قاتل کا پتا نہ چل جائے۔ کم از کم کتابوں اور فلموں میں یہی دکھایا جاتا ہے۔''

''تم بہت زیادہ پڑھتے ہو۔'' فرنچی نے کہا۔ ''واضح طور پر مشتبہ شخص اس عورت کا شوہر ہے کیونکہ اسی نے یہ قتل کیے ہیں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ ہم کوئی اہم بات نظرانداز کر رہے ہیں جس کا پولیس رپورٹ میں ذکر نہیں ہے لیکن مجھے تھیوڈور وسے تعاون کی امید نہیں۔''

فرنچی نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں تھیوڈور وسے بات کرے گا۔

''یہ ایک پیچیدہ کیس ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں سمجھ

سکتا ہوں کہ مقتولہ کا کوئی رشتے دار یا دوست نہیں ہے۔''
''میں دیکھوں گا کہ اگر تھیوڈورو نے اپنے نوٹس سنبھال کر رکھے ہوں۔''
اگلے روز بارش کی وجہ سے میں باہر نہ نکل سکا۔ لہٰذا میں نے ایک بار پھر کیس سے متعلق کاغذات دیکھنا شروع کر دیے اور سوچنے لگا کہ پولیس نے کس طرح ڈسٹرکٹ اٹارنی کو کیس پیش کیا۔ فرینکلن فورٹ کے پاس قتل کا محرک اور موقع موجود تھا۔ اس نے اعشاریہ اڑتیس کا ریوالور رکھا ہوا تھا۔ بیوی کے قتل پر اس کا سرد رویہ بھی اس کے مشکوک ہونے کی غمازی کر رہا تھا اس نے بیوی کی لاش بھی نہیں دیکھی۔ جب پولیس ہفتہ کے روز بیوی کے قتل کی اطلاع دینے اس کے گھر گئی تو وہ موجود نہیں تھا اور دفتر جا چکا تھا۔
میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دوبارہ پڑھی۔ اس میں اس کٹ کا ذکر نہیں تھا جس کے بارے میں اس کے شوہر نے بتایا اور جسے میں نے اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا تھا۔ میں ایک بار پھر کورونر آفس گیا۔ ناتھن اسٹیک نے بتایا کہ پیتھالوجسٹ اپنے کمرے میں موجود ہے۔ وہ مجھے ایک عقبی کمرے میں لے گیا جہاں ایک کھچڑی بالوں والا شخص رم کا چشمہ لگائے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ ناتھن نے میرا تعارف کروایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔
''میں مصروف ہوں۔'' ڈاکٹر زینگر نے کہا۔
''میں میگنولیا مرڈرز کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''شاید تمہیں وہ مرد اور عورت یاد نہ ہوں۔''
''بالکل یاد ہیں۔ بے شک کام زیادہ ہے لیکن میری یادداشت بہت اچھی ہے۔''
''بہت خوب۔'' میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف ایک منٹ لوں گا۔''
زینگر نے مجھے دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔
''میں نے اسے پوسٹ مارٹم رپورٹ کی نقل دکھاتے ہوئے کہا۔ ''مقتولہ کے شوہر کا کہنا ہے کہ تم نے اپنی رپورٹ میں ایک زخم کا ذکر نہیں کیا۔''
''ناممکن۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میں نے کاغذات اسے پکڑا دیے۔ اس نے انہیں پڑھنے کے بعد واپس میز پر رکھ دیا۔
''شوہر کا دعویٰ ہے کہ اس کی گردن پر کٹنے کا زخم تھا۔''
''میں اس طرح کی غلطیاں نہیں کرتا۔''

میں جانے کے لیے کھڑا ہو گیا لیکن آدھے راستے میں رک کر بولا۔ ''یہ جان کر اچھا لگا، مجھے بھی کسی بات پر اتنا یقین نہیں ہوا۔''
''بیٹھ جاؤ۔''
وہ کھڑا ہو کر ایک فائل کیبنٹ کی طرف بڑھا۔ اس میں سے ایک ریکارڈنگ ٹیپ نکالا پھر اپنی میز کے پیچھے رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر میں لگا دیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ٹیپ میں کیا کہا جا رہا ہے کیونکہ وہ جرمن زبان میں تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، وہ ریکارڈنگ ساڑھے دس بجے شروع ہوئی اور سوا گیارہ پر ختم ہوئی۔ اس نے ٹیپ کو دوبارہ اور سہ بارہ چلایا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
''یہ کام کی زیادتی کا نتیجہ ہے۔'' وہ ٹیپ کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں پوسٹ مارٹم کے دوران اپنے نوٹس ریکارڈ کرتا رہتا ہوں۔''
میں اس طریقے کا عینی شاید تھا۔ پیتھالوجسٹ میز کے عین اوپر چھت سے لٹکے ہوئے ایک مائیکروفون میں بولتے رہتے ہیں۔ اس نے دوبارہ اپنا سر ہلایا۔
''مقتولہ کی گردن پر ایک تین انچ لمبا کٹ تھا۔'' اس نے اپنی گردن کی بائیں جانب انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ فائنل رپورٹ لکھتے وقت اسے کیسے نظرانداز کر گیا حالانکہ رپورٹ لکھتے وقت میں ٹیپ سنتا رہتا ہوں۔''
میں کہنا چاہ رہا تھا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک سے غلطی ہو سکتی ہے لیکن اس نے جس انداز سے مجھے دیکھا۔ اس سے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ میں نے میز پر سے رپورٹ اٹھائی۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور ناتھن کے پاس چلا آیا۔
''کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان لاشوں کو کہاں جلایا گیا تھا؟''
''شہر میں ایسی دو ہی جگہیں ہیں۔'' اس نے مجھے ان کے نام بتا دیے۔
جب میں دفتر میں پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ یہ فرینچی تھا۔ اس نے بتایا کہ تھیوڈورو مجھ سے بات نہیں کرے گا۔ وہ ڈسٹرکٹ اٹارنی سے اتنا ناراض تھا کہ اس نے اپنے سارے نوٹس جلا دیے تھے۔
نیو اورلینز میں مون سون کا موسم چل رہا تھا۔ میں اپنے لیونگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھا بالکونی سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کچن کی میز پر پولیس رپورٹ، ڈیتھ سرٹیفکیٹ، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ،

محبت بھرے خطوط اور میرے نوٹس رکھے ہوئے تھے اور میں جانتا تھا کہ انہی میں سے کسی ایک میں میرے سوال کا جواب موجود ہے اور یہ بات مجھے ابھی معلوم ہوئی تھی۔ گھر آنے کے بعد میرے ذہن میں دو اہم سوال گردش کر رہے تھے۔ میں جی لیڈ کریمٹوریم (شمشان گھاٹ) گیا تھا جہاں معلوم ہوا کہ کسی نے بھی مقتولہ کی لاش کے بارے میں کوئی بات نوٹ نہیں کی۔ تدفین کرنے والے شخص کو اس کی گردن پر کوئی نشان نظر نہیں آیا۔

''ہم لاش کو تیار نہیں کرتے۔ یہ ہمیں کورونر آفس سے تھیلوں میں ملتی ہیں۔ ہم صرف اس پر لگے ہوئے ٹیگ کا موازنہ کاغذات سے کرتے ہیں پھر اسے ایک تابوت میں رکھ کر جلا دیتے ہیں اور اس کی راکھ گھر والوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔''

پہلا سوال یہ تھا کہ فرینکلن فورٹ کو مقتولہ کی گردن کے زخم کے بارے میں کیسے معلوم ہوا جبکہ اس نے لاش نہیں دیکھی۔ پوسٹ مارٹم اور پولیس رپورٹ میں بھی اس کا ذکر نہیں تھا۔ تدفین کرنے والے کو بھی گردن کا زخم یاد نہیں آیا۔ اور پیتھالوجسٹ اسے لکھنا بھول گیا تھا۔

دوسرا سوال میرے ذہن میں صبح آیا۔ اولیو نے کہا تھا کہ وہ پارک میں جاتی ہے، اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ کیا وہ ہمیشہ اس بوڑھی عورت کا پیچھا کرتی تھی اور کیا وقوعہ کے روز بھی وہ اس کے پیچھے گئی تھی۔

میں نے اولیو کو اپنے مکان کے باہر بلی کے بچے کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سرخ غبارہ تھا جس میں دھاگا باندھ کر وہ بلی کے بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہاری ماں اندر ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی پھر پیچھے ہٹ کر اولیو کو اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ جب اس کی ماں باہر آئے تو وہ یہ کارڈ اسے دے دے۔

''ہیلو، میرا نام لیوس کیمرون ہے۔'' میں نے اولیو کی ماں سے کہا۔ اولیو نے اسے میرا کارڈ دے دیا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ اولیو میری مدد کر سکتی ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو۔ میں اس سے چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''کس بارے میں؟''

''بعض اوقات بچے ہم سے زیادہ دیکھ لیتے ہیں۔''

اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور بولی۔ ''کیا تم ان لاشوں سے متعلق کچھ پوچھنا چاہتے ہو جو پارک سے ملی تھیں؟''

''ہاں میڈم۔''

''میں نے اپنے شوہر سے کہا تھا کہ پولیس کو معلوم ہو سکتا ہے۔ اولیو نے کچھ دیکھا تھا۔ اسے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ میرے شوہر نے کہا کہ پولیس والے اتنے ہوشیار نہیں ہوتے۔''

''میں پولیس والا نہیں ہوں۔''

وہ عورت اولیو کے برابر میں بیٹھ گئی اور بولی۔ ''میں چاہتی تھی کہ اولیو اس عورت کے پیچھے پارک میں نہ جائے لیکن وہ ہفتے کا دن تھا۔ اولیو علی الصباح اٹھ کر اس کے پیچھے چل دی اور روتی ہوئی واپس آئی۔ وہ نہیں جانتی کہ اس نے وہاں کیا دیکھا اور اسے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں کہ اس نے وہاں کیا دیکھا۔''

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''صرف ایک سوال۔''

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا اس نے وہاں کسی اور کو بھی دیکھا تھا؟''

وہ دونوں میری طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ ''اس بوڑھی عورت کے علاوہ کسی اور کو پارک میں دیکھا تھا؟''

میں نے دائیں جانب مڑ کر دیکھا۔ ایلویرا ہیرس ہماری طرف آرہی تھی۔

''ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور میں نے بچی کو وہاں سے ہٹا دیا۔'' ایلویرا نے سر ہلاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''تم نے وہاں اور کس کو دیکھا؟''

''ہم نے ایک آدمی کو دیکھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر اپنا ہیٹ اٹھایا اور میگنولیا کے درختوں سے دور چلا گیا۔'' ایلویرا نے آگے بڑھ کر اولیو کا ہاتھ تھام لیا۔

''ہم فاصلے پر ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے اور اس نے بھی ہمیں نہیں دیکھا۔ وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ سیلی اس جگہ گئی جہاں وہ کھڑا ہوا تھا اور دوڑتی ہوئی واپس آگئی۔''

''کیا تم نے دیکھا کہ وہ شخص کس طرف گیا تھا؟''

''وال نٹ اسٹریٹ کی طرف۔''

''کیا تمہیں اس آدمی کے بارے میں کوئی بات یاد ہے؟''

''اس کے بالوں کے درمیان ایک سفید لکیر تھی۔''

☆☆☆

میں فرینکلن فورٹ سے ملنے اس کے دفتر پہنچا تو اس نے مجھے فوراً ہی اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''کیا تمہیں کوئی کامیابی ہوئی؟''

''میں جانتا ہوں کہ تمہاری بیوی کو کس نے قتل کیا ہے۔''

وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''تم جانتے ہو؟''

''ہاں، لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ تم نے میری خدمات کیوں حاصل کیں؟''

اس نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھ لیے اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ میں نے اپنی گردن کے بائیں جانب انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یاد کرو تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری بیوی کی گردن پر کٹ کا نشان تھا۔''

وہ محض مجھے دیکھتا رہا۔ ''تم واحد شخص ہو جو یہ بات جانتے ہو۔ پولیس رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ شمشان والوں نے لاش کا معائنہ نہیں کیا اور تمہارے دندان ساز نے بھی لاش نہیں دیکھی۔ یہاں تک کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی اس زخم کا ذکر نہیں۔ کیونکہ پیتھالوجسٹ اسے لکھنا بھول گیا تھا پھر تمہیں اس زخم کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''تمہاری یہ کوشش پولیس کی تحقیقات کی طرح کمزور ہے۔''

''ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ تم اپنے آپ کو پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ کسی نے تمہیں جائے وقوعہ پر دیکھ لیا تھا۔''

اس کے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولا۔ ''تم میرے ساتھ فریب کر رہے ہو تاکہ مزید رقم اینٹھ سکو۔'' اس نے فون اٹھا کر کہا۔ ''مجھے اپنے وکیلوں سے بات کرنا ہوگی۔'' اس نے جو نام لیے وہ شہر کے چوٹی کے وکیل تھے۔

''مسٹر ہل نے مجھے تمہاری خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ میری پوزیشن صاف ہو جائے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''یہ بہت ضروری ہے کیونکہ مجھے گورنر کا الیکشن لڑنا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم شہر کے بہترین پرائیویٹ سراغ رساں ہو اور تمہارے پولیس میں بھی تعلقات ہیں۔ تم اس کیس کو غیر حل شدہ قرار دے کر ختم کرا دو گے۔''

''لیکن میں اسے حل کر چکا ہوں۔''

''کتنی رقم چاہیے؟''

میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم جو دے چکے ہو وہی کافی ہے۔''

''ٹھیک ہے جو جی چاہے کرو۔ تم اس بارے میں پولیس کو بتا سکتے ہو۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی اس پر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ وہ میری انتخابی مہم میں کام کر رہا ہے۔''

میں نے جاتے جاتے مڑ کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''جس کسی نے بھی تمہیں جائے وقوعہ پر دیکھا اس کی نظر تمہارے بالوں کے درمیان سفید لکیر پر گئی۔ یاد کرو۔ تمہارا ہیٹ زمین پر گر گیا تھا اور تم اسے اٹھانے کے لیے جھکے تھے۔ تبھی یہ سفید لکیر اسے نظر آئی۔''

ہم چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں جانے کے لیے مڑا لیکن دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے آواز دی۔ ''تم یہ بات میرے وکیلوں کو بتا دو۔ اس کے بعد میں تم پر ہتکِ عزت کا دعویٰ کر دوں گا۔ پھر تم بھی پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر کام نہیں کر سکو گے۔''

دفتر واپس آکر میں نے فرنچی کو فون کیا۔ ''تم تھیوڈورو کو بتا سکتے ہو کہ وہ صحیح تھا۔ فورٹ نے ہی اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔'' پھر میں نے اسے گردن کے زخم اور عینی شاہدوں کے بارے میں بتایا۔

''اسی لیے میں تمہیں یاد دلاتا رہتا ہوں کہ تم حقیقی سراغ رساں نہیں ہو۔ تم کسی شخص کو محض اس لیے مجرم نہیں ٹھہرا سکتے کہ اس کے بالوں میں سفید لکیر ہے۔ تمہارے گواہوں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ کسی نے اسے شناخت نہیں کیا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کرے گا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میں تمہارا غم بانٹنے شام کو آؤں گا۔''

دس بجے کے قریب وہ کھا پی کر رخصت ہوا تو میں آرام کرسی پر دراز ہو کر سوچنے لگا۔ ''کیا میں کسی کو فون کروں؟ کیا میں ہتکِ عزت کا خطرہ مول لے لوں۔''

میں نے فون اٹھایا اور کچھ ہچکچاتے ہوئے اپنی پسندیدہ رپورٹر کا نمبر ملایا۔

''ایولین۔ میں کیمرون بول رہا ہوں۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر ہے۔''

''اتنی رات گئے تم نے اسی لیے فون کیا ہے؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں کیونکہ یہ بہت اچھی اسٹوری ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ ایولین کے لیے اتنا ہی اشارہ کافی ہے۔ وہ پاتال سے بھی حقائق ڈھونڈ سکتی تھی۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب مجھے گمنامی میں جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا لیکن جانتا تھا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس سے پہلے فرینکلن اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔

آوارہ گرد

قسط 43

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سنی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو در حقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو در حقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، در حقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوتلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوتلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسمِ نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوتلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوتلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوتلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ”انڈیمان“ پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا

ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کوٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچادیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گیمبلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلا منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھادھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سوتنگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سوتنگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کران کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوتلسی کے ہیڈکوارٹر پہنچادیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے۔ داور کو قابو کرکے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹربوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرادیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچالانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسم نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانا ہوتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بھونچال طیارے میں نہیں بلکہ میرے وجود میں آیا تھا۔

آواز کی شناسائی پر غور کرنے سے پہلے ہی میری اس پر قریب...... بہت قریب سے نظر پڑ گئی تھی اور پھر جیسے میرے پورے وجود کو ایک زبردست جھٹکا لگا تھا۔

چند ثانیے کے لیے تو مجھے اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا کہ اتنے قریب سے میں جس ملعون شخص کا مکروہ چہرہ دیکھ رہا ہوں، وہ وہی تھا یا مجھے گمان گزرا تھا مگر

گمان بھی کیوں کر گزرتا؟ جبکہ وہ مجھے پہچان گیا تھا اور بڑی طنزیہ کاٹ کے ساتھ مجھے میرے پورے نام کے ساتھ شاید اسی لیے مخاطب کیا تھا کہ میں بھی اسے پہچاننے میں کسی مغالطے میں نہ رہوں۔

پل کے پل میرے جسم کے اندر پھیلی ہوئی اَن گنت شریانوں کے جال کا سارا خون جیسے میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ اُبلتا اُچھلتا لہو کھوپڑی کی دیواروں کو ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ چیخنے کے قریب ہوگئی۔ میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت حلق پھاڑ کے چیخ پڑوں......

''روکو...... روکو طیارہ...... میرے ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والا اور میری پوری زندگی کو ایک دھوکا بنا کے رکھ دینے والا یہ منحوس وملعون آدمی ایک خطرناک مجرم ہے۔ یہ فرار ہو رہا ہے۔''

''کوئی فائدہ نہیں......'' اس منحوس نے تپا دینے والی مسکراہٹ سے دھیمی آواز میں کہا۔ جیسے وہ میرے اندر کی شورش سے واقف ہوگیا ہو۔

''تم......'' بڑے ضبط اور کھولتے ہوئے لاوے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے میں اس خبیث سے بس یہی کہہ پایا تھا کہ وہ پھر اسی لہجے اور زہریلی مسکراہٹ سے دوبارہ بولا۔

''آں...... ہاں! کہا نا...... کوئی فائدہ نہیں غصے میں آنے کا۔ تمہارا اپنا ہی نقصان ہوگا۔''

''مم...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' بپھرے ہوئے لہجے میں یہ کہتے ہوئے میں اپنی سیٹ سے اُٹھنے ہی لگا تھا کہ اس نے میرا بازو دبوچ کے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

''غصہ دکھاؤ گے تو...... یہ لوگ تمہیں فسادی پاگل سمجھ کے الگ سیٹ پر رسیوں سے باندھ کے بٹھا دیں گے۔'' اس نے مابعد اثرات کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور...... کوئی بعید نہیں کہ بینکاک کے ائرپورٹ سے ہی تمہیں ڈی پورٹ کر دیا جائے۔''

اس کمینے اور خبیث شخص نے میری کمزور رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''تم میرے وطن کے دشمن ہو اور مت بھولو وزیر جان......! کہ طیارہ ابھی پاکستان کی فضاؤں میں ہی ہے۔......'' میں نے اپنے متزلزل لہجے میں روانی لانے کی پوری کوشش کی۔ ہاں......! وہ ملعون ابن مطعون شخص وزیر جان ہی تھا۔ ایک دھوکا، ایک سراب...... چلتا پھرتا ایٹم بم اور اسپیکٹرم کا مقامی سربراہ، وہ ٹینٹیکل...... جسے میں نے کاٹ تو ڈالا تھا مگر اس کا کٹا ہوا حصہ ابھی تک متحرک تھا۔

ہماری آوازیں دبی دبی اور ہلکے شور میں گھل مل گئی تھیں۔ ہماری باڈی لینگویج پر کوئی غور کرتا تو اور بات تھی۔ تاہم گفتگو اردو میں ہی ہو رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب سیٹھ نوید پر میں نے ہاتھ ڈالا تھا اور اسے بے بس کرنے کے بعد اس نے یہی حقیقت میرے سامنے اُگلی تھی کہ لولووش کچھ دنوں پہلے نیویارک میں تھا، اب وہ برمودا کے ایک جزیرے ''نگی تا'' میں اپنے محل میں رہتا ہے جبکہ وزیر جان کو اس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ اب پاکستان میں ہی کہیں موجود ہے، اور وہ خبیث واقعی پاکستان میں ہی کہیں میری گھات میں چھپا بیٹھا تھا، اب میرے سامنے کسی عفریت کی طرح اچانک نمودار ہوگیا تھا۔

''مگر...... یہ طیارہ پاکستانی نہیں ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''اور ہاں...... پھر بھی میں تمہیں اس فضول کی زحمت سے بچانے کے لیے اطلاعاً عرض کر دوں کہ تمہارے لگیج میں رکھے ہلکے سبز رنگ کے کیری میں دو عدد سفید پاوڈر کی تھیلیاں، جو کم از کم ٹیلکم یا پرفیوم پاوڈر تو ہرگز نہیں ہے، رکھ دی گئی ہیں۔ نہیں یقین آتا تو اپنا لگیج ٹیگ نمبر ملالو......'' یہ کہتے ہوئے اس نے نمبر پڑھا۔

میرا ٹیگ نمبر یہی تھا۔ میں سنسنا کر رہ گیا۔ نمبر بتا دینے سے ظاہر کرتا تھا کہ وہ ایسی کوئی ''کارروائی'' پہلے ہی نمٹا چکا ہے۔ نیز پاوڈر کی تھیلیوں سے مراد اس کی کیا ہو سکتی تھی۔

''ہیروئن کی اتنی سی مقدار بھی تمہیں نہ صرف تھائی لینڈ بلکہ تمہارے اپنے ہی ملک کی جیل میں تاعمر سڑنے کے لیے چھوڑ سکتی ہے۔''

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ فرطِ غیظ تلے میرا وجود کانپنے لگا تھا۔ وہ بدبخت شاید میرے تہدیدی الفاظ میں چھپی تلملا دینے والی بے بسی کو محسوس کر کے محظوظ ہوا تھا۔

''بچوں والی باتیں چھوڑو...... اب بڑے ہو گئے ہو تم......'' اس کے زہریلے طنز نے مجھے بلبلا دیا۔ اس کی حد سے زیادہ خود اعتمادی اور اطمینان صاف ظاہر کرتا تھا کہ ایک مربوط اور منظم حکمتِ عملی سے وہ مجھے اندر ہی اندر کسی ایسے پھندے میں جکڑ چکا تھا جس کی رسی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کسی بھی وقت اُسے کھینچ کر اس کا گھیرا تنگ کر سکتا تھا۔

''شاباش! اب اچھے بچوں کی طرح...... اپنا جوس ختم کرو تاکہ کول ہو سکو......''

غصے سے میرے ہونٹ ہی نہیں بلکہ منہ اور حلق بھی

خشک ہونے لگا تھا۔ غیر ارادی طور پر مجھے اس کا کہا ماننا پڑا۔ ایک ہی گھونٹ میں بچا کھچا جوس میں غٹا غٹ پی گیا۔

''ہیلو!'' وزیر جان نے قریب سے گزرتی ایک سبک اندام ہوسٹس کو روکا۔ اس نے ٹرے اُٹھا رکھی تھی، جس پر وہسکی کے چار پانچ پیگ رکھے ہوئے تھے۔

''سر......!'' وہ مترنم سی آواز کے ساتھ ٹرے سمیت جھکی تو وزیر جان نے جچی جچی سی مسکراہٹ کے ساتھ مارٹینی کا پیگ اُچک لیا۔

''سر......؟'' وہ میری طرف اپنی کھنچی ہوئی دلکش سیاہ پلکوں سے دیکھتے ہوئے استفساریہ بولی۔

''نو تھینکس ......'' میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا اور اپنا خالی پیگ نما گلاس اس کی ٹرے پر رکھ دیا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔

میں غیر محسوس انداز میں گہرے گہرے سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے لگا۔ ساتھ ہی وزیر جان کی طرف بھی گھور لیتا۔ اس نے مارٹینی کی چسکی لی اور نیچی آواز میں بولا۔

''یہ طیارہ تقریباً پانچ سے ساڑھے چار گھنٹے بعد بینکاک کے ائرپورٹ پر اُترے گا اور تمہیں کہیں بھی کھسکنے کی ضرورت نہیں ...... ورنہ سخت پچھتاؤ گے۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' ناچار میں نے گویا صبر کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں، فقط میری پیروی کرنی ہے اور بس......''

''تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''کم ازکم امریکا تو نہیں......'' وہ بولا اور مارٹینی کا ایک گھونٹ اور اپنے معدے میں منتقل کیا۔

''ہمم......'' میرے منہ سے برآمد ہوا۔

''گڈ......!'' اس کے بھی منہ سے نکلا۔

''لیکن دھیان رہے، مجھے وہاں اکیلا سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔ یوں بھی بینکاک ائرپورٹ پر تم کم ازکم کسی ہنگامے یا فساد کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔'' وہ مکاری سے بولا۔ ''اس وقت بھی میرے دو ساتھی جہاز میں موجود ہیں۔''

میں ایک بار پھر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ وہ رذیل آدمی میری اس کمزوری سے واقف تھا کہ ایک غیر ملک کی سرزمین پر مجھے کس قدر محتاط ہو کے رہنا تھا۔ کیونکہ اُسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ میں کیا شے تھا۔ لہٰذا بزدلوں کی طرح اس نے مجھے پہلے ہی ایسی کسی حرکت سے روکنے کی کوشش چاہی تھی۔

یہ حقیقت بھی تھی کہ میں کم ازکم بینکاک میں خود کو کسی ہنگامے میں ملوث کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا مگر اب زیادہ فکر اس ایجنٹ کی طرف سے لاحق تھی جو مجھے ائرپورٹ لینے کے لیے آرہا تھا۔ کچھ دنوں بعد امریکا بھی اسی کے ذریعے روانہ ہونا تھا۔

طیارے میں شور مچا کے وزیر جان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا بچکانا فعل کے سوا کچھ نہیں تھا اسی لیے میں نے اس خیال کو ہی رد کردیا اور آئندہ کے بارے میں غور کرنے لگا۔

اول تو میرا ذہن ابھی تک اسی بات پر قلابازی کھانے میں مصروف تھا کہ وزیر جان نے پاکستان کا رخ کب کیا تھا؟ کیونکہ میری محدود معلومات کے مطابق وہ بیرونِ ملک فرار ہوچکا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ...... میری انڈیمان والی مہم پر روانگی کے بعد آگیا ہو، کیونکہ نوشابہ ''شوشا'' بھی انہی دنوں ہی پوری طرح اُبھر کر سامنے آیا تھا اور ان تمام باتوں سے قطع نظر توجہ طلب امر تو یہ تھا کہ اس بدبخت نے کون سی اوٹ میں اور کب سے مجھے اپنی نظروں میں رکھا ہوا تھا کہ اب کسی بدروح کی طرح اچانک میرے سر پر سوار ہوگیا۔ کیسے اس نے علامہ اقبال ائرپورٹ پر میرے کیری میں ہیروئن کی تھیلیاں رکھی تھیں؟ اور کیا پھر یہ زور آور خان سے بھی واقف ہوچکا تھا؟ نیز کیبل دادا اور شکیلہ پھر کس طرح اس کی نظروں سے بچ نکلے، یا پھر اس مردود نے صرف مجھ پر ہی نظریں مرکوز کررکھی تھیں؟ ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں اُبھرا تھا کہ کہیں یہ ہیروئن کی ان دو تھیلیوں سے متعلق جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا؟ مگر کیا کیا جاسکتا تھا؟ میں اس کی بات نہ مان کر کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا اور وہ بھی ایک غیر ملکی ائرپورٹ پر...... میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس خبیث کی اسی وقت گردن دبوچ ڈالوں۔ سوچنے کی ایک بات یہ بھی تھی کہ اس کے ایجنٹ ملتان میں میری کہاں تک ریکی کرچکے تھے؟ کیا یہ زور آور خان سے بھی واقف تھا یا میری امریکا مہم سے بھی آگاہی حاصل کرچکا تھا؟

''تم نے مجھے بہت زک پہنچائی ہے شہزی! بہت دق کیا ہے...... لیکن اسپیکٹرم کی ایک شاخ کو کاٹ کر اس خوش فہمی میں رہنے کی غلطی کبھی مت کرنا کہ تم نے ہم پر مکمل فتح حاصل کرلی ہے۔'' تھوڑی سی خاموشی کا وقفہ گزرنے کے بعد اس نے کہا۔

''خوش فہمیوں میں مبتلا ہونا بے عمل لوگوں کا کام ہے۔'' میں نے کہا اور اس کے آئندہ کے عزائم جاننے کے

لیے کریدا...... ''اسپیکٹرم سے مجھے ذاتی طور پر کوئی پرخاش نہیں ہے۔ وہ میرے وطن سے باہر جہاں بھی اپنا گل کھلاتی رہے، مجھے اس کی پروا نہیں مگر میرے وطن میں وہ اپنی جڑیں مضبوط کرے...... یہ مجھے کبھی گوارا نہیں ہوگا۔''

میں نے شاید اس کی یا بشمول اسپیکٹرم کی 'دُکھتی رگ' پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اسی سبب وہ خاصے بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کب تک تم یہ کرتے رہو گے، اسپیکٹرم دوبارہ تمہارے ملک میں کونپل کی طرح پھوٹے گی اور ایک تناور درخت بن جائے گی۔'' اس کی یاوہ گوئی پر مجھے بھی واقعی طیش آگیا، میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''اسپیکٹرم کی اس بار بار پھوٹنے والی کونپل کی کمزوری سے میں اچھی طرح آگاہ ہو چکا ہوں...... جس کی آبیاری کی سب سے زیادہ فکر بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کو ہوتی ہے، اس کی سپورٹ کے لیے بلیوٹلسی کو خاص مقصد کے لیے را کے بطن سے پیدا کیا گیا اور اپنا ایک خطرناک جاسوس سندرداس سکینہ کو پاکستان داخل کرا دیا مگر تم نے دیکھا، بلیوٹلسی کا خاتمہ میں نے اپنے ہاتھوں سے کیا اور اسپیکٹرم کا مقامی طور پر خاتمہ ہو گیا۔''

''اسپیکٹرم کا مقامی طور پر قیام ''را'' والوں کے مفاد میں ہی نہیں بلکہ اب اور بھی کئی ایجنسیوں کا مضبوط ٹاسک بن چکا ہے۔ لہٰذا اس بار تمہیں اسپیکٹرم کی مقامی قیادت سے ہی نہیں، اس کی پشت پناہی میں دن رات کارفرما ان خفیہ بیرونی طاقتوں سے بھی نمٹنا پڑے گا۔ کہاں کہاں تک جاؤ گے؟'' اس نے پُرغرور اور معنی خیز لہجے میں کہا اور میں اس خبیث وطن فروش کی بات پر اندر سے تلملا گیا تھا۔

اسپیکٹرم کو پاکستان میں مضبوطی فراہم کرنے والا ''را'' کا نوزائندہ ونگ ''بلیوٹلسی'' تھا۔ میرے ہاتھوں اس کے خاتمے کے بعد ہی ''را'' کے زیرک دماغ مہاویروں نے کیا خبر یہ سوچا ہو کہ پاکستان میں دم توڑتی اسپیکٹرم کے خالی غبارے میں ہوا بھرنے کے لیے صرف وہی (را) کافی نہیں ہو سکتے، اُن عالمی خفیہ ایجنسیوں کا بھی ''اتصال'' لازمی ہوگا جو کسی نہ کسی حوالے یا موقع محل کے مطابق گل کھلاتی رہی تھیں۔ اس میں امریکا اور اسرائیل سرِفہرست ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا اس کے تاروپود امریکا یا اسرائیل کے کسی خفیہ پیلس میں مشترکہ طور پر جوڑے جا رہے ہوں اور اسی لیے اسپیکٹرم یا وزیر جان میری ''امریکا یاترا'' کی مہم کو سبوتاژ کرنے کی کوشش میں ہو اور وہ مجھے بینکاک ائیرپورٹ پر ایک جھوٹے الزام تلے پھنسانا چاہتا ہو۔

بہرکیف انہی باتوں کے تناظر میں فوری طور پر میرے ذہن میں پیش آئندہ حالات کے مطابق جو پہلا سوال اُبھرا تھا، وہ میں نے اس سے کر ڈالا۔

''اچھا سوال ہے۔'' اس نے کہا۔

میرا سوال یہی تھا جو میں نے بے حد سرگوشی کے انداز میں اس سے کیا کہ اگر اس نے کسی طرح میرے کیری بیگ میں ہیروئن کی تھوڑی مقدار رکھ دی تھی تو پھر وہ بینکاک میں کس طرح کسٹم اور امیگریشن میں ہونے والی چیکنگ سے مجھے بچا سکتا تھا۔

''جب میں تمہارے بیگ میں کوئی شے رکھ سکتا ہوں تو ظاہر ہے نکالنا بھی جانتا ہوں گا....'' بڑی خبیث مسکراہٹ سے اس نے مجھ سے کہا تو میں بولا۔

''بینکاک کے ائیرپورٹ میں بھی یہ خطرناک کام کر لو گے؟''

''خواہ دنیا کا کوئی بھی ائیرپورٹ ہو۔'' اس کے لہجے میں بے پایاں غرور تھا اور میں ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے رہ گیا۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ کبھی پیجنگ سسٹم پر طیارے کی فضائی پوزیشن اینڈ لیو اسٹیشن سے متعلق اور بلندی کے بارے میں مختصر سا اعلان کر دیا جاتا تھا۔

طیارے نے لاہور ائیرپورٹ سے صبح دس بج کر پینتالیس منٹ پر ٹیک آف کیا تھا۔ اعلان میں متوقع بینکاک آمد پانچ گھنٹے بعد اور تھائی ٹائمنگ کے مطابق (جو پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق دو گھنٹے آگے تھا) سات بجے بتایا گیا تھا۔

وزیر جان کسی بلا کی طرح میرے سر پر اچانک ہی نازل ہو گیا تھا جس نے مجھے دیگر عوامل کی جانب سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تھا اور میں انہی پریشان کن خیالات میں پھنس کر رہ گیا تھا کہ مجھے بینکاک ائیرپورٹ اُتر کر اس مصیبت سے کیسے جان چھڑانی چاہیے۔

بالآخر میں نے وہی کیا جو اس قسم کے نازک اور حساس معاملات میں کیا کرتا تھا، یعنی تفکرات اور پریشان کن خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور وزیر جان کے اس نفسیاتی دباؤ کو بھی جو اس کم بخت نے مجھ پر ایسے نازک وقت میں طاری کر رکھا تھا۔

لہٰذا میں اب سنجیدگی سے وزیر جان سے جان چھڑانے کے بارے میں غور کرنے لگا۔ یہ مردود کسی آسیب

کی طرح مجھ پر مسلط ہو گیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں یقیناً اسے موت کے گھاٹ اُتارنے کی کوشش ضرور کرتا، چھوڑنا تو خیر میں اسے اب بھی نہیں چاہتا تھا مگر اس ذلیل نے مجھے پھانسنے کی ایسی خطرناک چال چلی تھی کہ اگر یہ منحوس آسیب اپنی گردن بھی دبوچنے کے لیے میرے آگے پیش کر دیتا تو تب بھی میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، وجہ یہی تھی یہ کم بخت میرے بیگ میں ہیروئن جیسا بم نصب کر چکا تھا جس سے اب وہی چھٹکارا دلا سکتا تھا پھر اس کے ساتھی بھی طیارے میں موجود تھے۔ کہاں تھے اور کس سیٹ پر بیٹھے تھے یہ بھی مجھے پتا نہیں تھا۔ اس کے سوا مجھے اب اور کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں سر دست خود کو وزیر جان کے حوالے کر دیتا۔ مجھے اصل فکر اس شخص کی ہو رہی تھی جس سے میں بینکاک ائرپورٹ پر اُترتے ہی ملتا اور اس کے ساتھ جانا تھا۔ اسی کو میری آگے امریکا روانگی کا بندوبست کرنا تھا۔ میں نے سوچا پہلے اس مصیبت سے چھٹکارا پایا جائے، رہا زور آور خان کا آدمی تو اس سے بعد میں بھی ملا جا سکتا تھا۔ لہٰذا یہی سوچ کر میں آنکھیں موندے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

انہی سوچوں میں کبھی اُونگھتے کبھی جاگتے سفر کٹ گیا اور سیٹ بیلٹ باندھنے کے اعلان پر میں چونکا۔

تھوڑی دیر بعد جہاز بینکاک ائرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ میں وزیر جان کے ساتھ طیارے سے اُترا اور لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ وہاں نظر آ رہے تھے۔ وزیر جان منحوس سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس کے ان دو ساتھیوں کو وہاں تلاش کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ دیارِ غیر کی سرزمین اور اس پر مستزاد میرے بیگ میں ہیروئن کی موجودگی مجھے سخت نروس کر رہی تھی۔ ہم ٹرالی پسنجر لاؤنج میں پہنچے۔ وہاں کنوئیر بیلٹ پورٹ کے گرد بھانت بھانت کے لوگ جمع تھے۔ وزیر جان کے پاس اپنا ہینڈ کیری تھا۔ ممکن تھا باقی لگیج اس کے وہ دونوں ساتھی لینے کے لیے یہاں موجود ہوں جو ہنوز میری نظروں سے اوجھل تھے۔ ان کے چہرے میرے شناسا نہیں تھے اور کیا خبر وہ میرے دائیں بائیں کہیں موجود ہوں۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ کنوئیر بیلٹ پر لدے سامان کی قطار کو متحرک دیکھتا رہا۔ پھر جب میری نظر اپنے ہلکے سبز رنگ والے کیری پر پڑی تو میں نے وہ لپک کر اُٹھا لیا۔ اسی وقت میں نے وزیر جان کی طرف دیکھا۔ اس کی شکل پر انتہا درجے کی مکروہ مسکراہٹ تھی۔ اچانک نجانے کیا ہوا کہ میری چھٹی حس کسی بھیانک خطرے کا احساس دلانے لگی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس رذیل نے مجھے اسی طرح یہاں پھنسانے کا کوئی پھندا تیار کیا ہو۔ یعنی مجھے بظاہر اس مغالطے میں رکھ کر کہ اس نے محض مجھ پر قابو پانے کے لیے ایسا کیا تھا تاکہ میں اس کی بلیک میلنگ سے مجبور ہو کر اس کا کہا مانتا رہوں اور وہ عین وقت پر، یعنی اس کے ساتھی میرے کیری سے ہیروئن کی تھیلیاں نکال لیں گے، جبکہ بات اس کے برخلاف ہو، کسٹم امیگریشن کرواتے وقت وہ تھیلیاں ڈیسک پر برآمد ہو جائیں اور میں دھر لیا جاؤں اور پھر وزیر جان مجھ سے لاتعلقی کا اظہار کر دیتا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے وزیر جان سے اپنے اس خیال کا برملا اظہار کر ڈالا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کے لیے فوراً اپنی تیز اور بھانپتی نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔ ایک ایسے رنگ کی جھلک جو کسی چھپی سازش یا شرارت کے کھل جانے کے احتمال پر چہرے سے ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ یہی رنگ میں نے اس کے چہرے پر پل بھر کے لیے محسوس کیا۔

''خاصے محتاط اور بیدار مغز ہو......'' وہ میری بات کو ہنسی میں اُڑاتے ہوئے ہولے سے بولا۔

''بے فکر رہو، ایسی کوئی بات نہیں، مجھے تم مطلوب ہو، یہاں تمہاری گرفتاری ہرگز نہیں۔''

''میں تم پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ اسی وقت میرے سامنے ان تھیلیوں کو نکالو......''

''بے وقوف مت بنو...... وہ پہلے ہی نکالی جا چکی ہیں۔''

ڈیسک قریب آتی جا رہی تھی۔ ابھی وہاں قطار لگی ہوئی تھی۔ وہاں نہایت تیزی سے کام نمٹایا جا رہا تھا۔ میں نے پھر بھی اپنے قدم آہستہ کر دیے تھے، ممکن تھا کہ وہاں اور لوگوں کے درمیان ایسا کچھ نہیں کر سکتا جو یہاں کر سکتا تھا۔ تاہم یہاں مجھے نیلی وردیوں والے چست لباس میں ملفوف سیکیورٹی کے مسلح افراد بھی چاق و چوبند کھڑے نظر آ رہے تھے جو ہر مسافر کو اپنی چست نظروں میں لیے ہوئے تھے۔

''میں اسی وقت اس کی تصدیق کرنا چاہوں گا۔''

''اس وقت تم کھڑے ہو کر یہ کام نہیں کر سکتے۔'' وزیر جان دانت پیسنے کے انداز میں بولا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ تھوڑا پریشان ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے والی فتح اور گھمنڈ کی پُراعتمادی ہوا ہونے لگی تھی۔

''میں واش روم جارہا ہوں، تم یہیں کھڑے رہو یا ڈیسک پر چلے جاؤ۔''

''اب تم ایسی کوئی حرکت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔'' وہ غرایا۔

''میں ایسا کرنے جارہا ہوں۔ اگر تم نے چلاّنے کی کوشش کی تو تم بھی میرے ساتھ پکڑے جاؤ گے، کیونکہ سیکیورٹی اہلکار تم سے بھی یہ دریافت کریں گے کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرے کیری میں ہیروئن موجود ہے۔ کیونکہ پکڑے جانے پر میں یہی کہوں گا کہ تم بھی میرے ساتھی ہو۔''

''میں اُن سے یہی کہوں گا کہ میں نے تمہارے کیری میں مشکوک شے کی جھلک دیکھ لی تھی۔'' اس نے کمزور سی تاویل دی تو میں استہزائیہ انداز میں مسکرا کر بولا۔

''بے شک بول دینا مگر بچ کے تم بھی نہیں۔''

''معاف کیجیے گا آپ لوگوں کو کوئی مسئلہ ہے؟''

معاً ہماری سماعتوں سے ایک بارعب آواز ٹکرائی۔ ہم نے بیک وقت چونکتے ہوئے اس گٹھی ہوئی جسامت اور رعب داب والے گورے چٹے تھائی آفیسر کی طرف دیکھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں وہاں ''اسٹینڈنگ'' پر اس کا اعتراض کرنا بجا تھا۔ کیونکہ وہاں رک کر باتیں کرنا خلاف قانون تھا جہاں سے چیکنگ ڈیسک صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔

''نو سر! ہم لوگ موٹیلو کے بارے میں بات کررہے تھے۔'' وزیر جان نے فوراً مسکرا کر جواب دیا۔ وہ آفیسر مسکرا کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا مگر اب وہ ہم دونوں کو ہی ''واچ'' کررہا تھا۔

میں نے باتھ روم جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ وہ بولا۔ ''سنو! اگر مجھے تمہیں اس طرح پھانسنا ہوتا تو میں تمہیں ان تھیلیوں سے متعلق بتاتا ہی کیوں؟''

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کردی اور قریبی واش روم کی جانب قدم بڑھادیے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ آفیسر جس کی نظروں میں ہم آچکے تھے، اب دوبارہ ہمیں تنبیہہ کرے۔

واش روم میں آکر میں نے جلدی سے اپنا کیری کھولا اور اس کی تلاشی لینے لگا۔ وہ تھا ہی کتنا بڑا۔ میں نے اچھی طرح اس کی تلاشی لی، کپڑوں کی تہوں کو الٹ پلٹ دیا اور دوسرے ہی لمحے میرے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ وزیر جان نے مجھے بے وقوف بنا کر بلف کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر میری بروقت حاضر دماغی اور جرأت نے اس کے جھوٹ کا پول کھول دیا تھا۔ یوں بھی کیا خبر اس کے آدمی نے وہ تھیلیاں نکال دی ہوں، بقول اس کے، اس کے آدمی یہ کام کرچکے تھے۔

احتیاط کے پیش نظر میں نے ایک بار پھر اپنے بیگ کی تلاشی لے ڈالی اور مطمئن ہو کے جیسے ہی باہر نکلا تو اسی آفیسر کو واش کے قریب کھڑے پایا، وہ اب خاصی کھنڈی ہوئی سنجیدہ نظروں سے میری طرف گھور رہا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر خفیف سا مسکرایا۔ حسبِ توقع وزیر جان غائب تھا۔ میں جان گیا کہ وزیر جان نے مجھے واقعی بلف کیا تھا مگر اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

''کلیئر'' ہونے کے بعد میں باہر آگیا۔ زور آور خان کا آدمی میرے نام کا پوسٹر تھامے کھڑا تھا، میں نے پہلے اس کی طرف دیکھ کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ ہلا دیا پھر گردوپیش پر عقابی نظریں دوڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ میں سمجھا تھا وہ کوئی پاکستانی ہوگا، لیکن وہ ایک عام سے قدوقامت کا تھائی باشندہ تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملا۔

میں نے اس سے بغل گیر ہوتے ہی اس کے کان میں انگریزی میں سرگوشی کی۔

''جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے نکل چلو...... کچھ خطرناک آدمی میرے پیچھے ہیں۔''

میری بات سن کر اس کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ فوراً حرکت میں آیا اور پارکنگ ایریا میں کھڑی ایک چھوٹی سی امپالا میں سوار ہو گیا۔ میں اپنا کیری کار کی عقبی سیٹ پر پھینک کر اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔

کار فوراً حرکت میں آگئی۔ اس کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔

''کون لوگ تھے وہ......؟ کیا پاکستان سے ہی تمہارے پیچھے لگے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنا نام تو بتاؤ دوست......؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

''میرا نام کاوشی ہے......'' اس نے ایک معروف شارع سے دریا کا پل پار کیا اور پھر جیسے شہری حدود کے ایک ہنگامہ خیز سلسلے کی شروعات ہو گئی۔ شام کی مدھم مدھم تاریکی میں جلتے بجھتے نیون سائن اور سڑک کے دورویہ واقع دکانیں اور رہائشی عمارتیں، فٹ پاتھ پر پیدل چلتے لوگ، فضا اجنبی غیر مانوس مگر دلفریب تھی۔ گاڑیوں موٹروں کے علاوہ ایک اور چلتی پھرتی شے مجھے عجیب لگی اور مانوس سی بھی۔ وہ تھی

''ٹک ٹک'' گاڑی۔ یہ بالکل ایسی تھی جیسے ہمارے ہاں پاکستان میں ''چنگ چی'' رکشا ہوتے ہیں۔ ایسی مماثلت پر مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ البتہ یہ ٹک ٹک ہماری چنگ چی کے مقابلے میں ذرا کھلی ڈلی تھی۔

میں ان مناظر کی رنگینیوں اور دلچسپیوں سے قطع نظر اپنے گردوپیش پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وزیر جان میرے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ پاکستان سے روانہ ہوتے ہی اس کا مجھ سے ڈرامائی انداز میں ٹکراؤ اور اس کے جال میں جکڑے ہوئے وہ اعصاب شکن لمحات نے ہنوز میرا ذہن شل کر رکھا تھا۔ وہ لاؤنج سے اچانک کسی بدروح کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ یا اس کے آدمی اب بھی موقع کی تاک میں میرے پیچھے لگے ہوئے ہوں گے۔

ایک محل نما عمارت کے قریب سے گزرتے ہوئے کاؤشی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ دوسو سال قدیم عمارت گرینڈ پیلس ہے۔''

''ہم...... واقعی خوب صورت عمارت ہے۔'' میں نے بھی کھڑکی سے اس طلسماتی محل کے دروازوں، دالانوں اور میناروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی بہانے.... ایک بار پھر میں نے گردوپیش پر نظر ڈالی۔

''تم کچھ پریشان ہو......؟ شاید پہلی بار آئے ہو یہاں اس لیے......'' کاؤشی نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

اس کے سوال پر مجھے حیرت ہوئی۔ کیسا عجیب اور بے فکر آدمی تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے ہی تو میں نے اسے ایک خطرے سے آگاہ کیا تھا یا پھر شاید اس نے میرے وہم پر محمول کیا ہو کہ ایک ایسا اجنبی جس نے پہلی بار دیارِ غیر میں قدم رکھا ہو تو وہ کسی خوف زدہ بچے کی طرح ہر کسی سے ڈرتا ہے۔

سڑک کافی کشادہ تھی۔ ٹریفک بھی کم نہ تھا۔ سرِشام ہی سڑک پر روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ جابجا خوبصورت اور رنگین نیون سائن بھی جگمگاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ جیسے جیسے ہم شہر کے گردونواح میں پہنچے ٹریفک کا ہجوم بھی بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم ایک بار پھر معروف سڑک پر پہنچ گئے۔ میں بدستور گردوپیش میں دیکھتا جا رہا تھا۔ جابجا کلب، پب، شبینہ کلب، دکانیں اور ہوٹلز نظروں سے کسی رنگین و سنگین فلمی مناظر کی طرح گزر رہے تھے۔

''اب ہم اپنی اصل منزل کی جانب بڑھنے والے ہیں۔'' کاؤشی نے دھیرے سے کہا۔ اس کی بات سن کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''تو کیا ابھی بیس پچیس منٹ تک ہم فضول میں آوارہ گردی کر رہے تھے؟''

''ہرگز نہیں۔ تمہارے پیچھے جو خطرناک آدمی تھے، انہیں جُل دینے کے لیے......'' اس نے یوں اطمینان سے جواب دیا جیسے مجھے پاکستانی اور تھائی کرنسی کے ریٹ بتا رہا ہو۔

''لل...... لیکن مجھے تو وہ سارے راستے کہیں بھی نظر نہیں آئے؟ تم نے کیسے دیکھ لیا اُسے؟'' مجھے اس کے سفید جھوٹ پر غصہ سا آ گیا۔

''ایک بھاری جسم والا شخص جس نے بزنس سوٹ پہن رکھا تھا۔ ائرپورٹ سے ہی ہماری امپالا کے پیچھے لگ گیا تھا۔ اس کے دو ساتھی بھی اس کے ہمراہ تھے، باہر ایک سیاہ مسٹینگ کھڑی تھی انہیں لینے کے لیے۔ اس میں فقط ایک ہی ڈرائیور بیٹھا تھا۔'' اس نے اسی طمانیت سے جواب دیا تو میں حیران رہ گیا۔ اس نے کم از کم وزیر جان کا حلیہ بالکل صحیح بتایا تھا۔ مجھے اصل حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ میرا جیسا ایک ٹاپ ایجنٹ بھی اس تعاقب کو نہ ٹریس نہیں کر سکا اور اس نے وہ سب بڑے آرام سے دیکھ لیا۔ وہ مجھے متحیّر سا پا کے ہنسی کا ایک ٹھکا مار کے بولا۔

''ہمارا کام ہی ایسا ہے کہ ہمیں اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا پڑتا ہے۔ تم نہ بھی بتاتے تو بھی میری نظروں نے اس تعاقب کو بھانپ لینا تھا۔ کیونکہ سرکاری اہلکار ہم جیسوں کی تاک میں رہتے ہیں۔ تمہارے بتانے پر مجھے اور زیادہ محتاط ہونا پڑا...... خیر! بے فکر رہو، میں انہیں ڈاج دینے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ اب ہم اپنے پڑاؤ کی طرف جا رہے ہیں۔''

کاؤشی سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ حالانکہ وہ ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔ مجھے اس کی حرکات و سکنات سے بالکل بھی نہیں لگا تھا کہ وہ اپنے گردوپیش (تعاقب) پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

''حیرت ہے...... مجھے، ان مذکورہ افراد کو تو میں نے بھی دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر......''

''نئی جگہ اور اجنبی علاقے میں انسان نروس سا رہتا ہے۔ چُوک ہو جاتی ہے مگر یہ بتاؤ، یہ لوگ تمہارے شناسا تھے یا نیا مسافر جان کے تمہیں اپنے کسی کام کے لیے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے تھے؟'' اس نے پوچھا۔ جواباً میں نے ایک گہری ہمکاری خارج کی اور سیٹ سے پشت ٹکا کے سوچتا بن گیا کہ اسے کیا جواب دوں؟

''دیکھو دوست......! حقیقت بتانے میں تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔ تاکہ میں اپنی احتیاط پسندی کی ڈگری کو تھوڑا مزید ہائی فائی رکھوں۔ کیونکہ ہم ان چند دنوں میں یہاں کسی کی دشمنی کے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن مجھے نظر یہی آتا ہے کہ یہ تمہارا کوئی ایسا دشمن ہے جو......''

''تمہارا خیال ٹھیک ہے کاؤشی......!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''تم مجھے صرف کاؤ کہہ سکتے ہو۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''یہ میرا ایک پرانا دشمن ہے، اور میری بے خبری میں یہ مردود پاکستان سے میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آن پہنچا ہے۔''

''سمجھ گیا میں...... یہ تمہارا امریکا یاترا والا مشن سبوتاژ کرنا چاہتا ہے۔'' کاؤشی بولا۔

''بالکل......'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہوم م م......'' اس نے پُرسوچ سی ہمکاری بھری اور بولا۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارا بنا بنایا کام بگاڑ سکتا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے خیال انگیز انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''دوست! اس کی تم فکر نہ کرو، یہ یا اس کا کوئی ساتھی ہمارے سامنے آیا بھی تو انہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تم بس میرا کام جتنی جلد ہو سکے، کر ڈالو......''

اس نے جواب میں محض اپنے سر کو دھیرے سے اثباتی جنبش دی تھی مگر ٹھیک اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چمکا اور میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

''تم ایک کام کر سکتے ہو......؟''

''بولو......؟''

''اسی مسٹینگ کو دوبارہ ٹریس کرو...... میں فقط ان کا ٹھکانا دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''مم...... مگر...... یہ ہمارے معاہدے میں شامل نہیں......''

''پلیز......! دیر مت کرو...... یہ کام بہت ضروری ہے۔ میں تمہیں اس اضافی کام کے ایک ہزار بھات دوں گا۔''

اس نے فوراً اسٹیئرنگ کاٹا اور ایک بائیں ہاتھ والے گلی نما راستے میں گھس گیا۔ یہ ون وے تھا، اس راستے سے جانے والی ٹریفک رواں تھی۔

''کوشش کرتا ہوں...... مگر یاد رکھنا اگر تمہاری وجہ سے یہاں کوئی ہنگامہ ہو گیا تو میں تمہارے کام نہیں آسکوں گا اور اپنا راستہ بھی تم سے الگ کرلوں گا۔'' اس نے تنبیہہ کر ڈالی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت ہی تیز ہو گئی تھی۔

وہ خاصا چلتا پرزہ ثابت ہوا۔ اس نے بڑی مہارت اور چابک دستی سے ڈرائیونگ کے جوہر دکھائے تھے۔ ایک انڈر پاس میں داخل ہوتے ہی اس نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے محتاط اندازے کے مطابق اُن کی سیاہ مسٹینگ اسٹریٹ سی الیون کی لوئر روڈ پر ہونی چاہیے۔ بصورت دیگر ہمیں اپنی منزل کی راہ لینا ہوگی۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ٹریفک کا رش تھا مگر وہ رواں تھی۔ ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کا میں نے یہاں ایک ذرا شائبہ تک نہیں دیکھا تھا۔ سرخ یا سبز سگنل تو ایک طرف رہا، یلو لائٹ جو کاشن کی کہلاتی ہے، پہلے تو اسے ہی فالو کیا جاتا تھا مگر میں نے دیکھا کاؤشی نے میری (یا ایک ہزار بھات) کی خاطر کہیں تھوڑی بہت ٹریفک کی خلاف ورزی کر ڈالی تھی۔

''واؤ...... وہ رہی سیاہ مسٹینگ......'' مذکورہ انڈر پاس سے باہر آتے ہی قوس کی شکل میں اس چار رویہ ہائی وے پر آتے ہی کاؤشی نے نعرہ بلند کیا۔

''کدھر ہے......؟'' میں نے فوراً پوچھا۔ میرے چہار اطراف ٹریفک کا ازدحام تھا اور گاڑیوں کی تیز لائٹس...... تبھی میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا جو ہماری کار کے آگے چلتے ہوئے ایک ہیوی ٹریلر ٹرک پر جمی ہوئی تھیں۔

''اسی ٹریلر کے آگے جا رہی ہے وہ سیاہ مسٹینگ......'' اس نے بھی گویا مجھے سامنے گھورتے پا کر کہا۔ مجھے تھوڑی حیرت تو ہوئی کہ اتنے بڑے ٹریلر کے آگے جاتی ہوئی مطلوبہ کار اسے کیسے دکھائی دے گئی؟

''میں تو اس ٹریلر کے آگے دیکھنے سے قاصر ہوں۔''

''میں نے اسے ابھی تھوڑی دیر پہلے مسٹینگ کو اوورٹیک کرتے دیکھا تھا مگر اب بھی اس کی جھلک نظر آجائے گی، لو دیکھو......'' اس نے کہتے ہوئے اسٹیئرنگ کو

تھوڑا سا بائیں جانب گھمایا اور میں نے ذرا کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھنا چاہا تو مجھے ٹریلر کے آگے جاتی وہ لمبی سی سنگل ڈور اسپورٹس مسٹینگ جاتی دکھائی دے گئی۔

''گڈ'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''کاؤ...... ! یہ اب نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے، مگر خیال رہے کہیں ہم ہی اُلٹا ان کی نظروں میں نہ آجائیں......''

''بے فکر رہو...... وہ ناکام ہو کے لوٹ رہے ہیں۔ ان کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ جس کار کا یہ لوگ تعاقب کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اب وہی ان کے تعاقب میں ہے۔''

یہ چار رُویہ سڑک آگے جا کر دو رویہ ہو کے ایک اوور ہیڈ برج سے گھوم کر پھر دوسرے انڈر پاس میں داخل ہوگئی۔ وہاں سے سیدھی ہو کر وہ دو رُویہ سڑک دائیں جانب جھلملاتے پانیوں کے متوازی آگے چلی جا رہی تھی۔ یہاں ٹریفک کچھ کم تھا۔

''اوہ...... لگتا ہے ان کی منزل فوکٹ ہے۔'' کاؤشی بدستور سامنے نظریں مرکوز رکھے ہوئے بڑبڑایا۔

''فوکٹ شاید کسی علاقے کا نام ہے؟'' میرے منہ سے استفسار یہ نکلا۔

''ہاں......!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''آگے کا علاقہ سنسان ہے، نظروں میں آنے کا خطرہ ہے، میں دوسری سڑک پر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے کار بائیں جانب ایک گلی نما راستے میں موڑ دی۔ آگے سگنل تھا۔ اس نے اپنی امپالا روک دی۔

''وہ کار ہمارے سامنے سے گزرے گی، اپنے مطلوبہ آدمیوں کی تسلی کر لینا۔'' کاؤشی نے یہ بات مجھ سے شاید احتیاط کے پیشِ نظر کی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد وہی سیاہ مسٹینگ سامنے سے گزری اور میں نے ڈرائیونگ سیٹ کی برابر والی نشست پر وزیر جان کو براجمان دیکھ کر کاؤشی سے دبے دبے جوش سے کہا۔ ''کنفرمڈ......''

بتی سبز ہوتے ہی اس نے اپنی امپالا کو بجائے اس کار کے پیچھے لگانے کے سیدھا نکال لے گیا۔

''وہ جس سڑک پر گامزن ہیں، وہ ہل ٹاپ کی طرف جاتی ہے۔ خاصے دولت مند دشمن پال رکھے ہیں تم نے......'' کاؤشی بولا۔ میں اس کی بات پر ہولے سے مسکرا کر رہ گیا۔

''تمہیں یہ کیسے پتا چل جاتا ہے کہ ہماری مطلوبہ کار اب کہاں جائے گی اور کہاں سے موڑ کاٹے گی؟'' میں بالآخر اپنے ذہن میں کافی دیر سے اُبھرنے والے اس سوال کو نوکِ زباں پر لے آیا۔ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ کون سی سڑک کہاں اور کس طرف جاتی ہے، مجھے سب پتا ہوتا ہے۔ تاہم اس میں میرے محتاط اندازوں کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ کچھ سڑکیں ایسی ہوتی ہیں جن کی آگے جا کر ایک ہی منزل ہوتی ہے، اگر ان کے درمیان سے کوئی سڑک نکلتی بھی ہے تو زیادہ تر ٹریفک کا رخ کہاں ہوتا ہے، یہ مجھے معلوم ہوتا ہے، پھر بھی اگر مطلوبہ کار اس طرف مڑ جائے تو مجھے اسے دوبارہ پالینے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی، کیونکہ وہ بھی میرے ذہن میں ہوتی ہے۔ جب میں نے مطلوبہ کار کو جُل دیا اور دوسری سڑک پر آیا تو اُن لوگوں نے اندازے کی بنیاد پر دوسری سڑک پر موڑ کاٹا تھا، میں نے عقب نما آئینے میں انہیں جس سڑک پر موڑ کاٹتے ہوئے دیکھا، وہ آگے جا کر اسی چار رُویہ سڑک میں گم ہو رہی تھی، پھر تمہارے کہنے پر میں نے اسی فور وے روڈ کا رخ کیا۔''

''ہم......'' میں نے حلق سے ایک ہمکاری خارج کی۔ ''اب تم ایک بار پھر وہی ٹیکنیک استعمال کر رہے ہو۔ کیونکہ وہ کار آگے نکل چکی ہے۔''

''ہاں! اس بات کا تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ کار فوکٹ پیلس جا کر دم لے گی۔'' وہ بولا۔ ''کیونکہ اس کے بطن سے دو کلومیٹر تک اور کوئی دوسری سڑک نہیں نکلتی۔ تب تک ہم اسے جالیں گے۔ ایسا میں اسی لیے کر رہا ہوں تاکہ انہیں تعاقب کا شبہ نہ ہو۔''

نصف کلومیٹر بعد کاؤ نے اپنی امپالا ایک تنگ سے راستے سے موڑی اور کھلی سڑک پر آگیا۔ میں نے سامنے دیکھا۔ مسٹینگ نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ سڑک آگے جا کر بتدریج عمودی ہو رہی تھی جیسے ہم کسی پہاڑی پر چڑھ رہے ہوں۔

''وہ تو غائب ہو گئے۔'' میں نے پریشانی سے کہا۔ میرے دائیں بائیں عالیشان مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان پر واقعی پیلس کا گمان ہوتا تھا۔ شاید اسی لیے اس علاقے کو فوکٹ پیلس کہا جاتا تھا۔

''یہ ہل ٹاپ ہے...... دائیں بائیں دیکھتے رہو......'' اس نے کار کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے کہا۔ تب ہی مجھے اپنے دائیں جانب کھڑی کاروں کی ایک مختصر قطار کے ساتھ ذرا ہٹ کر وہ مسٹینگ کھڑی نظر آگئی۔

''روکو...... روکو......'' میں نے فوراً کاؤشی سے کہا۔ اس نے بریک لگا دیے۔ یہاں .... بوڑھ کے درختوں کی بہتات تھی۔ ہم ایسے ہی ایک درخت کی آڑ میں تھے۔ علاقہ سنسان تھا اور اُتری رات کے اندھیرے میں لیمپ پوسٹ کی لائٹس روشن تھیں۔ اسی روشنی میں مجھے سیاہ مسٹینگ سے وہ چاروں افراد اُترتے دکھائی دیے۔ وزیر جان آگے تھا۔ باقی مؤدبانہ انداز میں اس کے پیچھے چل رہے تھے، ان کا رخ ایک کشادہ باغیچے والا پیلس نما مکان تھا جو مدھم سی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''تمہارے دشمن خاصے دولت مند ہیں۔'' کاؤشی نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ ''یہ علاقہ بینکاک کے امرا میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن میں تم سے یہی کہوں گا کہ کم از کم ان سے یہاں بھڑنے کی غلطی کبھی مت کرنا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس جگہ اور وزیر جان کے اس محل نما مکان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ اس کے بعد کاؤشی کو روانہ ہونے کا کہا۔ اس نے کار ریورس کی اور ایک ٹرن لے کر واپس موڑ لی۔

لگ بھگ کوئی نصف پون گھنٹے کے بعد ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جسے عام فہم الفاظ میں ''غربا کالونی'' کہا جا سکتا تھا۔ بینکاک جیسے جدید لیونگ اسٹائل کے شہر میں جہاں بلند و بالا چمکتی دمکتی رہائشی عمارتیں، لگژری اپارٹمنٹس اور فلیٹس ہوں وہاں اسی علاقے سے ذرا آگے مرغیوں کے دڑبا نما لکڑی کے گھر اور جھونپڑوں کی یہ بستی دیکھ کر مجھے تعجب تو ہوا تھا مگر یہ خیال بھی آیا کہ غربا ایک ایسی قوم ہے جس کا وجود، کہیں کم اور کہیں زیادہ کے ساتھ ہر جگہ ہی ملتا ہے۔ تو پھر حیرت کیسی؟ لیکن مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ کاؤشی جیسا آدمی بھی ایسی جگہ رہتا ہے یا پھر یہ کوئی اور معما ہوگا؟

یہ بستی ساحلی محسوس ہوتی تھی۔ کار کی کھڑکی کے راستے اب مرطوب ساحلی ہوا میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ یہاں سڑک کی حالت بھی کچھ خستہ تھی اور دڑبا نما مکانوں کے سامنے سیلن اور پانی سا پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہل پہل یہاں بھی تھی۔ وہی گندے سندے ننگ دھڑنگ بچے، دھجی نما چیتھڑوں میں ملفوف خواتین اور مرد...... مجھے یہاں کا ماحول دیکھ کر ہول آنے لگے۔ زور آور خان کے کہنے کے مطابق میرا دو دن قیام ایک ہوٹل میں تھا مگر شاید موجودہ حالات کے پیش نظر کاؤشی مجھے یہاں لانے پر مجبور ہوا تھا۔

~~بالآخر میں نے کاؤشی سے پوچھا۔~~

''تم اس علاقے رہتے ہو......؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی مگر اگلے ہی لمحے اس نے میری طمانیت یہ کہہ کر ہوا کر ڈالی۔ ''مگر تمہیں اِدھر ہی رہنا ہو گا۔''

''وہ کیوں......؟''

''بتاتا ہوں......''

کاؤشی نے کار کی رفتار دھیمی کر لی تھی۔ وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر کبھی کسی کو دیکھ کے دوستانہ اشارہ کر ڈالتا تھا۔ ایک تنگ سی سیلن زدہ گلی میں کار داخل ہوئی اور ایک ایسے ہی دڑبا نما مکان کے دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہم نیچے اُتر آئے۔ مکان نسبتاً کشادہ دکھائی دیتا تھا۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ کاؤشی نے اپنی جیب سے چابی نکالنے کے بجائے دروازے کی چوکھٹ کے نیچے کسی خانے میں رکھی، چابی نکالی اور تالا کھولا۔ ہم اندر آ گئے۔

ایک وسیع لاؤنج تھا۔ وہاں مختصر سا پرانا فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ دو کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ایک سامنے تھا اور دوسرا دائیں جانب...... اندر سے بہرحال یہ مکان ٹھیک حالت میں اور صاف ستھرا تھا۔

''تم یہاں بیٹھو، میں جب تک تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں۔'' کاؤشی یہ کہہ کر سامنے والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں واش روم سے فریش ہو کے نکلا، تب تک وہ میرے لیے کچھ اسنیک اور نوڈلز لے آیا۔ ہلکا پھلکا کھانا تھا، رات میں یہی کافی لگا۔ یہ کھانے کے بعد وہ سلیقے سے کٹے ہوئے امرود لے آیا جو بڑے میٹھے اور خوش ذائقہ تھے۔

''تمہارا کام اسی جگہ نمٹانا پڑے گا۔'' وہ بولا۔ ''کچن میں ناشتے وغیرہ کا سامان موجود ہے۔ چائے کافی پینی ہو تو بنا لینا۔ میں اب چلوں گا، کل صبح سویرے آ جاؤں گا اور میرے ساتھ کچھ ایکسپرٹ ہوں گے۔ وہ تمہارا معائنہ کریں گے اس کے بعد...... وہ لوٹ جائیں گے، دو روز بعد وہ دوبارہ آئیں گے اور تمہارے چہرے کی تھوڑی بہت لیپا پوتی کریں گے، میں تب تک تمہارے...... راجیش کمار نامی بھارتی نوجوان کے سفری کاغذات چیک کرواتا ہوں۔ کاغذات تو تیار ہیں مگر ان کی مدت گزر چکی ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے رخصت ہونے لگا تو میں نے اسے پاکستان اپنی خیریت کی اطلاع پہنچانے کی بات کی تو اس نے ازراہِ تشفی مجھ سے کہہ دیا کہ میں اس سلسلے

میں کوئی فکر نہ کروں کیونکہ وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد زور آور خان کو مطلع کر دے گا۔ مجھے تسلی ہو گئی، کیونکہ زور آور خان تک میری تسلی پہنچ جاتی۔ لیکن میں خود بھی زہرہ بانو سے ٹیلی فون پر بات کرنا چاہتا تھا۔ میں کبیل دادا اور شکیلہ کے سلسلے میں فکر مند تھا کہ جانے ان کی خیریت بھی بیگم ولا پہنچی تھی یا نہیں۔

میں تھکا ہوا تھا اور نیند بھی خوب آ رہی تھی، لہٰذا میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ صبح کسی کے دروازہ دھڑ دھڑانے پر میری آنکھ کھلی۔ کاؤشی اپنے ساتھ تین آدمیوں کو لیے پہنچ گیا تھا۔ ان میں ایک جوان عورت بھی تھی۔ شکل وصورت عام سی تھی اور سنجیدہ مزاج بھی نظر آتی تھی۔ میں انہیں کاؤشی کے ساتھ دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ اپنے ساتھ پروفیشنل لوگوں کو لے آیا تھا۔ ان کے ساتھ کچھ سامان بھی نظر آ رہا تھا۔ جو ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا۔

مختصر سے تعارف اور صاحب سلامت کے بعد ہم صوفوں پر بیٹھ گئے۔

ان تینوں نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر میرے چہرے کا بغور معائنہ کیا۔ لڑکی کوئی گرافک اسکینز ایکسپرٹ اور بیوٹیشن تھی۔ دوسرا نوجوان سا شخص اسکیچ ماسٹر تھا۔ تیسرا شخص جو عورت کی طرح خاصی پکی عمر کا تھا، وہ سرجیکل میکینیشن تھا۔ بقول کاؤشی کے وہ یہاں ایک ٹراما سینٹر میں پلاسٹک سرجری کے شعبے میں کام کرتا ہے۔

کاؤشی اور مجھے ان تینوں ایکسپرٹس کی متفقہ رائے کا انتظار تھا۔ بالآخر جب چائے وغیرہ کا دور چلا تو انہوں نے متفقہ طور پر ہم سے یہی کہا کہ کام اتنا مشکل نہیں ہے۔۔۔۔ بہ آسانی مجھے راجیش کمار بنایا جا سکتا ہے مگر میک اپ یا پلاسٹک سرجری جس قدر پرفیکٹ ہو گی، اُتنی زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی۔ رفتہ رفتہ فیس میک اپ ''پیچز'' تو خود ہی ختم ہو جائیں گے، جبکہ سرجیکل اسٹچز جس میں خاص قسم کی ''کیٹ گٹس'' استعمال کیے جائیں گے۔ وہ تو از خود تحلیل ہو جائیں گے جس کے باعث چہرے کے وہ چند فیشل ایکسپریشن بھی غائب ہو کے ان کے اصل نقوش کو ظاہر کر دیں گے۔

میری اور عابدہ کی امریکا سے واپسی کے سلسلے میں بھی زور آور خان کا یہی گروہ اسی طرح ہمارے کام آتا، یہ بات زور آور خان مجھے اور زہرہ بانو وغیرہ کو بتا چکا تھا۔ جبکہ امریکا پہنچنے اور اپنی اصل شکل وصورت میں ظاہر ہونے کے بعد یہ وقتِ ضرورت میں ریڈی میڈ میک اپ سے کام چلا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ عابدہ کو دشمنوں کے نادیدہ چنگل اور کور کوران کی جیل سے رہائی دلانے کے بعد اس وقت کے حالات کے مطابق مجھے اور کوئی واپسی کی نسبتاً آسان راہ مل جائے۔ کچھ بھی تھا، میں بس ایک بار امریکا پہنچنا چاہتا تھا، خود کو تن بہ تقدیر تو میں کر ہی چکا تھا۔ آگے اللہ مالک تھا۔

یہ تینوں افراد دو گھنٹے بیٹھ کر چلے گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تین دنوں کی مہلت لی تھی، اس دوران میں ان کو ہوم ورک کرنا تھا۔ اس کے بعد پریکٹیکلی یہ لوگ فائنل ورک کے لیے مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جاتے۔ تب تک کاؤشی میرے سفری کاغذات مکمل کر لیتا۔

کاؤشی نے مجھے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ میں یہاں سے باہر نہ نکلوں۔ اس نے مجھے ایک سستا سا موبائل سیٹ دے دیا تھا، جس میں صرف اسی کا ہی نمبر سیو تھا۔ اسے بھی مجھے صرف ضرورت کے وقت استعمال کرنا تھا۔

☆☆☆

بینکاک کی اس ساحلی وڑبا کالونی میں میرا یہ دوسرا دن تھا۔ حسبِ معمول کاؤشی کہیں گیا ہوا تھا۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔ کوئی کام نہ تھا اسی لیے بوریت کا شکار رہتا تھا۔ مگر میری متنوع مزاجی اور فطرت میں موجود بے چینی اور سیماب کیفیت مجھے کہاں بیٹھنے دیتی۔ میرا ایک اہم اور خطرناک دشمن وزیر جان یہاں موجود تھا۔ پاکستان میں وہ اسپیکٹرم کے ایک مقامی کمانڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ نوشابہ اسی کی ''شہ'' پر اتنا اکڑ رہی تھی اور وزیر جان اس کی آڑ میں مقامی سطح پر اسپیکٹرم کو ایک بار پھر وہاں فعال کرنا چاہتا تھا۔ میرے لیے یہ اچھا موقع تھا کہ وزیر جان جیسے ناسور کا ادھر ہی خاتمہ کر ڈالوں۔ کیونکہ میں وزیر جان کے فوکٹ کے علاقے ہل ٹاپ میں واقع ٹھکانے سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں اسی دن سے ہی موقع کی تاک میں تھا۔ آج جا کر مجھے کچھ کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ میرے پاس تین دن کی مہلت تھی۔ اس عرصے میں مجھے وزیر جان کو موت کے گھاٹ اُتارنا تھا۔

میں نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ یہاں میرے آزادانہ گھومنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ میرے سفری کاغذات اور میری اصل شناخت سب قانونی تھے لیکن وزیر جان اور اس کے حواریوں کی طرف سے مجھے خطرہ تھا۔

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے اپنا شیونگ وغیرہ کا سامان باتھ روم کے ایک ریک پر سجا دیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے شیو بنائی۔ مجھے کلین شیو تو ویسے بھی ہونا ہی تھا۔ کیونکہ راجیش کمار کلین شیو تھا۔ اس سے اتنا تو

ضرور ہوتا کہ فوری طور میں وزیر جان اور اس کے آدمیوں کی نظروں میں نہیں آسکتا تھا۔ شیو کرنے کے بعد میں نے غسل کیا۔ گیزر لگا ہوا تھا، میں نے یہاں بدلتے موسم کی مناسبت سے ہلکے گرم پانی سے غسل کیا۔ اس کے بعد نئے کپڑے پہنے جو سیاہ ٹائٹ جینز اور ہلکے بلیو کلر کی ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ جس میں میرا کسرتی جسم کسی چیتے کی طرح سبک اور تنا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ایسا صاف ستھرا اور چست لباس جو میرے توانا اور لمبے چوڑے جسم پر سجتا بھی ہو مجھے بہت پسند تھا۔ پیروں میں سیاہ مضبوط بوٹ پہنے، جسم کو ''وارم اَپ'' کرنے کے لیے میں نے ایک کھلے کمرے میں گراؤنڈ پنچ پریس کی۔ یہ تیاری کرنے کے بعد میں نے کچن میں جا کر اپنے لیے ایک اچھی سی کافی بنائی اور اسے پینے کے بعد میں باہر آگیا۔ گھر کو تالا لگا کر چابی اسی طرح چوکھٹ کے ایک خفیہ خلا میں رکھ دی جس طرح کاوشی کرتا تھا۔

میرے بال قدرتی طور پر ہلکے براؤن تھے۔ رنگ تو سرخ و سپید تھا ہی تاہم کلین شیو ہونے کے بعد میں بھی کوئی ''گورا'' ٹائپ آدمی نظر آرہا تھا۔

فضا میں سیلن کی بُو رچی ہوئی تھی اور ہلکی سرد سی ہوا چل رہی تھی۔ میرے پاس جرسی یا ایسا کوئی گرم لباس نہ تھا، مگر اب باہر آیا تو اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ تاہم میں نے تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا تاکہ خون کی گردش جسم کو گرم رکھے۔ موسم خنک تھا اور آسمان پر شاید بادلوں کا بسیرا تھا اسی لیے سرِ شام ہی رات کا گماں ہونے لگا تھا۔

ایک سڑک پر آیا تو ٹک ٹک کی مخصوص جرس نما گھنٹی کی آواز میرے کانوں میں پڑی، میں لپک کر اس طرف بڑھا تو سامنے سے وہ آتی دکھائی دی۔ میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا وہ رک گئی۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ اور لوگ بھی سوار تھے، ایک نگاہ اُنہوں نے مجھ پر ڈالی اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگے۔

ٹک ٹک پر بیٹھ کر میں مین چوراہے پر اُترا اور یہاں سے پیدل ایک فٹ پاتھ پر آگے چل پڑا۔

میں نے کاوشی سے سرسری طور پر اس علاقے تک جانے کا آسان اور محفوظ راستہ سمجھ لیا تھا تاہم کاوشی نے اس کے ساتھ ساتھ مجھے تنبیہ بھی کر رکھی تھی کہ میں یہاں کسی غیر قانونی سرگرمی میں خود کو ملوث کرنے سے گریز کروں، بہ صورت دیگر معاملہ ہاتھ سے نکل گیا تو اس کا اور میرا معاہدہ (جوزور آور خان) کے توسط سے ہوا تھا، ختم ہو جائے گا۔

اب انہیں کیا معلوم تھا کہ یہاں آتے ہی میرا ایک اہم دشمن سے ٹکراؤ ہو جائے گا۔ وزیر جان پاکستان ہی سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا مگر اس بدبخت کی یہاں بینکاک میں مل ٹاپ جیسے علاقے اور فوکٹ پیلس میں اس کی عظیم الشان رہائش گاہ دیکھ کر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ اسپیکٹرم ایسے ضمیر فروشوں کو کس قدر نوازتی تھی جس کی مثال وزیر جان میرے سامنے تھا۔ ماضی میں کیا حیثیت تھی اس کی...... ! کسی مل میں نچلے درجے کا مزدور تھا۔ اس کے بعد میری ماں کو بہلا پھسلا کر شادی کی، اسے دکھ دیے، مجھے باپ کے دھوکے میں رکھا اور ایک اذیت ناک کرب میں مبتلا کیے رہا، جب یہ انکشاف ہوا کہ وہ میرا اصلی باپ تھا ہی نہیں تو میں اللہ کے حضور شکر بجا لایا تھا کہ میں ایسے کمینے انسان کا بیٹا تھا ہی نہیں...... پھر کب اور کیسے وہ اسپیکٹرم کے چھپر تلے آیا اور اپنی دنیاوی اور مادی حیثیت کو ضمیر بیچ بیچ پروان چڑھاتا چلا گیا۔

''ہلو...... مسٹر......!''

اچانک ایک ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور تھائی لہجے میں کسی نے مجھے پکارا...... میں خیالات سے چونک کر رکا اور گردن گھما کے عقب میں دیکھا۔ وہ ایک ٹھگنے قد کا موٹا سا شخص تھا۔ مقامی باشندہ ہی تھا۔ عمر کا اندازہ چالیس پینتالیس سے متجاوز ہی ہوتا تھا۔

اس نے بھاری قسم کی شرٹ اور نیچے لفافہ نما پینٹ چڑھا رکھی تھی، آنکھیں چندی چندی سی تھیں۔

''یس......؟'' میں نے کہا۔

''آئی ہیو سم بیوٹی فل...... چیکس......''

میں سمجھ گیا تھا کہ ''چیکس'' سے مراد اس کی خوبصورت لڑکیاں ہی تھیں۔ تاہم اس خبیث کی بات سن کر میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ تھائی لینڈ بالخصوص بینکاک میں بڑی سستی عیاشیاں تھیں اور اس قسم کے ''سپلائرز'' شکار پھانسنے کے لیے جابجا پھیلے ہوتے تھے بلکہ آبرو باختہ عورتیں بھی کھلے عام ''ماڈل'' بنیں شکار پھانسنے کے لیے گھومتی رہتی تھیں، بالخصوص غیر ملکی شکار تو ان کے لیے سہل اور ''مہنگے'' ہوتے تھے۔

''نو تھینکس......'' میں نے کہا اور پلٹ کر آگے بڑھا۔

''ویت...... ویت...... ہاتورو......'' وہ بدبخت انگریزی اور تھائی ملا جلا کر بکتا دوڑتا ہوا میرے آگے آگیا اور اپنی پتلون کی جیب سے چند ہوشربا اور کم عمر

حسیناؤں کی تصاویریں نکال کر میرے چہرے کے سامنے لہرانے لگا۔

''دیز گرلز سولولی اینڈ ویری کو پریتو...... ویری چیپ پرائس، جسٹ تو ہنڈریڈ بھات......، آئم شور، یو ول لائک دیم......'' وہ میرے آگے آگے قدموں کو پیچھے بڑھاتے ہوئے جوش سے بولا۔ رکا میں بھی نہیں۔ میرا جی چاہا کہ اس کے چہرے پر ایک عدد گھونسا رسید کر ڈالوں مگر میں اپنی اس خواہش کو بمشکل دباتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ ڈھیٹ تھا، اس نے خاصی دور تک میرا پیچھا کیا۔ اس کم بخت سے جان چھڑانے کے لیے ایک جگہ تو میری نوبت بھاگنے تک کی آگئی تھی۔ میرے آس پاس سے گزرنے والے چند لوگ میری حرکت پر مسکرائے بغیر نہیں رہے تھے، چند ایک نے تو قہقہہ بھی لگا دیا۔ اسی وقت جب میں اس بدبخت سے جان چھڑا کر ایک موڑ مڑا تو کسی کے ساتھ ٹکرا گیا۔ نرم اور لطیف سے خوشبو بھرے احساس کے ساتھ ہی میری سماعت سے ایک مترنم سی ہلکی چیخ بھی ٹکرائی تھی اور پھر نہ میں سنبھل پایا نہ وہ...... یوں ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے اُلجھ کر فٹ پاتھ پر گر پڑے۔ اس نے کچھ سامان ہاتھوں میں اُٹھا رکھا تھا۔ وہ بھی فٹ پاتھ اور کچھ سڑک کنارے بکھر گیا۔ وہ میرے ساتھ گرتے ہی چیختے ہوئے میرے سینے پر مکے برسانے لگی، مجھے اس کے نرم و نازک ہاتھوں کے مکے کیا اثر کرتے، البتہ خفت آمیز شرمندگی سے میں خجل سا ہو گیا تھا۔ وہ تھائی زبان میں کچھ کہہ بھی رہی تھی۔ غصے اور خوف کا ملا جلا انداز تھا۔

''او...... میڈم! سو سوری...... ایکسٹریملی سوری! میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا ہوں۔''

میں نے انگریزی میں اس سے کہا اور جلدی سے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور خود بھی سیدھا ہو گیا۔ وہ ایک اُنیس بیس سالہ نرم و نازک اور خوب صورت سی لڑکی تھی۔ اس کے تراشیدہ سے ریشمی بال بکھر گئے تھے اور وہ ان سے بے پروا قدرے خم ہو کے اپنا میرون رنگ اسکرٹ درست کرنے لگی، جبکہ اس کا پلین باڈر والا خاصا چست بلاؤز کچھ اس مختصر سی حادثاتی دھینگا مشتی میں مزید آوارہ سا ہونے لگا تھا۔ اسکرٹ درست کرنے کے بعد اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور پُرکشش تھیں، غصے میں وہ جانے کیوں اور بھی دلنشیں محسوس ہو رہی تھیں۔ سیب جیسے گال سرخ ہو کے مزید شفق رنگ بکھیرنے لگے۔ میں تھوڑا نروس سا ہو گیا تھا اور اسے غصے میں پھنکتا دیکھ کر اپنے عقب میں گردن موڑی تو مجھے وہ موٹا تھائی دلال نظر آیا، وہ بھی ڈھیٹ بنا میرے تعاقب میں اسی طرف مڑا اور ہمیں دیکھ کر ساری صورتِ حال سمجھ گیا پھر حالات خراب پا کر وہ اُلٹے پاؤں وہاں سے کھسک گیا۔

اس تھائی لڑکی کا سامان کچھ زیادہ نہیں تھا مگر جتنا بھی تھا وہ میں نے جلدی جلدی سمیٹ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے جہاں وہ موٹا تھائی غائب ہوا تھا۔ اس سے پھر معذرتی انداز میں بولا۔

''دراصل مجھے یہ موٹا شخص تنگ کر رہا تھا اور میں اس سے جان چھڑانے کے لیے ہی بھاگ رہا تھا کہ آپ سے ٹکرا گیا۔''

وہ تھائی لڑکی جو ذرا ہی دیر پہلے برہم نظر آرہی تھی، میری بات سنتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے بھی شاید اس موٹے تھائی کو دیکھ لیا تھا اور بوکھلا کر واپس کھسکتے بھی...... یوں وہ سارا ''معاملہ'' سیکنڈوں میں ہی سمجھ چکی تھی۔ تب ہی وہ اسی انداز میں بولی۔

''اِٹس، اوکے۔ یہ لوگ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے کچھ زیادہ ہی پیچھے پڑ جاتے ہیں۔'' اس کی انگریزی بہت رواں اور شستہ تھی۔ اس اعتبار سے وہ مجھے خاصی پڑھی لکھی لگی۔ ''تم انڈین ہو......؟''

اس نے آخر میں اپنے شاپر کو اچھی طرح سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔ وہ دیگر تھائی عورتوں کی بہ نسبت سرو قد تھی اور جسم بھی متناسب تھا۔

''نہیں، میں پاکستانی ہوں۔'' میں نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ''درحقیقت یہ موٹا آدمی میری جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا، میرے پیچھے لگ گیا تھا اور عجیب و غریب عورتوں کی تصاویر دکھا کر مجھے ریجھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور نوبت یہاں تک آگئی کہ مجھے بھاگنا پڑا تو موڑ کاٹتے ہی تم سے ٹکرا گیا۔'' وہ پھر مسکرائی۔

گو وہ خوب صورت تھی مگر اس کی آنکھیں دو آتشہ تھیں۔ اس لیے کہ مجھے اس کی آنکھوں میں نرمی اور لطافت بھری مسکراہٹ کا تاثر جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ آنکھیں جو ایسا تاثر رکھتی تھیں مجھے بہت بھا جاتی تھیں۔ یہ وہ آنکھیں اور چہرہ تھا جن میں بیک وقت گداز سی مسکراہٹ اور معصومیت کا عنصر بھی غالب تھا اور یہی وہ متاعِ حسن و جمال تھا جس سے قدرت نے عابدہ کو بڑی فراغ دلی سے نواز رکھا تھا۔ وہ تو حسن و جمال میں یکتا تھی مگر اس تھائی لڑکی میں کچھ ایسی بات ضرور تھی جسے ایک نظر دیکھتے ہی میں اس کا عابدہ سے

موازنہ نہ کر بیٹھا تھا، اگرچہ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ مجھے اس لڑکی میں عابدہ کے حسن کی صرف ایک جھلک کی محض ہلکی سی مماثلت محسوس ہوئی تھی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔
وہ ہولے سے کھنکھاری...... میں خیالات سے چونکا...... پتا نہیں وہ کیا سمجھی تھی مجھے اس طرح اپنی جانب چند ثانیے تک گھورتا پا کر...... جبکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو میں نے اپنی ''پارسائی'' کا اسے ثبوت دیا تھا۔
''ایک بار پھر میں معذرت خواہ ہوں میڈم! آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟'' میں نے جلدی سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا اور ساتھ ہی مسکراتے ہوئے ایک قدم بھی بڑھا دیا مگر دوسرے ہی لمحے ہلکی سی کراہ کے ساتھ وہ گرنے کے قریب ہو گئی اور غیر ارادی طور پر میرے دونوں بازو اسے گرنے سے سنبھالا دینے کے لیے آگے ہوئے اور وہ ان میں سما گئی۔ اس کا نرم و گداز وجود میرے بازوؤں میں بھر گیا اور گلاب سا چہرہ میرے سینے سے یوں ٹک گیا کہ اس کے گھنے تراشیدہ گیسو میرے چہرے پر سیاہ بدلی کی طرح بکھر گئے۔ ایک فرحت آگیں سی نکہت میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور مجھے بے خود سا کرنے لگی۔
اس نے بھی سنبھلنے سے معذوری ظاہر کی اور اسی طرح مجھ سے لگی کراہنے لگی تو مجھے فکر ہوئی......
''کک...... کیا ہوا......؟ شاید تمہیں کوئی چوٹ آگئی ہے۔'' میں نے کہا اور دھیرے سے اسے سنبھالا دیا تو وہ اپنا ایک ہاتھ اپنے دائیں کولہے پر رکھتے ہوئے بولی۔
''گرنے کی وجہ سے شاید میری ہپ کا کوئی مسل ٹل ہو گیا ہے۔ کیا تم میری چھوٹی سی مدد کر سکتے ہو؟ پلیز۔''
''شیور...... وائے ناٹ......'' میں نے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔
''یہاں سے تھوڑی ہی دور میرا مساج پارلر ہے...... وہاں تک مجھے سہارا دے کر چھوڑ دو......''
''میں ٹیکسی روکتا ہوں اور آپ کو وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔''
''ٹیکسی کی ضرورت نہیں، میں نے کہا نا...... بس، یہی ایک اسٹریٹ ہے، اس کے اختتام پر ہی میرا چھوٹا سا مساج پالر ہے میں وہیں جا رہی تھی۔''
اسے یہ چوٹ میری وجہ سے لگی تھی، کچھ یوں بھی میرا اخلاقاً فرض بنتا تھا کہ میں اس کی کم از کم اتنی تو مدد کر ہی دوں، لہٰذا سب سے پہلے میں نے اس کے ہاتھ سے شاپرز لیے اور پھر اسے سہارا دیا اور چل پڑا۔

اس مختصر سے دورانیے میں اس نے مجھے اپنا نام سانچی بتایا اور میں نے اپنا...... اور یہ بھی کہ وہ ایک مساج پارلر میں سات گھنٹے کی جاب کرتی تھی، نیز اس کے مساج پارلر میں صرف خواتین ہی آتی تھیں۔ وہ صبح دس بجے پہنچ جاتی تھی اور پانچ بجے اس کی ڈیوٹی آف ہو جاتی تھی۔
بہرکیف اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اسٹریٹ کی یہ دیوار اختتام پذیر ہوئی تو ہم دائیں جانب مڑے۔ بالکل کارنر پر ہی مجھے ایک شیشے والی خاصی بڑی سی دکان نظر آگئی، جس کی پیشانی پر جلتے بجھتے نیون سائن پر ''لارا مساج پارلر'' انگریزی میں اور اس کے نیچے تھائی زبان میں کچھ ٹیڑھے میڑھے الفاظ میں یہی کچھ درج تھا۔ اس کے بالمقابل ہی مجھے ایک بڑے ''مال'' کی دو منزلہ عمارت بھی نظر آئی۔ جس پر ''کوچی کانگ شاپنگ مال'' کے نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ نیچے تھائی زبان میں بھی شاید یہی کچھ لکھا تھا۔ وہاں لوگوں کی اچھی خاصی آمدورفت دیکھنے میں آرہی تھی۔ خاصا معروف شاپنگ مال تھا۔
''یہ سپھر امانیا کا سب سے بڑا اور مشہور شاپنگ مال ہے۔'' سانچی نے بتایا۔ ''ابھی چند ماہ پہلے ہی اس کا افتتاح شہر کے میئر نے کیا تھا۔''
''ہم...... خاصا بڑا ہے اور لگتا بھی ایسا ہی ہے کہ جلد ہی خوب چل نکلا ہے۔'' میں نے بھی بات سے بات نکالی۔ سانچی نے مزید بتایا۔
''ہاں! اس کی وجہ سے ہمارا یہ مساج پالر بھی پہلے سے زیادہ دوڑنے لگا...... اس عمارت کی دیوار ہمارے پارلر مساج سینٹر کے ساتھ ہی ملی ہوئی ہے۔'' میں نے پارلر کی جانب قدم بڑھا دیا۔
شیشے کے دروازے سلائڈنگ تھے جو بند تھے۔ ان کے درمیان متوازی لکیر پر جہاں اسٹیل کا ہینڈل نظر آرہا تھا۔ وہاں ''کی لیس'' لوک سسٹم کے روشن نمبروں پر اس نے اپنی مخروطی انگلیوں سے کوئی کوڈ ملایا اور گلاس ڈور دائیں بائیں سرک گئے۔ مجھے پہلے حیرت ہوئی، کیونکہ اس نے جو کوڈ ملایا، تو وہ مجھے بھی ازبر ہو گیا تھا۔ مختصر اور آسان سا ہی کوڈ تھا۔ یعنی 9190 لیکن دوسرے ہی لمحے جب میں نے روشن نمبروں کا رنگ جو پہلے سرخ تھا بعد میں سبز ہو گیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس لاک سسٹم میں صرف کوڈ کا ہی نہیں بلکہ فنگر پرنٹ کا بائیومیٹرک سسٹم بھی اٹیچ تھا۔ ورنہ تو میں بھی سمجھا تھا کہ اس طرح تو کوئی بھی یوں کوڈ ملاتے ہوئے اسے ذہن نشین کر سکتا تھا۔ لیکن فنگر پرنٹ جو پہلے ہی سے اندر ڈیٹا

بیس پر تھے۔ ان سے میچ نہیں ہوتے۔

میں اسے سہارا دیے اندر لے آیا۔ ہمارے عقب میں دروازہ خودکار طریقے سے دوبارہ بند ہوگیا۔ سامنے ہی ایک خوب صورت سی کاؤنٹر ٹیبل کے پیچھے موجود دبلی پتلی سی عورت ہماری طرف بڑھی، اس کے چہرے پر تفکر تھا۔ وہ درمیانی عمر کی تھی۔ اس نے تھائی زبان میں ہی اس سے کچھ پوچھا تھا۔

وہاں میں نے کچھ اور خوب صورت سی تھائی لڑکیاں دیکھیں جو اپنی وضع قطع سے ''مالشی'' نظر آتی تھیں۔ وہ میری طرف پُرشوخ نگاہوں سے دیکھ کر ایک دوسری کو کہنی کا ٹھوکا مار کے کچھ کہتیں اور پارلر کی اس خاموش اور سکون آور فضا میں مترنم قہقہوں کے جلترنگ سے بج اُٹھتے۔ انہی میں سے ایک درمیانی عمر والی عورت نے انہیں تھائی زبان میں ڈانٹا۔

اس دوران عورت اور اس مضروب لڑکی کے درمیان تھائی لفظوں میں کچھ تبادلہ ہوا اور پھر وہ عورت میری طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائی، اس کے بعد سانچی کو سہارا دیے اندر ایک کمرے میں آ گئی۔ یہ کمرا مجھے مساج روم ہی نظر آیا تھا۔ کمرا چھوٹا سا تھا، وسط میں ایک مساج کاؤچ رکھا تھا۔ عورت نے سانچی نامی لڑکی کو اس پر پیٹ کے بل لٹا دیا اس کے بعد قریب رکھے ریک پر سے ایک باسکٹ اُٹھالی، اس کے ساتھ بیلٹ لگی ہوئی تھی جو اس نے اپنی پشت کے گرد باندھ لی، اب یہ باسکٹ ''ہینڈ فری'' ہوگئی تھی۔ عورت نے باسکٹ کا کیپ اُٹھایا تو اس کے اندر قطار سے لگی ہوئی مختلف آئل کی بوتلوں کے سرے جھانکنے لگے۔ اس کے اندر یقیناً بھانت بھانت کے تیل بھرے ہوئے تھے، ان بوتلوں کی خوبی یہ تھی کہ انہیں باسکٹ کے خانوں سے نکالے بغیر ہی ان کا مخصوص ساخت کا پلاسٹک کیپ ہتھیلی سے دبا کر کھولا جاتا تو لوشن یا آئل ہتھیلی پر آجاتا۔

سانچی کو لٹانے کے بعد وہ اس کے کولہے پر سے اسکرٹ ہٹانے لگی تو میں سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت عقب سے عورت کی آواز آئی۔

''تم ذرا باہر ویٹ کرنا...... او کے......؟'' اس نے انگریزی میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں رکنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں نے سانچی کو یہاں پہنچا کر اپنا کام کر دیا تھا لٰہذا...... میں نے معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا۔

''میں ایک ضروری کام سے جا رہا تھا۔ بہتر ہوگا کہ میں اب چلا جاؤں۔'' اس پر وہ عورت تو کچھ نہ بولی، البتہ سانچی نے کاؤچ پر اُلٹے لیٹے میری طرف سر گھما کر دیکھا۔ وہ عورت ایک طرف ہٹ گئی تھی۔ تاکہ سانچی مجھ سے مخاطب ہوسکے۔

وہ بولی۔ ''تمہارا شکریہ! میں تو چاہتی تھی کہ تم سے اور باتیں کی جائیں، لیکن تم کسی ضروری کام سے جا رہے ہو اسی لیے میں روک نہیں سکتی، مگر یہاں دوبارہ آنا۔ مجھے خوشی ہو گی۔''

''اوکے، تھینکس۔'' میں نے مسکرا کے ایک ہاتھ اُٹھا کر اسے بائے کہا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ سامنے دروازہ تھا۔ ایک لڑکی نے اب کاؤنٹر ٹیبل سنبھال لی تھی، دو لڑکیاں جن کے پہلو سے وہی مساج والی باسکٹ بیلٹ جھول رہی تھی، ایک کونے میں بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں، مجھے دیکھ کر وہ مسکرائیں۔ میں سیدھا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ دھکیلنے کے لیے میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور ہینڈل پکڑ کر دھکا دیا تو وہ نہیں کھلا۔ میں نے دو ایک بار ہلکے سے زور لگایا تو ایک دم سلائڈ ہوگیا۔ اسی وقت مجھے لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ انہی کی شرارت تھی، کاؤنٹر ٹیبل پر موجود لڑکی نے کوئی بٹن دبایا تھا۔

میں نے ابھی مساج پارلر سے ایک ہی قدم باہر نکالا تھا کہ گولیوں کی زبردست تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا اور اسی طرح واپس اندر پلٹ آیا۔ دروازہ دوبارہ خودکار انداز میں سلائڈ ہوگیا۔ اندر موجود لڑکیاں بھی فائرنگ کی گھن گرج سن کر دہشت زدہ سی ہوگئی تھیں۔ سامنے سڑک پر رواں ٹریفک کی ترتیب بھی بکھرنے لگی اور کئی گاڑیوں کے ٹائروں کے چرچرانے کی آوازیں اُبھریں۔ بہت سے لوگوں کے شور کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ کمروں میں موجود مساج کراتی اور کرتی ہوئیں عورتیں بھی خوف زدہ اور سوالیہ چہروں کے ساتھ گھبرائی ہوئی باہر نکل آئیں، ان میں وہ عورت اور سانچی بھی تھی۔ میں وہیں پریشان سا کھڑا تھا، فائرنگ اور شور کی سمع خراش آوازیں پارلر کے اندر بھی دبی دبی سی سنائی دے رہی تھیں، کیونکہ دروازہ بند تھا۔

''ی...... یہ کیا اور کہاں ہو رہا ہے......؟'' وہ عورت سراسیمہ انداز میں میری طرف دیکھ کر یوں بولی جیسے میں ہی اس کی وجہ ہوں۔

''مم...... مجھے تو یہ آوازیں پاس کے شاپنگ مال سے آتی محسوس ہو رہی ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی گھبرائی ہوئی کھڑی سانچی نے کہا۔ ٹھیک اسی وقت کان پھاڑ دینے والے دھماکے کی آواز اُبھری، پورا پارلر لرز گیا۔ اندر دھواں اور گرد و غبار پھیل گیا۔ شیشے کا دروازہ ٹوٹ کر کانچ اندر اور باہر فٹ پاتھ پر بکھر گیا۔ ایک طرف کھڑی کئی عورتیں اُڑتی ہوئی دائیں بائیں گریں، باقی عورتیں چیخیں مارتی ہوئی باہر دوڑیں۔ مجھے مذکورہ سمت کی پوری ہی دیوار گری ہوئی نظر آئی اور وہاں سے میں نے چار پانچ اسلحہ بدست اور چست لباس میں ملبوس افراد کو نمودار ہوتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے حلق پھاڑ کر ہم سے تھائی زبان میں کچھ کہا تھا، وہاں ہم تینوں سمیت، چند اور لڑکیاں اور خواتین بھی تھیں، وہ فوراً چیختی ہوئی اپنے سروں پر دونوں ہاتھ رکھے زمین پر اکڑوں بیٹھ گئیں۔ ان مسلح دراندازوں نے چہروں پر فل نقاب چڑھا رکھے تھے جہاں سے صرف آنکھوں کانوں، منہ اور ناک کی جگہ خالی رکھی گئی تھی۔

ان کی دھمکی کا مفہوم سمجھتے ہوئے میں نے بھی اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے۔

ان میں سے ایک نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا تھا۔ وہ ہمیں جانوروں کی طرح ہانکتے ہوئے اسی دیوار کے سوراخ سے دوسری طرف لے گئے۔ ایک عمر رسیدہ عورت جو مساج کروانے آئی تھی، وہ زیادہ ہی تھڑدلی ثابت ہوئی اور اس نے ان مسلح افراد سے منتیں کرنا شروع کر دیں۔ نقاب پوش بھیڑیئے جیسی غراہٹ سے اسے پرے ہٹنے اور خاموش ہونے کے لیے کہہ رہے تھے، مگر وہ عورت اس قدر خوف زدہ تھی کہ ہسٹریائی انداز میں ان نقاب پوشوں سے روتے چلّاتے ہوئے منتیں کرنے لگی تو ایک نے اپنے ماؤزر کی نال کا رخ اس کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور وہ عورت اُڑتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی، اس کے سینے میں بڑا سا سرخ روشندان بن گیا تھا۔ باقی عورتیں اس بربریت پر اس قدر دہشت زدہ ہو گئیں کہ انہوں نے رونا چلّانا بند کر دیا۔

میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں یہی آرہا تھا کہ یہ کوئی ڈکیتی کی واردات ہے، یہ پورا گروہ اس شاپنگ پلازا کو لوٹنے آیا تھا، لیکن پھر فوراً ہی کچھ سوچ کر میں نے اپنا یہ خیال رد کر دیا۔

ہمیں مساج پارلر کی اسی ٹوٹی ہوئی دیوار سے اندر شاپنگ سینٹر میں لایا گیا تھا، یہاں کا نقشہ ہی تھرا دینے والا تھا۔ بڑے سے ہال کے چکنے فرش پر چند لاشیں اور ان کے قریب خون پھیلا ہوا تھا۔ اُوپری حصے کی طرف جاتے ہوئے مال کے دو رُویہ سمتوں میں بنے متحرک زینے رکے ہوئے تھے، وہاں بھی لرزہ خیز بربریت کی نشانیاں چند آڑی ترچھی اور ڈھلکتی ہوئی لاشوں کی صورت میں نظر آئیں، کچھ تو لڑھک کر نیچے آن گری تھیں۔ وہاں بھی شاپرز بیگ اور خریداری کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ یہ شاپنگ کے لیے آئے ہوئے بدنصیب خریدار مرد عورتوں کی لاشیں تھیں۔ ایسے ہی بہت سے لوگ جن میں مرد عورتیں اور بچے بوڑھے سب ہی شامل تھے، ہال کے وسط میں گن پوائنٹ پر یرغمال بنے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے خوف و دہشت سے سفید ہو رہے تھے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو اپنے ساتھ دبوچ رکھا تھا۔ ان کے سروں پر چار افراد جدید اسالٹ رائفلیں پکڑے کھڑے تھے۔ یہ چاروں بغیر نقاب کے تھے۔ ان میں ایک کریہہ صورت لمبا تڑنگا کسرتی بدن شخص بھی تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور آنکھیں یچی یچی سی تھیں، جبڑوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی اور ہونٹ موٹے تھے۔ اس کے ہاتھ میں جدید مشین پسٹل تھا۔ اس کے چہرے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی درندگی مترشح ہو رہی تھی۔ اس نے نیچے ڈھیلی ڈھالی پتلون اور اُوپر شلوکا نما بغیر آستینوں کی قمیص پہنی تھی، جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ جہاں سے اس کے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ وہ ان لٹیروں کا سرغنہ لگتا تھا، باقی اس کے ساتھ کھڑے بے نقاب تین ساتھی تھے۔ انہوں نے ہیوی اسالٹ تھام رکھی تھیں۔ ان کے ہتھیاروں کی ساخت سے مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ عام ڈکیتیاں کرنے والے گروہ کے لوگ نہیں ہو سکتے، ورنہ یہ لوگ اتنے دھماکے نہیں مچاتے نہ ہی یوں اطمینان سے کھڑے ہوتے۔ چہرے مہرے سے بھی وہ انتہائی تربیت یافتہ دکھتے تھے۔

ان یرغمال لوگوں میں اب ہم بھی شامل ہو گئے تھے۔ کچھ خون آلودہ لاشیں بھی بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں، ان کے شاپنگ بیگز کھل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے، ان میں سے اشیاء، کھلونے، کھانے پینے کی چیزیں سب نکل کر ہال کے چکنے فرش پر پھیلی ہوئی تھیں، خون کا تالاب بھی بنا ہوا تھا۔ ان درندوں نے خاصی خون ریزی پھیلائی تھی۔ ایسا ان درندوں نے یقیناً باقیوں پر اپنی دہشت طاری کرنے کے لیے کیا تھا۔ لوگوں کو اپنا مطیع بنانے کے لیے ہلکی ساخت کے بم دھماکے بھی کیے گئے تھے، ہم شاید اسی لیے لپیٹ میں

آ گئے تھے کہ مساج پالر کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ میں نے مشاہداتی نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ معاملہ ڈکیتی سے کچھ ''اُوپر'' کا تھا۔ کیونکہ ان کے ہاتھوں میں سوائے خطرناک اسلحے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی یہ لوگ ایسی کوئی حرکت کرتے نظر آرہے تھے، بلکہ یہ آٹھ دس اسلحہ پوش ہم سب کو ایک جگہ پر محبوس کیے ہوئے ملک الموت بنے سروں پر کھڑے تھے۔

مساج پارلر کی وہ عورت اور سانچی میرے دونوں بازو پکڑے چپکی بیٹھی تھیں۔ خوف اور سراسیمگی کے سبب ان کے جسموں کا ارتعاش میں محسوس کررہا تھا۔ ہم سب فرش پر بیٹھے تھے۔

میرا دل جیسے کانوں اور کنپٹیوں پر دھڑ دھڑا رہا تھا۔ میرے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ بے کار میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ یہ لوگ بڑے بے رحم اور خطرناک نظر آرہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کا مقصد کیا تھا کہ اچانک باہر پولیس کی متعدد گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی آن پہنچیں مگر یہ لوگ اسی طرح اطمینان سے کھڑے رہے۔ ان کا سرغنہ موبائل پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی کو دھمکا رہا ہو۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور کس سے باتیں کر رہا ہے؟'' میں نے اپنے ساتھ دبکی ہوئی سانچی سے دھیمی سرگوشی میں پوچھا تو وہ بھی کپکپاتی سرگوشی میں بولی۔

''یہ لوگ میئر سے باتیں کر رہے ہیں، ان کے کچھ ساتھی جیل میں قید ہیں اور یہ ان کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں اسی لیے ہمیں یرغمال بنا رکھا ہے۔''

''او......'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''لل......لیکن میئر نے ان کا مطالبہ نہیں مانا تو یہ ہمیں ایک ایک کر کے گولی مار دیں گے۔'' اس عورت نے بھی خوف میں ڈوبی سرگوشی کر ڈالی۔ اس خطرناک صورتِ حال سے وہ کچھ زیادہ ہی خوف زدہ اور حواس باختہ نظر آرہی تھی، اسی سبب اسے اپنی آواز پر بھی قابو نہ رہا اور یوں اس کی لرزیدہ سی آواز پاس کھڑے ایک دہشت گرد کے کانوں تک جا پہنچی، اس نے خونخوار نظروں سے عورت کی طرف دیکھا اور پھر اپنی گن کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتا ہوا وہ ہماری طرف بڑھا۔ قریب آتے ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑی بیدردی سے اُسے کھینچ لیا۔ وہ چیخنے لگی۔ سرغنہ موبائل پر باتیں کرنے کے دوران میں اپنے ساتھی دہشت گرد کی طرف دیکھ کر اس بار انگریزی میں چلّایا۔

''اس کُتیا کو چپ کراؤ...... میں بات کر رہا ہوں۔''

دہشت گرد نے عورت کی گردن دبوچ لی۔ میرے وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں اب تک خاموشی سے اچھے وقت کے انتظار میں تھا کہ کسی چکر میں خود کو حادثاتی طور پر بھی ملوث کیے بنا اس اجنبی سرزمین پر سکون سے چند دن گزار سکوں لیکن ظلم و بربریت کا یہ کھیل بھی برداشت کرنا میری فطرت میں شامل نہ تھا۔

دہشت گرد نے اپنے سرغنہ کی درشت تادیب پر عورت کو گردن سے پکڑ کے ایک دوسری جگہ لے جا کر پٹخ دیا۔ وہ مزید دہشت زدہ ہوگئی اور اس پر موت کے خوف سے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا۔ باہر کھڑی پولیس کی گاڑیوں کی چھت پر لگے سرخ اور نیلے ہوٹرز کی گردشی روشنیاں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ وہ پولیس کو قریب پا کر اور انہیں نجات دہندہ جان کر اُٹھ کر دوڑی۔

موت...... یقینی موت کا تصور دل و دماغ میں اپنا غلبہ پالے تو ایسی ہی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں، وہ بھی شاید اعصابی طور پر کمزور ثابت ہوئی تھی۔ وہ ابھی چند قدم ہی دوڑ پائی تھی ایک گولی چلنے کا ساعت شکن دھماکا ہوا اور عورت کی پیشانی میں سرخ روشندان نمودار ہو گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر ہی چکنے فرش پر گری اور لڑھکتی چلی گئی۔ سرغنہ نے موبائل کان سے لگائے ہوئے اپنے مشین پسٹل سے اس بدنصیب عورت پر گولی چلا دی تھی اور وہ بدستور اسی طرح باتوں میں مشغول رہا جیسے کسی جانور پر گولی چلائی ہو۔ اس بے رحم درندے کی اس کھلی بربریت پر وہاں موجود کئی یرغمالیوں کی گھٹی گھٹی خوف زدہ سی چیخیں سنائی دیں۔ میرے ساتھ چپکی بیٹھی سانچی بھی بری طرح سہم گئی اور اس نے گھٹے گھٹے انداز میں سسکنا شروع کر دیا۔

''ششش...... کوئی آواز منہ سے مت نکالو......'' میں نے اس کے کان میں ہلکے سے تنبیہی سرگوشی کی۔ ''ان پر خون سوار ہے۔ فکر مت کرو، میں کچھ کرتا ہوں۔''

اس نے سسکنا بند کر دیا۔

میں نے اب اپنے ذہن سے سارے خدشات و خطرات کو جھٹک دیا اور اس نازک صورتِ حالات سے نمٹنے اور راہِ فرار کے بارے میں غور کرنے لگا۔ میری ان لوگوں سے کوئی دشمنی نہ تھی اور نہ ہی میں کوئی ''کارنامہ'' انجام دینے کے موڈ میں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر ان سب بے گناہ انسانوں کو ان بے رحم درندوں سے اس طرح چھٹکارا دلاؤں کہ کامیابی کی صورت میں میری کسی

بھی قسم کی ذرا شہرت نہ ہونے پائے۔

ان کا سرغنہ فون کر کے فارغ ہوا تھا کہ ایک دم باہر کھڑی پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹر چلانا بند ہو گئے، بھی نہیں وہ مال کے سامنے سے بھی ہٹ کر چند فرلانگ کے فاصلے پر جا کھڑی ہوئیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ فون پر دہشت گردوں اور انتظامیہ کے مابین کوئی ''معاملہ داری'' ہوئی تھی مگر صورتِ حال۔ ہنوز مخدوش ہی نظر آتی تھی۔

میرے سامنے مال کے بڑے سے گیٹ کا منظر تھا۔ سرغنہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا ہمارے قریب آیا اور پھر ہم یرغمالیوں پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالنے کے بعد جیسے خودکلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔

''ہوں ں...... ہمیں انتظامیہ کو اپنا مطالبہ جلد از جلد منوانے کے لیے ہر ایک گھنٹے بعد لاش کی صورت میں ایک تحفہ انہیں دینا ہوگا۔''

چونکہ مال میں ہر رنگ و نسل کے لوگ آئے ہوئے تھے، ان میں سکھ بھی تھے انڈین بھی اور یورپین بھی، شاید اسی لیے سرغنہ انگریزی میں ہی بول رہا تھا۔ تاہم کثرت مقامی تھائی باشندوں کی بھی تھی۔ لہٰذا انگریزی بولنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ ہم بھی ان کے خطرناک عزائم جان کر دہشت زدہ ہو کے بلاچون وچرا ان کا حکم مانتے رہیں۔ اب وہ ایک ایک یرغمالی کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس درندے سے کسی یرغمالی کو نظریں ملانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی، وہ اس کی طرف دیکھتا اور وہ اپنا منہ پھیر لیتے۔ تب ہی اس کی نظریں سانچی اور مجھ پر پڑیں۔ سانچی اور میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی نظریں ہمارا طواف کرتی ہوئی دوسری جانب سرک جائیں گی، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی پاٹ دار آواز اُبھری۔

''تم...... کھڑے ہو جاؤ......'' یہ مختصر الفاظ اس نے انگریزی میں ہی ادا کیے تھے۔ میرا دل ایک دم دھک سے رہ گیا۔ میں نے ڈرنے کے سے انداز میں دھیرے دھیرے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں میرے ساتھ خوف زدہ بیٹھے ایک یورپین جوڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ نوجوان مرد عورت تھے، اب پتا نہیں بھائی بہن تھے یا پھر میاں بیوی۔ بیوی خوش شکل تھی، بال سنہری تھے اور چہرہ کتابی، وہ خاصی حسین انگریز عورت تھی۔ وہ سرو قد بھی تھی بلکہ مرد سے اس کا قد ایک دو انچ اونچا ہی تھا۔ اس نے ٹائٹ پینٹ شرٹ اور کھلے گریبان کی بنیان ٹائپ شرٹ پہن رکھی تھی۔ مرد عام سی شکل وصورت کا مالک تھا اور اس نے بھی پینٹ شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ تاہم سرغنہ کا تخاطب وہ مرد ہی تھا۔

اُس بے چارے کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا اور وہ کپکپاتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''نن...... نہیں، نخ...... خدا کے لیے نہیں......'' وہ عورت ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مم...... میرے شوہر کو کچھ مت کہو، ہمارے چھوٹے بچے ہیں۔''

وہ بے رحم سرغنہ شاید اس کے شوہر کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتا تھا۔ عورت بھی اپنے شوہر کے ساتھ ہی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے آگے ڈھال بن گئی تھی۔

سرغنہ کے بدہیئت ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ اُبھری اور ساتھ ہی میں نے اس کی آنکھوں میں بے رحم چمک کو بھی اُبھرتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنے اُلٹے ہاتھ کا بھاری بھرکم تھپڑ عورت کے چہرے پر اس زور سے جڑ دیا کہ...... وہ چیختی ہوئی دور جا گری۔ اگلے ہی پل اس کا دایاں ہاتھ اُٹھا اور اس میں دبا ہوا پسٹل گرجا۔ پسٹل کو اس نے شاید سنگل شاٹ پر ایڈجسٹ کر رکھا تھا۔

گولی چلی اور مرد کی پیشانی توڑتی ہوئی آر پار ہو گئی۔ وہ کھڑے کھڑے کوئی آواز نکالے بغیر لہرایا پھر سانچی اور میرے اُوپر آن گرا۔ اس طرح کہ اس کا خون آلودہ سر میری گود میں آن پڑا تھا اور بے جان کا وجود، فرش پر...... میری نظریں اس بدنصیب کے بے نور مگر کھلی آنکھوں والے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ مجھے اپنے دماغ کی رگوں میں گرم گرم خون کی ٹھوکریں محسوس ہونے لگیں۔ انسان چاہے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، انسانی رشتے کے اعتبار سے اس ظلم پر میرا جی بھر آیا تھا۔ اس کی بیوی جو اب بیوہ ہو گئی تھی اور خود اس کی بھی زندگی کی کیا ضمانت تھی۔ اس کے فریاد کناں الفاظ میری سماعتوں میں گونجے، جو اس نے درندہ صفت دہشت گرد سرغنہ سے منت کرتے ہوئے کہے تھے۔

''نن...... نہیں، نخ...... خدا کے لیے نہیں...... مم...... میرے شوہر کو کچھ مت کہو، ہمارے چھوٹے بچے ہیں۔''

تبھی میں نے عہد کر لیا کہ اگر اللہ کی رضا اسی میں تھی کہ میں باقی بے گناہ اور معصوم انسانوں کو اس بربریت سے بچانے کی کوشش کروں تو یہ میرا انسانی فرض بنتا ہے جس کا حکم میرے مذہب کا بھی تھا۔

سانچی خوف سے چیخی۔ چند یرغمالیوں میں سے بھی بھرائی ہوئی چیخوں کی آوازیں اُبھری تھیں۔

''اوہو......نو......نو......'' میں نے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی لاش کو خود سے پرے دھکیلا اور ساچی سمیت تھوڑا دور جا کھسکا۔

سنہرے بالوں والی عورت...... جو سرغنہ کا تھپڑ کھا کے ذرا دور ایک اور دہشت گرد کے پیروں کے قریب فرش پر جا پڑی تھی، وہ گولی کی آواز اور اپنے شوہر کو گرتا دیکھ کے وہیں پڑی رہ گئی تھی۔ اس بے چاری کو سکتہ ہو گیا تھا۔ ابھی محض چند لمحے پہلے ہی تو اس کا شوہر جیتا جاگتا اس کے ساتھ کھڑا تھا اور پلک جھپکتے میں موت کی اندھیاری وادیوں میں جا اُترا تھا۔ اسی سنگین گھڑی نے سنہرے بالوں والی عورت کو سکتے میں مبتلا کر دیا تھا، یہ اس کے لیے ایک عذاب ناک اور سنگین گھڑی تھی کہ قیامت تھی جو اس پر...... اس کی آنکھوں کے سامنے ٹوٹی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ایک صدمے سے بھری اور کپکپاتی ہوئی چیخ ماری اور اُٹھ کر گرتی پڑتی اپنے شوہر کی لاش پر جا گری۔ دوسرے ہی لمحے اسے جانے کیا ہوا کہ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور سرغنہ پر وحشی بلی کی طرح جھپٹی۔ اس نے اپنے نکیلے اور لانبے ناخنوں سے اس کے کریہہ چہرے پر سرخ نشان ڈال دیے۔ سرغنہ نے ایک ہاتھ سے اس کے بال پکڑ لیے اور جھٹکا دے کر خود سے پرے کر دیا مگر چھوڑا نہیں۔ البتہ اپنے ایک قریب کھڑے ساتھی سے تھائی زبان میں کچھ کہا اور پھر عورت کو اس کی طرف دھکیل دیا۔ اس نے عورت کو دبوچا اور اپنا ایک ہاتھ اس کی مخروطی گردن کے گرد کسا اور پھر نجانے اس کے کان میں کیا کہا تھا کہ عورت کا ہسٹریائی پن دم توڑنے لگا اور وہ سہم سی گئی۔ اس کے بعد اسے ایک طرف دھکا دے دیا۔ ایک عمر رسیدہ تھائی عورت نے فوراً اسے سنبھالا اور اپنے ساتھ لگا کر بٹھا دیا۔

میری آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ سرغنہ نے اپنے دو ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا اور پھر انہوں نے بدنصیب مرد کی لاش کو ڈنڈا ڈولی کر کے اُٹھایا اور مال سے باہر لے جا کر قوس کی صورت بنے قدمچوں سے نیچے سڑک پر لڑھکا دیا۔

سرغنہ پھر فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ وہ یقیناً میئر سے مخاطب تھا اور اسے تحفے کے بارے میں بڑی مکروہ اور سنگدلانہ مسکراہٹ سے بتا رہا تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے کسی اور سے بھی فون پر مخاطب ہو جاتا تھا، تب اس کا لہجہ بدل کر یک دم مؤدبانہ ہو جاتا تھا۔

''گویا اس کا بھی کوئی باس تھا۔'' میرے ذہن میں اُبھرا۔

میرا منہ خشک ہو رہا تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہونے لگی۔ میں بار بار اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر رہا تھا۔ ان دہشت گردوں سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ کب کس یرغمالی کی بات یا حرکت سے مشتعل ہو کے گولی چلا دیں۔

لاش کی صورت میں موت کے ان ہرکاروں نے پہلا تحفہ بینکاک کی انتظامیہ کو دے دیا تھا۔ اب ایک گھنٹا گزرنے کے بعد وہ اگلے تحفے کے لیے نجانے کس بدنصیب یرغمالی کو موت کا شکار کرنے والے تھے۔ اس اگلی ''باری'' پر ہر کوئی خوف زدہ تھا کہ کیا خبر اب اس کی باری آ جائے۔ موت ان کے سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار تھی۔

وقت ہر لحظہ موت کی دستک دیتا دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ اس دوران میں سرغنہ نے اپنے چار ہرکاروں کو کوئی ہدایت دی اور وہ فوراً حرکت میں آئے۔ دو زینے کی طرف بڑھ گئے، باقی دو نے مین گیٹ کا رخ کیا۔ میں دُزدیدہ نظروں سے ان کی تعداد کا درست تعین کر رہا تھا جو مجھے سات کے قریب دکھائی دے رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کے ساتھی ہرکارے سب اِدھر ہی یرغمالیوں کے گرد پہرے پر موجود تھے۔ اب کہیں جا کر سرغنہ نے اپنے چار ساتھیوں سے نجانے کیا کہہ کر انہیں کہاں اور کس لیے روانہ کیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ہلکی سرگوشی میں ساچی کے کان میں کہا۔

''اس نے اپنے ساتھیوں سے کیا کہہ کر اور کہاں بھیجا ہے؟''

جواباً ساچی نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری، سہمی ہوئی نظروں سے اس نے اُس ہرکارے کی طرف دیکھا جو دوسروں کی بہ نسبت...... ذرا ہمارے قریب کھڑا تھا۔ ساچی کو ڈر تھا کہ کہیں وہ پھر ان کی سرگوشیوں کی آواز پر بگڑ نہ جائے۔ بہت ہولے سے بولی۔

''انہیں پولیس کی طرف سے کمانڈو ایکشن کا شبہ ہے اسی لیے ان کے دو آدمی مال کی چھت پر گئے ہیں اور دو باہر گیٹ کی نگرانی کر رہے ہیں۔''

صورتِ حال کا ادراک ہوتے ہی میرے اندر کا کمانڈو یکلخت بیدار ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ گھنٹا گزرے اور یہ ہرکارے پھر کسی بے گناہ کی جان لیں، مجھے اسی وقت کچھ کرنا تھا۔ اب میرے سامنے سرغنہ سمیت تین ہرکارے تھے۔ میں ابھی کوئی عملی قدم اُٹھانے پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک سرغنہ نے حظ اُٹھانے کے انداز میں اپنے ان دو

ہرکاروں سے کہا۔

’’خون خرابا ہوتا رہے تو جسم و جان کو تازگی ملتی رہتی ہے، اب یہ خاموشی تو مجھے سخت بورنگ محسوس ہو رہی ہے۔‘‘

انگریزی میں یہ کہنے کے بعد اس نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ’’ابھی اگلا ایک گھنٹا گزرنے میں چالیس منٹ باقی ہیں...... تو کیا خیال ہے دوستو! کچھ رقص و سرود کی محفل سج جائے......؟‘‘

’’یس باس! مزہ دوبالا ہو جائے اس سنسنی خیز ایڈونچر کا۔‘‘ ہمارے قریب کھڑے ہرکارے نے اپنے سرغنہ کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں اپنی باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا تو دوسرے ہرکارے نے بھی اس کی توثیق کر ڈالی۔ سرغنہ ہم یرغمالیوں کی طرف مڑا۔ بہت سے یرغمالی بے چینی سے کسمسا کر رہ گئے۔ میں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر سرغنہ کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہاں مجھے شیطنت ناچتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

وہ شیطانی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’تم میں سے کوئی ایسی عورت جو یہاں ہمیں اپنے اس ہاٹ اور سیکسی ڈانس سے محظوظ کرے...... خود ہی اُٹھ کر آ جائے، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ...... اگر ڈانس اچھا ہوا تو اگلے شکار کی موت کا وقت کچھ آگے سرک سکتا ہے۔ کیونکہ اگلا شکار اب کوئی مرد نہیں بلکہ ایک جوان عورت ہوگی۔ اس طرح ڈانس کا فائدہ اُٹھا کر وہ لڑکی خود کو موت کے اس شکنجے سے بھی بچا سکتی ہے جو ایک خوفناک عفریت کی صورت اپنے اگلے شکار کا منتظر ہے۔ یوں اس کی باری نہیں آئے گی۔‘‘

اتنا کہہ کر وہ انتظار کرنے لگا۔ میں پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچے اس سفاک اور درندہ صفت خبیث سرغنہ کی بات سن رہا تھا۔ ’’اسٹرپٹیز ڈانس‘‘ انتہائی درجے کا واہیات بھرا ڈانس تھا جو مغرب کے پب اور کلبوں میں آبرو باختہ عورتیں کیا کرتی تھیں۔ جس میں فاحشہ عورت بیہودہ انداز میں ناچتی تھرکتی ہوئی ایک ایک کر کے اپنے جسم سے لباس نوچ پھینکتی تھی۔

ہال میں خاموشی طاری رہی تو سرغنہ کا چہرہ بگڑا اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ’’ہمم...... اس کا مطلب ہے کہ یہ انتخاب مجھے خود ہی کرنا پڑے گا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ شیطان یرغمالیوں میں سے ایک ایک عورت کو گرسنہ نظروں سے گھورنے لگا۔ ہر عورت اس سے نگاہیں چرانے لگیں، کیونکہ یہ کوئی کلب نہ تھا۔ نہ ہی یہاں کوئی آبرو باختہ عورت شامل تھی۔

اس رذیل کی گندی نظریں بالآخر میرے ساتھ چپکی سانچی پر پڑیں...... اور وہیں جم کر رہ گئیں۔ میرا دل بھی جیسے اسی وقت رک رک کر دھڑکنے لگا۔

’’تم...... اِدھر آ جاؤ......‘‘

سرغنہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پسٹل کی نال کا رخ اس کی طرف کر کے لہراتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا، سانچی کا کنول سا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ میں اس کے چہرے پر حیا و شرم کی لالی دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ شریف عورت، چاہے کسی ملک کی ہو، شرم اس کا زیور اور حیا اس کا حُسن ہوتی ہے۔

اب تک سب ٹھیک جا رہا تھا لیکن، اب شاید سب کچھ اُلٹ پلٹ ہونے والا تھا۔ میرے اندر کا کمانڈو اب میرے جسم کے رو ئیں رو ئیں کو تھرتھرانے لگا تھا، جوش اور غیظ و غضب کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑکنے لگی تھیں اور اب کسی وقت بھی وہ لاوے کی صورت بہنے اور سب کچھ بھسم کر ڈالنے کے لیے بے چین تھیں۔

’’تم نے سنا نہیں...... لڑکی؟ اِدھر آؤ......‘‘ سرغنہ نے سانچی کو اسی طرح بے حرکت بیٹھے دیکھا تو درشت لہجے میں بولا۔ سانچی نے بمشکل سسکتے ہوئے اس سے لرزیدہ آواز میں کہا۔

’’پپ...... پلیز! یہ میں نہیں کر سکتی، مم...... میں ایک شریف لڑکی ہوں......‘‘

’’ہاہا...... ہاہا...... اسٹرپٹیز ڈانس بے باک لڑکی سے زیادہ...... شریف لڑکی کا ہی مجھے پسند ہے۔ ہو سکتا ہے اگلی باری تمہاری آ جائے، موت سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ تم ہماری بات مان لو......‘‘

’’میں مرنا پسند کروں گی......‘‘ سانچی نے بے جگری سے جواب دیا۔ اس کے جواب نے میری مردانگی کو اُدھیڑ ڈالا جبکہ سرغنہ پُرطیش نظروں سے سانچی کو گھورنے لگا۔ وہ جارحانہ انداز میں سانچی کی طرف بڑھا اور میری سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دل تیزی سے دھڑ دھڑاتا محسوس ہونے لگا، میرے وجود میں جوار بھاٹا ابھرا اور کسی خوابیدہ آتش فشاں کے مانند میرے جسم میں جنبش ابھری۔ تب ہی اچانک ایک تیز نسوانی آواز ہال میں گونجی۔

’’میں کروں گی اسٹرپٹیز...... ڈانس۔‘‘

ہم سب سمیت سرغنہ...... کی ہی نہیں بلکہ دیگر یرغمالیوں کی نظر اس آواز کی طرف اُٹھتی چلی گئی۔ یہ وہی سنہرے بالوں والی...... عورت تھی جس کے بے گناہ شوہر کو

تھوڑی دیر پہلے ہی بڑی بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

''واؤ..... ویٹس گڈ!'' سرغنہ بھوکی نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے خوش ہو کر بولا۔ ساچی کی طرف اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور میرے وجود کی آتش فشانی تھرتھراہٹ بھی تھم سی گئی۔ سرغنہ اس عورت کی طرف بڑھا اور میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں بلکہ ہال میں موجود بھی یرغمالیوں کی یک ٹک نگاہیں اسی عورت کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

''کیا مجھے یہ ڈانس اِدھر ہی کرنا ہوگا.....؟'' عورت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میری نظروں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کسی زندہ لاش کی طرح کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ جیسے ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

''ہاں! اِدھر ہی کرنا ہوگا۔'' سرغنہ نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کمینے پن سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بُوالہوسی کی چمک نمایاں تھی۔

''باس.....!'' اچانک اس کے ساتھی نے کہا۔ ''اس کا چہرہ تو پہلے ہی اُترا ہوا اور مایوس کن ہے۔ اس میں وہ چابک دستی کہاں ہوگی؟''

اس کے ساتھی سنہرے بالوں والی عورت کے ڈانس کرنے سے خوش نہ تھے۔ وہ ساچی کو زیادہ پسند کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔

''گدھو! تمہیں اسٹرپٹیز ڈانس کا کیا ذوق ہے۔ یہ ڈانس ایسی ہی عورت پر زیادہ جچے گا جو مایوس، ٹوٹی ہوئی اور اندر سے شکست خوردہ ہو..... ایسی عورت زیادہ قیامت خیزی، تیزی اور دیوانگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔'' سرغنہ بولا۔ مجھے وہ خبیث اس میدان کا کوئی زیادہ ہی پرانا پاپی محسوس ہو رہا تھا۔

عورت چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی ہال کے قدرے وسط میں آگئی اور اپنے جسم کو قدرے خم دے کر دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے اُوپر اُٹھا لیے۔

کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ بدنصیب عورت ہاری ہوئی تھی یا پھر کوئی کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے تھرکنا شروع کیا۔ دیگر عورتوں نے اپنے چہروں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ مردوں نے منہ موڑ لیا تھا۔

ایسے میں ساچی کی باریک آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

''عورت کی تذلیل کا یہ منظر میں نہیں دیکھ سکتی تیھی

سنہرے بالوں والی عورت نے لہراتے ہوئے اپنے ہاتھ بلاؤز کے بٹن کی طرف، انہیں کھولنے کے لیے بڑھائے تھے، میری جلتی سلگتی نظروں کے سامنے سلوموشن کے انداز میں گزری ہوئی فلم کے مناظر فلش بیک کی طرح چمکے۔ پارلر میں فائرنگ، خون میں لت پت پڑی ہوئی لاشیں، عورت کے شوہر کا بے دردی سے قتل..... اس کے بعد اصل منظر ابھرا..... سب کچھ جیسے مجھے ہنوز سلوموشن میں ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ نجانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے مجھے جگایا۔ میں نے اپنی جگہ سے اس وقت حرکت کی جب سرغنہ سمیت اس کے دونوں ساتھی عورت کی طرف متوجہ تھے۔ ساچی کی پھٹی پھٹی نظروں اور تحیر آمیز انداز میں کھلے ہوئے منہ کے قریب سے میں تڑپ کر اُٹھ کے گزرا..... جھکا ہوا وجود میرا سیدھا ہوا..... دونوں بازو آگے کو لپکے..... جو سرغنہ کی گردن دبوچ لینے کے لیے اُٹھے تھے۔ میرا اور اس کا فاصلہ صرف چند قدموں کا رہا ہوگا کہ اسے اپنے عقب میں بڑھتے ہوئے خطرے کی بُو محسوس ہوئی۔ وہ اپنا مشین پسٹل والا ہاتھ اُٹھائے، عقب میں پلٹا، مشین پسٹل کی مہیب نال میرے چہرے کی طرف اُٹھنے لگی جس کے میں بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا اور پھر جیسے ایک دم ہی اُن جاں کش مناظر میں بجلی دوڑ گئی، اُدھر مجھے حملہ کرتے دیکھ کر سرغنہ کے حلق سے پُرغیظ سی دہاڑ سے مشابہ چیخ ابھری، اِدھر میرے منہ سے بھی جوش لہو رنگ تلے غراہٹ..... برآمد ہوئی، مشین پسٹل کی نال عین میرے چہرے پر آئی تھی کہ... میرے آگے کو اُٹھے ہوئے ایک ہاتھ کے پنجے نے اس کے پستول کو دھکیلنے کے سے انداز میں وار کیا مگر تب تک سرغنہ..... نے ٹریگر دبا یا، جدید ساختہ اسپیڈ لوڈر مشین پسٹل گرجا، گولی چلی اور میری دائیں کنپٹی سے محض چند سوت کے فاصلے سے گزر گئی۔ مجھے اس کی آتشیں ''جھپک'' چہرے پر نمایاں طور پر محسوس ہوئی تھی۔ اب اس کے بھیانک پسٹل کی نال ''پوائنٹ بلینک'' پر تھی، مگر تب تک میرے گھونسے کی ضرب سے وہ اس کے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔ دوسرا بازو چشم زدن میں حرکت پذیر ہوا اور اس کا تنا ہوا مضبوط گھونسا سرغنہ کے چہرے پر پڑا۔ وہ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا مگر گرا نہیں......

میں جانتا تھا کہ یہ حرکت مجھے بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ یہ سب موت کے ہرکارے تھے، ان پر خون سوار تھا۔ میری یہ حرکت، ان کی خوں ریز جبلّت کو ہوا دینے کے لیے کافی تھی۔ قریب موجود اس کے دونوں ساتھی بیک وقت حرکت میں آئے اور اپنی ہیوی لوڈر رائفل کا رخ میری جانب موڑا

مگر تب تک میں چکنے فرش پر لفٹ ٹک سوئینگ کرتا، پھسلتا ہوا بیک وقت ان دونوں کی ٹانگوں سے جا ٹکرایا۔ وہ مجھ پر خوں ریز فائرنگ کی حسرت لیے بغیر فضا میں اُچھل کر گرے...... مگر غضب کے تربیت یافتہ ہونے کے سبب وہ خوفناک رائفلیں ان کی گرفت میں دبی رہیں، جن سے انہیں محروم کرنا میرے اس والہانہ وار حملے کا اہم مقصد تھا۔ یہ مقصد ''فیل'' ہوتے ہی میں نے بس نہیں کی اور فرش پر لیٹے لیٹے پشت کے بل پر ہی اپنی دونوں ٹانگوں کو ہیلی فین (دو پنکھ) کے انداز میں گردش دی۔ نتیجے میں وہ دونوں موت کے ہرکارے جنھوں نے گرتے ہی اُٹھ کھڑے ہونے میں چشم زدن کی تاخیر کی ہوگی، مجھ پر گولیوں کی ہولناک بوچھاڑ کے لیے پر تولے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر میری گردش کرتی ٹانگوں کی زد میں آگئے۔ ایک کی ناف کے نچلے اور نازک ترین حصے پر پڑی تھی اور وہ کریہہ انداز میں چیختا ہوا، پرغمالیوں کی طرف جا پڑا جبکہ دوسرے کی رانوں پر ٹانگ لگی، وہ وہیں لہرا کر گرا تو اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر میرے قریب آن گری۔ ٹھیک اسی وقت سانچی کی چلاتی ہوئی آواز اُبھری۔

''بچو......!''

میں گن سنبھالتے ہی پارے کی طرح تھرکا اور ان کے سرغنہ کو دھیان میں لیے ہوئے اس کی طرف پلٹا ہی تھا کہ وہ اُڑتا ہوا فلائنگ کک کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کی دونوں ٹانگیں میرے سینے پر پڑیں اور مجھے یوں لگا جیسے میں فضا میں پرواز کر گیا ہوں...... ساتھ ہی مجھے اپنے سینے کی پسلیاں تڑختی ہوئی محسوس ہوئیں، ایسا لگا تھا جیسے میرے سینے کا پنجر کسی نے بھینچ ڈالا ہو۔ میں تقریباً اُڑتا ہوا متحرک زینے کی طرف جا پڑا اور میرے ہاتھ سے گن بھی نکل گئی۔ میرا سر اسکلیٹر کے کسی اسٹیپ سے ٹکرایا تھا اور میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ مجھے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ دیو ہیکل سرغنہ ماہر فائٹر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ایک ہی داؤ نے مجھے جیسے ڈھا کر رکھ دیا۔ میں ایکا ایکی بلینک پوائنٹ سے برننگ پوائنٹ پر آگیا تھا۔ یعنی میں موت کے ان ہرکاروں کی زد میں آگیا تھا، کیونکہ اگلے ہی لمحے سرغنہ کے ہاتھ میں اپنا مشین پسٹل نظر آنے لگا تھا جبکہ اس کے دونوں ہرکارے بھی اپنی گنز مجھ پر تان چکے تھے۔ ایک کی تو گن میرے ہاتھ آکر نکل چکی تھی۔ وہی اس نے موقع پاتے ہی جھپٹ کر اُٹھالی تھی۔

''گولی مت چلانا......'' سرغنہ کی دہاڑ گونجی۔ سانچی دوڑتی ہوئی میری طرف لپکی تھی کہ راستے ہی میں سرغنہ نے اسے اُچک لیا۔ وہ چیخی اور اب اس خونی شکرے کے ایک بازو کے شکنجے میں بے بس چڑیا کی طرح پھڑک رہی تھی۔

''ہاہا...... ہاہا...... تمہارا بوائے فرینڈ تو بہت اسمارٹ نکلا۔ اب تو اسے بہادری کا خوب اچھی طرح مزہ چکھائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ اس اثنا میں اس کے دیگر ساتھی بھی یہاں آگئے، مگر سرغنہ نے پُرغرور انداز میں انہیں واپس اپنی جگہوں پر جا کے کھڑا ہونے کا حکم دے ڈالا تھا۔ گویا میں اُن کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ سردست نظر بھی یہی کچھ آرہا تھا۔

میرا سینہ ابھی تک دکھ رہا تھا۔ سر پر لگنے والی چوٹ نے الگ میرا دماغ دکھا رکھا تھا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا تو اِدھر اُدھر لڑھک جاتا۔ سرغنہ نے مجھ پر بڑا کاری وار کیا تھا۔ سانچی شاید مجھے سنبھالنے کے لیے لپکی تھی اور یہی اس کی فاش غلطی تھی کہ سرغنہ نے اسے میری ''گرل فرینڈ'' سے تشبیہ دے ڈالی تھی۔ ممکن تھا وہ پہلے بھی اسے میرے ساتھ دیکھ کر یہی سمجھے ہوں مگر اب انہیں یقین ہوگیا تھا۔

''تمہاری بہادری تو ایک ہی ہلّے میں ہوا ہوگئی...... آؤ...... ذرا اپنی گرل فرینڈ کو چھو کے تو دکھا دو......'' سرغنہ نے مجھے طیش دلانے والے انداز میں کہا۔

میرا جلد سے جلد اپنے حواسوں میں آنا ازحد...... ضروری تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکے دیے اور سینے کو مسلا۔ بے ترتیب سانسیں بحال ہوئیں تو میں نے کچھ گہرے سانس لیے۔ سنبھل کر اُٹھا اور اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو کے بے خوفی سے بولا۔

''تم اور تمہارے ساتھی ظلم و بربریت کا جو یہ گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں، اس کا انجام کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لڑکی کو چھوڑ دو...... یہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔''

''واؤ...... ویٹس گریٹ! کیا خوب صورت ڈائیلاگ بولتے ہو۔ اب ذرا اپنی آنکھوں سے ایک خوب صورت منظر بھی دیکھ لو۔'' سرغنہ نے حظ اُٹھانے کے انداز میں کہا اور اپنے شکنجے میں دبی ہوئی سانچی کا چہرہ اپنے قریب کر کے زبردستی وحشیانہ انداز میں ''کس'' لے لی۔ وہ بے بس چڑیا کی طرح تڑپنے اور خود کو اس کے شکرے جیسی گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

سانچی سے میرا کسی قسم کا کوئی جذباتی تعلق نہ تھا۔ وہ راہ چلتے مجھ سے ٹکرائی تھی اور بس...... لیکن اندازِ شناسائی کا کوئی تو ایسا پہلو تھا جس نے ہمیں ایک دوسرے کا ہمدرد بنا

دیا تھا۔

موت کے ہرکاروں کے اس وحشی سرغنہ نے سانچی کو قریب تر کرنے کے بعد کہا تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ خبیث اب میرے ''نام'' اور حوالے سے سانچی پر کیا قامت توڑنے والا تھا۔ تب ہی اچانک باہر سے فائرنگ کی گونج سنائی دی اور اسی وقت دو افراد دھپ کی آواز سے نیچے کھلے ہال کے چکنے فرش پر گرے۔ وہ خون میں لت پت تھے۔ سرغنہ اور اس کے دونوں ساتھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لاشوں کو گھورنے لگے۔ کیونکہ وہ انہی کے ساتھیوں کی تھیں۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے مشین پسٹل سے ہوائی فائرنگ کر ڈالی...... اب پتا نہیں ایسا اس نے اپنے دو ساتھیوں کی موت کے جنون اور غصے میں کیا تھا یا پھر اس نے کسی خطرے کی بُو سونگھ لی تھی کہ ہال کی چھت کی جانب فائرنگ کرنے کے اگلے ہی لمحات میں چار افراد جو چست نیلی کمانڈو وردیوں میں ملفوف تھے، ایک رسی کے سہارے نیچے لہرائے اور فضا میں معلق ہوگئے، ان کے جسموں سے خون ٹپکنے لگا جو سرغنہ کے مشین پسٹل کی گولیوں کا ہی شاخسانہ تھا۔ ساری بات سمجھ میں آگئی۔ پولیس نے کمانڈو ایکشن لیا تھا اور وہ ان کے چھت پر متعین دو ساتھی ہرکاروں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد سیلنگ فال کے ذریعے نیچے اُترنے کی راہ تلاش رہے تھے کہ سرغنہ نے خطرے کی بُو اپنے دونوں ساتھیوں کے اُوپر سے نیچے ہال میں گرتے ہی سونگھ لی۔ وہ سب اس طرف متوجہ ہوئے تھے کہ میں مچھلی کی طرح تڑپا۔ اسی وقت مجھ پر گولیوں کی پوری باڑ پڑی، مگر میں تب تک ان غافل لمحوں کی اتنی سی بھی مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسکلیٹر کے نیچے بنے خلا میں چلا گیا۔ گولیوں کی اندھا دُھند بوچھاڑ میرے تعاقب میں جاری رہی...... میرے اردگرد جیسے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میں نہتی حالت میں زیادہ دیر یہاں محبوس نہیں رہ سکوں گا...... اسی لیے میری تیزی سے گردش کرتی نظروں نے...... ایک اور آڑ کو تاڑا اور میں نے بہ سرعت اس جانب لیٹے لیٹے قلابازی کھائی اور ایک بڑے سے سیل کاؤنٹر کی آڑ میں چلا گیا۔

پولیس کا کمانڈو ایکشن...... نجانے کس حد تک پہنچا تھا، اس کا کچھ اندازہ تو یہی ہوتا تھا کہ وہ ناکام رہا ہے، کیونکہ اسی لمحے موت کے ہرکاروں نے اس طرف دستی بم لڑھکا دیے تھے، جن کی جھلک میں نے پاس کی کھڑکی سے دیکھی۔ وہ دستی بم پولیس کی گاڑیوں کے نیچے جا کر بلاسٹ ہوئے تھے اور میں نے دو پولیس گاڑیوں کو فٹ بال کی طرح فضا میں اُچھلتے دیکھا۔

میرے تعاقب میں ایک ہرکارہ لپکا تھا۔ میں نے جھک کے اس کے پیروں کی جھلک دیکھی اور پیچھے سے رینگ کر اس پر جھپٹا۔ اس نے پلٹ کر گن کا بٹ مجھے مارنے کی کوشش چاہی تھی، مگر میں اب اسے کہاں موقع دینے والا تھا، تیزی سے جھکائی دیتے ہوئے میں نے اس کے پہلو میں مُکا جڑ دیا۔ ضرب قریب سے اور خاصی زوردار تھی۔ اس کے حلق سے کریہہ ناک سی چیخ خارج ہوئی، اگلا موقع تاک کر میں نے اس کی ٹھوڑی پر بھی ایک عدد مُکا جڑ دیا۔ شاید اس کا کوئی دانت ٹوٹا تھا یا پھر دانتوں تلے اس کی زبان آگئی تھی۔ وہ ڈھے گیا، میں نے اس کی گن پر جھپٹا مارا اور وہ قبضے میں لیتے ہی اس کے آہنی کندے سے ایک فیصلہ کن وار اس کی کنپٹی پر کیا اور وہ وہیں بے حس و حرکت ہوگیا۔

اسی وقت گولی چلی اور ایک چیخ اُبھری، میں دھک سے رہ گیا کہ کہیں اس وحشی سرغنہ نے انتقاماً سانچی کو گولی نہ ماردی ہو۔

''یہ لاش باہر پھینک دو...... تاکہ پولیس کو اپنی مہم جوئی کا سبق ملے۔'' مجھے سرغنہ کی غضب ناک آواز سنائی دی۔

گن قبضے میں آتے ہی میں نے ایک آڑ سے اپنا سر ذرا اُبھارا تھا کہ یہ دیکھ سکوں اس بے رحم نے کس بدنصیب یرغمالی کو اپنی بربریت کا نشانہ بنایا ہے، اسی وقت مجھے کسی سائے کی جھپک دکھائی دی۔ میں چشم زدن میں جھکائی دے گیا۔ یہی وہ وقت جب مجھے سرغنہ کا مشین پسٹل والا ہاتھ لہراتا دکھائی دیا۔ میں اس کی مکاری اور بلا کی چابک دستی پر ایک لمحے کو اش اش کر اُٹھا۔ اس نے مجھے بلف کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ میرا دھیان ہٹا کر اس نے مجھے آڑ سے ابھرنے کا دانستہ موقع دیا تھا کہ وہ مجھے نشانہ بنا سکے۔ محض ایک پل کی تاخیر سے میں اس کے جھانسے میں آسکتا تھا کہ میں نے اس پر اپنی رائفل کا بٹ رسید کر دیا۔ پسٹل ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں یکدم گن تھامے آڑ سے نمودار ہوا۔ میری گن کی نال سرغنہ کے سینے سے لگ گئی۔ اس کا دوسرا ساتھی ہرکارہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ یرغمالی پہلے ہی دہشت زدہ تھے ان سے اور وہ ایک جگہ پر ہی محبوس ہو کے بیٹھ رہنے پر مجبور تھے۔ جبکہ مجھے ایک تازہ لاش دکھائی دی۔ وہ جوان مرد کی تھی جسے ابھی ذرا دیر پہلے پولیس کا تحفہ دینے کے لیے سرغنہ نے ہلاک کیا تھا۔ جبکہ سانچی وہیں خوف زدہ سی کھڑی

تھی۔

"گن رکھ دو۔" میں نے انگریزی میں سرغنہ کے عقب میں گن تانے اس کے ساتھی ہرکارے کی طرف دیکھ کر کہا۔ سرغنہ کا چہرہ مارے غیظ کے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس کی خوں خوار نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر گن سنگل شاٹ پر کی اور فائر کر دیا۔ گولی نے سرغنہ کے کان کی لو اُڑا دی۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ برآمد ہوئی اور اس نے خون آلود کان پر ہاتھ رکھ دیا، وہاں سے اب خون کے قطرے بہنے لگے۔ جدید ساخت کی گن کی پل میں "چال" بدلنے اور ٹھیک نشانہ داغنے پر اس کے ساتھی ہرکارے پر ہی نہیں بلکہ سرغنہ پر بھی اس بات کی دہشت بیٹھ گئی کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہو سکتا۔

"کک...... کون ہو تم......؟" سرغنہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر اب سناٹے اُترے ہوئے تھے۔

"پہلے اپنے ساتھی سے کہو کہ گن پھینک دے۔ ورنہ دوسری گولی کا نشانہ تمہارا سینہ ہوگا۔" میں نے غراتے ہوئے سرغنہ سے کہا تو اس نے اپنے ایک ہاتھ کے اشارے سے ساتھی ہرکارے کو گن پھینک دینے کا کہا۔ اس نے فوراً گن فرش پر پھینک دی۔

ہال میں گن گرج کے بعد دھڑکا دینے والا سناٹا طاری ہو گیا۔

"کون ہو تم؟ آرمی سولجر ہو یا ٹروپر......؟" سرغنہ سناٹے دار لہجے میں پوچھا۔

"اپنی بکواس بند کرو اور اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر کے منہ دوسری طرف پھیر لو۔"

"کاسپاکو...... سے دشمنی تمہیں مہنگی پڑے گی۔" اس نے دھمکی دی۔ پتا نہیں یہ اس کا نام تھا یا اس کے باس کا، مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ میں نے ایک اور فائر داغ دیا۔ گولی اس کی بائیں ران پر لگی اور وہاں سے خون کا فوارہ بلند ہو گیا۔ ادھر یرغمالیوں میں سے بھی کچھ لوگوں کو جوش آ گیا اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس پر جھپٹنے کے لیے لپکے، میرا دھیان اس جانب پلٹا تو سرغنہ نے جو اپنی زخمی ٹانگ پکڑے جھکا ہوا تھا، اس نے پھرتی سے دوسری ٹانگ کی پنڈلی سے بندھی نیام سے چاقو نکال کر میری طرف پھینکنا چاہا تھا کہ میری ٹریگر پر کپکپاتی اُنگلی نے حرکت کی۔ فائر ہوا اور گولی سرغنہ کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ وہ تیورا کر گرا تو اس کے ساتھ کھڑے ہرکارے نے چیخ بلند کی۔

"تم نے کاسپاکو کے اہم آدمی کو ہلاک کر کے بڑی بھیانک غلطی......" اس کا جملہ اُدھورا رہ گیا، میری چلائی ہوئی گولی نے اس کی زبان بند کر دی...... وہ اپنا دائیں بازو پکڑے پیچھے کی جانب لڑکھڑایا، یرغمالی اس پر ٹوٹ پڑے اور دیگر بھی اُٹھے، کچھ نے باہر کی جانب دوڑ لگائی کہ پولیس کو مطلع کر سکیں۔ وہاں ہلچل مچ گئی۔ میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں کھسک لیتا، لہٰذا میں نے گن پھینک دی اور ایک جانب کو دوڑا۔ عقب سے مجھے ساچی کی پکار سنائی دی مگر میں کوئی پروا کیے بغیر ایک سنسان راہداری کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے جو کرنا تھا، وہ کر چکا تھا اور اب پولیس کی نظروں میں آئے بغیر میں یہاں سے خاموشی کے ساتھ نکل جانا چاہتا تھا۔ راہداری دور تک ویران تھی۔ اسی وقت مجھے عقب میں بھاری قدموں اور شور کی آواز سنائی دی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ شاید پولیس اندر در آئی تھی۔ میں رکا نہیں مگر مجھے ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی کہ جہاں میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر نکل سکتا کیونکہ یقیناً باہر بھی اس مال کے گرد پولیس کا گھیرا ہو سکتا تھا۔ سرِدست تو میں کسی چور دروازے کی تلاش میں تھا۔ مال کی راہ گزر سے میں کب آشنا تھا؟

اچانک مجھے عقب سے ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"مسٹر شہزاد!"

میں نے رک کر مڑ کے دیکھا اور بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ساچی تھی اور دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس نے ہال میں مجھے پکارنے کے بعد میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

"پلیز! ٹھہر جاؤ......" اس نے کہتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ بھی کیا۔ میں تو رکا ہوا ہی تھا۔ وہ میرے قریب آ گئی۔

"تم واپس چلی جاؤ۔ میں پولیس کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر کیوں......؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ اُن خطرناک لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہم سب پر احسان کیا ہے۔ پولیس تو تمہاری مدد کرے گی۔"

"مگر پولیس اسے تحفظ نہیں دے سکتی......" اچانک ایک اور نسوانی آواز اُبھری اور مجھ سمیت ساچی نے بھی اس طرف دیکھا جہاں ایک قریبی آڑ سے میں نے اس سنہرے بالوں والی عورت کو نمودار ہوتے دیکھا تھا جس کے شوہر کو موت کے ہرکاروں نے بیدردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ وہ

بھی.... نجانے کس وقت سانچی کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔

اسی وقت پولیس اہلکاروں کے بھاری قدموں کی دھمک راہداری میں گونجی۔

''یہاں سے نکل چلو...... کہیں اور بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں اس مسئلے سے متعلق...... آؤ مجھے ایک محفوظ جگہ معلوم ہے۔'' سنہرے بالوں عورت بولی اور ہمیں اشارہ کرتے ہوئے راہداری کے سرے سے مڑ گئی، سانچی تو سوچتی رہ گئی مگر میں نے فوراً اس عورت کی تقلید کی۔ میں اس کے پیچھے دوڑتا چلا گیا۔ وہ مجھے مختلف تنگ اور کہیں کھلی گزرگاہوں سے لے کر ایک ایسی جگہ پہنچی جو دوسری منزل پر واقع تھی۔

یہ ایک بڑا سا اسٹور تھا۔ ہم یہاں آ کر رک گئے۔ عورت دروازہ بند کرنے کے لیے بڑھی تو چونک گئی۔ سانچی بھی دوڑتی ہوئی وہاں آ گئی تھی اور اسے گھورتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ عورت نے اس کے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔

''تم اسے یہ کیا پٹی پڑھا رہی ہو......؟'' سانچی نے عورت کو بدستور غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم نہیں جانتیں کہ اس طرح اس لڑکے کے لیے مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔'' اس کا اشارہ میری جانب تھا۔ عورت جواب میں اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی تو میں نے سانچی سے کہا۔

''سانچی! تمہیں میری مجبوری کا علم نہیں ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم واپس لوٹ جاؤ اور ہمارا راستہ کھوٹا مت کرو......'' میرا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ مگر سانچی اس بار بڑے رسان سے بولی۔

''تم تو ہمارے محسن ہو، میں بھلا تمہارا راستہ کیوں کھوٹا کروں گی۔ میں تمہاری بہتری کی بات کر رہی ہوں۔ لیکن تمہاری گواہی تمہارا بیان پولیس کے لیے ضروری ہے۔ وہ ظالم لوگوں کا پورا گروہ ہے۔ ان کے چند افراد کا پولیس کے ہتھے چڑھنا شاید کوئی معنی نہ رکھے مگر تمہاری گواہی......''

''آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو میری بات......'' میں نے برہمی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بات کاٹی۔ ''میں ایک غیر ملکی ہوں اور یہاں سیر کی غرض سے آیا تھا، نہیں چاہتا کہ میں خود کو یہاں کسی بڑے چکر میں پھنسا دوں۔''

''لیکن یہ جو تم کر رہے ہو، اس سے تم بڑی مشکلات کا شکار ہو جاؤ گے، دیکھو مسٹر شہزاد! میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم کسی چکر میں نہیں پھنسو گے۔'' وہ بولی۔

''ہے مس!'' سنہرے بالوں والی عورت نے اسے ٹوکا۔ ''بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور ہمارے بارے میں پولیس کو کچھ مت بتانا۔''

''یو شٹ اپ'' سانچی نے اسے جھڑک دیا اور گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم کیسی عورت ہو؟ وہاں تمہارے شوہر کی لاش پڑی ہے اور تم بجائے اس کی تدفین کرنے کے اس نوجوان کو غلط راہ پر لگا رہی ہو۔'' عورت کو غصہ آ گیا اور اس نے ہونٹ بھینچ کر اسے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ سانچی کا چہرہ مارے طیش کے سرخ ہو گیا۔ اس نے شاید اسے تھائی زبان میں کوئی گالی دی اور ایسا ہی جواب دیا یعنی تھپڑ رسید کر دیا۔ دونوں خواتین گتھم گتھا ہو گئیں، میں گھبرا گیا۔ عجیب صورتِ حال ہو گئی تھی۔ بات سانچی کی بھی غلط نہیں تھی مگر اسے جب میرے بارے میں معلوم ہو جاتا تو وہ وہی کرتی جو سنہرے بالوں والی یورپین عورت کر رہی تھی۔ جی میں تو آئی کہ میں ان دونوں کو لڑتا مرتا چھوڑ کر نکل جاؤں مگر مال کی بھول بھلیوں اور چور راستوں سے واقف نہ تھا جو واقف تھی وہ سانچی کے ساتھ اُلجھ گئی تھی، بالآخر میں نے بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کیا۔ وہ بپھری ہوئی لڑاکا بلیوں کی طرح ہانپنے لگیں۔ میں نے سانچی سے کہا۔

''دیکھو! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو......'' پھر سنہرے بالوں والی عورت سے مخاطب ہوا۔ ''مس......!''

''ہلینا نام ہے میرا......'' اس نے نام بتایا۔

''ہاں! مس ہلینا! چلو، مجھے محفوظ طریقے سے باہر نکلنا ہے۔''

''میں پولیس کو بتا دوں گی۔'' سانچی چیخی۔ ہلینا پھر اس کی جانب جارحانہ انداز میں بڑھی مگر میں نے اسے روک دیا اور پھر سانچی کو ایک طرف دھکا دے کر ہم باہر نکلے۔ باہر سے احتیاطاً ہم نے دروازہ بند کر دیا۔

''اس طرف......'' ہلینا بائیں جانب ایک بند گلی جیسی مختصر اور تنگ سی راہداری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ہم نے اس سمت چند قدم ہی اُٹھائے تھے کہ دائیں جانب زینہ نظر آ گیا۔ عقب میں ہمیں اسٹور کے بند دروازے کو دھڑ دھڑانے کی آوازیں سنائی دیں۔ سانچی ابھی تک مجھے روکے ہوئے تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے تئیں مجھے مزید کسی پریشانی یا مصیبت سے بچانا چاہتی تھی۔ تاہم مجھے اس نوجوان بیوہ ہلینا پر حیرت تھی کہ آخر یہ کیا سمجھ کر میری مدد کر رہی تھی؟ ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ میں

نے اس کے شوہر کے قتل کا انتقام موت کے ہرکاروں کے سرغنہ کو ہلاک کر کے لے لیا تھا۔ لیکن پھر اگر ایسا تھا بھی تو اسے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا، پھر یہ کیوں میری مدد کرنا چاہتی تھی؟ کیا اس نے اپنی زیرک دماغی سے میری کسی مجبوری کا خود سے ہی کوئی اندازہ قائم کر لیا تھا؟ پھر بھی میرا ذہن اس کی طرف سے کسی نامعلوم سی کھدبد میں مبتلا تھا۔

میں ان باتوں پر تیزی سے غور کرتا ہوا اس کے پیچھے زینے چڑھنے لگا۔ وہاں سے ہم ایک گودام نما کمرے میں آ گئے یہاں گروسری کا ڈھیروں سامان بڑے بڑے ڈبوں اور کھلی حالت میں رکھا ہوا تھا اور بھی بہت کچھ ریختے کی صورت بکھرا ہوا تھا۔ یہاں مجھے ایک بڑا سا مستطیل روشندان نظر آیا وہاں ایک ریک رکھا ہوا تھا۔ اس میں کھانے پینے کی اشیا کے خشک ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ ہلینا نے ریک سے وہ سب ڈبے گرا دیے اور اس ریک پر چڑھ روشندان پر جا پہنچی۔ میں بدستور اس کی تقلید کر رہا تھا۔ اس نے روشندان کا سلائڈ ہونے والا پٹ تیزی سے کھسکایا اور نیچے جھانکا۔ اس کے بعد مجھے اشارہ کیا پھر وہ دوسری جانب کود گئی...... میں نے بھی ایسا ہی کیا اور دوسری جانب تقریباً پانچ فٹ نیچے ایک چھجے پر میں نے ہیلنا کو ٹکے ہوئے پایا۔ وہ بہت غور سے نیچے دیکھ رہی تھی پھر اس نے وہاں سے بھی نیچے چھلانگ لگا دی۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔

اب ہم ایک تاریک سی تنگ گلی والی سڑک پر کھڑے تھے۔

''تم اِدھر ہی ٹھہرو......'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''میں مال کے مین گیٹ کی طرف جا رہی ہوں، کوشش کرتی ہوں اپنی گاڑی یہاں لے آؤں۔''

''نہیں، وہاں پولیس کی نفری موجود ہے۔ تم...... ایسا نہیں کر پاؤ گی۔'' میں نے کہا۔

''فکر مت کرو...... پولیس اپنے کام میں مصروف ہو گی اس وقت...... اگر ناکابندی ہوئی تو میں ایسے ہی لوٹ آؤں گی۔ ایک کوشش کر لینے دو، بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔'' اس نے کہا اور تیزی سے ایک طرف غائب ہو گئی۔ میں وہیں ویران جگہ پر ایک تاریک کنج کی طرف کھسک کر کھڑا ہو گیا۔ پولیس سائرن اور فائر بریگیڈز، ایمبولینس وغیرہ کے سائرن کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔ میں بے چینی سے ہلینا کی واپسی کا منتظر رہا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ مجھے اس طرف سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں جہاں ہلینا گئی تھی۔ میں ٹھٹک گیا کہیں پولیس کی کوئی گاڑی نہ آ رہی ہو، میں تھوڑا اور تاریکی میں ہو کے دبک گیا۔ چند لمحے بعد ہی میں نے مذکورہ سمت سے ایک نیلی ...اسپورٹس کار کو تیزی سے مڑتے دیکھا۔ بدقسمتی سے اس کے تیز برقی لیمپس کی روشنی مجھ پر ہی پڑی تھی اور میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ کار میرے قریب آ کر ایک جھٹکے سے رکی۔

''ہری اَپ! کم آن......!'' مجھے ہلینا کی آواز سنائی دی اور میں چونکا پھر بجلی کی سی تیزی سے کار کی جانب لپکا، اس نے اپنی سائڈ کا دروازہ پہلے ہی کھول رکھا تھا۔ میں لپک کر بیٹھا اور میرے دروازہ بند کرتے کرتے وہ ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا چکی تھی۔

☆☆☆

ان سخت اعصاب شکن لمحات کے گزر جانے کے بعد جب کچھ سکون کی گھڑیاں نصیب ہوئیں تو مجھے اپنا پورا وجود ہی نہیں بلکہ ذہن بھی تھکا تھکا محسوس ہونے لگا۔ میں نے سیٹ کی پشت گاہ سے اپنا سر ٹکا دیا۔ بینکاک کی مصروف شاہراہوں، چمکتے دمکتے بازاروں اور گزرگاہوں پر رات پورے جوبن کے ساتھ اُتری ہوئی تھی۔ ایک موڑ کاٹ کر ہم نہر کے کنارے والی روڈ پر آ گئے۔ دائیں جانب ہمارے ایک موٹیل کی لمبی چوڑی عمارت تھی۔ نہر ہمارے بائیں جانب تھی۔ وہاں چند کشتیاں اور کروزر تیرتی پھر رہی تھیں۔ ایک کروزر پر تو میں نے باقاعدہ کلب کی طرح کی رونقیں تھیں۔ یہ اوپن کروزر تھی اور شاید اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھی کہ ''زمینی کلبوں'' سے ذرا ہٹ کر کچھ نیا کیا جائے۔ چمکتی ہوئی اس خوبصورت نہر کے اُوپر چاند کا سنہرا روپ عجب طلسماتی منظر پیش کر رہا تھا۔

''یہ موٹیل کاسپا کو کا ہے......'' مجھے اس عمارت کی طرف گھورتا پا کر ہلینا نے بتایا۔ اس کے شہابی رنگت اور مخروطی اُنگلیوں والے ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے اور نگاہیں سامنے ونڈ اسکرین کے پار۔ اگرچہ اس نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا تھا۔

''کاسپا کو......'' میں زیرلب بڑبڑایا۔

''ہاں! وہی کاسپا کو...... جس کے بارے میں اس خونی قاتل کا ساتھی تمہیں دھمکا رہا تھا۔

''ہوں ں...... ں ں۔'' میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میں تھوڑا پریشان سا ہو گیا تھا۔

''تم کیسے جانتی ہو اسے......؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے ایک موڑ کاٹا۔ اب

ہم ناریل اور اناناس سے بھری تاریک سڑک پر آگئے تھے۔

بمشکل ایک ڈیڑھ کلومیٹر کی ڈرائیونگ کے بعد مجھے ایک بڑے سے بورڈ پر ''گلیسی روڈ'' لکھا نظر آیا۔

''اس کمینے خبیث کو کون نہیں جانتا......'' وہ دانت پیس کر بولی۔ ''بینکاک کا بَوّا کہلاتا ہے یہ...... بااثر اتنا ہے کہ بڑے سے بڑا سرکاری اہلکار بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پایا ہے ابھی تک......'' میں اس کی بات سن کر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''وہ سامنے والی بلڈنگ میں میرا فلیٹ ہے۔'' اس نے جیسے باتوں کا سلسلہ دانستہ موقوف کرنا چاہا، میں سامنے دیکھنے لگا۔ ایک بڑے پروجیکٹ کا وسیع وعریض قطعۂ اراضی تھا۔ وہاں روشنیاں چمک رہی تھیں۔ اس کی پیشانی پر ''ہولی گارڈن'' لکھا ہوا تھا۔ اَن گنت فلیٹوں کی کھڑکیاں اور دروازے نظر آرہے تھے۔ خاصی کثیر المنزلہ عمارت تھی۔ اندر آکر ہلینا نے کار کھڑی کی اور ہم اُترے۔ کئی مرد عورتیں اور بچے بوڑھے مٹرگشت کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ ایک جگہ ٹولی بنائے کھڑے باتیں کررہے تھے۔ بچے کھیل میں مشغول تھے۔ سائیکلیں اور ''اسکوٹی'' چلا رہے تھے جو پاؤں سے اور بیٹری سے چلتی تھیں۔

ہم ایک لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچے اور پھر ایک فلیٹ کا تالا کھول کر اندر آگئے۔

ہلینا نے ایک بٹن دبایا اور روشنی ہوگئی، سامنے لاؤنج تھا۔ فلیٹ بس ٹھیک ہی تھا، یوں تو سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ضرورت کی ہر شے وہاں نظر آتی تھی مگر چھوٹا تھا۔ دو ہی کمرے مجھے نظر آرہے تھے، اور درمیان میں یہ مختصر سا لاؤنج تھا۔ ہوادار تھا۔ ہال میں یہ اپنے بچوں کا تذکرہ کرچکی تھی مگر وہ مجھے نظر نہیں آرہے تھے۔

اچانک ہلینا کو کیا ہوا کہ وہ ایک صوفے پر گرگئی اور اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ شاید شوہر کے بغیر خالی فلیٹ کو دیکھ کر اس کا جی بھر آیا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ میرا اپنا ذہن انتشار کی زد میں تھا..... میں وزیر جان سے آخری حساب کرنے کی غرض سے فوکٹ کے علاقے اس کی محل نما رہائش گاہ کی طرف جانے کے لیے کاؤشی کے گھر سے نکلا تھا اور اب کہاں پھنس گیا تھا۔

فلیٹ کے محدود ماحول میں ایک ماتم کناں سی افسردگی طاری ہوگئی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو مجھے ایک کونے میں پانی کا جگ اور کانچ کا گلاس نظر آگیا، میں اُٹھا اور جگ سے گلاس میں پانی اُنڈیل کر ہلینا کے قریب آگیا، پہلے اپنا ایک ہاتھ اس کے شانے پر آہستگی سے رکھا، پھر جب اس نے اشک بار چہرہ اُٹھایا تو میں نے گلاس اسے تھما دیا۔ اس نے چند گھونٹ پانی کے حلق سے اُتارے اور ہولے سے تھینکس کہہ کر گلاس مجھے تھمادیا۔ میں اسے درمیان میں رکھی میز پر رکھنے کے بعد اپنی جگہ جا بیٹھا۔ ہلینا خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی تو میں نے دھیرے سے کہا۔

''میں تمہارے دکھ کا اندازہ ہی کرسکتا ہوں کہ تمہارے ہنستے بستے گھر پر اچانک کیسی قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے تمہارے شوہر کے مرنے کا بے حد افسوس ہوا ہے۔'' اس نے سامنے رکھے ٹشو باکس سے ایک ٹشو نکالا اور اپنے آنسو اور منہ پونچھتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں بولی۔

''خالی فلیٹ دیکھ کر دراصل میرا دل بھر آیا تھا۔ جوڑی کے بغیر اب یہ فلیٹ مجھے کھانے کو دوڑے گا۔ اس کی یادیں مجھے کافی دن بے چین رکھیں گی لیکن یہ تو سب میں برداشت کرلوں گی، مگر اپنے دونوں بچوں کو کس ہمت اور حوصلے سے بتاؤں گی ان کے لاڈ پیار اُٹھانے والا باپ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''

بولتے بولتے اس کا لہجہ ایک بار پھر رندھ گیا۔ میرے پاس اس بدنصیب عورت کے لیے مزید اظہارِ افسوس کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں خود پریشان تھا۔ اُس نے بھی شاید کچھ ایسا ہی محسوس کرکے فوراً خود کو سنبھال لیا اور اُٹھتے ہوئے بولی۔

''تم اس کمرے میں جاؤ۔ اندر واش روم ہے فریش ہولو تب تک میں کافی اور کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

''میرا خیال ہے کافی ہی ٹھیک رہے گی۔'' میں نے اسے کچھ بنانے کی زحمت سے بچانے کی خاطر کہا جانتا تھا کہ اس بے چاری کو تو اس بڑے صدمے کے بعد کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ رہا ہوگا، مگر وہ میری خاطر ہی کرتی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور پاس بنے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ میں کمرے میں آگیا۔ سوئچ بورڈ ٹٹول کر میں نے پہلے لائٹ آن کی۔

کمرا بے حد مختصر سا تھا۔ نہ ہی ایسی کوئی اور شے جو بیڈروم کہلانے کے زُمرے میں آتی ہو۔ ہاں! اسے ایک آفس روم ضرور کہا جاسکتا تھا۔ بک شیلف، فائل ریکس، بڑی سی میز، کرسیاں اور اس پر رکھا کمپیوٹر مانیٹر، فون، کاغذوں

اور فائلوں کے انبار اور نجانے کیا کیا، بس دفتری امور کی چیزیں تھیں۔

مجھے حیرت ہوئی کہ دو میاں بیوی اور بچے اتنے مختصر سے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے، اُوپر سے ایک کمرے کو آفس کے لیے مخصوص کرلیا گیا تھا، تو کیا فقط ایک ہی بیڈروم استعمال میں رکھا ہوا تھا؟ بچوں سے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ دوسرے کمرے میں سو رہے ہوں شاید۔ بہرحال...... سامنے مجھے باتھ روم کا دروازہ نظر آگیا اور میں اس طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں واپس لاؤنج میں آیا تو میز پر کافی کا صرف ایک .... کپ اور کچھ کیک بسکٹ وغیرہ پلیٹوں پر رکھے ہوئے تھے، مگر وہ خود غائب تھی۔ میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنا چاہا تو اس کی آواز سنائی دی۔

''تم شروع کرو، میں آتی ہوں......''

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا جہاں سے مجھے ہلینا کی آواز آئی تھی، وہ بیڈروم تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کا نصف منظر روشن اور دید کے سامنے تھا۔ وہاں مجھے ایک بیڈ بچھا نظر آیا جو خالی تھا۔ اس کے سامنے ہی مجھے باتھ روم کا دروازہ ادھ بھڑا ہوا دکھائی دیا، وہیں سے تھوڑا دروازہ کھول کر ہلینا نے مجھے لاؤنج میں آتے دیکھ کر ہانک لگائی تھی۔

میں کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ کافی کی تلخی میں ایک عجیب سی کڑواہٹ کا احساس ہوا اور تھکن عنقا ہونے لگی پھر میں نے ایک بسکٹ بھی اُٹھا کر منہ میں داب لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہلینا بھی فریش ہو کے آگئی۔ اس نے پہلے کچن کا رخ کیا اور جب لوٹی تو اس کے ایک ہاتھ میں اپنے لیے گرما گرم کافی کا کپ تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

وہ اب ہلکے پھلکے گھریلو لباس میں تھی۔ پنک کلر کا ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر تھا اور اس پر کھلی ڈلی، آدھی آستینوں والی ڈارک کلر کی شرٹ تھی۔ ہاتھ منہ دھونے اور اپنے سنہری بالوں کو سلیقے سے سنوار کر آنے کے بعد اب اس کی کچھ صورت نکل آئی تھی۔

اس نے سب سے پہلے سانچی سے متعلق مجھ سے پوچھا کہ وہ میری کیا لگتی تھی...... نیز میرا اس سے کیا رشتہ تھا۔ میں نے اسے وہی کچھ بتا دیا جو سچ تھا کہ اس سے میری وجہ ملاقات عمومی نوعیت کی قطعاً حادثاتی اور دورانیہ قلیل ترین تھا۔ جو بمشکل بیس منٹ پر ہی محیط تھا۔

''او......'' اس نے میرا یہ جواب سن کر قدرے حیرت بھرے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے۔ ''مگر...... اس کے تاثرات سے تو یہی جھلکتا تھا جیسے وہ تمہیں نجانے کتنے عرصے سے جانتی ہے اور تمہاری کتنی بڑی ہمدرد ہے۔''

''ہاں! بعد کے حالات اور واقعات نے شاید اسے میری کسی بات سے متاثر کیا ہو۔''

''پھر وہ تمہاری بہادری اور دلیری سے متاثر ہوئی ہو گی۔''

''ممکن ہے۔''

''تم کون ہو......؟'' اس نے اچانک مجھ سے سوال کر ڈالا۔

''میں ایک پاکستانی ہوں اور سیر کی غرض سے یہاں آیا تھا۔''

''تم اب بھی کچھ چھپا رہے ہو۔'' وہ شک بھری نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہارا شکریہ!'' معاً ہی میں نے رخصت چاہنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے اب چلنا چاہیے۔''

''اوہ...... تم شاید برا مان گئے۔'' وہ تفکر سے بولی۔ ''میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ تم مجھے اپنے کسی اہم راز سے آگاہ کرو۔ لیکن میری بات سن لو جو میں تم سے کہنا چاہتی ہوں۔ پھر اگر تم جانا چاہو تو تمہاری مرضی۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور پھر اس نے اپنے بارے میں تفصیل سے جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب یہ تھا۔

ہلینا اور اس کا شوہر جوڈی اینچ...... ایک فارماسسٹ تھے اور انہوں نے ایم فل کر رکھا تھا۔ (ابتدا میں مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ...... پھر بھی وہ ایسے کابک نما فلیٹ میں رہتے تھے مگر پوری بات سننے کے بعد مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔)

ان کے دو نوعمر بچے تھے۔ بیٹا بیٹی۔ وہ لندن میں ہی تھے۔ وہاں ان کا اپنا گھر تھا جو مورگیج پر تھا اور خاصا بڑا اور لندن کے مہنگے ترین علاقے میں تھا۔ مورگیج کی قسط ہر مہینے دینا ان کے لیے مشکل ہونے لگا تھا۔ ایک گورنس رکھی ہوئی تھی۔ لندن میں ہی یہ میاں بیوی ایک بڑی ملٹی نیشنل فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاب کرتے تھے۔ اسی دوران کمپنی نے یہاں تھائی لینڈ میں اپنی کمپنی کی برانچ کھولی اور انہیں ٹرانسفر کر دیا، سیلری پیکیج پرکشش تھا اور دیگر مراعات بھی تھیں، یوں مورگیج کی قسطیں بھی بہ آسانی ادا کرنا ان کے لیے سہل ثابت ہونے لگا۔ دونوں یہاں آگئے۔ مذکورہ کمپنی نے انہیں رہائش کے لیے

فوکٹ کے علاقے ہل ٹاپ جیسے ماڈرن اور مہنگے علاقے میں گھر دے رکھا تھا۔ یہ وہیں رہتے تھے۔

کمپنی کے ریسرچرز گروپ گلے کے کینسر کے علاج میں مستعمل ہونے والی ایک دوا لانچ کرنا چاہتے تھے۔ جس کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ اس دوا کی تیاری میں ایک خاص قسم کا کیمیکل استعمال ہونا تھا۔ چونکہ اس کیمیکل کا شمار ''نارکوٹیکس'' کی کیٹگری میں آتا تھا۔ اسی لیے اسے ڈرگ اینڈ نارکوٹیکس کنٹرول اتھارٹی کے ایکٹ کے مطابق رجسٹر کرانا ضروری تھا کہ وہ، یعنی مذکورہ فارماسیوٹیکل کمپنی اس Narcotics substance کو بہ غرض علاج (انسانی بھلائی) کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے ایسے کیمیکل کی تیاری اور حصول قانوناً ناممکن بات نہ تھی۔ جبکہ دیگر لوگوں کے لیے اس کیمیکل کا حصول ناممکن حد تک مشکل ہوتا ہے۔ اگر ہوتا بھی ہے تو اس میں دس گناہ اضافی خرچہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

بدقسمتی سے یہ کیمیکل ہیروئن، میری جوانا اور دیگر منشیات میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جس سے ان کی (منشیات کی) افادیت دوچند ہو جاتی ہے اور یہ ڈرگ، منشیات کی مارکیٹ میں بہت مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔ ہلینا کے شوہر جوڈی ایچ نے کمپنی کے توسط سے اس کیمیکل کا حصول اور تیاری کے سارے کام مکمل کر لیے تو کچھ پُراسرار لوگوں نے جوڈی سے خفیہ میٹنگ کی اور بھاری رشوت اور مراعات کا لالچ دیتے ہوئے اس کیمیکل کا حصول اور فروخت وغیرہ کے سلسلے میں بات کی۔

لیکن جب جوڈی پر یہ عقدہ کھلا کہ ان پُراسرار لوگوں کا تعلق بہت بڑے منشیات فروشوں کے سینڈیکیٹ سے تھا جن کا سربراہ کاسپاکو نامی ایک تھائی لینڈ کا انڈر ورلڈ کنگ ہے۔ جب جوڈی نے ان کی بات ماننے اور ان کی بھاری رشوت کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تو وہ خطرناک دھمکیوں پر اُتر آئے۔ جوڈی اور ہلینا نے پولیس سے رابطہ کیا تو اس ''جرم'' کی پاداش میں کاسپاکو کے آدمیوں نے ان کے گھر پر حملہ کیا۔ وہ پانچ افراد تھے اور انہوں نے ان کی ہل ٹاپ والی رہائش گاہ پر حملہ کر کے دونوں میاں بیوی کو زدوکوب کیا اور توڑ پھوڑ کرتے ہوئے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

یہ دونوں میاں بیوی اس علاقے میں شفٹ ہو گئے۔ اگرچہ خطرہ انہیں یہاں بھی تھا، کیونکہ کاسپاکو کے آدمیوں کو بھلا انہیں یہاں تلاشنے میں کیا مشکل پیش آسکتی تھی۔ تاہم فوری طور پر انہیں یہی جگہ مناسب لگی تھی کہ یہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا اور گھٹی گھٹی آبادی تھی۔ کچھ وقت یہاں سوچنے اور آئندہ کے لائحہ عمل کو ترتیب دینے کے لیے یہ جگہ انہیں بہتر محسوس ہوئی تھی۔

جوڈی نے اپنی کمپنی کے سربراہ سے اس خطرناک صورتِ حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے انٹرپول سے رابطہ کیا۔ جس کے بعد ان لوگوں کی گرفتاری عمل میں لائی گئی جنہوں نے ان کے گھر پر دھاوا بولا تھا۔ وہ سب گرفتار تو کر لیے گئے مگر ان میں سے کسی نے بھی کاسپاکو کا نام تک نہیں لیا۔ لہٰذا اپنے انہی قیدیوں کی رہائی کے لیے کاسپاکو کے دوسرے آدمیوں نے مال پر ہلّا بولا تاکہ عام شہریوں کو یرغمال بنا کے اپنے گرفتار ساتھیوں کو رہائی دلائی جاسکے۔ چنانچہ ابھی یہ سب چکر درمیان میں تھا کہ یہ نئی اور اچانک صورتِ حال پیش آگئی۔

میرے ایک سوال پر کہ اگر شاپنگ مال میں ہلّا بولنے والے بھی کاسپاکو کے آدمی تھے تو انہوں نے یا جوڈی اور ہلینا نے انہیں پہچانا کیوں نہیں؟ ہلینا نے اس کا بڑا سادہ سا جواب دیا تھا کہ وہ آدمی دوسرے تھے۔ کیونکہ کاسپاکو کے پاس آدمیوں کی کوئی کمی تو نہ تھی۔

''یہی وجہ تھی کہ جب ان کے سرغنہ نے تمہیں دھمکی دیتے ہوئے ''کاسپاکو'' کا نام لیا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکی تھی اور یوں میں تمہاری مدد میں دلچسپی لینے لگی۔''

''لیکن...... اس کے کہنے پر ''اسٹریپٹیز'' جیسا بیہودہ ڈانس کرنے پر کیوں آمادہ ہو گئیں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے یہ سوال نکل گیا تو وہ ایک بے تاثر سی مسکراہٹ سے بولی۔

''میں ان کا دل بہلانا چاہتی تھی، تاکہ کوئی موقع تاک کر ان سے اپنے بے گناہ شوہر کے قتل کا بدلہ لے سکوں۔'' اس ضمن میں بہت سی باتیں اور نصیحتیں میرے ذہن میں اُبھری تھیں مگر اب اس بے کار موضوع کو طول دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لہٰذا اس کی ساری جیون کتھا سننے کے بعد میں غور کرنے لگا کہ میں اس پر کس حد تک بھروسا کر سکتا ہوں؟ آخری فیصلہ میرا یہی تھا کہ میں اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا اور اس سے جان چھڑانے کی کوشش کروں گا۔

''مجھے بہت افسوس ہوا یہ سب سن کر......'' میں نے

گفتگو کو درمیانی موڑ دیتے ہوئے اس سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔ ''اب تو سب کچھ ہی ختم ہو گیا ہے اور میرا تمہیں نیک مشورہ بھی یہی ہوگا کہ تم...... اپنے شوہر کی تدفین وغیرہ کے بعد واپس لندن چلی جاؤ......''

''میں کاسپاکو سے انتقام لینا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے تمہارے جیسے دلیر فائٹر کی ضرورت ہے۔'' وہ بولی۔ میں نے جواباً کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

''میں یہاں کسی سے جھگڑا مول لینے کے لیے نہیں آیا ہوں اور یوں بھی میں عارضی طور پر یہاں ہوں، اب تو مجھے قبل از وقت ہی جانا پڑے گا۔''

''میں تمہیں معاوضہ دوں گی ...منہ مانگا......''

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی بات کو صرف نظر کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اب چلوں گا لیکن، میرے مشورے پر غور کرنا، اسی میں ہی تمہاری بھلائی ہے کیونکہ تمہارے بچوں کو اب تمہاری ضرورت ہوگی۔ بائے۔'' میں دروازے کی طرف بڑھا۔

''ٹھہرو......'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں تمہارے لیے بھاری معاوضے کی پیشکش کے ساتھ تمہاری ہر طرح سے دل بستگی کا بھی خیال کروں گی۔''

ہلینا کی اس عامیانہ بات پر میری طبیعت منغص تو ہو ہی گئی تھی مگر مجھے اس پر بے حد ترس آیا اور افسوس بھی ہوا کہ ایک عورت اپنے مطلب کی برآوری کے لیے اس حد تک بھی خود کو گرا سکتی ہے۔ کیونکہ میں اس کی ''دل بستگی'' کی بات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ انتقام نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے اُمید اسی لیے لگا بیٹھی تھی کہ اس کی نگاہوں نے میرے اندر کے جنگجو انسان کو تاڑ لیا تھا۔

میں دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے رکا اور اس کی جانب مڑا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تم نے میرے مزاج اور طبیعت کے بالکل برخلاف ایسی بات کہہ ڈالی کہ اب تو میں یہاں ایک لمحہ بھی رکنا پسند نہیں کروں گا لیکن میں تمہیں پھر بھی دوستانہ مشورہ دوں گا کہ خاموشی سے واپس لندن چلی جاؤ۔ تم ابھی جوان ہو، پڑھی لکھی ہو اور اچھے عہدے پر فائز ہو۔ رہی انتقام کی بات، تمہارے شوہر کا اصل قاتل میرے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکا ہے۔ رہا کاسپاکو تو میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا نہ ہی مجھے ضرورت بھی ہے، لیکن بہر حال وہ ایک بڑا گینگسٹر ہے اور تم اتنے بڑے اور خطرناک ....گروہ سے تنہا نہیں ٹکرا سکتیں۔''

''سوری! میں اپنے عامیانہ الفاظ واپس لیتی ہوں، میں تمہیں غلط سمجھی تھی۔'' وہ خفیف سی ہو کے بولی۔ ''لیکن...... کاسپاکو نے ہماری زندگی اجیرن کر رکھی تھی...... تت...... تم نہیں جانتے کہ اس خبیث نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔ میں نے تمہیں یہ حقیقت بتانا غیر ضروری سمجھا تھا لیکن اب بتائے دیتی ہوں کہ جس رات اس کے آدمیوں نے ہماری رہائش گاہ پر ہلا بولا تھا اسی رات وہ مجھے کاسپاکو کے حکم پر کڈنیپ کر کے بھی لے گئے تھے۔ وہاں پہلے کاسپاکو نے مجھے روندا اس کے بعد اس کے حواریوں نے میرا گینگ ریپ کیا۔ پھر مجھے صبح منہ اندھیرے میری... رہائش گاہ کے دروازے پر ادھ موا کر کے پھینک گئے۔ میں جیسے تیسے اندر داخل ہو گئی - جوڈی موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ظالموں نے اسے بہت مارا تھا۔''

وہ اپنی یہ دردناک داستان سنا کے ایک بار پھر رو پڑی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا اور پھر میں نے اس کے سامنے اپنا وہی مشورہ دہرا دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے عقب سے اس کے رونے کے سسکنے کی آوازیں آتی رہیں۔

میں نے دروازے کے ہینڈل کی طرف ابھی اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک کال بیل بج اُٹھی۔ میں دروازہ کھولتے کھولتے رک گیا اور گردن موڑ کر ہلینا کی طرف دیکھا۔ وہ سسکنا چھوڑ کر اسی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے میری سوالیہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہی اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ دروازے پر میجک آئی نصب تھی، میں نے اس پر آنکھ چپکا دی، مگر دھند کے سوا کچھ نظر نہ آیا، دفعتاً ہی میری چھٹی حس پھڑکی۔ میجک آئی پر چھائے ہوئے ''فوگ'' پر مجھے شبہے کا احتمال ہوا مگر دوسرے ہی لمحے میری محتاط اور ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے دھیمی سی آواز ٹکرائی، اگلے ہی پل میں میرا وجود سنسنا اُٹھا۔

یہ کسی آہنی ہتھیار کے ''چال'' کے بدلنے کی وہ مخصوص آواز تھی جسے پہچانتے ہی میں نے یک دم دائیں جانب جست لگائی۔ ہلینا دروازے کے قریب آچکی تھی۔ اس کی مجھے ہلکے سے کراہنے کی آواز آئی، ایک سماعت شکن برسٹ فائر ہوا، یہ ہیوی گن چلنے کی آواز تھی۔ اُدھر میں کچن کی طرف جا پڑا اور بہ سرعت پلٹا۔ دروازہ ٹوٹ کر ڈھے چکا تھا اور ہلینا کا لہو آلودہ جسم لہراتا ہوا صوفے پر آڑا تر چھا جا پڑا تھا۔ دو فل بلیک ماسک پوش بھاری گنز تھامے اندر داخل ہو چکے تھے۔ ان دونوں کے مخصوص گیٹ اَپ سے مجھے جانا پہچانا اندازہ ہوا مگر یہ خطرناک گھڑی زیادہ غور کرنے کی متحمل نہیں تھی۔ دونوں نے اِدھر اُدھر گردن گھماتے ہوئے میری شاید جھلک دیکھ لی تھی، جب میں کچن کی طرف بنی بالکونی کی

جانب تیزی سے رینگ گیا تھا کیونکہ اسی پل اس طرف... برسٹ فائر ہوا تھا، تب تک میں بالکونی کی طرف کھلنے والے جالی دار شٹر کو دھکا دے کر ریلنگ سے خود کو نیچے اُتارنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ شکر تھا کہ ریلنگ پر گرل نصب نہیں تھی، وہ اوپن تھی، ورنہ یہ ذرا سی کچن کی جگہ میرے لیے چوہا دان بن کر رہ جاتی اور موت بانٹنے والے ہرکارے مجھے پل کے پل چھلنی کر ڈالتے جن کا تعلق مجھے انہی ہرکاروں سے ملتا جلتا ہی محسوس ہوا تھا جنہوں نے مال میں دھاوا بولا تھا۔

میرا دل موت کی دستک دیتا تیزی سے دھڑ دھڑا رہا تھا۔ مجھے اسی پھرتی سے کام لینا تھا جس پھرتی سے وہ خونی در انداز داخل ہوئے تھے۔ ورنہ دروازے سے کچن تک کا فاصلہ ہی کتنا تھا۔

میری گردشی نظروں نے بلندی کا اندازہ کیا جو خاصی تھی مگر نیچے ہی ایک فلیٹ کی کھڑکی کا مجھے چھجا نظر آیا، فوری طور پر میں نے اسی پر چھلانگ لگا لی۔ دونوں ہرکارے اگر وہی تھے جن کے "قبیل" کا مجھے شبہ تھا تو میں اس وقت ٹاپ کر منلو کی زد میں تھا جو پلک جھپکتے ہی موت بانٹتے تھے۔ چھجے پر گرتے ہی میں نے اُوپر سر اٹھایا تو ایک سیاہ نقاب میں لپٹا چہرہ اپنی گن کی نال سمیت دکھائی دیا۔ وہ اُوپر سے مجھے نشانہ لینے کے لیے پر تول رہا تھا۔ لیکن اس کی راہ میں چھجا تھا۔ اس نے اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ میری تیزی سے گردش کرتی نظریں محفوظ مقام یا آڑ تلاش رہی تھیں اور تو کچھ نہیں مجھے اسی چھجے کی جہاں میں ٹکا ہوا تھا، کھڑکی کا بند شیشہ نظر آیا۔ میں اسے توڑتا ہوا جیسے ہی اندر کودا۔ عقب میں چھجے کا بڑا سا ٹکڑا ٹوٹ کر گرا، یہی وہ وقت تھا جب میں نے اسی ہرکارے کو بھی اس پر چھلانگتے دیکھا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر ہی وہیں ٹکے ٹکے..... مجھ پر برسٹ چلا دیا۔ میرے دائیں بائیں فرش پر چنگاریاں اُڑیں اور میں سانپ کی سی تیزی سے لڑھکنیاں کھاتا ہوا، ایک بڑے سے بیڈ کی طرف چلا گیا، مگر جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ یہ کمرا جو سرِدست مجھے کسی اور انسان کے وجود سے یکسر عاری نظر آتا تھا، میرے لیے چوہے دان بن سکتا ہے۔ میرے ذہن نے پل کے پل کھڑکی کے باہر چھجے پر ٹکے ہرکارے کی "پوزیشن" کا اندازہ کیا اور قریب دھری ایک قدرے بھاری کرسی اُٹھا کر بڑے زور سے اُچھال دی۔

ہرکارے نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کمرے کا سائز مجھے اس کی نظروں اور گن کی رینج سے دور نہیں کر سکتا، اسی سبب اس نے کمرے میں داخل ہونے کے لیے مجھے اپنی گن سے نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی کہ وہ میری چال میں آ گیا۔ میری پھینکی ہوئی کرسی خاصی تیزی کے ساتھ اس سے جا ٹکرائی تھی، وہ عقب میں گرتے گرتے بچا تھا کہ...... اس کوشش میں اس کے ہاتھوں سے گن چھوٹ کر نیچے جا رہی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سنبھلتا ہوا ایک پیراٹروپنگ انداز میں قلابازی کھاتا اندر کود پڑا تو میں نے بھی اسی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اُچھل کر اس پر جست لگائی، جب تک اس کے قدم کمرے کے فرش پر ٹکتے، میں اسے بری طرح رگید چکا تھا اور نہ صرف یہ بلکہ اس کی وحشیانہ درندگی پر مغلوب الغضب ہو کے میں نے اس کا سر بھی بڑے زور سے دیوار سے ٹکرا دیا تھا۔ "بھچاک" کی آواز کے ساتھ ہی اس کا سر پھٹ گیا اور وہ وہیں بے حرکت ہو گیا۔ اعصاب شکن لمحات میں میرا رُواں رُواں مثل پارا تھرک رہا تھا۔

یہ فلیٹ شاید خالی تھا، ورنہ اب تک کی ہڑبونگ سے کوئی نہ کوئی سامنے آ ہی چکا ہوتا۔ مجھے اس کے دوسرے ساتھی ہرکارے کی طرف سے خطرہ تھا۔ اس کے اچانک غیاب پر میں یہی اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ دوسری جانب سے مجھے گھیرنے کی کوشش میں کمرے سے ہی پلٹ گیا ہوگا۔ میں نے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ ان کی بناوٹ ایک ہی جیسی تھی۔ جیسی اُوپر والے فلیٹ کی تھی۔ اب وہاں ہلینا کی لاش کے سوا کچھ نہ تھا۔ مجھے اس کے انجام پر نہایت افسوس تھا۔ کچھ ایسا ہی لگا تھا مجھے کہ یہ لوگ کاسپاکو کے ہی ہرکارے تھے۔ یا تو وہ ہمارے تعاقب میں یہاں تک آئے تھے، یا پھر انہوں نے پہلے ہی سے اس فلیٹ کی ریکی کر رکھی تھی اور دوسری بار حملہ کرنے کی نیت سے آئے تھے۔

ابھی ان سب باتوں پر غور کرنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں ایک پھندے سے نکلتا تو دوسرے میں پھنستا جا رہا تھا۔

ٹھیک اسی وقت باہر نیچے مجھے پولیس گاڑیوں کے چیختے ہوئے سائرن کی آواز سنائی دی۔ ایک نئی مصیبت میرے گلے کو آن پڑی تھی۔ میں دروازے کی طرف لپکا۔ کھول کر اسے ذرا باہر جھانکا۔ حسبِ توقع باہر قریب کے فلیٹوں سے نکلے ہوئے لوگوں کا شور مچا ہوا تھا۔ دوسرے ہرکارے کے بارے میں میرا یہی خیال تھا کہ ہلینا کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد وہ لوٹ گیا ہو مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنا یہ خیال رد کر دیا۔ وہ اپنے ساتھی کی تلاش میں تو ہوگا؟ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پولیس کی آمد پر کہیں دبک گیا ہو۔ کچھ بھی سہی وہ میرے لیے کسی وقت بھی موت کا پیامبر ثابت ہو سکتا تھا۔

اگر یہ کاسپا کو کے ہی آدمی تھے اور نہیں ہلینا کو قتل کرنے کا ٹاسک ملا ہوا تھا تو...... وہ اپنا کام کر چکے تھے لیکن غور طلب بات یہ تھی کہ آخر ایسا اُنہوں نے کیوں کیا؟ ہلینا اور جوڑی (جب وہ زندہ تھا) ان کو ہلاک کرنا ان کے مفاد میں نہیں ہوسکتا تھا۔ یا پھر.. صرف دھمکی کے طور پر صرف ہلینا کو ہی موت کے گھاٹ اُتارنا ان کا مقصد رہا ہو (ابھی انہیں شاید یہ حقیقت معلوم نہ تھی کہ جوڈی بھی مارا جاچکا ہے)

کاسپا کو...... بیک وقت دو محاذوں سے برسرِ پیکار تھا۔ ایک طرف اس نے اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے ایک بڑے شاپنگ مال پر اپنے ساتھیوں کے ذریعے دھاوا بولا تھا اور دوسری جانب اس نے اپنے دوہرکارے...... ہلینا کے فلیٹ کی جانب روانہ کردیے ہوں جس کی ریکی وہ پہلے کر چکے تھے۔

میں نے اس سارے چکر پر لعنت بھیجی، کیونکہ اب برٹش جوڑے کی ہلاکت کے بعد یہ معاملہ ختم ہوتا محسوس ہورہا تھا۔ رہا میں...... تو وہ مجھے ہلینا کا کوئی عام دوست وغیرہ سمجھے ہوں۔

میرے لیے اب یہاں سے نکلنا ازبس ضروری ہوچکا تھا۔ میں نے کچھ سوچا اور باہر آکر عام لوگوں میں گھل مل گیا۔ پولیس اہلکار تیزی سے اُوپر چڑھتے آرہے تھے اور لوگ اسے ہلینا کے فلیٹ کی طرف اشارہ کر کرکے تھائی زبان میں کچھ بتا رہے تھے۔ میں موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے باہر نکل چکا تھا اور ابھی باؤنڈری وال کے اندر ہی تھا، یہاں بھی وسیع احاطے میں لوگ جمع تھے۔ مجھے پولیس کی دو گاڑیاں ... کھڑی نظر آئی تھیں۔ گیٹ پر بھی چند پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک وائرلیس سیٹ پر کسی سے باتیں کررہا تھا۔ تھائی پولیس کی گیٹ پرنا کابندی دیکھ کر میں پریشان سا ہوا تھا، تاہم...... لوگوں کے ہجوم میں گھس کر میں دائیں بائیں نکاسی کا کوئی اور راستہ تاڑتا ہوا باؤنڈری وال کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا دیوار پھلانگ کر باہر نکل ہی آیا اور رات کی سرد تاریکی میں اندھیری گلیوں سے گزرتا مین شاہراہ پر آگیا۔

مجھے ٹیکسی کی تلاش تھی جو جلد ہی ایک چھوٹے سے بار کے سامنے کھڑی مل گئی۔ میں اس میں سوار ہوگیا اور ڈرائیور کو گلیسی اسٹریٹ چلنے کا کہا۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ میں پچھلی سیٹ پر براجمان تھا اور تھکے تھکے انداز میں میں نے اپنا سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا دیا مگر آنکھیں کھلی رکھی تھیں۔

میں وزیر جان کو ٹھکانے لگانے کے لیے آج شام گھر سے کاؤشی کے ڈربا نما گھر سے نکلا تھا اور کہاں جا پھنسا تھا۔ انہی پریشان کن خیالات کی رو میں پتا ہی نہ چلا کہ کب ٹیکسی رکی اور ڈرائیور نے مجھے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گلیسی اسٹریٹ آنے کی خبر دی۔

اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اب آگے کس طرف چلنا ہے۔ میں نے منع کردیا اور کرایہ ادا کرکے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ راستہ تاریک اور سنسان تھا۔ اسٹریٹ لیمپس کی روشنی میں کاؤشی کے گھر کی جانب بڑھتے ہوئے میں...... اِدھر اُدھر محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے...... آگے بڑھتا رہا۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں ٹھٹکا۔ دروازے پر تالا نہیں تھا۔ جس کا مطلب تھا کاؤشی آیا ہوا تھا۔ مجھے تھوڑی حیرت ہوئی۔ ممکن تھا وہ مجھ سے کوئی اہم بات کرنے آیا ہو۔ ورنہ تو اس نے دو تین روز بعد آنے کا کہہ رکھا تھا۔ مجھے پریشانی بھی ہوئی کہ وہ مجھے اس طرح رات گئے باہر دیکھ کر ناراض بھی ہوگا۔ مجھے فکر بھی تھی کہ کہیں میری آج کی بھاگم دوڑ اس کے سامنے میڈیا یا اور کسی ذرائع سے آشکارا نہ ہوگئی ہو۔ ایسی صورت میں وہ معاہدہ بھی ختم کرسکتا تھا جس کی تنبیہ وہ پہلے ہی مجھے کرچکا تھا۔

بہرحال...... میں نے دروازے پر دستک دینی چاہی تو وہ کھلا ملا۔ یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ میں نہایت محتاط انداز میں اندر قدم رکھتے داخل ہوا۔ لاؤنج میں مدھم روشنی تھی۔ وہاں میں نے کسی کو بیٹھے پایا۔ سامنے میز پر وہسکی کی بوتل اور ایک ادھ بھرا پیگ رکھا ہوا تھا۔ اس آدمی کو دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوگئی۔ وہ کاؤشی تھا۔ میں آگے بڑھا اور سوئچ بورڈ کی جانب ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کردی۔ اگلے لمحے جیسے میری ریڑھ کی ہڈی میں سیکڑوں چیونٹیاں رینگتی محسوس ہوئیں۔ کاؤشی کی آنکھیں پھٹی پھٹی انداز میں کھلی ہوئی تھیں، پشت صوفے سے ٹکی ہونے کے سبب اس کا سر بھی سیدھا ہی ٹکا ہوا تھا یا اس طرح ٹکایا گیا تھا جیسے پہلی نظر میں یہی لگے کہ وہ آرام سے بیٹھا "شغل" میں مصروف ہے لیکن قریب اور روشنی میں دیکھنے پر ایک لرزا دینے والا منظر میرا منتظر تھا۔ کاؤشی کے سینے میں عین دل کے مقام پر دستے تک خنجر دھنسا ہوا تھا۔ ابھی میں سنسناتی گھڑیوں کی زد میں ہی تھا کہ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میرے عقب میں کوئی موجود تھا۔ خطرے کا احساس ہونے تک کوئی قیامت سی میرے سر پر ٹوٹی تھی اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا......

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آخری سین

مہتاب خان

شوبز کی چمکتی دمکتی دنیا کی روشنیاں ہر شخص کی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہیں... وہ نو عمر تھی... نادان تھی اور ایک فنکار کی ایسی مداح و پرستار تھی جس کے لیے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے... وہ اس بات سے لاعلم تھی کہ اس کے خوابوں کا دیوتا کیسی بلندی اور کیسی پستی کا شہ سوار ہے...

ہر چال پر عمل کا وقت آتا ہے اور اس نے اپنی چال پر عمل کر ڈالا تھا......

خرم شہزاد ٹی وی ڈراموں کا مشہور ترین اداکار تھا۔ وہ نہ صرف ایک مقبول فنکار تھا بلکہ مانا ہوا مصنف اور کامیاب پروڈیوسر بھی تھا۔ اس کا اپنا شاندار اسٹوڈیو تھا۔ وہ اپنے ڈراموں کی کہانی خود لکھتا اور خود ہی اسے ڈائریکٹ بھی کرتا تھا۔ اس کا لکھا ہوا کوئی ڈراما کبھی ناکام نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنے لکھے زیادہ تر ڈراموں میں ہیرو کا کردار خود ہی

ادا کرتا تھا۔ ایک باوقار، رومینٹک، ہمدرد، بہادر اور خطروں سے کھیل جانے والا کردار۔ اکثر ڈراموں میں اس کا مقابلہ ایسے لوگوں سے دکھایا جاتا تھا جو معاشرے کے ناپسندیدہ افراد تھے۔ وہ ستم رسیدہ افراد کی مدد اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر کیا کرتا تھا۔

ان دنوں بھی اس کا ایک سلسلے وار ڈراما آن ایئر تھا جو بے انتہا مقبول تھا۔ اس میں اس نے بھٹکی ہوئی ایک لڑکی کو بچانے والے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا جو آسائشوں کی تلاش میں اپنی راہ سے بھٹک گئی تھی پھر دنیا نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ ایسے میں وہ مایوس ہو کر خود کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ کہانی کے اس موڑ پر خرم روشنی کا مینار بن کر نمودار ہوتا ہے۔

اس دن اس ڈرامے کی آخری قسط اس کے اسٹوڈیو میں ریکارڈ ہونی تھی۔ بیڈروم کا سیٹ ریڈی تھا مگر خرم نے کسی وجہ سے ریکارڈنگ کینسل کر دی پھر یہ سین کبھی ریکارڈ نہیں ہوا۔

اگلی صبح جب عملہ شوٹنگ کے لیے اسٹوڈیو پہنچا تو ایک درد ناک منظر ان کا منتظر تھا۔ خرم سیٹ پر دروازے کے درمیان بے ڈھنگے انداز میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر چوٹ کا نشان تھا اور قالین پر خون کا بڑا سا دھبا نظر آرہا تھا۔ سر کے قریب ہی پیتل کا بھاری گلدان پڑا تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کی موت گلدان کی بھاری ضرب سے واقع ہوئی ہے۔ قریبی میز پر اسکرپٹ رکھا ہوا تھا۔

اس کے اسٹاف نے فوری طور پر پولیس کو اطلاع دے دی تھی اور آناً فاناً یہ خبر ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی تھی۔ ہر شخص حیران تھا۔ کسی کو اس کی اچانک موت کا یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کی کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ وہ عام افراد کے دلوں پر راج کرنے والا پسندیدہ فنکار تھا۔

پولیس نے وہاں پہنچتے ہی اپنی تفتیش کا آغاز کر دیا تھا اور لاش کی مختلف زاویوں سے تصویریں بنائی جارہی تھیں۔ پیتل کے گلدان پر سے انگلیوں کے نشانات کو بڑی خوبی سے صاف کر دیا گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل جو کوئی بھی تھا بہت ہوشیار تھا۔

سب سے پہلے پولیس کے ایک افسر نے اس کے اسٹاف سے پوچھ گچھ کا آغاز کیا تھا۔ اس کی اسسٹنٹ تہمینہ عرف مینا غم سے نڈھال تھی۔ کیمرا انجینئر، سیٹ ڈیزائنر اور عملے کے دیگر افراد سے بھی پولیس کو کوئی قابلِ ذکر بات پتا نہیں چلی تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔

خرم ان دنوں اپنے شاندار بنگلے میں تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ بنگلے سے ملحق اس کا اسٹوڈیو تھا۔ خرم نے دو شادیاں کی تھیں جو ناکام ثابت ہوئی تھیں۔ اس کی پہلی بیوی ایک دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جس کے ساتھ اس نے صرف دو سال کا مختصر عرصہ گزارا تھا پھر اس سے علیحدگی حاصل کر کے وہ بیرونِ ملک شفٹ ہوگئی تھی جہاں کچھ عرصے بعد اس نے شادی کر لی تھی اور ان دنوں وہ اپنے بیٹے اور شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی تھی۔

اس کی دوسری بیوی کا تعلق شوبزنس سے ہی تھا۔ وہ ایک دوسرے درجے کی اداکارہ تھی۔ بلا کی منہ پھٹ اور تیز طرار عورت تھی۔ پولیس کی تفتیش کے دوران اس نے کہا تھا۔

”خرم کی بے راہ روزندگی کا یہی انجام ہونا تھا۔ مجھے اس پر بالکل حیرت نہیں ہوئی۔“

بہرحال قتل کے حوالے سے اس نے جائے وقوعہ سے اپنی دوری کے ثبوت پولیس کو فراہم کر دیے تھے۔ وہ قتل کے وقت جائے وقوعہ سے بہت دور شوٹنگ میں معروف تھی۔

خرم کا والٹ اس کی قیمتی گھڑی اور موبائل فون سب کچھ اس کے پاس موجود تھا اس لیے چوری وغیرہ کا معاملہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پولیس کی تفتیش کی گاڑی رک سی گئی تھی قتل کا محرک کیا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

وہ پوری محویت کے ساتھ ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ بالکل کسی سحر زدہ انسان کی طرح۔ ٹی وی پر اس وقت اس کے پسندیدہ آرٹسٹ کا پلے چل رہا تھا۔

اس کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ بڑی سحر انگیز تھی۔ وہ بڑے مشفقانہ انداز میں اس شکست خوردہ اور ٹھکرائی ہوئی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ شازمہ کے دل میں اس کے لیے محبت کا طوفان موجزن ہوگیا۔ اس نے سوچا کاش اس لڑکی کی جگہ وہ خود ہوتی تو دوڑ کر اس کے کشادہ سینے سے لپٹ جاتی۔

اٹھارہ سالہ شازمہ خرم سے عقیدت کی حد تک محبت کرتی تھی اور ہر وقت اس کی یادوں میں کھوئی رہتی تھی۔ وہ اس کا آئیڈیل تھا۔ شازمہ کی ماں اس کے بچپن میں ہی وفات پا چکی تھی۔ بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔ والد کے آفس جانے کے بعد وہ گھر میں تنہا ہی رہتی تھی۔ ایک جزوقتی ملازمہ چند گھنٹوں کے لیے آتی تھی، باقی وقت وہ تنہا ہی گزارتی تھی۔

اس نے اپنے خیالوں اور خوابوں کی ایک دنیا بسائی ہوئی تھی جس کا ہیرو خرم تھا۔ وہ ہر وقت اس کی یادوں میں ڈوبی رہتی تھی اور یہی سوچتی رہتی کہ کس طرح اس سے رابطہ قائم کرے۔ وہ ہر اس جگہ کوشش کرتی جہاں جہاں اس کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ اس نے کسی طرح خرم کے اسٹوڈیو کا پتا بھی لگا لیا تھا

اور اس ایڈریس پر خرم کو بے شمار خطوط بھی لکھ چکی تھی جس میں اس نے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا مگر اس کے کسی خط کا جواب نہیں آیا تھا۔

اچانک اس دن اس کی یہ دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔ وہ اپنی کالج کی دوست رمشا کے ساتھ کسی سنگر کے کنسرٹ میں گئی تھی۔ وہاں اسٹیج پر خرم شہزاد کو دیکھ کر وہ اچھل پڑی، اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ خرم بحیثیت گیسٹ وہاں مدعو تھا۔ وہ اسے دیکھ کر دیوانی سی ہوگئی تھی۔ اس سے ملنے کا یہ سنہرا موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

اس نے رمشا سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔ ''یہ فنکار لوگ عام لوگوں سے نہیں ملتے، خاموشی سے پروگرام انجوائے کرو۔''

ابھی وہ آپس میں بحث کر ہی رہی تھیں کہ شازمہ کے برابر بیٹھی ہوئی عورت اس سے مخاطب ہوئی۔

''آپ خرم شہزاد سے ملنا چاہتی ہیں؟''

''جی، میری بڑی خواہش ہے۔''

''ان کی اسسٹنٹ پہلی صف میں بیٹھی ہے۔ میں اسے جانتی ہوں۔ اگر آپ لوگ چاہیں تو میں مینا سے آپ کو ملوا سکتی ہوں۔ مینا آپ کی ملاقات کا بندوبست کردے گی۔''

شازمہ کی آنکھیں چمکنے لگیں، اس نے سوالیہ نظروں سے رمشا کو دیکھا اور اس کے ساتھ جانے پر تیار ہوگئی۔

وہ انہیں ساتھ لیے مینا کے پاس آگئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے شازمہ کی سفارش کی تھی۔ شازمہ نے خرم کے ساتھ ایک سیلفی بنوانے کا اظہار کیا تو کچھ ہچکچاہٹ کے بعد وہ مان گئی اور ان دونوں کو یقین دلایا کہ پروگرام کے اختتام پر وہ خرم سے ان کی ملاقات کروادے گی۔

پھر پروگرام کب ختم ہوا اور کس نے کیا پرفارمنس دی، اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ پروگرام کے اختتام پر مینا نے انہیں خرم سے ملوایا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ جیتا جاگتا خرم اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ وہ حقیقی زندگی میں زیادہ خوبرو نظر آرہا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اس سے کچھ نہیں کہہ پائی۔

وہ بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ رمشا نے اسے ٹوکا۔ ''خود کو سنبھالو شازمہ۔''

خرم سے گفتگو کا آغاز رمشا نے ہی کیا تھا۔

''سر، ہم آپ کے فینز ہیں اور آپ کے ساتھ سیلفی بنوانا چاہتے ہیں۔'' خرم نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے ان کے ساتھ سیلفی بنوائی تھی۔ وہ جانے کے لیے قدم بڑھانے والا تھا جب شازمہ نے اچانک کہا۔ ''آپ میرے آئیڈیل ہیں خرم صاحب، میں نے آپ کے سارے ڈرامے دیکھ رکھے ہیں۔ آج آپ سے ملاقات کر کے میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہوئی ہے۔ میں نے آپ کے اسٹوڈیو کے ایڈریس پر بے شمار خطوط لکھے تھے اور آپ کے فین پیج پر بھی میسج کیے تھے۔''

اس نے سر سے پاؤں تک شازمہ کو بغور دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جواب نہیں دیا ہوگا۔''

''جی ہاں، میں تو مایوس ہوگئی تھی مگر دیکھیں میرا جذبہ سچا تھا یہاں آپ سے ملاقات ہوگئی۔''

''دراصل ہر روز مداحوں کے بے شمار خطوط اور پیغامات آتے ہیں۔ سب کو فوراً فوراً جواب دینا ممکن نہیں ہوتا...... بہر حال۔'' کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ ''تم کسی دن بھی میرے دفتر آکر مجھ سے مل سکتی ہو۔''

''کیا واقعی...... میں آپ سے ملنے آسکتی ہوں؟'' زمین پر اس کے پاؤں نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ خوشی سے دیوانی ہوگئی تھی۔

''ہاں کسی بھی دن آجانا لیکن شام پانچ بجے کے بعد کیونکہ دن میں، میں بہت مصروف ہوتا ہوں...... مینا ان کو ایڈریس سمجھادو۔'' یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا تھا۔

اس ملاقات کی خوشی میں سرشار وہ گھر پہنچی تو ڈیڈی اس کے منتظر تھے۔ اس نے خوشی خوشی اپنے ڈیڈی کو بتایا کہ وہ ٹی وی اسٹار خرم شہزاد سے مل کر آئی ہے۔

''کیا، کس سے مل کر آئی ہو؟'' اس کے ڈیڈی نے چونکتے ہوئے کہا۔

''خرم سے......''

''یہ کون ہے؟''

''اوہ ڈیڈی آپ خرم کو نہیں جانتے۔ تعجب ہے کتنا لاجواب ہیرو ہے۔ کبھی آپ اس کا کوئی ڈراما دیکھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے۔ اتنی اچھی اداکاری کرتا ہے وہ۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے، میں نے نہیں دیکھا تم ہی دیکھو۔ میں تفریح کے لیے ٹی وی دیکھتا ہوں، چہرے یاد رکھنے کے لیے نہیں۔''

''ڈیڈی اس نے مجھے اپنے آفس بلایا ہے میں کسی دن اس سے ملنے جاؤں گی۔''

''کیا نام بتایا تم نے؟''

''خرم شہزاد۔''

"کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی۔ شوبزنس کی دنیا اچھی نہیں ہوتی۔ یہاں ہوتا کچھ ہے اور دکھائی کچھ دیتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مصیبت میں پڑو۔" لیکن باپ کے ڈراوے بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکے تھے۔ اسے اپنے والد کی باتیں قطعی پسند نہیں آئی تھیں۔

خرم کو شوبز کی دنیا کا ذلیل ترین شخص کہا جاتا تھا۔ اس کا حقیقی کردار اس کے ڈراموں کے کردار سے بالکل الٹ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک کہنہ مشق آرٹسٹ اور بہترین مصنف تھا لیکن عملی زندگی میں وہ ایک عیاش انسان تھا۔ شراب اور لڑکیاں اس کی کمزوری تھیں۔ اداکاری اور دیگر مصروفیات سے جو وقت بچتا، وہ شراب اور حسیناؤں کی نذر ہو جاتا تھا۔

کوئی لڑکی اس کی سفلی خواہشات کے سامنے سر جھکائے بغیر اس کے ڈراموں میں کام حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ لڑکیوں کی اہمیت اس کی نظر میں ایک کھلونے سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی بدمزاج اور مغرور شخص تھا۔

اس کے اسٹوڈیو میں کام کرنے والا ہر شخص اس سے نفرت کرتا تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں سے ذلت آمیز سلوک روا رکھتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے اپنی ابتدائی زندگی میں بہت ٹھوکریں کھائی تھیں۔ وہ انتھک محنت کے بعد اس مقام تک پہنچا تھا۔

اپنے کردار کی ان کمزوریوں کے باوجود وہ بے مثال فنی صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فن کی دنیا کا ایک روشن ستارہ تھا۔ شوبز کی دنیا سے متعلق لوگ اس کی تمام نازیبا حرکات کو جاننے کے باوجود اس سے کام لینے پر مجبور تھے۔ کیونکہ ان کے پاس اس کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ اس کی ٹکر کا کوئی اور آرٹسٹ دور دور تک دکھائی نہ دیتا تھا۔

ایک ہفتے بعد شام پانچ بجے شازمہ اس کے آفس گئی۔ سیکریٹری سے اس نے خرم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

"اس وقت......" اس نے چونک کر کہا۔

"جی خرم صاحب نے مجھے اسی وقت بلایا تھا۔"

اس کی سیکریٹری نے انٹرکام پر اسے بتایا کہ شازمہ نامی ایک لڑکی اس سے ملنا چاہتی ہے۔

"کون ہے یہ؟ میں کسی شازمہ کو نہیں جانتا؟" خرم نے بدمزاجی سے کہا۔

اس وقت وہ ایک اسکرپٹ پر نظرثانی کر رہا تھا۔

"یہ کہہ رہی ہے کہ آپ نے اسے بلایا تھا۔"

"کیسی ہے؟"

"خوب صورت۔" اس نے کچھ فاصلے پر بیٹھی شازمہ کو دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اگر اجازت ہو تو اندر بھیج دوں؟"

"بھیج دو۔" وہ بولا اور انٹرکام بند کر کے دوبارہ اسکرپٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چند لمحوں بعد اس کے کانوں سے ایک مترنم آواز ٹکرائی۔

"میں اندر آ جاؤں سر؟"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سترہ اٹھارہ سال کی ایک نرم و نازک حسین لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے شازمہ کو نہیں پہچانا تھا۔

"ہیلو۔" خرم نے کہا۔ "آؤ بیٹھو۔"

"لگتا ہے آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ ایک ہفتے پہلے میں آپ سے کنسرٹ میں ملی تھی اپنی سہیلی رمشا کے ساتھ۔" اس نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"ہم...... کیا نام بتایا تم نے؟"

"میرا نام شازمہ ہے۔"

"شازمہ پیارا نام ہے...... ہاں تو شازمہ تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟"

"مم...... میں۔" وہ گڑبڑا گئی۔ "میں آپ کے ڈرامے بہت شوق سے دیکھتی ہوں، آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں...... مم میرا مطلب ہے آپ بہت اچھی اداکاری کرتے ہیں۔" وہ بدحواسی سے بولی۔

وہ بڑی دلچسپی سے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور کیمرامین کمرے میں داخل ہوا۔

"سر!" اس نے کہا۔ "شوٹنگ کب شروع کرنی ہے؟"

"کیا منہ اٹھائے اندر آ جاتے ہو، مینا سے پوچھو۔" وہ غرایا۔ "دیکھتے نہیں میں مصروف ہوں۔"

"لیکن۔"

"شٹ اپ۔ جاؤ یہاں سے جب ضرورت ہو گی بلوالوں گا۔" کیمرامین کمرے سے چلا گیا۔

خرم ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ "یہ لوگ ایک منٹ بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔"

ابھی اس کی بات بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ سیٹ ڈائریکٹر کمرے میں داخل ہوا۔

"سیٹ تیار ہے سر......" خرم نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی دھن میں کہتا رہا۔ "آپ اسے دیکھنا پسند کریں گے؟"

"گیٹ آؤٹ۔" وہ دھاڑا پھر انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کہا۔ "اب کوئی شخص میرے کمرے میں نہ آئے۔ میں بہت مصروف ہوں۔" پھر اس نے زوردار آواز کے ساتھ ریسیور پٹخ دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر شازمہ کو دیکھا تو وہ یہ دیکھ کر

حیران رہ گئی کہ ذرا سی دیر میں ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے، ایک بدمزاج چہرے والا خرم مسکراتی آنکھوں اور مسکراتے چہرے والے خرم میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کی ایک لکیر تک باقی نہیں رہی تھی۔

''م...... میرا خیال ہے میری وجہ سے آپ کا کام ڈسٹرب ہو رہا ہے۔ میں اب چلتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا ایسے ہی چلی جاؤ گی؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس نے چونک کر خرم کو دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کچھ خدمت کا تو موقع دو مجھے۔ آخر تم میری مہمان ہو۔'' خرم نے کہا۔

شازمہ کو اس کی باتیں اور اس کا انداز کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ یہ اس خرم سے خاصا مختلف تھا جسے وہ ڈراموں میں دیکھتی رہی تھی۔ وہ ایک نرم مزاج، باوقار، سلجھا ہوا اور ہمدرد شخص تھا لیکن جو خرم اس کے سامنے بیٹھا تھا وہ ایک تند مزاج، تلخ اور غصیلا شخص تھا۔

اس نے خود کو سمجھاتے ہوئے سوچا شاید وہ آج کسی بات پر پریشان ہے۔ خرم نے اسکرپٹ بند کر کے دراز میں رکھا اور انٹرکام پر کسی سے بات کرنے لگا۔

''مینا آج کی شوٹنگ کینسل کر دو اور سب کو چھٹی دے دو۔ اسٹوڈیو میں مجھے کوئی نظر نہیں آنا چاہیے اور سنو تم اس وقت تک نہیں جانا جب تک میں نہ کہوں۔''

اس نے ریسیور رکھا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آؤ چلیں۔''

وہ گھبرا گئی اور بولی۔ ''ک ک...... کہاں سر؟''

''بھئی کچھ خاطر مدارت کا موقع دو۔ میں بھی اٹھنے والا تھا کہ تم آگئیں۔''

اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا، وہ اس کے پیچھے چل پڑی۔

وہ اسے اندر آفس کے پہلو میں بنے ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں لے آیا۔ جہاں آرام دہ صوفے کے قریب رکھی ٹیبل پر چائے اور دیگر لوازمات سجے ہوئے تھے۔

شازمہ کو یہ سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ اتنا بڑا آرٹسٹ سارے کام چھوڑ کر اسے اتنی اہمیت دے رہا تھا۔ وہ تو یہ سوچ کر گھر سے نکلی تھی کہ شاید اس سے ملاقات کا موقع ہی نہیں ملے گا اور اگر ملا بھی تو چند منٹ سے زیادہ نہیں ملے گا۔

کمرا ساؤنڈ پروف تھا۔ خرم نے دروازہ لاک کیا تو شازمہ گھبرا گئی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے کی سمت لے آیا۔

''ہم یہاں اطمینان سے باتیں کریں گے یہاں ہمیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔''

اس نے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''تم کچھ لو۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر بدحواسی نمودار ہو گئی تھی۔

''م...... مجھے دیر ہو رہی ہے...... م...... م...... میں پھر کبھی آؤں گی۔'' وہ دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے بولی۔

''ٹھہرو میری بات سنو۔'' خرم کے مکار ذہن نے اندازہ لگا لیا تھا کہ لڑکی خوف زدہ ہو گئی ہے اور اس طرح قابو میں نہیں آئے گی۔ اس نے دوسرا حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک ایسا حربہ تھا جسے وہ متعدد بار آزما چکا تھا اور اس سے کوئی لڑکی بچ نہیں سکی تھی۔

''تم سوچ رہی ہو گی کہ میں تم پر اتنا مہربان کیوں ہو گیا ہوں۔'' اس نے چالاکی سے کہا۔ ''دراصل مجھے اپنی نئی ٹیلی فلم کے لیے ہیروئن چاہیے۔ تمہارا چہرہ دیکھتے ہی مجھے خیال آیا تھا کہ تم میری اس فلم کے لیے بالکل پرفیکٹ ہو اور یہی بات کرنے کے لیے میں تمہیں یہاں لایا تھا۔'' اس نے نہایت چالاکی سے پینترا بدلا تھا۔

اس بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ شازمہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی تاہم اسے پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن مجھے تو اداکاری نہیں آتی۔''

''اس کے لیے مجھے تمہارا ٹیسٹ لینا پڑے گا۔ اگر تم اسکرپٹ کے مطابق تھوڑی بہت بھی اداکاری کر سکیں تو باقی معمولی رہنمائی سے سیکھ جاؤ گی۔ اداکاری کوئی اتنا مشکل کام بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں جو کچھ کیا جاتا ہے، وہ کسی بھی فرد کے لیے نیا نہیں ہوتا۔ عام زندگی میں بھی تو فرد محبت، نفرت، غصے اور شفقت کا اظہار کرتا ہی رہتا ہے۔ کیمرے کے سامنے بھی یہی کچھ کرنا ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ کیمرے کے سامنے یہ سب کچھ مصنوعی ہوتا ہے جبکہ عام زندگی میں حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔''

یہ سنتے ہی شازمہ کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ جو اس کا آئیڈیل تھا اس کی محبت تھا حقیقی نہیں تھا، مصنوعی تھا۔ یہ شخص جو اس کے سامنے بیٹھا تھا اس کے آئیڈیل سے کتنا مختلف تھا۔ اپنی تمام بشری کمزوریوں کے ساتھ گوشت پوست کا بنا ہوا ایک عام انسان اس کے سامنے تھا۔ خرم کے لیے اس کے آدرش بہت بلند تھے۔

اس کی شخصیت کے اس پہلو نے اسے مایوس کیا تھا۔ تب اس نے دوسرے پہلو پر غور کیا۔

''کیا میں واقعی اداکارہ بن سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے لیے تمہیں ایک چھوٹا سا ٹیسٹ پاس کرنا ہو گا۔ میں آج ہی تمہارا ٹیسٹ لے لیتا ہوں۔'' وہ بھویں سکیڑے سوچتا ہوا بولا۔

''اوہ آج تو مشکل ہو گا۔ ڈیڈی کو میں کیا بتاؤں گی، کافی

دیر ہوگئی ہے۔"

"تم اپنے ڈیڈی کو بتا کر آئی تھیں کہ یہاں آئی ہو؟"

"نہیں، وہ مجھے کبھی آنے نہیں دیتے۔ ان سے میں نے بہانہ بنایا تھا کہ اپنی ایک سہیلی سے ملنے جانا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا تم ان سے فون کر کے کہہ دو کہ تمہیں دیر ہو جائے گی۔"

وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔

"خوش قسمتی صرف ایک بار دستک دیتی ہے لڑکی، ایسے موقع بار بار نہیں ملتے۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے لڑکیاں پوری زندگی انتظار کرتی ہیں۔" خرم نے منہ بنا کر کہا۔ "میں بہت مصروف رہتا ہوں اور اسٹوڈیو بھی خالی نہیں ہوتا۔ آج کوئی شوٹنگ نہیں ہے۔ اسٹوڈیو بھی خالی ہے، ہم آسانی کے ساتھ تمہارا ٹیسٹ لے سکیں گے۔ مینا تمہیں اسکرپٹ کے مطابق اداکاری کی ریہرسل کروا دے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

خرم کو اس کی سادگی پر ہنسی آئی تھی۔ وہ اسے بھرپور طریقے سے اپنے اعتماد میں لے چکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں خرم کے آفس میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ خرم نے انٹرکام پر مینا کو بلوایا تھا اور ایک اسکرپٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے مطابق شازمہ کی ریہرسل کروا دے۔ ریہرسل کے بعد اسے اسٹوڈیو میں پہنچا دے اور خود گھر چلی جائے۔

مینا اسے اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ کچھ دیر وہ پُرتاسف نظروں سے اس کم عمر لڑکی کا جائزہ لیتی رہی۔ اسے دیکھ کر اسے بہت کچھ یاد آگیا تھا۔ وہ بھی اسی عمر کی ایک معصوم اور سادہ لڑکی تھی جب انہی ہتھکنڈوں سے وہ خرم کے ہتھے چڑھی تھی۔ بہرحال اس نے شازمہ کو سمجھانا شروع کیا۔

"اس پورے سین میں کوئی ڈائیلاگ نہیں ہے۔ تمہیں صرف ایکٹنگ کرنی ہوگی۔" مینا نے اسکرپٹ کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا اسے بتانا شروع کیا۔

"سچویشن کچھ اس طرح ہے کہ تمہارا شوہر رات کی ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے۔ تم گھر میں اکیلی ہو اور ذرا سے کھٹکے پر ڈر جاتی ہو پھر تمہیں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور پھر کسی کے قدموں کی آہٹ ابھرتی ہے۔ تم ایک دم اٹھ کر بیٹھ جاتی ہو اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہو۔ قدموں کی آواز قریب آتی ہے تم جلدی سے اٹھتی ہو اور ادھر ادھر دیکھتی ہو پھر میز پر پڑا ہوا پیتل کا گلدان اٹھا کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو جاتی ہو۔ اسی وقت دروازے میں ہیولا نمودار ہوتا ہے جسے تم چور سمجھ کر پوری قوت سے گلدان اس کے سر پر مار دیتی ہو لیکن وہ تمہارا شوہر ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ گلدان اسے لگتا، وہ اسے تھام لیتا ہے اور دور پھینک دیتا ہے تم اس سے لپٹ جاتی ہو اور سسکیاں لینے لگتی ہو۔ بس اتنا ہی کرنا ہے، سمجھ گئیں نا؟"

شازمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پہلے میں تمہیں کر کے دکھاتی ہوں کہ ایکٹنگ کیسے کرنی ہے پھر تم کر کے دکھانا، ٹھیک ہے۔" مینا نے ایکٹنگ کر کے اسے سمجھایا۔

"حقیقت سے قریب اداکاری کرو گی تو کامیاب رہو گی۔"

ایک دو بار ریہرسل کے بعد وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

"میں نے ٹھیک کیا نا؟" شازمہ نے پوچھا۔

"بہت اچھا بس اتنا ہی کرنا ہے۔ آؤ چلیں۔"

وہ اسے اسٹوڈیو میں چھوڑ کر چلی گئی تھی جہاں خرم اس کا منتظر تھا۔ وہاں اس دن کی شوٹنگ کے لیے بیڈروم کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ جو خرم کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔

شازمہ خوف زدہ نظروں سے خالی اسٹوڈیو کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"میں ہوں نا؟" خرم نے بے پروائی سے کہا۔ "اچھا سنو، باتیں بعد میں پہلے ٹیسٹ ہو جائے۔ سین تمہاری سمجھ میں آگیا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اگر تم اس میں کامیاب ہو گئیں تو سمجھو کہ اداکارہ بن گئیں۔"

مگر اگلی صبح خرم کی لاش اسٹوڈیو کے دروازے پر پڑی ہوئی ملی تھی اور وہ گلدان بھی جس کی کاری ضرب سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس دن مینا، خرم کی ہدایت کے مطابق گھر نہیں گئی تھی بلکہ اپنے کمرے میں موجود تھی جب یہ وقوعہ پیش آیا تھا۔ اس نے شازمہ کو متوحش انداز میں روتے ہوئے باہر بھاگتے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ خرم کی لاش کے قریب آئی تھی اور گلدان پر سے فنگر پرنٹس بڑی مہارت سے صاف کر دیے تھے اور وہاں سے نکل گئی تھی۔

میز پر جو اسکرپٹ رکھا تھا، اس میں سب کچھ وہی تھا جو مینا نے شازمہ کو سمجھایا تھا لیکن کہیں بھی پیتل کے گلدان اور اس ضرب کا ذکر نہیں تھا جس سے خرم کی موت واقع ہوئی تھی۔ اسکرپٹ کے آخر میں لکھا تھا۔ ہدایت و پیشکش خرم شہزاد۔

کوئی رشتہ ... کوئی جذبہ نبھانا کبھی مشکل نہیں ہوتا... انسان کا کردار... حسنِ سلوک اسے رواں دواں اور قائم رکھتا ہے... اگر اس رشتے میں کسی بھی قسم کی ملاوٹ شامل ہوجائے تو پھر اسے ٹوٹنے میں دیر نہیں لگتی... ایک دوسرے سے نالاں میاں بیوی کا ماجرائے حیرت...

ایک ہی کشتی میں سوار دو مخالف سمتوں میں گامزن جوڑے کے داؤ پیچ

داؤ پیچ

سرور اکرام

ہوٹل میں اب تک اس کی جان پہچان کا کوئی نہیں آیا تھا۔

کچھ لوگ بیٹھے تھے جو اس کے لیے اجنبی تھے اور وہ ان کے لیے اجنبی تھا۔ ان اجنبی لوگوں کو خادم کی داستان سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی؟

خادم کو اپنے ان جاننے والوں کا انتظار تھا جو برسوں سے اسے جانتے تھے اور اس کی زندگی کے سب سے بڑے المیے سے واقف تھے۔ خادم کا المیہ یہ تھا کہ اس کی بیوی

ذہنی مریضہ تھی اور اس حد تک کہ اسے پاگل بھی قرار دیا جا سکتا تھا۔

خادم اس کے بارے میں بتاتے بتاتے رونے لگتا تھا۔ کبھی کبھی بے بس ہو کر اپنا سر پیٹنے لگتا۔ اس کے جاننے والے مشورہ دیتے۔ ''یار خادم! تم بھابی کو کسی ذہنی امراض کے اسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اسے پاگل خانے میں داخل کرادوں؟''

''نہیں، تمہارے ذہن میں جو خیالات ہیں، اس قسم کے شفاخانے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ وہاں قابل ڈاکٹرز ہوتے ہیں۔ جو نفسیاتی علاج کرتے ہیں۔ کنسولنگ کی جاتی ہے۔ پُرسکون رہنے کی دوائیں بھی دی جاتی ہیں۔ بہت اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ صاف ستھرا ماحول ہوتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلے گا کہ بھابی کسی نامناسب جگہ پر ہیں۔''

یہ سب سُن کر خادم کی آنکھوں میں آنسو آجاتے، اس کی آواز بھرا جاتی۔ ''تم لوگ نہیں جانتے کہ میں صفیہ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میرے لیے وہ دنیا کی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں اس کی خدمت کر رہا ہوں۔ تو مجھے اس میں کوئی عار نہیں ہے۔ پلیز تم لوگ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔''

اس کے جاننے والے اس کی حالت اور کیفیت کو دیکھ کر خاموش ہو جاتے پھر وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا۔ ''تم لوگ نہیں جانتے کہ اس کی خدمت کر کے مجھے کتنا سکون ملتا ہے۔'' یکدم ہی اس پر یاسیت چھا گئی۔

''ایسا لگتا ہے جیسے اپنے گناہوں کی تلافی ہو رہی ہو۔''

سب خاموش ہو جاتے۔ خادم کے یہ جاننے والے اس کے پرانے محلے کے لوگ تھے یا پرانے دوست تھے۔ اس نے نئے محلے والوں سے کوئی راہ و رسم نہیں رکھی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا۔ ''کیا فائدہ نئی دوستیاں کرنے کا۔ ہر ایک کو یہ بتاتے رہو کہ میری بیوی کا یہ حال ہے۔ وہ ذہنی مریضہ ہے۔ اب سوائے مذاق اڑوانے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ تم لوگوں کی بات اور ہے۔ تم سے برسوں کی دوستی ہے۔ تم لوگ میری ہر بات جانتے ہو۔ دکھ سکھ میں ساتھ رہے ہو۔ میں کیوں ہر ایک کے سامنے اپنا دکھڑا روتا پھروں؟''

اس نے اپنی بیوی کے پاگل پن کے بارے میں محلے کے صرف ایک شخص کو بتایا تھا۔ اس کا نام حکیم تھا۔ حکیم پچاس پچپن برس کی عمر کا ایک سمجھ دار آدمی تھا۔ وہ کبھی کبھی خادم کو کوئی مشورہ بھی دے دیا کرتا تھا۔

اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے چونکا دیا۔ یہ اس کا پرانا جاننے والا فیاض تھا۔ جو اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے یار؟'' اس نے پوچھا۔ ''کوئی پرابلم ہوگئی ہے کیا؟ بہت کھوئے کھوئے سے نظر آرہے ہو؟''

''ہاں یار۔'' خادم نے ایک گہری سانس لی۔ ''کل سے تمہاری بھابی کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ یہ دیکھو۔'' اس نے اپنی آستین الٹ دیں۔ اس کی دونوں کلائیوں پر ناخنوں کی خراش کے نشانات تھے۔ گہرے نشانات۔ ''کل غصے میں آکر مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔''

''اوہو۔'' فیاض نے زخموں کو دیکھا۔ ''یہ تو بہت گہرے نشانات ہیں۔ کیا پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟''

''نہیں کبھی نہیں۔ کل پہلی بار ایسا ہوا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ خود کو نقصان پہنچالیتی تھی۔ کبھی کبھی خود اپنے آپ کو زخمی کرلیا۔ لیکن کل اس نے مجھ پر ہی حملہ کر دیا۔''

''دیکھو۔ ایسی کنڈیشن میں تمہیں اور زیادہ محتاط ہو جانا چاہیے۔ اب انہیں کسی شفاخانے میں داخل کرا ہی دو۔''

''میرے دوست! اب میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' خادم نے کہا۔ ''میں ایک دو جگہوں کا سروے بھی کر آیا ہوں۔ دیکھتا ہوں ان میں سے کون سا بہتر ہے۔''

فیاض نے اتنی دیر میں چائے منگوالی تھی۔ خادم کے لیے اس کے پاس ہمدردی ہی ہمدردی تھی۔ وہ خادم اور اس کی بیوی دونوں کے بیک گراؤنڈ سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جس طرح خادم ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ اسی طرح اس کی بیوی صفیہ بھی تھی بلکہ صفیہ کے والدین کی مالی پوزیشن کہیں زیادہ مضبوط تھی۔ اس کا باپ ایک بڑا تاجر تھا۔ اس نے صفیہ کو جہیز میں ایک مکان کے علاوہ ایک گاڑی بھی دی تھی۔

صفیہ دو بیٹوں کے درمیان اکلوتی بیٹی تھی اسی لیے سب کی چہیتی تھی۔

جبکہ خادم کی صورتِ حال ویسی تو نہیں تھی پھر بھی وہ ایک کھاتا پیتا شخص تھا۔ اس کی جاب بہت اچھی تھی۔ اس کا مستقبل بھی شاندار ہونے والا تھا۔ اس کی ترقی کے امکانات بہت واضح تھے۔

اسی لیے شاید ان دونوں کی جوڑی دوستوں کے حلقے میں آئیڈیل سمجھی جاتی تھی۔ صفیہ ایک سلجھی ہوئی عورت تھی۔ خوب صورت اور ذہین۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی حسِ ظرافت تھی۔ بات سے بات نکالنا جانتی تھی۔ اس کی

باتیں سن کر لطف آیا کرتا تھا۔ اب وہی عورت پاگل پن کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ان دوستوں کو یہ سب کچھ خادم ہی سے معلوم ہوا کرتا تھا۔ وہ جب صفیہ کی ذہنی حالت کے بارے میں بتاتا تو اس کے دوست سوائے افسوس کرنے کے اور کیا کر سکتے تھے؟

''لیکن اب میں نے سوچا ہے کہ اس کو کہیں دِکھا ہی دوں۔'' خادم نے کہا۔

''تو اب تک کیا کر رہے تھے؟'' فیاض نے حیرت سے پوچھا۔

''یار بس وہ......'' خادم کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔ ''وہ دعاؤں سے کام لے رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے بتایا تھا کہ فلاں فلاں وظیفہ پڑھ لو۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک ہو جائے گی۔ ویسے دو تین بار اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا چکا ہوں لیکن فائدہ کچھ نہیں ہوا۔''

''خدا کے بندے دعاؤں کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ اور پراپر علاج ایک الگ چیز ہے۔ علاج کے لیے بھی منع نہیں کیا گیا۔''

''ہاں یار اسی لیے تو میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے۔'' خادم نے کہا۔ ''بس دعا کرنا کہ اس کو شفا ہو جائے۔''

ہوٹل سے نکل کر خادم اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کا گھر ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پیدل کا راستہ تھا۔ اس کو جب کسی مسئلے پر سوچ بچار کرنی ہوتی تو وہ پیدل ہی چلتا تھا۔ ابھی وہ اپنی گلی میں داخل ہی ہوا تھا کہ محلے کا ایک بچہ پاگل پاگل کہتا ہوا اس کے سامنے سے گزر گیا۔

خادم کو بچے کی اس حرکت پر حیرت ہوئی تھی۔ عجیب بدتمیز قسم کا بچہ تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ اس کے والدین سے مل کر اس کی شکایت ضرور کرے گا۔ اس کی طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں جھلاتا ہوا اپنے دروازے تک پہنچ گیا۔ اسی وقت ایک اور بچہ پاگل پاگل کہتا ہوا برابر سے گزر گیا۔ وہ تو باقاعدہ ہنس بھی رہا تھا۔

خادم نے آواز دے کر اسے بلایا۔ ''اوئے ادھر آؤ۔''

لیکن وہ بچہ منہ چڑاتا ہوا تیزی سے بھاگ لیا۔ خادم نے جھلا کر دروازے کو پیٹ دیا۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ صفیہ نے دروازہ کھولا۔

''کیا ہو گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''سب پاگل ہو گئے ہیں۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''ایک بھی قابو میں آیا نا تو اس کی گردن مروڑ کر رکھ دوں گا۔ کیا سمجھ رکھا ہے۔''

''آئیں، اندر آئیں۔'' صفیہ نے کہا۔

اسی دوران میں اندر سے دو عورتیں باہر آگئیں۔ خادم کے خیال میں دونوں ہی محلے ہی کی تھیں۔ ان میں سے ایک نے صفیہ سے کہا۔ ''اچھا صفیہ، ہم تو چلتے ہیں۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو بتا دینا۔''

دونوں چلی گئیں۔ خادم اندر ڈرائنگ روم میں آگیا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ صفیہ نے اسے پانی لا کر دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اب وہ کچھ نارمل ہوا تھا۔

''ہاں، اب بتائیں۔'' صفیہ نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

بری عادت

''اللہ نے بڑا کرم کیا...... آج میں موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا ہوں!'' شوہر نے گھر آتے ہی گہرا سانس لے کر اپنی زوجہ کو بتایا۔

''ہائے...... اللہ آپ کو سدا سلامت رکھے۔ میں ابھی بکرا منگوا کر آپ کا صدقہ دیتی ہوں، ہوا کیا تھا؟'' بیوی ہراساں ہو کر بولی۔

''بس اسٹاپ پر ہم پانچ آدمی کھڑے تھے۔ بس آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ میں جیسے ہی وہاں سے ہٹا، ایک کار نے بے قابو ہو کر ان چاروں کو بری طرح کچل دیا۔''

''سب بے چارے مر گئے؟''

''چاروں اسی وقت مر گئے۔ میں دھماکے کی آواز سن کر واپس بھاگا تو لوگ گاڑی میں سے زخمی ڈرائیور کو نکال رہے تھے...... وہ کوئی بہت امیر آدمی تھا۔ کہہ رہا تھا کہ گاڑی کے بریک فیل ہو گئے مگر غلطی اسی کی ہے...... وہ مرنے والوں کے وارثوں کو دس لاکھ فی کس دے گا۔''

یہ سنتے ہی بیوی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''تم وہاں سے کہاں چلے گئے تھے؟''

''کیبن سے پان کھانے گیا تھا۔''

''لعنت ہو تمہارے پان اور گٹکے پر...... ہزار بار منع کیا ہے کہ یہ بری عادتیں چھوڑ دو لیکن تم کب مانتے ہو......!'' بیوی نے صدقے کو بھول کر شوہر پر گرجنا برسنا شروع کر دیا۔

کراچی سے شاہانہ علیم کا تعاون

''کیا بتاؤں۔ محلے کے لونڈے مجھے چھیڑ رہے تھے۔ پاگل پاگل کہہ رہے تھے۔ بدتمیزی کی انتہا ہے۔''

''یہ تو واقعی بہت بُری بات ہے۔'' صفیہ نے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ شریفوں کا رہنا محال ہے اور ان بچوں نے خود یہ بات تو نہیں کی ہوگی۔ ان کے والدین ان کے پیچھے ہوں گے۔ ورنہ بچوں کی اتنی ہمت نہیں ہوسکتی۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔'' خادم نے کہا۔ ''ٹھہرو، پہلے میں پتا لگالوں کہ کس گھر کے بچے ہیں۔ اس کے بعد ہی کوئی کارروائی کروں گا۔''

دو دن گزر گئے۔ دو دنوں کے بعد دوستوں کی بیٹھک میں خادم نے بتایا۔ ''یار کل ایک عجیب کہانی ہوئی۔ سب کچھ ٹھیک ہونے لگا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' کسی نے پوچھا۔ ''سب کچھ ٹھیک سے کیا مراد ہے؟''

''مطلب یہ ہے کہ کچھ دنوں سے صفیہ کو کوئی دورہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے گھر کے کاموں میں بھی دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ لیکن کل پھر وہی کیفیت ہوگئی بلکہ پہلے سے زیادہ شرمندہ ہونا پڑا محلے والوں کے سامنے۔''

''ایسی کون سی بات ہوگئی؟''

''وہ محلے کے لونڈوں کی وجہ سے اشتعال میں آگئی۔'' خادم نے بتایا۔ ''یہ لونڈے بھی تو ایک نمبر کے شیطان ہوتے ہیں۔ ذرا بھی تمیز نہیں ہوتی ان میں۔ نہ جانے ماں باپ ایسی تربیت کیوں دیتے ہیں؟''

''آخر ہوا کیا تھا؟''

''ارے بھائی، وہ بے چاری کل گھر سے نکلی تھی کہ محلے کے لونڈوں نے پاگل پاگل کہہ کر چھیڑنا شروع کردیا۔ بس پھر کیا تھا اس کو غصہ آگیا۔ اس نے محلے کے گھروں پر پتھر برسانے شروع کردیے۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ایک دو کو چوٹیں بھی آئیں۔ کیا بتاؤں کیسی شرمندگی ہوئی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے معافی مانگ کر جان چھڑائی۔ اب ایک نیا تماشا یہ ہوا ہے کہ محلے والوں نے ہنگامہ شروع کردیا ہے کہ ایسی پاگل کو گھر میں کیوں رکھا ہوا ہے۔ اس کو پاگل خانے کیوں نہیں بھیج دیتے؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہارے محلے والے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔'' اس کے دوست فیاض نے کہا۔ ''یہ ایک خطرناک صورت ہے۔ کل کسی کو کوئی گہری چوٹ آگئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ابھی تو محلے والے تمہارا لحاظ کررہے ہیں لیکن کب تک...... کل کو کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔''

خادم خاموش رہا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے فیاض کی یہ باتیں ناگوار گزر رہی ہیں لیکن ان باتوں میں سچائی بھی تھی۔

وہ اس رات دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی اٹھ رہی تھیں۔ سوچوں کا ایک ریلا تھا جو بار بار اس کے ذہن سے ٹکرا کر گزر جاتا تھا۔ زندگی روز بروز بوجھل ہوتی جارہی تھی۔ آج بھی دفتر میں وہ لوگ آئے ہوئے تھے جو اس سے پیسوں کا تقاضا کررہے تھے۔ خادم نے ان لوگوں سے قرض لے رکھے تھے اور ان قرضوں کی ادائیگی کی کوئی سبیل نظر نہیں آرہی تھی۔

ایک تو یہ پریشانی۔ ادھر ایسے حالات۔ محلے میں بھی اس کی ساکھ کچھ عجیب سی ہوتی جارہی تھی۔ گلی کے لونڈوں نے اسے دیکھ کر جو آوازیں نکالی تھیں، ان کے علاوہ بھی ایک ایسا واقعہ ہوا تھا جس نے اسے جھلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ محلے کی ایک دکان پر شیو کے لیے بلیڈ خریدنے گیا تھا۔ دکان دار اسے اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس نے خادم کو بلیڈ دینے سے انکار کردیا۔ ''نہیں بھائی جان۔ میرے پاس بلیڈ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کسی اور دکان سے لے لیں۔''

''ارے میرے سامنے پیکٹ رکھا ہوا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ بلیڈ نہیں ہے۔''

''یہ بیچنے والے نہیں ہیں۔'' دکان دار نے کہا۔ ''آپ کوئی اور دکان دیکھ لیں۔''

''کمال ہے۔'' خادم بڑبڑاتا ہوا دکان سے باہر آگیا۔ اس نے دوسری دکان سے بھی ٹرائی کی لیکن وہاں سے بھی یہی جواب ملا۔

''نہیں بھائی، میرے پاس بلیڈ نہیں ہے۔'' خادم کا دل چاہا کہ وہ اس کم بخت دکان دار کو مارنا شروع کردے۔ اس کے سامنے ابھی ابھی اس نے ایک گاہک کو بلیڈ کا پیکٹ دیا تھا اور خادم کو منع کررہا تھا۔ اس دکان دار سے تو اچھی خاصی جھڑپ ہوگئی تھی۔ دکان دار نے بہت توہین کرکے اسے دکان سے بھگا دیا تھا۔

وہ جب غصے میں بھرا ہوا گھر پہنچا تو صفیہ گھر پر ہی تھی۔ اس کو دیکھ کر اس نے سمجھ لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ خادم گالیاں ہی دیتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔

''کیا بات ہوگئی؟'' صفیہ نے پوچھا۔

''ایسا لگتا ہے کہ شاید پورے محلے کا دماغ خراب ہو

گیا ہے۔'' خادم نے کہا۔ ''اب دیکھو، یہ کوئی بات ہے۔ کوئی کم بخت دکان دار مجھے بلیڈ دینے کو تیار نہیں ہے۔ جس کے پاس گیا، اس نے یہی کہا کہ اس کے پاس بلیڈ نہیں ہے۔ حالانکہ بلیڈ سامنے رکھا ہوا ہے، حد ہوگئی۔''

''چلیں لعنت بھیجیں۔ کہیں باہر سے جا کر لے لیں۔''

''وہ تو میں لے ہی لوں گا لیکن محلے کے دکان داروں کو کیا ہوا ہے؟ کس نے منع کر دیا ہے ان کو؟''

''خدا جانے۔'' صفیہ نے کہا۔ ''آپ ایسا کریں۔ میں جب تک چائے بناتی ہوں۔ آپ برابر کی دکان سے کچھ سموسے لے آئیں۔ بہت دل چاہ رہا ہے۔ سموسوں کو۔''

''تم چلی جاؤ۔'' خادم تلخی سے بولا۔ ''ایسا نہ ہو کہ مجھے سموسہ بھی نہ ملے۔''

''اب ایسا بھی کیا۔'' صفیہ ہنس پڑی۔ ''سب ہی تو پاگل نہیں ہوں گے نا۔''

خادم بکتا جھکتا گھر سے نکلا۔ حلوائی سامنے ہی تھا۔ بس روڈ کراس کر کے جانا تھا۔ چند ہی قدم چلا ہوگا کہ کسی طرف سے آواز آئی۔ ''پاگل ہے، پاگل ہے۔''

وہی آواز تھی۔ وہی خون جلانے والی۔ آواز دینے والا لونڈا ایک کیبن کی آڑ میں کھڑا ہوا آوازیں دے رہا تھا۔ خادم نے بھنا کر ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کی طرف کھینچ مارا۔ بچے کو پتھر نہیں لگا۔ لیکن اس کی آوازیں اور تیز ہو گئیں۔ اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور لونڈے بھی اِدھر اُدھر سے آوازیں بلند کرنے لگے۔ خادم سموسے لیے بغیر گھر واپس آ گیا۔ اس وقت وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔

''جان سے ماردوں گا ایک ایک کو۔'' وہ اندر آتے ہی بولا۔ ''پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔''

''کیا ہو گیا۔ آپ تو سموسے لینے گئے تھے؟''

''کیا خاک سموسے لاتا۔ گھر سے نکلا ہی تھا کہ بشیر خان کے لونڈے نے پاگل پاگل کا شور مچا دیا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ پتھر سے بچ گیا۔ ورنہ کسی اسپتال میں پڑا ہوتا۔''

''ارے خدا کے لیے ایسا مت کیجیے گا۔'' صفیہ پریشان ہو کر بولی۔ ''ورنہ مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔''

''تو پھر کیا کروں ان کم بختوں کا۔'' خادم نے پوچھا۔ ''بتاؤ، کیا کروں؟'' اس وقت وہ بُری طرح جھلایا ہوا تھا۔

''آپ ایسا کریں۔ بشیر خان سے شکایت کر دیں اس کی۔ وہ معقول انسان ہیں۔ اپنے بیٹے کو سمجھا دیں گے۔''

''یاد رکھو۔ اگر اس پر بھی اس لونڈے کو عقل نہیں آئی نا تو پکڑ کر گلا دبا دوں گا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

اس رات دوستوں کے حلقے میں اس نے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔ ''کل، کل میں اپنی بیوی کو اسپتال بھیج رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ اب کیس بہت بگڑ چکا ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔''

''ہاں، یہ خطرناک بات ہے۔'' اس کے ایک دوست نے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ تمہیں اپنی بیوی سے کتنی محبت ہے۔ تم پر کیا گزر رہی ہو گی لیکن تمہارا یہ قدم بھابی کی بھلائی کے لیے ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو کر واپس آ جائیں۔''

''آمین۔'' دوسرے دوست نے تائید کی۔ ''اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے نا۔''

دوسرے دن خادم کی پلاننگ کے مطابق ذہنی امراض کے شفاخانے سے ایمبولینس بھی آ گئی لیکن وہ ایمبولینس صفیہ کے لیے نہیں آئی تھی بلکہ خود خادم کے لیے آئی تھی۔ وہ چیختا چلاتا رہا لیکن اسے زبردستی اٹھا کر ایمبولینس میں ڈال دیا گیا تھا اور محلے والے بھی یہی کہہ رہے تھے کہ ایسے خطرناک آدمی کا پاگل خانے جانا ہی بہتر ہے۔

جو چال خادم نے اپنی بیوی کے لیے سوچی تھی، وہی چال صفیہ چل رہی تھی۔ محلے کے لونڈے اسی کے بہکائے ہوئے تھے۔ محلے کی عورتوں کو اسی نے باور کرا دیا تھا کہ اس کا شوہر ایک پاگل انسان ہے جس طرح خادم اپنے دوستوں کو باور کرانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ اس کی بیوی ایک ذہنی مریضہ ہے۔

اور دونوں نے یہ حرکت اس لیے کی تھی کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ پہلے ہی یہ طے ہو چکا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں سکتے۔ یا تو ان میں سے کسی کی موت ہو جائے یا پھر ان میں سے ایک پاگل ہو جائے۔

ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی کہانی میں ایسی کوئی بات نہ ہو کہ اس سے سبق مل سکے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔

خطا پرور

کبیر عباسی

ہر شخص میں خیر و شر کی کشمکش رہتی ہے... اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی جنگ بھی چلتی رہتی ہے... شیطان جو انسان کا دشمن ہے... اور شر کا دوست... خیر کی طاقت کے سامنے ایک بڑی رکاوٹ بن کے کھڑا رہتا ہے... جس کا کام ہی انسان کو الجھنوں میں قید کرنا ہے... ایک ایسے ہی راندۂ درگاہ کی کہانی... جس نے بے ہودہ لذتوں کے شوق میں دنیاوی کثافتوں پر اپنا بدصورت جال پھیلا رکھا تھا... ہوس کار و خطا پرور گمراہ کی لغزشوں کا حیرت انگیز ماجرا...

قتل کے کیس میں الجھ جانے والے نوجوان کے بچاؤ کی کوششیں.....

سورج آتشیں گولے کے مانند لحہ بہ لحہ سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کی نارنجی شعاعوں نے اردگرد کے ماحول کی فسوں خیزی میں اضافہ کر دیا تھا۔ یہ خوبصورت منظر اتنا بھی خوبصورت نہ ہوتا اگر اس میں ایک زندہ جاوید کردار موجود نہ ہوتا۔ وہ کردار سارہ کا تھا۔

وہ جہاز کے عرشے پر کھڑی اس خوبصورت منظر کے فسوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے اس کی پشت ہی دکھائی دے رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے اس کی سیاہ زلفیں اڑ رہی تھیں۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

اس نے چونک کے مجھے دیکھا۔ میری نظر اس کے چہرے پر پڑی تو میں یک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ سورج کی نارنجی شعاعوں نے اس چہرے کو عجیب ہی رنگ دے دیا تھا۔ پتا نہیں اُفق پر پھیلی لالی زیادہ حسین لگ رہی تھی یا اس کے چہرے پر پھیلی لالی۔ وہ مجھے یک ٹک اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کے دھیما سا مسکرائی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا انداز نارمل ہی رکھا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ جواب میں کیا سننا چاہتی ہے۔

میں نے ذہن میں مناسب الفاظ جوڑنے کی کوشش کی جن کی مدد سے اس کے حسن کو خراجِ تحسین پیش کیا جا سکتا ہو لیکن ناکام رہا۔ میں دل ہی دل میں اپنے جاسوسی ناولز پڑھنے کے شوق کو کوسنے لگا۔

وہ منتظر نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے کچھ نہیں بن پایا تو بولا۔ ''آج تو بالکل قطرینہ کیف لگ رہی ہو۔''

اس کے چہرے پر پھیلتی برہمی دیکھ کے مجھے احساس ہوا کہ شاید اسے قطرینہ کیف پسند ہی نہیں۔ میں فوراً بات بدل کے چہرے پر مسکینیت طاری کرتے ہوئے بولا۔

''سوری، میں کرینہ کپور کہنا چاہ رہا تھا۔'' اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اسے کرینہ بہت پسند ہے، سو اس بار مجھے امید تھی کہ وہ خوش ہو جائے گی لیکن اس بار تو اس کی آنکھیں باقاعدہ شعلے اگلنے لگیں۔

''اچھا، ایشوریہ چلے گی؟'' میں مسمسی سی صورت بنا کے بولا تو اس کی ہنسی نکل گئی۔

''تم بھی ناں.....'' اس نے کندھے جھٹکے اور پیچھے مڑنے لگی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''وہ کیا ہے ناجان، تم جانتی ہو مجھے زیادہ باتیں بنانا نہیں آتیں مگر میری آنکھوں میں دیکھو، ان میں تمہیں اپنے لیے پیار کا ایسا سمندر نظر آئے گا، جو تمہیں کسی فلم کے دوران قطرینہ، ایشوریہ یا کرینہ کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں نظر آئے گا۔'' اپنی عادت سے مجبور میں جملہ مکمل ہونے تک اپنی سنجیدگی برقرار نہیں رکھ سکا۔

اس کے چہرے پر مصنوعی خفگی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ میں نے دوسرا ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگی

اور میں اس کی آنکھوں میں۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی آنکھوں میں ڈوب جاتا، میرے کانوں نے ایک آواز سنی اور سارہ سمیت سارا منظر جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں اپنے بیڈ پر چت لیٹا تھا اور سائڈ ٹیبل پر موبائل بجتا چلا جا رہا تھا۔

پتا نہیں کس نامعقول کو مصیبت پڑی ہے جس نے دخل در نامعقولات کرتے ہوئے میرے خوابِ شیریں میں خلل ڈالا ہے۔ میں دل ہی دل میں اسے کوستے اور خود کو گھسیٹتے ہوئے موبائل کی جانب بڑھا۔ سیل کی اسکرین پر سارہ کی تصویر چمکتے دیکھ کے میری ساری کلفت دور ہو گئی۔ میرا ذہن ابھی خواب کے ٹرانس سے باہر نہیں نکلا تھا اس لیے کال ریسیو کرتے ہی رومانوی لہجے میں بولا۔

''ہاں جان، کیسی ہو؟''

''طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ مشکوک سے لہجے میں بولی۔

''بس نہ پوچھو طبیعت کا، ابھی کچھ دیر پہلے میں ساتویں آسمان پر موجود تھا کہ نیچے سے تم نے سیڑھی ہٹا دی اور میں دھڑام سے نیچے آ گرا۔'' میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''مجھے لگتا ہے تم نے پی رکھی ہے۔'' وہ اپنے لہجے میں پہلے سے زیادہ شک بھر کے بولی۔

''اچھا سوری...... بتاؤ کال کیوں کی؟'' میں مزاجِ یار کو ناگوار ہوتے دیکھ کے فوراً پٹری پر چڑھتے ہوئے بولا۔

''آج یونی آ رہے ہو ناں؟'' وہ بھی مجھے لائن پر آتے دیکھ کے اصل لائن یعنی مطلب کی بات پر آ گئی۔

میں نے سیل کان سے ہٹا کے وقت دیکھا۔ نو بج کے پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ ''ارادہ تو نہیں تھا، کیوں خیریت؟''

''تمہیں نہیں پتا آج ''پروگرامنگ'' کی لسٹ لگ رہی ہے؟'' پروگرامنگ وہ مضمون تھا جس کی لسٹ ابھی تک نہیں لگی تھی۔

''تمہیں کس نے بتایا؟ میں نے کل سر نصر سے پوچھا تھا تو وہ کہہ رہے تھے ابھی رزلٹ تیار ہی نہیں۔''

''ان کا رات کو واٹس ایپ آیا تھا گروپ میں کہ آج ساڑھے نو تک لسٹ لگ جائے گی اور دس بجے سے پہلے اپنے اعتراضات دور کرا لیں۔'' اس کے بتاتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

سر نصر اقبال واحد پروفیسر تھے جو مجھے انتہائی ناپسند

تھے۔ ناپسندیدگی کی سب سے بڑی وجہ ان کا دل پھینک ہونا تھا۔ ان کی عمر چالیس سال سے اوپر تھی لیکن دیکھنے میں چالیس سے کم ہی لگتے تھے۔ ان کی پرسنالٹی اتنی شاندار تھی کہ لڑکیاں بھی ان کے آگے پیچھے پھرتی تھیں۔ وہ اس چیز کا بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے۔ مڈٹرم میں انہوں نے تمام لڑکیوں کو بہت اچھے نمبر دیے تھے اور لڑکوں کو کم...... اس وجہ سے ان کے لیے میرے دل میں ناپسندیدگی کے جذبات میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

ان سے میرے تعلقات قدرے کشیدہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مارکنگ میں کچھ ڈنڈی ضرور ماریں گے۔ دس بجے سے پہلے اگر میں یونیورسٹی نہ پہنچتا تو انہیں جو بھی رزلٹ بنانا ہوتا مجھے قبول کرنا ہی پڑتا۔

''میں نے تو میسج دیکھا ہی نہیں۔ بس ابھی کپڑے چینج کر کے نکلا۔'' اتنا کہتے ہی میں بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے اللہ حافظ کہہ کے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد ہی میں بائک پر تیز رفتاری سے یونیورسٹی کی جانب گامزن تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ میں آج یونیورسٹی نہیں بلکہ ایک مصیبت میں گرفتار ہونے جا رہا ہوں۔

☆☆☆

نوٹس بورڈ پر لسٹ آویزاں تھی۔ میں نے دھڑکتے دل سے اپنے نمبر چیک کیے۔ سب سے زیادہ نمبر میری توقع کے مطابق سر نصر کی چہیتی علیسا نے لیے تھے۔ اس کا اے پلس گریڈ آیا تھا۔ جبکہ کلاس کا اور کوئی طالبعلم اے گریڈ سے اوپر نہیں جا پایا تھا۔

علیسا ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ اس نے لیٹسٹ ماڈل کی ''وٹز'' رکھی ہوئی تھی اور خود ہی ڈرائیو کر کے یونیورسٹی آیا کرتی تھی۔ وہ ہماری کلاس کی واحد لڑکی تھی جو کلاس میں کبھی کبھار ہی آتی تھی مگر سمسٹر میں حاضری پوری نہ ہونے کے باوجود اسے نہ صرف امتحانات میں بیٹھنے دیا جاتا تھا بلکہ اس کے مارکس بھی اچھے آ جاتے تھے۔ اس بار وہ امتحانات میں میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ تجسس کی وجہ سے میں اس کے سارے پیپرز دیکھتے رہا تھا۔ اس کا پیپر نارمل ہی ہوتا تھا۔ آدھے پرچے تو وہ خالی ہی چھوڑ دیا کرتی تھی سو اس کے سب سے زیادہ مارکس لینے کی وجہ سے حیرانی ایک فطری بات تھی۔ میں نے اپنے نمبر دیکھے تو کلس کے رہ گیا۔ میرا پرچہ علیسا سے بہت بہتر ہوا تھا لیکن میرا بی گریڈ آیا تھا۔ میرا وجود غصے سے کھولنے لگا۔

میں اسی کھولتے ہوئے وجود کے ساتھ کلاس کی طرف بڑھنے لگا...... دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ سر نصر کو کلاس سے باہر نکلتے دیکھا۔ کچھ لڑکے ان کے پیچھے پیچھے تھے لیکن وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے باہر نکلے۔

میں نے انہیں سلام کیا لیکن انہوں نے جواب دینا گوارا نہ کیا۔

میں ان کے ساتھ چلنے لگا۔ ''ایکسکیوزمی سر، میں اپنا پرچہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''میں سب لوگوں کو پرچے دکھا چکا۔ آپ کو وقت پر آنا تھا۔'' حسب توقع انہوں نے روکھا سا جواب دیا۔

''سوری سر، بائک راستے میں خراب ہو گئی تھی سو لیٹ ہو گیا۔'' میں نے ٹپیکل پاکستانی قسم کا سب سے معروف بہانہ گھڑا۔

''سوری......'' وہ اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ اتنا کہتے ہوئے انہوں نے دروازہ دھکیلا۔

''پلیز سر، میں آپ کے بس دو منٹ لوں گا۔'' میں لجاجت سے بولا لیکن انہوں نے میری بات سنے بغیر دروازہ بند کر دیا۔ کچھ اور لڑکے بھی میرے ساتھ بند دروازے کو دیکھتے رہ گئے۔

''یہ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے۔ اس نے میرے نمبر ٹھیک نہ کیے تو میں چھوڑوں گا نہیں اسے۔'' میں غصے سے بولا۔

''تمہیں پتا ہے سب سے زیادہ نمبر کس کے ہیں؟'' میرا ایک کلاس فیلو عدنان بولا۔

''ہاں معلوم ہے اس کی چہیتی علیسا کے ہیں جس کی بیس فیصد حاضری بھی پوری نہیں تھی اور اس کا پیپر جیسا ہوا تھا اور جس طرح اس نے اے پلس گریڈ لیا میں سب جانتا ہوں۔'' میں جل کے بولا۔

جواب میں عدنان کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میرے کانوں میں ایک مدھر سی آواز ٹکرائی۔ ''ایکسکیوزمی......''

سب لڑکے آواز کے ماخذ کی جانب دیکھنے لگے۔ وہ علیسا تھی۔ اسے دیکھ کے باقی لڑکے سائڈ پر ہو گئے۔ اس نے جینز کی پینٹ کے اوپر ایک قدرے کھلے گلے والی ٹائٹ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اوپر سے اس نے لیدر جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے شوخ میک اپ کیا ہوا تھا اور بال کھلے رکھ چھوڑے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بے پناہ خوبصورت تھی اور اس حلیے میں تو وہ کسی زاہد خشک کا ایمان بھی ڈگمگا سکتی تھی۔

وہ میرے قریب آئی تو میں دروازے سے ہٹ گیا۔
اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کے اسے دھکیلا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے ایک انگلی سے نزاکت سے دروازے پر دستک دی۔
چند لمحے میں ہی دروازہ کھل گیا۔ اس نے بالوں کو ایک ادا سے جھٹکا، میری طرف دیکھ کے ہلکا سا فخریہ مسکرائی اور اندر چلی گئی۔
باقی لڑکے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے بند دروازے کو دیکھا، میرے چہرے پر پُرسوچ سے تاثرات بکھر گئے۔

☆☆☆

سارہ کا نمبر آف جا رہا تھا۔ میں کینٹے ٹیریا میں آ گیا۔ کچھ وقت وہاں گزارنے کے بعد ایک لڑکی سے پتا چلا کہ اس نے سارہ کو لان میں بیٹھے دیکھا تھا۔
میں وہاں پہنچا تو سارہ کو ایک بینچ پر بیٹھے پایا۔ اس نے ایک گرم شال لے رکھی تھی۔ حسبِ معمول اس نے بالوں کی پونی بنا رکھی تھی۔ اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے سیل پر تیزی سے کچھ ٹائپ کرتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے اغوا کے ما بعد اثرات سے خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔
میں اس کے پاس پہنچ کے کھنکھارا۔ اس نے چونک کے مجھے دیکھا۔ ''ہائے۔'' وہ مجھے دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرائی۔
میں خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔
''کیا ہوا، مزاجِ یار کچھ برہم لگ رہا ہے۔'' وہ شوخی سے بولی۔
''تمہیں پتا ہے سر نصر نے میرے ساتھ کیا کیا؟''
''نہیں۔'' وہ چیونگم چباتے ہوئے اطمینان سے بولی۔
''انہوں نے مجھے بی گریڈ دیا ہے۔'' میں جیسے چبا چبا کے بولا۔
''شکر کرو ڈی گریڈ نہیں کیا۔'' اس کے اطمینان پر ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا۔
''وہ بھی کیا؟'' میں جل کے بولا۔
''چچ چچ...... چلو رونا چھوڑو اور یہ لو چیونگم کھاؤ۔'' وہ پیکٹ میں سے ایک ببل نکال کے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔
''تم مجھے بچے کی طرح کیوں ٹریٹ کر رہی ہو؟'' میں غصے سے بولا۔
''کیونکہ تم اس وقت ایک بچے ہی کی طرح بی ہیو کر رہے ہو۔'' وہ اس بار بھی اسی طرح اطمینان سے بولی۔
میں اسے افسوس بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کے لاپروائی سے بولی۔
''یار، زیادہ تر لڑکوں کو انہوں نے بی گریڈ ہی دیا ہے۔ اس میں اتنا پریشان ہونے یا رونے دھونے کی کیا بات ہے؟''
''ہاں...... تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ سب لڑکیوں کو تو انہوں نے اے گریڈ ہی دیا ہے۔'' میں جل کے بولا۔
''اچھا تو اس وجہ سے تم رو رہے ہو۔'' وہ چہرے پر مصنوعی افسوس کے تاثرات طاری کرتے ہوئے بولی۔
''نہیں۔''
''تو......؟'' وہ ہونٹ سکیڑ کے آنکھیں پھیلاتے ہوئے ایک ادا سے بولی۔
''علیسا کو اے پلس گریڈ ملا ہے۔''
وہ میری بات سُن کے ہنسنے لگی۔ ''میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا۔'' میں ناگواری سے بولا۔
''یار...... کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ یقین مانو اس وقت تم بالکل ایک چھوٹے سے بچے لگ رہے ہو۔ یہ سب تو یونی میں چلتا رہتا ہے۔ چل کرو۔''
میں یہ سب جانتا تھا لیکن دراصل مجھے مارکس سے زیادہ سر نصر کے رویے...... سے تپ چڑھی ہوئی تھی۔ مجھے دو منٹ انہوں نے نہیں دیے تھے اور اپنی چہیتی کے لیے اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔
''تم کرو چل۔ میں تو سر نصر کے پاس جا رہا ہوں۔''
اس کے ردِعمل نے میرے غصے کو اور بڑھا دیا اور میں سوچے سمجھے بغیر سر نصر کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔
''میرے خیال میں تم اس وقت غصے میں ہو۔ تمہیں اس وقت ان سے بات نہیں کرنی چاہیے۔'' وہ پیچھے سے بولی لیکن میں نے اسے اَن سنا کر دیا۔ اور یہ میں نے بہت غلط کیا تھا۔ اس کا احساس مجھے بعد میں ہوا کہ مجھے سارہ کی بات مان لینی چاہیے تھی۔

☆☆☆

میں نے راہداری میں قدم رکھا ہی تھا کہ میری نظر علیسا پر پڑی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی سامنے سے آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے پریشانی دکھائی دی۔ وہ مجھے دیکھے بغیر گزر گئی۔ میں نے سیل فون میں وقت دیکھا۔ گیارہ بجنے

والے تھے۔ یہ کیا پورے گھنٹے تک سر نصر کے کمرے میں ہی بیٹھی رہی ہے؟ اگر یہ سر نصر کے کمرے سے آ رہی ہے تو اسے پریشان تو نہیں ہونا چاہیے۔

میں قیافے لگاتا ہوا سر نصر کے روم کی طرف بڑھنے لگا۔

ان کے دروازے پر پہنچ کے میں نے دستک دی۔ کافی دیر انتظار کے باوجود دروازہ کسی نے نہیں کھولا۔ میں نے ہینڈل دبا کے دروازہ دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے اندر نگاہ ڈالی۔ ٹیبل کے پیچھے سر نصر کی ریوالونگ چیئر کا رخ کمرے کی عقبی جانب، کھڑکی کی طرف مڑا ہوا تھا۔ کمرا کسی بھی ذی نفس کے وجود سے خالی نظر آ رہا تھا۔ میری نظر واش روم کے دروازے پر پڑی۔ دروازے کی درزوں کی روشنی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ واش روم میں کوئی ہے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ سر نصر واش روم میں ہیں۔ میں آہستگی سے اندر آ گیا۔ ایک کاؤچ پر بیٹھ کے ذہن میں سر نصر سے بات کرنے کے الفاظ بننے لگا۔

میں نے سوچا کہ پہلے میں ان سے آرام سے بات کر کے بس پیپر دیکھنے کی گزارش کروں گا۔ اگر وہ میری بات ماننے سے انکاری ہوتے تو میں نے سوچا تھا کہ علیسا کے حوالے سے انہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کروں گا۔

کافی دیر تک میں اسی اُدھیڑبن میں لگا رہا لیکن واش روم کا دروازہ نہ کھلا۔ میں واش روم کے دروازے پر دستک دینے کی نیت سے اٹھنے لگا تو میری نظر فرش پر پڑے موبائل فون پر پڑی۔ میں الجھن بھرے انداز میں سیل کی طرف بڑھا۔ سیل سر نصر کی چیئر کے پاس ہی پڑا تھا۔ میں نے سیل اٹھایا ہی تھا کہ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس نامعلوم سے احساس نے مجھے اپنی نگاہ ریوالونگ چیئر پر ڈالنے پر مجبور کیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھائی۔ ریوالونگ چیئر پر سر نصر سر جھکائے غیر فطری سے انداز میں بیٹھے تھے۔ ان کے اس طرح بیٹھنے کی وجہ ایک چاقو تھا جو ان کے سینے میں دستے تک گڑا ہوا تھا۔ چاقو کے گرد ان کے گرے کوٹ پر خون پھیلا ہوا تھا جو جمنا شروع ہو چکا تھا۔ میں اس طرح کے لاتعداد مناظر فلموں میں دیکھ چکا تھا، کہانیوں میں پڑھ چکا تھا لیکن حقیقت میں ایسا منظر دیکھنے کا تجربہ کتنا بھیانک ہوتا ہے، اس کا احساس مجھے آج ہو رہا تھا۔

یکایک مجھے اپنی پوزیشن کا احساس ہوا۔ آج سر نصر کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی کے باعث ان کی موت کا ذمے دار مجھے بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی، میں جوان کے قتل کے متعلق کسی کو بتانے کی سوچ رہا تھا، نئی سوچ میں پڑ گیا۔

ابھی ان کے روم کی طرف آتے ہوئے مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ صرف سارہ جانتی تھی کہ میں ان کے روم کی طرف آیا ہوں۔ اسے میں حقیقت بتا سکتا تھا۔ وہ میری بات کا یقین کر لیتی، لیکن پولیس...... وہ ہرگز میری بات کا یقین نہ کرتی۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے فرار کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کمرے میں آنے کے بعد کسی چیز کو چھوا نہیں تھا۔ سر نصر کا سیل فون میں نے جیب میں ڈال لیا تھا۔ اگر خدا نخواستہ ان کے قتل کا شک مجھ پر ہونے لگتا تو یہ سیل فون ہی اصل قاتل کا سراغ لگانے میں میری مدد کر سکتا تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کمرے کا دروازہ کھولا۔ راہداری سنسان نظر آ رہی تھی۔ باہر نکل کے میں نے جیب سے ٹشو نکال کے دروازے کا ہینڈل صاف کیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا دل دھڑک رہا تھا، کسی بھی لمحے کوئی راہداری میں مڑ سکتا تھا، اور کوئی مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیتا تو ایک ناکردہ جرم کی سزا میں میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔

ہینڈل صاف کرنے کے بعد میں خود کو سنبھالتے ہوئے راہداری میں چلنے لگا۔ میں چند قدم ہی چلا تھا کہ راہداری کے سرے سے کوئی اس طرف مڑا۔

وہ عدنان تھا۔ کافی دیر قبل چند دوسرے لڑکوں کے ساتھ وہ بھی میرے ساتھ سر نصر کے روم کے دروازے تک آیا تھا۔ میرے دل میں چور تھا، اسے دیکھتے ہی میں گھبرا گیا۔ میرے پاس پہنچتے ہی وہ بولا۔

''ہاں یار، سر نصر نے پیپر دکھایا؟'' مجھے دیکھتے ہی اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں ان کے روم کی طرف سے آ رہا ہوں۔ میں خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''میں پیپر کے سلسلے میں ہی ان سے ملنے آیا تھا لیکن شاید وہ روم میں موجود نہیں۔ دو دفعہ میں نے دستک دی لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔''

''اوہ......'' اس کے چہرے پر تاسف جھلکا۔ ''مجھے تو خود ان سے کام تھا۔ انہی سے ملنے جا رہا تھا۔''

''چلو، کل مل لینا ابھی تو وہ شاید جا چکے ہیں۔'' مجھے لاش کے دریافت ہونے کا ڈر ستا رہا تھا۔ اس لیے اسے اگلے دن ملنے کا مشورہ دے دیا۔

''نہیں...... میرا ان سے آج ہی ملنا ضروری ہے۔

میں انہیں کال کر لیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سیل نکال لیا اور ان کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

معاً ایک خیال نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ سر نصر کا سیل فون تو میری جیب میں تھا۔

☆☆☆

میں حوالات میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میری کمر میں حوالات کی سنگی دیوار چبھ رہی تھی لیکن میں نہ صرف اس سے بے نیاز تھا بلکہ حوالات میں موجود دوسرے قیدیوں کی کھسر پھسر سے بھی...... جو میرے بارے ہی میں کر رہے تھے۔

میں سر جھکائے اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ میں نے زندگی کے متعلق جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا لیکن میرا نصیب پھانسی کا پھندا ہوگا، یہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔

''اوئے، سر اٹھا...... ادھر دیکھ تیری ملاقات آئی ہے۔'' یہ آواز مجھے کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔ میں نے ناچار سر اٹھایا۔ حوالات کی سلاخیں تھامے سارہ دکھ سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تم...... تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

اس نے میرا سوال نظرانداز کر دیا۔ ''میں نے تمہیں منع کیا تھا نا...... نہ جاؤ۔'' وہ دکھ سے میری طرف دیکھ کے بولی تھی۔ ایک ہی رات میں اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ اس نے کبھی لفظوں میں مجھ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ نہ میں نے کبھی واضح الفاظ میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا لیکن آج اس کی حالت دیکھ کے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔

میں نے نرمی سے سلاخوں کے گرد اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔

اس نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے۔ میں نے تڑپ کے اسے دیکھا۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟'' اس بار وہ سپاٹ سے انداز میں بولی تھی۔

''سارہ میرا یقین کرو۔ میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔'' میں بے بسی سے بولا۔

''ساری دنیا جھوٹ کہہ رہی ہے۔ ایک تم ہی سچے ہو۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''ہاں...... جھوٹ کہہ رہے ہیں سب۔ کیا کسی نے مجھے انہیں قتل کرتے دیکھا؟ میں جب ان کے کمرے میں گیا تو وہ مر چکے تھے۔ کوئی انہیں قتل کر کے جا چکا تھا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے سے غصہ جھلکنے لگا۔ سارہ تو مجھے جانتی تھی۔ اسے تو مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے تھا۔

''واہ حسان، سی سی ٹی وی کیمرے میں تم کمرے میں جاتے صاف نظر آ رہے ہو۔ دس منٹ تم ان کے کمرے میں موجود رہے۔ پھر باہر نکلے۔ ہینڈل سے اپنے فنگر پرنٹ صاف کیے۔ پھر بھی کہتے ہو کہ تم نے قتل نہیں کیا۔'' وہ جارحانہ لہجے میں بولی۔

''سارہ تم میرا یقین کیوں نہیں کر رہی میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ جب میں کمرے میں گیا تو واش روم کی لائٹ روشن تھی، میں سمجھا وہ واش روم میں ہیں اس لیے میں ادھر بیٹھ گیا۔ میں......''

''بس کرو حسان، کتنے جھوٹ بولو گے۔ مان لو کہ تم قاتل ہو۔'' وہ میری بات کاٹ کے بولی۔

''نہیں ہوں میں قاتل......'' میں چلّایا۔

وہ میری بات نظرانداز کرتے ہوئے واپس جانے لگی۔ میں پیچھے سے چلّایا۔ ''سارہ، میری بات سنو۔ میں قاتل نہیں ہوں۔ نہیں ہوں......'' اسے دور جاتے دیکھ کے میری آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور تھا اور میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اُف...... شکر ہے خدا کا...... یہ خواب تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے سائڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس غٹاغٹ پی لیا اور چت لیٹ کے چھت کو گھورنے لگا۔ میرے ذہن میں دن میں پیش آنے والے واقعات کی ریل چلنے لگی۔

☆☆☆

عدنان نے نمبر ملا کے سیل کان سے لگا لیا تھا۔ میں اسے روکنے کی کوئی تدبیر سوچتا رہ گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر مایوسی پھیلتی دیکھی۔

''ان کا تو سیل فون ہی آف ہے۔'' میرا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔

''تم بڑے پریشان لگ رہے ہو؟'' میرے چہرے پر چھائی ہوائیاں اس نے بھی دیکھ لی تھیں۔

''بس پیپر ہی کی وجہ سے پریشان تھا۔ میں بھی اب کل ہی ان سے ملوں گا۔'' میں نے بات بنائی۔

''چلو کیفے ٹیریا میں چل کے کچھ چل کرتے ہیں۔'' وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے خوشدلی سے بولا۔

میں اس کے ساتھ بڑھنے لگا۔ ''ویسے تم پیپر کی وجہ

سے اتنی ٹینشن لینے والے لگتے تو نہیں۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے قدرے حیرت سے بولا۔

''یار، مجھے اپنا سی جی پی اے مینٹین رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ بس اس لیے تھوڑا پریشان تھا۔'' میں نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

''فکر چھوڑ یار...... ہو جائے گا سی جی پی اے مینٹین۔ ابھی ایک پورا سمسٹر پڑا ہے۔'' وہ بے فکری سے بولا۔

''فکر کیسے نہ کروں۔ بدقسمتی سے میں حنان ہوں۔ علیسا نہیں۔'' میں تلخی سے بولا۔

وہ ہنسنے لگا۔ ''یار تجھے ایک مزے کی بات بتاؤں؟'' وہ پُرشوق انداز میں بولا۔

میں منتظر نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ''علیسا کو اے پلس کیسے ملا یہ تو سب جانتے ہی ہیں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں بولتے ہوئے آنکھ میچی۔ ''لیکن نئی خبر یہ ہے کہ سر نصر، علیسا کو بلیک میل کر رہے ہیں۔'' وہ یہ خبر سنا کے فخریہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''وہ کیسے؟'' میں اچنبھے سے بولا۔

''کیفے میں تو چل...... کوئی بوتل شوتل پلا مجھے پھر بتاتا ہوں۔''

''یار...... پلا دوں گا بوتل، مگر اس وقت وہاں رش ہو گا تو ادھر ہی بتا دے۔'' میں جھنجلاہٹ چھپاتے ہوئے بولا۔

''سر نصر، علیسا کو کسی ہوٹل میں لے کے جاتے رہے ہیں۔ ادھر انہوں نے علیسا کی ویڈیو بنالی۔ اب اس ویڈیو کے بل بوتے پر اسے بلیک میل کر رہے ہیں۔'' وہ چٹخارے لینے والے انداز میں بولا۔

''تمہیں کیسے پتا یہ سب؟'' میں نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ بس ابھی کہ ابھی یونیورسٹی میں شور پڑنے والا ہے کہ پروفیسر نصر کا قتل ہو گیا لیکن میں اپنی پریشانی چھپائے عدنان سے باتوں میں مشغول تھا کیونکہ اس کی باتوں سے میرے ذہن میں سوچ کا ایک نیا در وا ہو رہا تھا۔

اگر واقعی علیسا، سر نصر کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہی تھی تو عین ممکن تھا کہ اسی نے سر نصر کا قتل کیا ہو۔ وہ سر نصر کے کمرے میں میرے سامنے ہی گئی تھی۔ جب میں ان کے کمرے میں جا رہا تھا تو وہ راستے میں مجھے ملی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی مجھ پر نظر ڈالے بغیر میرے پاس سے گزر گئی تھی۔ اب عدنان کی باتوں سے مجھے کوئی ایسا کلیو مل سکتا تھا جن کی بنا پر علیسا قاتل ثابت ہو جاتی، سر نصر کا قاتل پکڑا جاتا تو ہی میرے سر پر لٹکی خطرے کی تلوار ہٹ سکتی تھی۔ عدنان کچھ کہہ رہا تھا لیکن میرا ذہن نئی ہی ادھیڑبُن میں لگ گیا تھا۔ دفعتاً میں چونک کے اپنے خیالات سے باہر آیا۔

''تم نے کیا بتایا...... تمہیں کیسے پتا لگا کہ علیسا کو سر نصر بلیک میل کر رہے ہیں؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاہاہا...... میں نے تو یہ بتایا ہی نہیں لگتا ہے تم خیالوں ہی خیالوں میں ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئے تھے جہاں سر نصر اور علیسا......'' اس نے معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تو بتاؤ ناں...... تمہیں کیسے پتا چلا۔'' وہ پٹڑی سے اتر رہا تھا۔ میں اسے واپس پٹڑی پر چڑھاتے ہوئے بولا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتاتا، ہماری نظر سامنے سے آتی کرسٹینا پر پڑی۔ وہ ''کیٹ واک'' کرنے کے انداز میں چلتی آ رہی تھی۔ اپنے بھورے بال اس نے ایک پراندے میں قید کر رکھے تھے۔ وہ چلتے ہوئے ایک ادا سے پراندے کو دائیں بائیں جھلا رہی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی۔ کرسٹینا صفائی ستھرائی پر مامور تھی۔ وہ ایک جواں سالہ دوشیزہ تھی۔ اپنی چمپئی سی رنگت اور پُرکشش خدوخال کے باعث وہ یونیورسٹی کے لڑکوں میں بے پناہ مقبول تھی۔ یہ یونیورسٹی کی واحد ملازمہ تھی جسے میں اس کے نام سے جانتا تھا۔

وہ معنی خیز انداز میں ہمیں دیکھتے ہمارے پاس سے گزر گئی۔ میں اور عدنان منہ کھولے اسے دیکھتے رہ گئے۔

''یہ تو صبح صبح صفائی کرنے آتی ہے۔ آج اس وقت کیسے؟'' عدنان نے جیسے خود سے سوال کیا۔

''اسے چھوڑ یار تو مجھے علیسا کے بارے میں بتا رہا تھا۔ تجھے کیسے پتا چلا کہ علیسا کو سر نصر بلیک میل کر رہے تھے؟''

''بتاؤں گا۔ پہلے کیفے میں تو چل۔'' وہ مجھے کھینچتے ہوئے بولا۔ میرا ذہن کشمکش کا شکار تھا۔ وہ میرا بازو پکڑ کے کھینچ رہا تھا۔ میں نے بے خیالی میں اپنے بازو پر موجود اس کے ہاتھ پر نظر ڈالی۔ اس کے کوٹ سے اس کی شرٹ جھانک رہی تھی۔ اس نے میری نظروں کا ارتکاز محسوس کیا تو یکدم ہی اپنا بازو کھینچ لیا۔ اس کی شرٹ کوٹ میں چھپ گئی۔ میں اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''نہیں آنا تو نہ آ۔ میں جا رہا ہوں۔'' وہ مجھے مڑ کے دیکھے بغیر کینٹین کی طرف بڑھ گیا۔ میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

میں بائک پر یونیورسٹی سے باہر نکلا تو مجھے قدرے اطمینان کا احساس ہوا۔ سارے راستے میں سرنصر کے قتل کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ عدنان کی آستین پر مجھے کچھ خاص نظر نہیں آیا تھا۔ لیکن اس کا رویہ اسے میری نظر میں مشکوک بنا رہا تھا۔ جتنی تیزی سے اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تھا اور ایک دم ہی مجھے چھوڑ کے چل دیا تھا، یہ نارمل تو نہیں تھا۔

تو کیا سرنصر کو عدنان نے ہی قتل کیا تھا اور اس ڈر سے کہ کہیں اس کی آستین پر خون نہ لگ گیا ہو، اپنا ہاتھ کھینچ لیا؟ میں کڑی سے کڑی جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ سب مفروضے تھے۔

دوسری طرف علیسا کا کردار بھی مشکوک تھا۔ اگر عدنان سچ کہہ رہا تھا کہ سرنصر، علیسا کو بلیک میل کر رہے تھے تو اس کے پاس قتل کا جواز تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسی نے سرنصر کو غصے میں قتل کر دیا ہو۔

خیر قاتل جو بھی تھا، اس کا پکڑا جانا ضروری تھا۔ ورنہ پولیس اگر مشکوک لوگوں کو پکڑنا شروع کر دیتی تو میرا پکڑا جانا بھی یقینی تھا۔ اسی سوچ میں گم مجھے موبائل کی بیل بجنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ گھر کے گیٹ پر میں نے بائک روک کے وقت دیکھنے کی نیت سے موبائل نکالا تو سارہ کی پانچ مسڈ کالز آئی ہوئی تھیں۔ میرا دل دھڑکا۔ میں اسے کال بیک کرنے ہی لگا تھا کہ پھر سے سارہ کی کال آنے لگی۔ میں نے بے تابی سے کال ریسیو کر کے سیل کان سے لگایا۔ وہ میرے بولنے سے پہلے ہی بول پڑی۔

''کہاں ہو، جان؟''

''میں تو گھر پہنچ چکا ہوں، کیوں خیریت؟'' میں نے دھڑکتے دل سے استفسار کیا۔

''گھر...... اتنی جلدی تم گھر کیوں چلے گئے، وہ بھی بتائے بغیر؟'' اس کا لہجہ جانے کیوں مجھے عجیب سا لگا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بتاؤ تم نے کیوں فون کیا؟'' میرا دل پسلیوں کے پنجرے میں بے تاب ہو رہا تھا لیکن وہ اصل مدعے کی طرف آ نہیں رہی تھی۔

''تمہیں پتا ہے۔ سرنصر کا قتل ہو گیا ہے؟'' اس بار بھی مجھے اس کے لہجے میں کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ تو کیا وہ مجھ پر شک کر رہی ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔

''دل''

تبدیلیِ قلب کے آپریشن کے بعد سرجن صاحب نے ''مریض سے دریافت کیا۔ ''اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک کے بجائے دو دو دھڑکنیں سنائی دینے لگی ہیں۔'' مریض نے شکایت کی۔

''اوہ...!'' ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔ ''میں بھی سوچ رہا تھا آخر میری گھڑی کہاں گئی...''

''زاویۂ نظر''

فٹ بال میچ کے بعد ایک ٹیم کے منیجر نے اپنے کھلاڑی سے کہا۔ ''تم نے بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔''

کھلاڑی قدرے شرمندگی سے بولا۔ ''سر! میرے خیال میں تو میں بہت برا کھیلا...''

''نہیں... تم نے دوسری ٹیم کے حق میں بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔'' منیجر نے اپنے تبصرے کی وضاحت کی۔

''آمد''

سنیما کی اسکرین پر ایک المیہ منظر چل رہا تھا اور ایک صاحب کچھ زیادہ ہی آہ و بکا کر رہے تھے۔ جب وہ کسی طرح خاموش نہ ہوئے تو تماشائیوں نے منیجر کو بلوا بھیجا۔ منیجر نے اندھیرے میں آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آخر آپ آئے کہاں سے ہیں؟''

''بھائی... میں اوپر بالکونی سے گرا ہوں۔'' ان صاحب نے بری طرح کراہتے ہوئے جواب دیا۔

''سوال''

آنٹی: بیٹا! اگر تمہارے پاس کیک کے دو پیس بچے ہوں... ایک بڑا اور ایک چھوٹا... تو تم اپنے بھائی کو کون سا پیس دو گے؟

بچہ: آپ کون سے بھائی کی بات کر رہی ہیں؟ بڑے کی یا چھوٹے کی؟

''عالم خواب''

ایک خاتون نے حیرت سے دوسری خاتون سے پوچھا۔ ''یہ تم آنکھیں بند کیے آئینے کے سامنے کیوں کھڑی ہو؟''

''میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ میں سوتے میں کیسی لگتی ہوں۔'' دوسری خاتون نے جواب دیا۔

''خوش لباس''

ایک لڑکی نے اپنے منگیتر کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''سوٹ تو تم نے بہت اچھا پہن رکھا ہے۔''

''تمہیں پسند آیا؟'' منگیتر نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں... لیکن یہ تو بتاؤ کہ ناپ دینے کے لیے تم نے کسے بھیجا تھا؟''

''تم نے سنا، سرنصر کا قتل ہو گیا ہے؟'' مجھے خاموش پا کے وہ پھر سے بولی۔

''وہاٹ!......'' میں نے روایتی ری ایکشن دیا۔

''تم ان کے کمرے میں گئے تھے ناں؟'' اس کے لہجے سے مجھے ایسا لگا جیسے وہ جواب میں مجھ سے نہ سننے کی متمنی ہے۔ میں نے اس کی خواہش پوری کی۔

''نہیں...... میں نے دو تین بار دستک دی تھی لیکن دروازہ کسی نے نہیں کھولا۔'' میں اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''شکر ہے۔'' اس نے سکون کا سانس لیا۔

''پولیس کو کسی نے اطلاع دی؟''

''ہاں...... پولیس آچکی ہے اور سنا ہے پولیس نے سر نصر کے قتل کے الزام میں سرتنویر کو گرفتار بھی کر لیا ہے۔''

مجھے حیرانی تو ہوئی لیکن قاتل کی گرفتاری سے میں نے اپنے سر سے ایک بڑی سلیب کھسکتی محسوس کی۔ ''سرتنویر کو کیوں؟''

''کیوں کا تو فی الحال نہیں پتا چل سکا۔ بس میں نے یہی سنا ہے کہ سرتنویر کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔''

''پولیس کو کس نے اطلاع دی؟''

''کرسٹینا نے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ میں یہ نام سُن کے حیران رہ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ باہر نکلتے ہوئے میں نے اور عدنان نے اسے دیکھا تھا۔

''لیکن وہ تو صبح صبح صفائی کر جاتی تھی۔ اس وقت وہ کیسے......'' میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

''پتا نہیں...... تم واپس نہیں آسکتے۔ یونی میں اتنی سنسنی پھیلی ہے۔ تم ساتھ ہوتے تو ہم مل کے اپنے طور پر تفتیش کرتے۔ بڑا مزہ آتا۔''

قاتل گرفتار ہو گیا تھا۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں تھا۔ کیوں، کس نے، کیسے جیسے سوالات کا جواب میں یونیورسٹی جا کے اپنے طور پر حاصل کر سکتا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں نے سارہ کو ہاں کر دی۔

کچھ دیر بعد میں یونیورسٹی کی طرف واپس جا رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ یونیورسٹی پہنچنا میرے نصیب میں لکھا ہی نہیں۔

☆☆☆

میں نے راول ڈیم چوک کراس کیا ہی تھا کہ میرا سیل بجنے لگا۔ سارہ کال کر رہی تھی۔ میں نے سیل ہیلمٹ میں ڈالا۔

''ہاں سارہ......''

''کدھر پہنچے۔'' اس کے لہجے سے سنسنی جھلک رہی تھی۔

''بس پہنچنے والا ہوں۔ کوئی اَپ ڈیٹ ہے؟''

''ہاں...... میری کرسٹینا سے بات ہوئی ہے۔ پولیس نے پوچھ گچھ کے بعد اسے چھوڑ دیا ہے۔ وہ اس وقت چٹخارے لے لے کے سب کو سارا ماجرا سنا رہی ہے۔''

''کیا بتایا اس نے؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''میں نے ریکارڈنگ کی ہے۔ رکو تمہیں وہی بیک گراؤنڈ میں پلے کر کے سناتی ہوں'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ چند لمحات بعد کرسٹینا کی آواز آنے لگی۔ میں نے بائک سائڈ پر لگائی اور ہمہ تن گوش ہو کے سننے لگا۔ یہاں پر میں سوالات اور دوسری باتیں حذف کر کے ضروری باتیں ہی بتاؤں گا۔

''باجی کیا بتاؤں آپ کو، میرے میاں کی طبیعت خراب تھی اس لیے مجھے صبح دیری ہو گئی۔ جب میں صاحب جی کے کمرے میں گئی تو ان کمرے سے اونچا اونچا بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اندر جھگڑ رہا ہو۔ میں ''حریان'' پریشان ادھر ہی کھڑی رہ گئی۔ میں دروازے سے کان لگا کے باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی لیکن آواز صاف نہیں آرہی تھی۔ میں نے تھوڑا سا دروازہ کھولا تو باجی میں نے پتا ہے کیا دیکھا...... وہ تنویر صاحب بڑے غصے سے نصر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہے تھے۔ میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ اگر تم باز نہ آئے تو تمہارے خون سے اپنے ہاتھ رنگتے ہوئے میں خوشی محسوس کروں گا۔ میں تو جی ادھر ہی کھڑی رہ گئی۔ تنویر صاحب اتنا کہہ کے دروازے کی طرف لپکے۔ نصر صاحب نے انہیں گندی سی گالی دی۔ وہ غصے سے واپس پیچھے پلٹنے لگے تھے کہ ان کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ باہر نکل گئے۔ میں جی ڈر گئی تھی۔ میں نے کسی بھی کمرے کی صفائی کی ہی نہیں اور اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔ دس بجے نصر صاحب کا فون آیا کہ آکے میرے کمرے کی صفائی کر جاؤ۔ میں ان کے کمرے میں گئی تو مجھے لگا کہ ادھر کوئی نہیں ہے۔ میں گنگناتے ہوئے صفائی کر رہی تھی کہ میری نظر نصر صاحب کی کرسی پر پڑی۔ ان کے دل میں چاقو کھبا ہوا تھا۔ میں تو انہیں اس حالت میں دیکھ کے چیخیں مارنے لگ گئی۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آئے۔ ان میں سے کسی نے پولیس کو فون کر دیا۔ پولیس نے آکے مجھ سے پوچھ گچھ کی تو میں نے تنویر صاحب اور نصر صاحب کے جھگڑے کا سب بتا دیا۔'' پیچھے لڑکوں اور

لڑکیوں کی ملی جلی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ بہرحال اس کے باوجود کرسٹینا کی آواز بہت واضح ریکارڈ ہوئی تھی۔ اس کے بیان سے سرتنویر کے پکڑے جانے کی وجہ پتا چل گئی تھی۔

''واہ...... یہ ہوئی ناں بات۔ ویسے عجیب بات ہے کہ سرنصر نے کرسٹینا کا نمبر سیو رکھا ہوا تھا۔''

وہ ہنسی۔ ''وہ چیز ہی ایسی ہے۔ اس کا نمبر تو ہوسکتا ہے تمہارے پاس بھی سیو ہو۔''

''میرا ٹیسٹ اتنا بھی خراب نہیں۔'' میں ناگواری سے بولا۔

''ہاں۔ یہ تو ہے تمہارا ٹیسٹ واقعی بہت اعلیٰ ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

اس نے بات تو مزے کی کی تھی۔ میں اس کی بات پکڑ کے اس سے تھوڑی چھیڑ چھاڑ کرسکتا تھا لیکن موجودہ حالات میں، میں اس چھیڑ چھاڑ کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں مطلب کی بات پر آگیا۔

''پولیس ادھر ہی ہے یا چلی گئی ہے؟''

''کچھ لوگ چلے گئے ہیں کچھ ادھر ہی ہیں۔ راہداری میں لگی سی سی ٹی وی فوٹیج کا ریکارڈ بھی انہوں نے حاصل کرلیا ہے۔ اس سے واضح ہوجائے گا کہ سرتنویر، سرنصر کے کمرے میں گئے تھے یا نہیں......'' اس کی بات سن کے میں اپنی جگہ پر اچھل پڑا۔ وہ اپنی دھن میں بولتی جارہی تھی لیکن میرا دھیان سی سی ٹی وی فوٹیج پر اٹک کے رہ گیا تھا۔ یہ تو میرے ذہن میں ہی نہیں تھا کہ یونیورسٹی کی سب کلاسز اور رراہداریوں میں کیمرے لگے ہیں۔ پولیس وہ فوٹیج چیک کرتی تو میری گرفتاری یقینی تھی۔ اب یونیورسٹی جانا گویا خود کو پھندے میں پھنسانا تھا۔

سارہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ کتنی دیر میں پہنچو گے، اس کا جواب یہی بنتا تھا کہ ''کبھی نہیں۔'' لیکن یہ جواب میں اسے دے نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

میں ایک دفعہ پھر واپسی کے سفر پر رواں دواں تھا۔ سوچ سوچ کے میرا ذہن گھن چکر بن چکا تھا۔ آخرکار میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے بائک ایک ورکشاپ پر رکھا۔ ورکشاپ والا میرا جاننے والا تھا۔ اس سے میں نے ایک اور بائک ادھار لی، اور مری کی طرف گامزن ہوگیا۔ مری کی طرف چلنے سے پہلے میں گھر سے ایک کپڑوں کا بیگ بھی لے آیا تھا۔ امی کو میں نے بتایا تھا کہ میں ایک ضروری کام سے گوجرخان جارہا ہوں۔

اپنا سیل فون گھر میں چھوڑ کے میں نے گھر سے ہی ایک اور سیل پاس رکھ لیا تھا۔ اس میں، میں نے ایک ایسی سم ڈال لی تھی جو میرے نام پر نہیں تھی۔ میں نے مری میں موجود اپنے ایک دوست عدیل کو کال کرکے آنے کا بتادیا تھا۔ عدیل سے میرے دوسرے دوست اور گھر والے ناواقف تھے اسی لیے میں نے اس کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں اگر پکڑا جاتا تو میرا بچنا محال تھا۔ ایک دفعہ میں اندر ہوجاتا تو میں خود کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میری جان صرف اسی صورت میں بچ سکتی تھی کہ میں اصل قاتل کو کسی طرح گرفتار کرادوں۔ اس لیے باہر رہ کے میں نے اصل قاتل کی تلاش کا فیصلہ کیا تھا۔

پولیس سے مجھے گہرائی سے تفتیش کرنے کی امید نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ پولیس مجھ سمیت دیگر مشکوک لوگوں کو پکڑ کے تشدد کے ذریعے اقرار جرم حاصل کرنے کی کوشش کرتی اور میں اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

اصل قاتل کی تلاش کے لیے میرے ذہن میں ایک لائحہ عمل تھا یہ الگ بات تھی کہ اس کی بنیاد چند مفروضوں پر تھی۔ اگر میرے مفروضے درست ثابت ہوجاتے تو ہی میں اصل قاتل تک پہنچ سکتا تھا۔ اس کا فیصلہ بہرحال وقت ہی کر سکتا تھا کہ میرے مفروضے درست نکلتے ہیں یا نہیں، اب میں اس وقت کا انتظار کررہا تھا۔

میں تین بجے کے قریب مری پہنچ گیا۔ عدیل کی جیولری کی شاپ تھی۔ میں نے بائک جی پی او پر کھڑی کی اور اس کی شاپ پر پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے گرمجوشی سے ملا۔ وہ مجھے تھائی ریسٹورینٹ میں لے گیا۔ ہم نے وہاں اکٹھے بیٹھ کے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ بہت خوش مزاج تھا۔ اس کی کمپنی میں میں اپنی پریشانی بڑی حد تک بھول گیا۔

میں نے اسے بتایا کہ میں آج رات ادھر ہی رہوں گا۔ میں نے اس سے کسی مناسب ہوٹل کا پوچھا جس میں، میں کمرا لے سکتا لیکن وہ بضد ہوگیا کہ میں اس کے گھر جاؤں گا۔ میں نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے اسے اس کی جیولری شاپ بھیج دیا کیونکہ اپنا کام کرنے کے لیے مجھے تنہائی درکار تھی۔ میں نے اسے بتادیا کہ میں چند ضروری کام کرنے کے بعد شام کو اس کے پاس آجاؤں گا۔

عدیل کو بھیجنے کے بعد میں مال روڈ پر چلنے لگا۔ مال

روڈ پر لاتعداد بار آ چکا تھا۔ مجھے یہاں کی چہل پہل بہت پسند تھی اور ہمیشہ میں یہاں بہت انجوائے کرتا تھا مگر آج پہلی بار مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مال سے آگے آ کے میں ایک تنہا کیبن میں بیٹھ گیا۔ اب میں وہ کام کر رہا تھا جس پر میری آنے والی زندگی کا دارومدار تھا۔

☆☆☆

میں نے سر نصر کا سیل فون نکال کے اس میں اپنی سم ڈال لی۔ یہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ اگر پولیس سر نصر کے فون نمبر سے اس سیل کی لوکیشن ٹریس کرنے کی کوشش کرے تو وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ میں نے سیل آن کیا تو حسبِ توقع اس پر پن کوڈ لگا ہوا تھا۔ زیادہ تر لوگ عام طور پر موجودہ سال، ڈیٹ یا ایئر آف برتھ، یا اپنے فون نمبر کے پہلے یا آخری ہندسے پن کوڈ کے طور پر رکھتے ہیں۔ میں نے 2017 بطور پن کوڈ درج کیا لیکن کوڈ غلط کا میسج ظاہر ہوا۔

بہر حال کئی کوششوں کے بعد ان کی آئی ڈی کی مدد سے میں نے ان کے سیل کا پن کوڈ ری سیٹ کیا۔ آخر کار آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد میں ان کا سیل کھولنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یہ میری محنت تھی لیکن اس سے آگے کے کام کا سارا دارومدار میری قسمت پر تھا۔ اچانک میرے ہاتھ میں سر نصر کے سیل پر ایک بیپ بجی۔ اس بیپ کے ساتھ سیل پر جو نوٹیفکیشن ظاہر ہوا تھا اس نے میری بدقسمتی پر اپنی مہر ثبت کر دی تھی۔

☆☆☆

میں اکثر سنا کرتا تھا کہ فلاں کی قسمت کا ستارہ عروج پر ہے۔ مجھ پر یہ محاورہ اس وقت تھوڑی سی ''ایڈیٹنگ'' کے ساتھ صادق آ رہا تھا۔ اس وقت میری بدقسمتی کا ستارہ عروج پر تھا۔ سر نصر کے سیل پر جو بیپ بجی تھی، وہ بیٹری لو کا سگنل تھا۔ اتنی محنت سے میں ان کا سیل کھولنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن جب محنت کا پھل کھانے کا وقت آیا تو سیل کی بیٹری دغا دے گئی تھی۔

خیر ابھی دس فیصد بیٹری باقی تھی۔ اس سے میں زیادہ تفصیل نہ سہی کم از کم میں اپنے مفروضوں کے درست یا غلط ہونے کے متعلق نتیجہ اخذ کر سکتا تھا۔ میں نے فلموں اور کہانیوں میں سراغ رسانوں کو مختلف طریقوں سے سراغ ڈھونڈتے دیکھتا رہتا تھا۔ ان سب سے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن کسی کے سیل سے اس کی جاسوسی کیسے کی جا سکتی ہے، یہ میں نے اپنی ذہانت، لوگوں کی نفسیات اور سیل کے متعلق معلومات سے ہی سیکھا تھا۔ سراغ رسی کا یہ طریقہ میرا ذاتی تھا۔

میں نے اپنی مطلوبہ چیزیں چیک کرنا شروع کیں۔

سب سے پہلے میں نے ''کال ریکارڈر'' کی ایپ ڈھونڈنے کی کوشش کی میری خوش قسمتی کے اس میں نہ صرف کال ریکارڈر کی ایپ موجود تھی بلکہ اس میں ''آٹو کال ریکارڈ'' کا آپشن بھی آن تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سر نصر کی ساری کال ریکارڈنگز اب میں سن سکتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ یہ ریکارڈنگز اصل قاتل تک پہنچنے کے لیے معاون ثابت ہوں گی۔

میں نے ان کی گوگل ڈرائیو کھولی اور امید بر آئی۔ اس میں دس کے قریب ویڈیوز اور کافی زیادہ تصاویر محفوظ تھیں۔ میں نے تصاویر دیکھنا شروع کیں۔

سر نصر کا گھناؤنا روپ میرے سامنے آشکار ہوتا چلا گیا۔ وہ کوئی انسان نہیں درندہ تھا جس نے لاتعداد لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کی تھیں۔ زیادہ تر تصاویر لڑکیوں ہی کی تھیں اور قابلِ اعتراض حالت میں تھیں۔ ان میں کچھ تصاویر ایسی لڑکیوں کی بھی تھیں جنہیں میں جانتا تھا۔ علیسا کی تصاویر بھی ان میں میری توقع کے مطابق موجود تھیں۔ سر تنویر کی بیوی کی بھی چند تصاویر موجود تھیں جو ہماری یونیورسٹی ہی میں پڑھاتی تھیں۔ تاہم ان کی تصاویر قابلِ اعتراض حالت میں نہیں تھیں۔ میں ایک تصویر دیکھ کے چونکا۔ یہ عدنان کی بہن کی تصویر تھی۔ وہ تصویر جس حالت میں تھی اگر وہ دیکھ کے عدنان نے انہیں قتل کیا بھی تھا تو وہ اس میں حق بجانب تھا۔

میں مزید تصاویر دیکھنے لگا پھر میرے سامنے ایک ایسی تصویر آئی کہ سیل میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ اس تصویر کو دیکھ کے میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ سر نصر ایک گھٹیا شخص تھا یہ میں پہلے سے جانتا تھا۔ وہ گھٹیا ترین تھا یہ میں اس کی ڈرائیو میں محفوظ تصاویر دیکھ کے جان گیا تھا لیکن وہ اس سے کہیں زیادہ کسی درجے کا شخص تھا، یہ میں نے اس تصویر سے جانا تھا۔

☆☆☆

میری اس وقت جیسی حالت تھی، میں عدیل کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ میں خود کو کمپوز کرنے کے لیے مال روڈ پر گھومنے لگا لیکن مال روڈ کی رونقیں بھی میری حالت میں کوئی تبدیلی نہ لا سکیں۔ آٹھ بجے کے قریب میں عدیل کے پاس پہنچا۔ اس وقت تک میں خود کو کافی حد تک کمپوز کر چکا تھا۔ عدیل مجھے اپنے گھر لے آیا۔ اس کا گھر مال روڈ سے نیچے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُم مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہی ایک گاؤں مسیاڑی میں تھا۔

اس کے گھر پہنچ کے میں نے نصر (اس شخص کے اصل روپ کے بعد اسے ''سر'' کہنا اس معزز لفظ کی توہین تھی۔) کا سیل چارجنگ پر لگا دیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد عدیل مجھے لے کے باہر آ گیا۔ سگریٹ پیتے ہوئے ہم گپیں مارنے لگے۔ اس کی خوش مزاجی کی بدولت میرا موڈ قدرے بہتر ہو گیا تھا۔

رات گیارہ بجے وہ مجھے میرے کمرے میں چھوڑ گیا۔ میں نصر کے قتل کی تفتیش کی تازہ صورتِ حال جاننا چاہ رہا تھا۔ معلوم نہیں فوٹیج سے پولیس نے میرے بارے میں جان لیا تھا یا نہیں۔ اگر وہ جان گئے تھے تو زیادہ چانس تھا کہ اتنی دیر میں میرے گھر، میری گرفتاری کے لیے پولیس نے چھاپا بھی مار لیا ہوگا۔ ایسی صورت میں میرے والدین کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہوتا۔ اس چھاپے سے ان پر کیا گزرتی؟

میرا دل اچانک بے چین ہو گیا۔ کچھ سوچ کے میں نے ارسلان کو کال کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ میری ہیلو سنتے ہی چلایا۔ ''کدھر ہو تم یار۔ تمہارا نمبر ٹرائی کر کر کے میں تھک گیا۔''

''کیوں خیریت؟'' میں نے محتاط انداز میں سوال کیا۔

''تجھے اپنے کرتوتوں کا پتا بھی ہے پھر بھی خیریت کا پوچھ رہا ہے۔'' وہ چلایا۔ میرا دل ہولنے لگا۔

''یار پلیز، پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ میں پہلے سے ہی بہت زیادہ پریشان ہوں۔'' میرا التجائیہ لہجہ سن کے وہ نرم پڑ گیا۔

''پولیس آئی تھی تمہارے گھر تمہیں گرفتار کرنے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

میں تڑپ اٹھا۔ ''پھر......''

''پھر کیا...... تمہاری امی نے انہیں بتایا کہ تم گوجر خان کا بتا کے گئے ہو۔ انہوں نے تمہارے کمرے کی تلاشی لی اور چلے گئے۔ مجھے افسوس ہے تم پر، تم نے مجھے بھی کچھ بتانا گوارا نہیں کیا۔ اگر تم نے اس کمینے نصر کو قتل کر بھی دیا تھا تو کم از کم مجھے اور حسیب کو تو سب بتا دیتے۔ ہم تمہاری مدد ہی کرتے لیکن افسوس تم نے ہمیں اعتبار کے قابل ہی نہ سمجھا۔'' وہ اگر شکوہ کناں تھا تو اپنی جگہ حق بجانب تھا۔

''میں نے یہ قتل نہیں کیا۔'' میں دھیمے لہجے میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''تو پھر تم کیوں چھپتے پھر رہے ہو؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

میں نے اسے دھیمے دھیمے ساری کہانی سنا دی۔ ماسوائے اس کے، کہ میں اس وقت مری موجود ہوں۔ باقی سب بتا دیا۔ میری ساری رام کہانی سننے کے بعد وہ بولا۔

''سر نصر کے قتل کی خبر میڈیا پر بھی آ چکی ہے۔ گو کہ پولیس نے میڈیا کو اپنی تفتیش کے متعلق کچھ نہیں بتایا لیکن پولیس پوری جانفشانی سے تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے تم واپس آ جا۔ ویسے بھی فرار کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔''

''بس یار میں اپنے طور پر اصل قاتل تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے میں اس تک پہنچ جاؤں گا۔ بس مجھے تمہاری تھوڑی مدد درکار ہے۔''

''یار ایسے فارمل ہو کے نہ بات کر۔ مجھے سیدھا سیدھا بتا میں کیا کروں۔'' اس کے خفگی بھرے انداز نے میرا دل اس کی محبت سے بھر دیا۔ مجھے اپنا حوصلہ بڑھتا محسوس ہوا۔ اچھے دوست خدا کی نعمت ہوتے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں ایسی نعمت سے مالا مال ہوں۔

''یار...... میں جاننا چاہ رہا ہوں کہ مجھ سے پہلے نصر کے کمرے سے کون نکلا تھا۔ اور یہ فوٹیج دیکھ کے ہی پتا چل سکتا ہے۔ تم اپنے ایس پی کزن سے وہ فوٹیج نکلواؤ۔''

''ہم...... ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ فوٹیج میں جو شخص تم سے پہلے کمرے سے باہر نکلا ہوگا، وہی قاتل ہوگا لیکن مسئلہ یہ ہے معیز بھائی اسلام آباد پولیس میں ہیں اور یہ کیس راولپنڈی کی حدود میں آتا ہے۔''

''یار تم ان سے بات تو کرو۔ ہو سکتا ہے ان کا کوئی لنک نکل آئے۔ اگر وہ یہ کام نہ کر سکے تو بتانا میں کوئی اور راہ تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے یہ پتا چل جائے کہ مجھ سے پہلے اس کے کمرے سے کون نکلا تھا تو میں اس کے خلاف باقی ثبوت تلاش کر سکتا ہوں۔''

''او کے، میں ان سے بات کر کے تمہیں بتاتا ہوں۔''

''تم میرے لیے دعا کرنا اور کوئی بھی اپ ڈیٹ ہوئی تو مجھے بتا دینا۔ لیکن پلیز کسی کو بتانا نہیں کہ میں نے تمہیں کال کی ہے۔ سارہ یا حسیب کو بھی نہیں۔'' آخر میں میرا لہجہ ملتجیانہ ہو گیا۔

وہ مجھ سے مزید بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے کال کاٹ کے سیل آف کر دیا۔

کافی دیر میں چت لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ ارسلان کی

باتیں میرے سر پر ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد میری حالت سنبھلی تو میں نے اپنے کام کی طرف توجہ دی۔ وہ کام جو مجھے اس ساری مصیبت سے بچا سکتا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ اگر میری قسمت میرا ساتھ دیتی تو......

میں نے نصر کا سیل کھولا لیکن بدقسمتی کا سایہ ابھی تک مجھ سے ہٹا نہیں تھا۔ اس کے سیل پر میں نے جس نیٹ ورک کی سم ڈال رکھی تھی اس کا تھری یا فور جی نیٹ ورک ہی ادھر دستیاب نہیں تھا۔ میں نے اپنا سیل چیک کیا۔ ادھر بھی یہی صورت حال تھی۔ اب میں سیل میں موجود صرف وہی چیزیں چیک کر سکتا تھا۔ جو اس کی میموری میں محفوظ تھیں۔

ارسلان کا میسج ملا کہ معیز بھائی کا نمبر آف ہے۔ میں اس طرف سے مایوس ہو کے سیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں سیل میں موجود ریکارڈ کالز سننے لگا۔ ان کالز سے نصر کے مزید کرتوت تو آشکار ہوئے لیکن مجھے کوئی ایسا کلیو نہ ملا جو قاتل کی طرف میری راہنمائی کرتا۔ وہ ریکارڈنگز سنتے سنتے جانے کب میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ میں جانے کتنی دیر سویا تھا کہ اس بھیانک خواب نے مجھے جگا دیا۔ اب نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

کہتے ہیں رات مایوسی کے اندھیرے ساتھ لاتی ہے۔ میں جو دن کے وقت کافی پُرامید تھا، اب مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی گردن کے گرد پھانسی کا پھندا سخت ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح میری آنکھ دس بجے کے قریب کھلی تھی۔ رات گئے جب میری آنکھ لگی تو اس کے بعد بڑی پُرسکون نیند آئی تھی۔ اس وقت میں خود کو کافی فریش محسوس کر رہا تھا۔ عدیل میرے لیے کمرے میں ہی ناشتا لے آیا۔ ہم اکٹھے بیٹھ کے ناشتا کرنے لگے۔ میں ناشتا کر ہی رہا تھا کہ سیل کی بیل بجی، ارسلان کال کر رہا تھا۔ میں عدیل کے سامنے اس سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کال کاٹ کے اسے میسج کیا۔

''اس وقت کال ریسیو کرنے کی پوزیشن میں نہیں، میسج کر دو۔''

''معیز بھائی نے سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھ لی ہے۔ تم سے پہلے کمرے سے علیسا ہی نکلتی نظر آ رہی ہے۔'' اس کا میسج پڑھ کے میں سوچ میں پڑ گیا۔ تو نصر کو علیسا نے قتل کیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس کی نسبت پولیس کے پاس مجھ پر شک کرنے کا زیادہ مضبوط جواز موجود تھا۔ میں نے ہینڈل سے اپنے فنگر پرنٹس خود کو بچانے کے لیے صاف کیے تھے لیکن ہینڈل سے فنگر پرنٹس صاف کرنا ہی میرے خلاف جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اگر میں علیسا کو قاتل گردانتا تو اس کا مطلب تھا کہ جب میں کمرے میں گیا تو نصر قتل ہو چکا تھا۔ میں نے کسی کو بتانے کے بجائے جو فرار کا فیصلہ کیا تھا، یہ بھی مجھ پر پولیس کا شک بڑھا رہا تھا۔

''یار، میں کل سے دیکھ رہا ہوں تم بار بار مراقبے میں چلے جاتے ہو، کیا بات ہے۔ کسی پیر فقیر کو تو جوائن نہیں کر لیا۔'' عدیل نے مجھے کھویا ہوا دیکھ کے چوٹ کی۔

''تمہارا کیا خیال ہے آج کل کے پیر فقیر مراقبے جیسے چکروں میں پڑتے ہیں۔'' بات بدلنے کے لیے مجھے یہی جملہ سوجھا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب عدیل پیروں فقیروں کی عادات، خواص اور اپنے تجربات بیان کرنا شروع کر دے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ناشتے کے اختتام تک وہ پیروں فقیروں پر پورا ''تھیسز'' زبانی بیان کر چکا تھا۔ اگر ''پیریالوجی'' نامی کوئی ڈگری ہوتی تو اس تحقیق کی بنیاد پر اسے فوراً وہ ڈگری الاٹ کر دی جاتی۔

ناشتے کے بعد میں اسے اپنے بائک پر بٹھا کے اس کی دکان تک لے گیا۔ اسے دکان پر چھوڑ کے مال پر نکل آیا۔ مال روڈ پر لوگوں کی چہل پہل جاری تھی۔ میں نے ارسلان کو کال کی۔

اس کی باتیں سن کے مجھے اپنے قدموں سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ پولیس نے سرتنویر کو چھوڑ دیا تھا۔ فوٹیج کی وجہ سے انہوں نے مجھے قاتل گردان لیا تھا۔ عدنان اور چند دیگر لڑکوں نے میرے خلاف گواہی دی تھی۔ بقول عدنان کے میرا نصر سے جھگڑا ہوا تھا، اور میں نے اس کے اور چند دیگر لڑکوں کے سامنے کہا تھا، کہ اگر نصر نے میرے نمبر ٹھیک نہ کیے تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اس نے پولیس کو یہ بھی بتایا کہ جب وہ نصر کے کمرے میں جانے لگا تو میں اسی طرف سے آ رہا تھا۔ میں نے اسے ان کے کمرے کی طرف جانے ہی نہ دیا۔

فوٹیج کے بعد عدنان کا بیان میرے گلے میں پھندا فٹ کرنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے اس کے ایسے بیان سے حیرت ہوئی۔ گو کہ وہ میرا کوئی اتنا قریبی دوست نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے جس انداز میں پولیس کو بیان دیا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے نصر کے قتل کے الزم میں گرفتار دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ایسا کیوں چاہتا تھا، یہ ہنوز میرے لیے ایک سوالیہ نشان تھا۔

پولیس اب پوری تندہی سے میری تلاش میں مصروف تھی۔ میرے گھر والوں سے بھی دوبارہ پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ میرے دوست بھی پولیس کی پوچھ گچھ سے بچے نہیں تھے۔ میری احتیاطی تدابیر میرے کام آرہی تھیں، ورنہ اگر میں اپنا سیل لے آتا اور گھر والوں یا اپنے دوستوں سے رابطے میں رہتا تو میری ساتھ ساتھ وہ بھی مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ میرے بائک کا نمبر بھی موٹر وے پولیس کو بتا دیا گیا تھا۔ گویا میں نے بائک ورکشاپ میں چھوڑ کے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔

ارسلان نے مجھے بتایا کہ میرے گھر والے، میرے دوست سب مجھے ہی قاتل سمجھ رہے تھے۔ مجھے اس کی باتوں سے ایسا لگا کہ وہ بھی مجھے ہی قاتل سمجھتا ہے۔ بس اظہار نہیں کر رہا۔ گویا اس وقت دنیا میں صرف دو افراد ایسے تھے جنھیں میری بے گناہی کا یقین تھا۔ ان دو میں سے ایک تو میں خود تھا اور دوسرا اصل قاتل تھا۔

مجھے امید تھی کہ تازہ صورتِ حال سے مجھے خود کو بچانے کی کوئی راہ میسر آجائے گی لیکن ہوا اس کے الٹ تھا۔ میری راہ ہر طرف سے مسدود ہو چکی تھی۔ میں ایک کیبن میں بیٹھ کے اس کیس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ سوچ سوچ کے میرے سر میں درد شروع ہو گیا، لیکن اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ میں نہیں آرہا تھا۔

بہت سی سائنسی ایجادات، یا دریافتیں کسی حسین اتفاق کے تحت ہوئی تھیں۔ میں نے بارہا فلموں میں دیکھا تھا، کہانیوں میں پڑھا تھا کہ قاتل کسی اتفاق کے تحت پکڑا جاتا ہے۔ میں بھی اب بس کسی ایسے ہی اتفاق کے ظہور پذیر ہونے کی امید رکھ سکتا تھا۔

یکایک مجھے خیال آیا کہ میرے اور قاتل کے علاوہ بھی کوئی ایسا ہے جسے میری بے گناہی کا علم ہے۔ اب وہی میری مدد کر سکتا تھا۔ میں نے اسی سے ہی مدد مانگنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اصل قاتل کے کتنے قریب ہوں۔

☆☆☆

میں ارسلان اور حسیب کو لے اس وقت ''ریڈ چلی'' ریسٹورینٹ میں ان کی فرمائش پر انہیں ''چل'' کرا رہا تھا۔ ان کے لیے تو یہ ڈنر ''چل'' تھا لیکن میرے لیے ادائیگی تھی۔ صرف بل کی نہیں بلکہ اس جرمانے کی ادائیگی جو ان دونوں نے مجھ پر عائد کیا تھا۔ جرمانہ عائد کرنے سے پہلے حسیب نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی تھی جس میں اس نے میرے سارے جرائم کی تفصیلات بتائی تھیں۔ جب میں نے ان کی طرف جرمانے کے بار بار تقاضے پر اپنا قصور دریافت کیا تو حسیب بولا۔ ''تم...... تم اپنا قصور پوچھ رہے ہو......'' یہ جملہ اس نے اتنے دکھ سے کہا تھا کہ اگر شیکسپئر کے ڈرامے کا کردار سیزر دیکھ لیتا تو وہ اپنے یوٹو بروٹس...... والے ڈائیلاگ کی ادائیگی میں مزید بہتری کے لیے اس سے راہنمائی ضرور طلب کرتا۔

حسیب صرف اسی جملے پر نہیں رکا تھا۔ اس نے جو لمبی چوڑی تقریر مجھے سنائی تھی اسے سن کر میں صرف مسکراتا رہا تھا۔ یہ مصنوعی مسکراہٹ نہیں بلکہ حقیقی مسکراہٹ تھی جو جانے کتنے دنوں سے مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔

میں اصل قاتل کی گرفتاری کے بعد ہی گھر لوٹا تھا۔ اصل قاتل کی گرفتاری میں سب سے زیادہ میرا ہی ہاتھ تھا، تاہم تاحال میں نے کسی کو یہ بتایا نہیں تھا۔ میرے گھر پہنچنے پر بڑا جذباتی سا سین ہوا تھا۔ جس میں رونا دھونا، ڈانٹنا ڈپٹنا، چیخنا چلانا، مرنا مارنا، معافیاں تلافیاں...... جیسے سنسنی خیز اور ڈرامائی قسم کے سارے پارٹس شامل تھے۔ امی نے پہلی بار مجھ پر غصہ کیا تھا، تو ابو نے پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا لیکن مجھے کچھ بھی برا نہیں لگا تھا۔ میں جس قسم کی صورتِ حال سے میں نکلا تھا، اس کے بعد تو یہ سب پیار بھری ڈانٹ پھٹکار اور مار مجھے اچھی ہی لگی تھی۔

سارہ بھی مجھ سے ناراض تھی اور جدید دور کے تقاضوں کے مطابق وہ بھرپور طریقے سے اپنی ناراضی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس نے نہ صرف میرا نمبر بلاک کر دیا تھا بلکہ واٹس ایپ، فیس بک اور دیگر سوشل اکاؤنٹس پر بھی مجھے بلاک کر دیا تھا۔ یہ اس کی ناراضی کی انتہا تھی لیکن مجھے امید تھی کہ میں اسے منالوں گا۔

مجھے لوٹے دو دن ہو چکے تھے لیکن میں ابھی تک یونیورسٹی نہیں گیا تھا۔ سارہ کا بھی پتا چلا تھا کہ یونیورسٹی نہیں آرہی۔ اس لیے فی الحال یونیورسٹی جانے کو کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

یہ دو دن میں نے گھر ہی گزارے تھے لیکن دوسرے دن ارسلان اور حسیب آدھمکے اور مجھے گھر سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ ڈنر کے دوران میں انہیں اپنی تفتیش کی تفصیلات بتانے لگا۔

کہتے ہیں کہ جب سب سہارے ساتھ چھوڑ جائیں تو پھر بھی ایک سہارا بچ جاتا ہے۔ وہ سہارا اللہ کا ہوتا ہے۔ کیبن میں بیٹھے بیٹھے مجھے اللہ کا خیال آیا تھا۔ اللہ میری بے

گناہی کے بارے میں جانتا تھا۔ اب میں بس اسی سے مدد مانگ سکتا تھا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ میں ظہر کی نماز کی ادائیگی کے لیے چل پڑا۔ ''قاتل'' بھی میرے ساتھ ہی تھا لیکن میں اس سے بے خبر تھا۔

میں نے قریبی مسجد میں نمازِ ظہر ادا کی اور رب کی بارگاہ میں سربسجود ہو گیا۔ آج جانے کتنے عرصے بعد میں نے اس طرح دل سے کوئی دعا مانگی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اللہ میری دعا نہ سنتا۔ دعا مانگنے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ اب میں خود کو کافی پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ قاتل اس وقت بھی میرے ساتھ تھا۔

میں مسجد سے باہر نکلا، تو میری عدیل پر نظر پڑی۔ وہ بھی مسجد سے ہی نکل رہا تھا۔ وہ مجھے فرائی چکس پر لے آیا۔ ...''ٹوسٹر رول'' کھاتے ہوئے باتوں میں، میں نے عدیل کا پورا ساتھ دیا۔ وہ بھی مجھے پرانی ٹون میں دیکھ کے خوش ہو گیا۔ قاتل اس وقت بھی میرے ساتھ تھا۔

لنچ کے بعد ہم گھومنے لگے۔ ہم مال روڈ سے ہوتے ہوئے، کشمیر پوائنٹ کی طرف آ گئے۔ وہاں پی آئی اے پارک میں پہنچ کے ہم بیٹھ گئے۔ قاتل میرے ساتھ ساتھ یہاں تک بھی پہنچ چکا تھا۔

میں ایک بینچ پر بیٹھا تھا کہ عدیل نے مجھ سے سیل مانگا۔ وہ میری تصویر لینا چاہ رہا تھا۔ میں نے جیب سے سیل نکال کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے میری چند تصویریں لیں اور سیل میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے ہاتھ سے سیل لے کے مجھے پتا چلا کہ بے خیالی میں، میں نے نصر کا سیل عدیل کو دے دیا تھا۔ میں گیلری میں اپنی تصویریں دیکھنے لگا اور پھر...... قاتل میرے سامنے آ گیا۔

وہ کھڑکی میں کھڑا تھا۔ کھڑکی کے شفاف شیشے سے اس کا چہرہ واضح نظر آ رہا تھا۔ سیل کی اسکرین پر اس چہرے کے علاوہ ایک اور چہرہ بھی موجود تھا۔ یہ چہرہ نصر کا تھا۔

یہ دراصل ایک سیلفی تھی۔ جو نصر نے لی تھی لیکن اتفاق سے بیک گراؤنڈ میں قاتل کا چہرہ بھی آ گیا تھا۔ میں نے تصویر کا وقت دیکھا۔ یہ اس وقت سے چند منٹ قبل کا وقت ہی تھا۔ جب میں نصر کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ آخر کار میں قاتل تک پہنچ ہی گیا تھا۔

میں کڑی سے کڑی جوڑنے لگا۔ میرے خیال میں ہوا یہ تھا کہ نصر اپنی سیلفی لے رہا تھا۔ قاتل اس وقت کھڑکی کھول کے اندر آ رہا تھا۔ یہ قدِ آدم سلائڈنگ ونڈو تھی جس کے شیشے شفاف تھے۔ کھڑکی کے پردے سمٹے ہوئے تھے۔ اس لیے اتفاق سے قاتل بھی تصویر میں آ گیا۔ اس کے بعد میرے خیال میں نصر نے سیل کی اسکرین پر اس شخص کو دیکھتے ہی اپنی چیئر کھڑکی کی طرف گھمائی ہو گی۔ قاتل اتنی دیر میں کھڑکی کھول کی اندر آ چکا تھا۔ اس نے نصر کو سامنے دیکھتے ہی چاقو سیدھا اس کے دل میں اُتار دیا۔ وار سیدھا دل پر لگا۔ نصر کے ہاتھ سے اس کا سیل نیچے جا گرا یا ہو سکتا تھا کہ چیئر گھماتے ہوئے ہی سیل گر گیا ہو۔ قاتل کھڑکی کے راستے واپس فرار ہو گیا۔ جاتے ہوئے وہ کھڑکی بند کر گیا۔

میں نے ذہن میں پزل کے سارے ٹکڑے جوڑ لیے، یوں تصویر مکمل ہو گئی۔ لیکن اسے ثابت کرنے کے لیے مجھے مزید ثبوت درکار تھے۔

اصل قاتل مجھے مل چکا تھا۔ جس اللہ نے میری اصل قاتل تک راہنمائی کی تھی، وہ لازماً آگے بھی میری مدد کرتا۔

اس تصویر کا بننا اور اس تک پہنچنا بظاہر اتفاق ہی تھا لیکن میرے خیال میں یہ سب کی پلاننگ سے ہوا تھا۔ قاتل ہمیشہ خود کو بچانے کے لیے فول پروف منصوبے بناتے آئے ہیں لیکن ان سے کوئی نہ کوئی غلطی ضرور سرزد ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ پکڑے جاتے ہیں۔ وہ غلطی دراصل غلطی نہیں اللہ کی پلاننگ ہوتی ہے، جس سے وہ قاتل کو پکڑواتا ہے اور بے گناہوں کو بچاتا ہے۔ میں بھی بے گناہ تھا، یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ میری مدد نہ کرتا۔ میں نے مشکل میں پڑ کے اسی سے تو مدد مانگی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنا وہ وعدہ ایفا نہ کرتا جو اس نے سب انسانوں کے ساتھ قرآن میں کیا۔ اس نے میری دعا سن لی تھی تبھی اس تصویر تک پہنچنے کے لیے یہ ساری صورتِ حال بنی تھی۔ ورنہ شاید میں کبھی نصر کے سیل کی گیلری میں نہ جھانکتا۔

عدیل مجھے سیل تھما کے خود اپنے سیل سے اپنی سیلفیاں لینے لگ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''اٹھ نہ یار، ادھر آ...... ایک اکٹھے سیلفی لیتے ہیں۔'' مجھے ہر وقت سیلفیاں لینے اور سیلفیاں لینے والے والوں سے چڑ تھی لیکن کسی کی سیلفی لینے کی عادت نے ہی میرا کام آسان کر دیا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں اس کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

☆☆☆

میں نے عدیل کو سارا ماجرا بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ میری کہانی سن کے ہکا بکا رہ گیا۔ کچھ دیر تو وہ سکتہ زدہ مجھے دیکھتا رہا۔ اور پھر اچانک اس نے وہ حرکت کی جس کی میں کم سے کم اس وقت بالکل توقع نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے میرے

کندھے پر زوردار مکا رسید کیا۔ میرا کندھا جھنجھنا اٹھا۔

''ابے تو مجھے یہ سب اب بتا رہا ہے۔ کیا سمجھ رہا تھا تو یہ سب جان کے میں تیرے کام نہ آتا۔'' وہ اور بھی جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن میں سکون سے سنتا رہا۔ اس کے مُکا مارنے سے تو میں کچھ اور ہی سمجھا تھا تاہم جب وہ بولا تو مجھے اس پر پیار آنے لگا۔ وہ بھی دراصل مجھ سے پیار ہی جتا رہا تھا مگر دوستوں کے پیار جتانے کا انداز بھی نرالا ہی ہوتا ہے۔

وہ جی بھر کے مجھے سنا چکا تو میں معصومیت سے بولا۔

''اچھا سوری......'' یہ میں نے اتنی معصومیت سے کہا تھا کہ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے مجھے گلے سے لگالیا۔

''یار تو اتنے کرائسز سے گزر رہا تھا لیکن منہ سے کچھ پھوٹا تک نہیں۔ اکیلا ایک اور دو گیارہ ہوتے ہیں۔ مجھے تو سب بتا دیتا تو بہت پہلے ہی شاید ہم اس کا حل نکال لیتے۔''

میں اب اسے کیا کہہ سکتا تھا۔ میں نے اس سے قاتل کے متعلق ثبوت اکٹھے کرنے کے لیے مشورہ طلب کیا۔ کچھ دیر کی مشاورت کے بعد ہم ایک طریقے پر متفق ہو چکے تھے۔ میں نے اسے ایک نمبر دیا تو وہ اس پر کال کرنے لگا، لیکن دوسری طرف سے کال ریسیو ہی نہیں کی گئی۔ اس نے دوبارہ کوشش کی لیکن اس بار بھی نتیجہ ندارد۔ بڑی مشکل سے کوئی ساتویں بار کال کرنے پر کال ریسیو ہوئی۔

''کون؟'' دوسری طرف کوئی مرد پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا تھا۔ عدیل نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ شاید وہی ہے جس سے ہم بات کرنا چاہ رہے ہیں۔'' میں نے اسے سرگوشی کی۔

''تمہارا ہمدرد۔'' عدیل بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیا مطلب۔ صاف بات کرو۔'' دوسری طرف سے اس بار محتاط لہجے میں کہا گیا۔

''میرے پاس ایک ویڈیو ہے۔ کیا تم اس کے بارے میں بات کرنا چاہو گے۔'' عدیل پُراسرار سے انداز میں بولا۔ مجھے اس کے اس جملے سے جھنجلاہٹ ہوئی۔

''کونسی ویڈیو۔ میں نے کہا نا صاف بات کرو۔'' دوسری طرف سے غصیلی سی آواز ابھری۔

''یار، مطلب کی بات کرو۔ یہ نہ ہو وہ فون ہی بند کر دے۔'' میں نے اسے سرگوشی کی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور فون پر بولا۔

''اس ویڈیو میں تم کھڑکی کے راستے پروفیسر نصر صاحب کے کمرے میں داخل ہو رہے ہو۔ تم نے ان کے

ڈاکٹر اللہ رکھا مرحوم

ڈاکٹر اللہ رکھا مرحوم حکمت اور سینیٹری کے کام کے علاوہ ایک اخبار میں کالم بھی لکھتے تھے، وہ خود کو کالم نگار کہتے تھے مگر لوگ انہیں ''گالم نگار'' قرار دیتے تھے کیونکہ ان کے ''کالم'' میں گالیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا اور یہ گالیاں وہ انہیں نکالتے تھے جو ان کی حکمت اور سینیٹری کے کاموں میں مہارت سے انکاری ہوتے تھے اور یا پھر ان کو جو ان کی کالم نگاری کو ''گالم نگاری'' قرار دیتے تھے، آخری عمر میں مرحوم نے ڈاڑھی رکھ لی تھی اور پگڑی باندھنا شروع کر دی تھی، اب وہ گالیاں بہت دیتے تھے بلکہ منہ زبانی ہر ایک کو ''تباہ کر دوں گا، برباد کر دوں گا'' کی دھمکیاں دیتے تھے لیکن انسان فانی ہے، وہ خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے ہوئے خواہ جتنے بڑے بڑے دعوے کرے ایک دن خود اس کے فانی جسم نے تباہ ہو جانا ہے چنانچہ ڈاکٹر اللہ رکھا بھی ایک دن ایک عام آدمی کی طرح فوت ہو گئے!

عطاالحق قاسمی کی تصنیف منیت نامے سے انتخاب

سینے پر چاقو سے ایک وار کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یاد آئی...... یا مزید تفصیل بتاؤں۔''

عدیل نے سرد آواز میں کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔

''کون ہو تم؟'' دوسری طرف اس بار خوفزدہ سی آواز میں پوچھا گیا۔

''مجھے تم اپنا دوست سمجھ سکتے ہو۔ وہ ویڈیو اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گئی تھی۔ میں وہ تمہیں دینا چاہتا ہوں۔''

''مجھے کیوں؟'' وہ پریشانی سے بولا۔

''یار تمہاری ویڈیو ہے اس لیے تمہیں دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم نہیں لینا چاہتے تو بتاؤ، میں وہ پولیس کے حوالے کر دیتا ہوں۔'' عدیل اس بار لاپروائی سے بولا۔

''نہیں...... نہیں پولیس کو نہ دینا۔ تم بتاؤ، تم مجھے کہاں مل سکتے ہو؟'' پولیس کا سنتے ہی وہ گھبرا گیا اور ہمارے بچھائے ہوئے جال میں اس نے پہلا قدم رکھ دیا۔ اب آگے عدیل کی صلاحیت کا امتحان تھا کہ وہ اسے کیسے گھیر کے پوری طرح جال میں قید کرتا ہے۔

''تم جہاں کہو، میں آجاؤں گا، لیکن......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کے میری طرف دیکھا۔ مجھے بے چین دیکھ کے اس نے آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو۔

''جسٹ ریلیکس۔''

''لیکن کیا؟'' دوسری طرف سے بے چینی سے پوچھا گیا۔

''لیکن تمہیں میرے اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ تم نے پروفیسر نصر کو کیوں قتل کیا۔'' عدیل نے اس کے گرد جال کا گھیرا مزید تنگ کیا۔ میں بے چینی سے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ بولا۔

''میں تمہیں مل کے سب بتا دوں گا۔'' اس کے جواب سے مجھے مایوسی ہوئی۔ عدیل نے مجھے تسلی آمیز نظروں سے دیکھا۔

''لگتا ہے مجھے ویڈیو پولیس ہی کو دینا پڑے گی۔'' عدیل نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''تم وجہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''تم ویڈیو کیوں لینا چاہتے ہو؟ میں تمہیں مفت میں ویڈیو دے رہا ہوں۔ حالانکہ میں چاہتا تو اس ویڈیو کے بدلے میں تم سے پیسے بھی مانگ سکتا تھا۔ اب کیا مجھے اس ویڈیو کے بدلے تم میرے چھوٹے سے سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتے۔'' وہ شکوہ کناں انداز میں بولا۔

''وہ کمینہ تھا ہی اسی قابل۔'' اس کی نفرت بھری آواز اسپیکر میں ابھری۔ میں اس کی بات سے متفق تھا۔ وہ اس سے بڑی سزا کا مستحق تھا۔

''ہاں...... تھا تو وہ واقعی اسی قابل۔ تم نے اسے مار کے بہت نیک کام کیا۔ تم نے بہت سی لڑکیوں کی زندگی برباد ہونے سے بچالی۔''

''وہ...... وہ میری بیوی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔'' دوسری طرف سے تھکن زدہ سی آواز ابھری۔ عدیل نے مجھے اور میں نے اسے دیکھا۔ آخرکار ہمارے بچھائے ہوئے جال میں وہ اوندھے منہ گر پڑا تھا، لیکن وہ اس سے بے خبر نصر کو قتل کرنے کی وجہ بتانے لگا۔ عدیل بیچ بیچ میں سوال بھی کرتا رہا۔ جب وہ ساری تفصیل بتا چکا تو عدیل نے کال کاٹ دی۔ دوسری طرف سے واپس کال آنے لگی تو عدیل نے کال کاٹ کے نمبر بلیک لسٹ کر دیا۔ اس نے دوسرے نمبر سے ٹرائی کی۔ یہ شاید اس کا اپنا نمبر تھا۔ عدیل نے کال ریسیو کر کے پوچھا۔

''کون؟''

اس نے اپنا نام بتایا۔ یہ اس کے تابوت میں آخری کیل تھی۔ ''تم نے فون کیوں کاٹ دیا۔ پلیز...... وہ ویڈیو میرے حوالے کر دو۔''

''سوری یار، سگنل ڈراپ ہو رہے ہیں۔ میں تھوڑی دیر میں تمہیں کال کر کے بتاتا ہوں کہ وہ ویڈیو تمہیں کہاں مل سکتی ہے۔'' وہ فوری ملنا چاہتا تھا لیکن عدیل نے اسے بہلا پھسلا کہ گھنٹے بعد ملنے پر قائل کر لیا۔ عدیل نے اپنا کام بخوبی کر لیا تھا۔ اس سے کال پر اعترافِ جرم کرا کے کال ریکارڈ کر لی تھی۔ اب میرا کام شروع ہونے والا تھا۔

☆☆☆

میں نے ارسلان کو کال ریکارڈنگز اور تصویر واٹس ایپ کر دی۔ کال ریکارڈنگز اسی نمبر سے سیو ہوتی ہیں جس نمبر پر کال کی گئی ہوتی ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید ثبوت تھا۔ پولیس باقی کی تفتیش سے مزید شواہد بھی اکٹھے کر لیتی۔

ارسلان نے یہ دونوں چیزیں اپنے کزن ایس پی معیز کو دے دیں۔ کچھ ہی دیر میں یہ چیزیں اس تھانیدار تک پہنچ چکی تھیں۔ جس کے پاس نصر کا قتل کیس تھا۔ ایس پی معیز نے ارسلان کے کہنے پر اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ قاتل انہیں کہاں سے مل سکتا تھا۔ اسے سادہ لباس میں جلد از جلد اس جگہ پہنچنے کی ہدایت کر دی گئی۔ اس نے آدھے گھنٹے میں اس جگہ پہنچ جانے کی یقین دہانی کرا دی۔ اسے پکا پکایا کیس مل رہا تھا۔ اب بھی وہ ایفی شینسی نہ دکھاتا تو کیا کرتا۔

عدیل نے قاتل کو کال کر کے جگہ بتا دی۔ جہاں سے اسے ویڈیو ملنی تھی۔ یہ اور بات کہ وہاں اسے ویڈیو ملنے کے بجائے ہتھکڑی لگتی۔ اس کے وہاں پہنچنے کے چانس ففٹی ففٹی ہی تھے۔ گو کے کال پر اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ۔ وہ مطلوبہ جگہ پہنچ جائے گا لیکن وہ کسی بھی وقت ہوشیار ہو سکتا تھا۔ خیر وہ وہاں نہ بھی جاتا تو اسے تلاش کرنا اب پولیس کا دردِ سر تھا۔ اتنا سا کام تو وہ کر ہی سکتے تھے۔

البتہ وہ ابھی پکڑا جاتا تو اس کیس کا مکمل کریڈٹ میرے ہی کھاتے میں جاتا۔ قاتل کی دریافت سے لے کے گرفتاری تک۔ پولیس کو پکی پکائی دیگ ہی ملتی۔ میں نے ''کمہار یا نائی'' نہ ہوتے ہوئے بھی یہ دیگ تیار کر دی تھی۔ اب ہمارے ذمے ایک ہی کام تھا اور وہ تھا انتظار سو ہم بے چینی سے اس کے جال میں پھنسنے کا انتظار کرنے لگے۔

ہمارا یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ آدھے گھنٹے میں ہی ارسلان کی کال آئی کہ قاتل گرفتار ہو چکا ہے۔

میں نے ہرہ کا نعرہ بلند کیا۔ عدیل نے بھی میرا ساتھ دیا۔ پارک میں موجود دیگر لوگ ہماری طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے ہمارا دماغ چل گیا ہو۔ میری گردن پھانسی کے پھندے سے آزاد ہو گئی تھی۔ اب بھلا ہمیں لوگوں کی نظروں سے کیا فرق پڑتا تھا۔

☆☆☆

سارہ اسی بینچ پر بیٹھی تھی جہاں میں اسے آخری بار چھوڑ کے گیا تھا۔ وہ سر جھکائے لان کی گھاس میں نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ میں اس کے پاس جا کے کھنکھارا اس نے چونک کے سر اٹھایا۔ مجھے دیکھ کے اس کا چہرہ یک لخت ہی سپاٹ ہو گیا۔

میں نے ناراض محبوباؤں کو منانے کے طریقے دریافت کرنے کے لیے اتنی طویل تحقیق کی تھی کہ جتنی اپنے پندرہ سال تعلیمی کیریئر میں نہ کی تھی۔ لیکن سارہ کو دیکھتے ہی وہ سارے الفاظ جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

''سوری سارہ۔'' کچھ نہ بن سکا تو میں یہ روایتی سے دو لفظ ہی کہہ سکا۔ اس نے شکوہ کناں نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اس کا تروتازہ چہرہ اس وقت مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ میرا دل کٹ گیا۔

''دیکھو تمہاری ناراضی بجا ہے لیکن پوچھو گی نہیں کہ میں نے تمہیں کیوں اندھیرے میں رکھا؟''

''نہیں۔'' اس نے ہتھوڑا مار کے جواب دیا تاہم ایک لحظے کے لیے اس کی آنکھوں میں چمکتی شرارت میں نے دیکھ لی تھی۔ میرا حوصلہ پھر بڑھا۔

میں نے کاغذات کا ایک پلندہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''چلو وہ نہ پوچھو۔ بس یہ دیکھ لو۔'' میں سادگی سے بولا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے بھویں اچکا کے دیکھا۔

''نوٹس۔'' میں اطمینان سے بولا۔

''اردو میں؟''

''جہاں سے لیے ہیں وہاں اردو میں ہی تھے۔'' میں معصومیت سے بولا۔

وہ دلچسپی سے نوٹس کا مطالعہ کرنے لگی اور میں اس سے دوگنی دلچسپی سے اس کے تاثرات کا مطالعہ...... جو اس نے جان بوجھ کے ایک بار پھر سپاٹ کر لیے تھے۔ چند صفحات کو سرسری سا دیکھنے کے بعد اس نے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

''یہ کیا ہے؟'' اسے ہنسی آ رہی تھی جسے وہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''اسی لیے تو میں لیکچر کے دوران نوٹس نہیں لیتا کہ جو دیکھے گا یہی پوچھے گا، یہ کیا ہے؟'' میں لہجے میں مصنوعی مایوسی طاری کر کے بولا۔

اس نے برہمی سے مجھے دیکھا تو میں یکدم بولا۔ ''اچھا سوری۔ یہ دراصل میرے ریسرچ پیپرز ہیں جو میں نے تمہیں منانے کے لیے تیار کیے تھے۔ تمہاری خاطر، صرف تمہاری خاطر میں نے اپنے مزاج سے قطع نظر خواتین کے بہت سے ڈائجسٹ کھنگالے ہیں۔ وہ تمام طریقے اور الفاظ جو ایسے موقع پر محبوباؤں کو موم کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، کڑی تپسیا کے بعد تیار کر کے یہ ریسرچ پیپرز تیار کیے ہیں۔ اگر میں یہ شائع کرا دوں تو یہ پاکستان کی تاریخ کے سب سے معروف ریسرچ پیپرز بن جائیں گے۔ ہر مردان سے فائدہ اٹھائے گا لیکن تم پھر بھی پوچھ رہی ہو یہ کیا ہے؟'' آخری جملہ میں نے جل بھن کے ادا کیا تھا۔

اس نے اپنی مسکراہٹ دبائی اور بولی۔ ''یہ سارے طریقے تو روایتی ہیروئینز پر اپلائی ہوتے ہیں اور میں تمہاری بدقسمتی سے روایتی ہیروئن نہیں ہوں۔''

''تو تم کیسی ہیروئن ہو؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''غیر روایتی۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''اوہ...... چلو پھر تم بتا دو کہ تم کیسے راضی ہو گی؟''

''تم اگر مجھے صدر لے جاؤ تو۔'' اس کی فرمائش سن کے میں حیرانی سے بولا۔

''صدر کیوں؟''

''کیونکہ ادھر پرل کانٹیننٹل ہے۔'' وہ سکون سے بولی۔

مارے گئے۔ چل حتان نکل جا تیلی گلی سے۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو مشورہ دیا لیکن کم بخت دل نے ہی مشورہ ماننے سے انکار کر دیا۔

بائک پر پی سی کی طرف جاتے ہوئے میں اس سے بولا۔ ''تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔''

''ہمم......''

''تم بھی روایتی ہیروئن ہی ہو۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ صفحہ نمبر بیالیس پر لکھا ہے کہ ناراض محبوبہ کو منانا ہو تو اسے فائیو اسٹار ہوٹل لے جاؤ۔'' میں مزے سے بولا۔

وہ میری کمر پر اپنے نازک...... ہاتھوں سے ''مکیاں'' مار کے اپنی جھلاہٹ دکھانے لگی۔ میں ہنستے ہوئے بائک کا ایکسلیٹر دباتا چلا گیا۔ میرا دل خوشی سے معمور تھا۔

☆☆☆

سارہ سے ملاقات کا احوال پڑھتے ہوئے کہیں آپ اصل قاتل کو بھول ہی تو نہیں گئے؟ خیر آپ بھی بھول گئے ہوں تو میں تو نہیں بھولا۔ نصر کو کرسٹینا کے شوہر سائمن

نے قتل کیا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس کے معاملے میں انتہائی پوزیسو تھا۔ نصر، کرسٹینا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ کرسٹینا پہلے تو اسے نظر انداز کرتی رہی لیکن جب اس کی دست درازیاں حد سے بڑھنے لگیں تو ایک دفعہ اس نے نصر کو اچھا خاصا بے عزت کر دیا۔ یہ خبر اڑتے اڑتے سائمن تک بھی جا پہنچی۔ اس نے کرسٹینا سے استفسار کیا تو اس نے اسے سب بتا دیا۔ سائمن نے اسے کہا کہ اگر وہ اسے آئندہ تنگ کرے تو وہ اسے لازمی بتائے۔

نصر کہاں باز آنے والا تھا، دور ہو جانے والی چیز سے تو ویسے بھی کشش بڑھ جاتی ہے۔ وہ اس کی بے خبری میں دورانِ صفائی اس کی ویڈیوز بنانے لگا۔ کرسٹینا صفائی کے دوران اپنے کام میں مگن رہتی تھی، اس دوران اسے اپنے حلیے کی بھی پروا نہیں رہتی تھی۔ نصر نے ان ویڈیوز سے کچھ تصاویر نکال لیں جو قابلِ اعتراض کے زمرے میں آسکتی تھیں۔ میں نے نصر کے سیل میں بھی تصاویر دیکھی تھیں تو سیل میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔ نصر نے اور تو اور ایک ملازمہ کو بھی نہیں بخشا تھا۔ اس درجے تک گر جانے کی میں اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

نصر یہ تصاویر دکھا کے کرسٹینا کو بلیک میل کرنے لگا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے اپنے شوہر کو بتا دیا کہ نصر اب بھی اسے تنگ کرتا ہے۔ تصاویر والی بات اس نے گول کر دی تھی۔ سائمن اتنا ہی جان کے بھڑک اٹھا۔ وہ تو حد درجہ کرسٹینا سے محبت کرتا تھا۔ اسے یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ نصر ایسے باز آنے والا نہیں۔ اس نے نصر کو سزا دینے کا فیصلہ کیا۔

اس دن جب نصر نے کرسٹینا کو فون کر کے بلایا تو سائمن کا خون کھول اٹھا۔ اسے اندازہ تھا کہ صفائی تو دراصل بہانہ ہے۔

کرسٹینا نے اسے سر تنویر اور نصر کے جھگڑے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ پنپنے لگا۔ اس نے کرسٹینا کے بجائے خود جا کے صفائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اور بات کہ اس نے کمرے کی صفائی کے بجائے، دھرتی سے نصر کے ناپاک وجود کو صاف کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دروازے سے اندر جاتے ہوئے اسے دیکھ لینے کا ڈر تھا۔ اس لیے وہ.... کھڑکی کے راستے اندر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ کھڑکی کا اندرونی کھٹکا عموماً کھلا ہی رہتا ہے۔ نصر اس معاملے میں انتہائی لاپروا تھا۔ ویسے بھی کھڑکی ایک ایسی جگہ کھلتی تھی جہاں سے کوئی اندر آ ہی نہیں سکتا تھا۔ سائمن کے پاس اس جگہ کی چابی تھی۔ وہ بہ آسانی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں قدرت نے اس کی مزید مدد کی۔ نصر اسے دیکھتے ہی پلٹا اور سائمن کو اس پر وار کرنے کا ایک آسان موقع مل گیا۔ وار سیدھا دل پر لگا تھا۔ سائمن کو اتنے نپے تلے وار کی خود بھی امید نہیں تھی۔ نصر کے ہاتھ سے سیل گرا۔ سائمن نے اسے نظر انداز کر دیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سیل اسے پکڑوا سکتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ پکڑا سیل نہ لے جانے کی وجہ سے جائے گا۔

اس کا کوارٹر یونیورسٹی سے ملحق ہی تھا۔ اس نے کرسٹینا کو بلا لیا۔ کرسٹینا کو اس نے سب سمجھا دیا تھا۔ اس نے لاش کو دیکھتے ہی چیخنا شروع کر دینا تھا۔ بعدازاں جب پولیس آتی تو اسے بس تنویر صاحب اور نصر کے جھگڑے کا بتانا تھا۔ نصر نے خود کرسٹینا کو کال کر کے بلایا تھا اس لیے اس پر شک کا کوئی جواز ہی نہ بنتا تھا۔ سارا کھیل اس کی توقع کے مطابق ہی چلا تھا۔ اس کے منصوبے کے عین مطابق تنویر صاحب پکڑے گئے تھے۔

وہ خوش تھا کہ اس کا منصوبہ کامیاب رہا ہے لیکن اس کی بدقسمتی کہ نصر کے قتل کیس میں، میں بھی پھنس گیا۔ اس تک پہنچنے کے لیے دعا کے ساتھ تدبیر بھی کام آئی تھی، لیکن اس سے اعترافِ جرم کرانے کے لیے عدیل کی معاونت اور مشورہ کارگر رہا تھا۔ نصر کے سیل سے کرسٹینا کا نمبر مجھے مل گیا تھا۔ عدیل نے اسی نمبر پر کال کی تھی۔ انجان نمبر ہونے کی وجہ سے شاید اس نے کال ریسیو ہی نہیں کی تھی۔ ہماری بار بار کی کوشش کے بعد اس نے شاید سیل سائمن کو دے دیا تھا اور اسے ہم سے بات کرنا بہت مہنگا پڑا تھا۔

میں نے نصر کا سیل اس کے سارے سوشل سائٹس کے اکاؤنٹس ری سیٹ کر کے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ اکاؤنٹس میں نے اس لیے ری سیٹ کیے تھے کہ ان میں بہت سے لوگوں کی ''عزتیں'' محفوظ تھیں۔

میرے پاس نصر کی گوگل ڈرائیو کا پاس ورڈ محفوظ ہے جس کی بدولت میں اس سارے بلیک میلنگ اسٹف تک رسائی رکھتا ہوں۔ میں پہلے والا حنان ہوتا تو اس سارے ڈیٹا سے بے پناہ فائدہ اٹھا سکتا تھا، لیکن اس کیس میں جس طرح خدا نے میری مدد کی، اس کے بعد میں شش و پنج کا شکار ہو چکا ہوں۔ ایک طرف خدا کی ذات اور اس کے احکامات ہیں اور دوسری طرف دنیاوی فوائد۔ آپ بتائیں آپ میری جگہ ہوتے تو کیا وہ سارا ڈیٹا ڈیلیٹ کر دیتے یا اس سے فائدہ اٹھاتے؟

ناآسودہ عاشق

سلیم انور

وہ عشق بھری باتوں کی شیدائی تھی... جن سے اسے آسودگی... راحت اور خوشنودی ملتی تھی... مگر اس کا عاشق اپنی خواہشات کی آسودگی چاہتا تھا... ناتکمیل شدہ جذبات و خواہشات کے نتیجے میں رونما ہونے والا حادثہ...

عشق و عاشقی کے ادھورے جذبوں کی کہانی......

''شاید آج کا دن میرے لیے خوش قسمت ہے۔'' لاس ویگاس کے سراغ رساں نے کہا۔ اس کی نظریں نیچے موجود اس لاش پر مرکوز تھیں جسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ''لیکن یقیناً اس لاش کے لیے یہ خوش قسمتی کا دن نہیں تھا۔''

فاصلہ ہونے کے باوجود مرنے والی عورت کی گردن کے اطراف میں موجود نشانات اسے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ عورت منہ کے بل پڑی ہوئی تھی لیکن ہاتھوں کے نشانات اس کی زرد جلد پر نمایاں تھے...... خاص طور پر انگوٹھوں کے دو نشانات جو اس کے عریاں شانوں پر نیچے کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔

اس بدقسمت عورت کی لاش پر اپنا شوخ رنگ کا سرکس کا لباس موجود تھا۔ یہ لاش لاس ویگاس اسٹرپ پر بگ ٹاپ کیسینو کے اسٹیج کے داخلی دروازے کے پاس ایک کوڑے دان کے عقب میں چھپائی گئی تھی۔

سراغ رساں کی خوش قسمتی کا سبب وہ غیر معمولی طوفان تھا جو گزشتہ شب جنوبی نیواڈا سے ٹکرایا تھا اور جس کے سبب بارش ہوئی تھی۔ لاش کے نزدیک ہی گیلی مٹی پر پیروں کے نشانات موجود تھے۔ یہ نشانات مشتبہ طور پر ان نوک دار جوتوں کے نشانات سے مشابہ تھے جو مختنی رِنگ ماسٹر اور پروڈیوسر ہاورڈ کائی کے گیلی مٹی پر چلنے سے بنے تھے۔

''گزشتہ رات تیز بارش ہوئی تھی۔'' ہاورڈ کائی نے تصدیق کی۔ ''بارش لگ بھگ رات دو بجے شروع ہوئی تھی۔ آج صبح میں جلدی آ گیا تھا تاکہ چیک کرسکوں کہ سرکس کی چھت کہیں سے لیک تو نہیں ہو رہی۔ جبھی میں نے اس لاش کو دیکھا۔''

ہاورڈ شو 'ویگاس ورائٹی' ایک معروف و مقبول سرکس تھا جو کیسینو کے عقب میں ایک ٹینٹ نما تھیٹر میں مستقل جاری رہتا تھا۔ ''ہم لوگ ایک فیملی کے مانند ہیں۔'' ہاورڈ کائی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''فریڈا ہماری اسٹار ایکروبیٹ تھی۔ وہ ایک حسین اور اپنے فن سے عشق کرنے والی عورت تھی۔ اسے بھلا کوئی کیونکر قتل کرسکتا تھا۔'' لاش کے نزدیک پہنچنے سے قبل.... گیلی زمین کا دوبارہ سے جائزہ لیا تو اسے بیس سائز کے جوتوں کے ایک اور نشانات دکھائی دیے۔

''کیا فریڈا کی تمہارے سرکس کے کسی فرد سے کچھ زیادہ دوستی تھی؟''

اس بات کا سراغ لگانے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ جوتوں کے وہ نشانات سرکس کے ہیڈ کلاؤن اور فریڈا کے بدمزاج شوہر کیومیگز سے مل رہے تھے۔ ''میں اس سے ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ تم جس طرح مردوں سے ہنسی مذاق کرتی ہو تو تم اپنے لیے خود مشکل کو دعوت دیتی ہو۔ میرا خیال ہے کہ بالآخر کسی نے اس کی فلرٹ کرنے کی عادت کو سنجیدگی سے لے لیا۔''

''کیا تمہاری بیوی کا کسی کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا؟'' سراغ رساں نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

اس سوال پر کیومیگز نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ''فریڈا کو سیکس سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف چاہتی تھی کہ اسے چاہا جائے۔ آپ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کتنے ناآسودہ مرد ہوتے ہیں جن کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔''

فریڈا کے بازی گر پارٹنر نے اس کی اپنے فن سے عشق کرنے والی شہرت کی تصدیق کی۔ ''جہاں تک میرے علم میں ہے وہ بس فلرٹ کیا کرتی تھی۔'' روڈولف نے بتایا۔ ''شو ختم ہونے کے بعد فریڈا رات میرے ساتھ تھی۔ ہم مین ٹینٹ میں تھے اور ایک نئے کرتب کی مشق کر رہے تھے۔ ہم نے یہ مشق لگ بھگ ایک بجے کے قریب ختم کردی تھی۔ پھر میرا خیال تھا کہ وہ گھر چلی گئی تھی۔ وہ اور کیومیگز یہاں سے صرف تھوڑے ہی فاصلے پر رہتے ہیں۔''

لیکن کیومیگز کا کہنا تھا کہ فریڈا گھر پہنچی ہی نہیں تھی۔ ''جب وہ گھر نہیں پہنچی تو بارش میں اسے تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا اور اسٹیج کے دروازے پر دستک دی۔ میں اس وقت یقیناً اس کی لاش سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا مگر وہ اس وقت تک مر چکی تھی۔''

سراغ رساں اسٹیج کے دروازے کی طرف لوٹ آیا اور لاش اور پیروں کے نشانات کا غور سے جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''یہ بالکل صاف دکھائی دے رہا ہے کہ یہ قتل کس نے کیا ہے۔''

''اس کیس میں پیروں کے نشانات سب سے اہم کلیو نہیں تھے۔ اگر فریڈا کو بارش شروع ہونے سے پہلے قتل کیا گیا تھا جو رات دو بجے شروع ہوئی تھی تو یہ قتل کوئی بھی کرسکتا تھا اور وہ لاش کے اطراف میں گیلی مٹی کے نشانات نہیں چھوڑ سکتا تھا۔'' سراغ رساں نے اپنی رپورٹ میں تحریر کیا۔ اس کیس میں اہم نشانات پیروں کے نہیں بلکہ انگلیوں کے نشانات تھے جو لاش کی گردن پر پائے گئے تھے۔''

'لاش کی' گردن کے اطراف میں جو ہاتھوں کے نشانات تھے' وہ عقبی جانب سے اور اوپر سے نیچے کی طرف تھے۔ قاتل نے فریڈا کا گلا اس کے سر سے اوپر کی جانب سے گھونٹا تھا جبکہ اس کا رخ قاتل سے مخالف سمت میں تھا۔ یہ تقریباً ایک ناممکن پوزیشن تھی جس سے کسی کا گلا گھونٹا جاسکتا تھا...... البتہ کسی کرتب دکھانے والے ایکروبیٹ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔''

''یہ قتل روڈولف نے کیا تھا۔ وہ فریڈا سے شادی کا خواہاں تھا اور اسے اس میں ناکامی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ جب وہ ایک نئے توازن برقرار رکھنے والے کرتب کی مشق کر رہے تھے تو اس ایکٹ کے دوران میں روڈولف نے سر کے اوپر اور عقب سے فریڈا کی گردن پکڑ لی تھی اور اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔''

روڈولف سے سراغ رساں نے اپنی حتمی رپورٹ میں حقیقت بیان کی۔ جب سختی سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا اور اسے حراست میں لے لیا گیا۔

وہ اس روز تنہا بیٹھا تھا۔ چائے بھی اس نے اپنے
لیے خود ہی بنائی تھی مگر اس کی نظریں دیوار پر لگی اس تصویر پر
ٹکی ہوئی تھیں جس میں فرزانہ اس کے ساتھ کھڑی تھی۔
فرزانہ اس کی سوتیلی بہن تھی۔ اُصولی طور پر تو اسے اپنی بہن
سے محبت ہونی چاہیے تھی، چاہے سوتیلی ہی سہی مگر اسے
فرزانہ سے حد درجہ نفرت تھی۔ اس کی شاید ایک وجہ بانو بیگم

دام

اے۔ آر راجپوت

رشتے وائلن کے تاروں کے مانند ہوتے ہیں... ایک دوسرے سے
منسلک... جڑے ہوئے سُروں سے بھرے ہوئے... تاروں کی لرزش
ٹھوس چٹانوں کے پرخچے اڑا سکتی ہے... مگر وہ بہت ہی نامراد
اور بدقسمت شخص تھا... جو رشتوں کو باندھ کے رکھنے کے
بجائے توڑنا جانتا تھا...

نفرت ولالچ کے دام میں سب کچھ تمام کر دینے والے بازی گر کا انجام.....
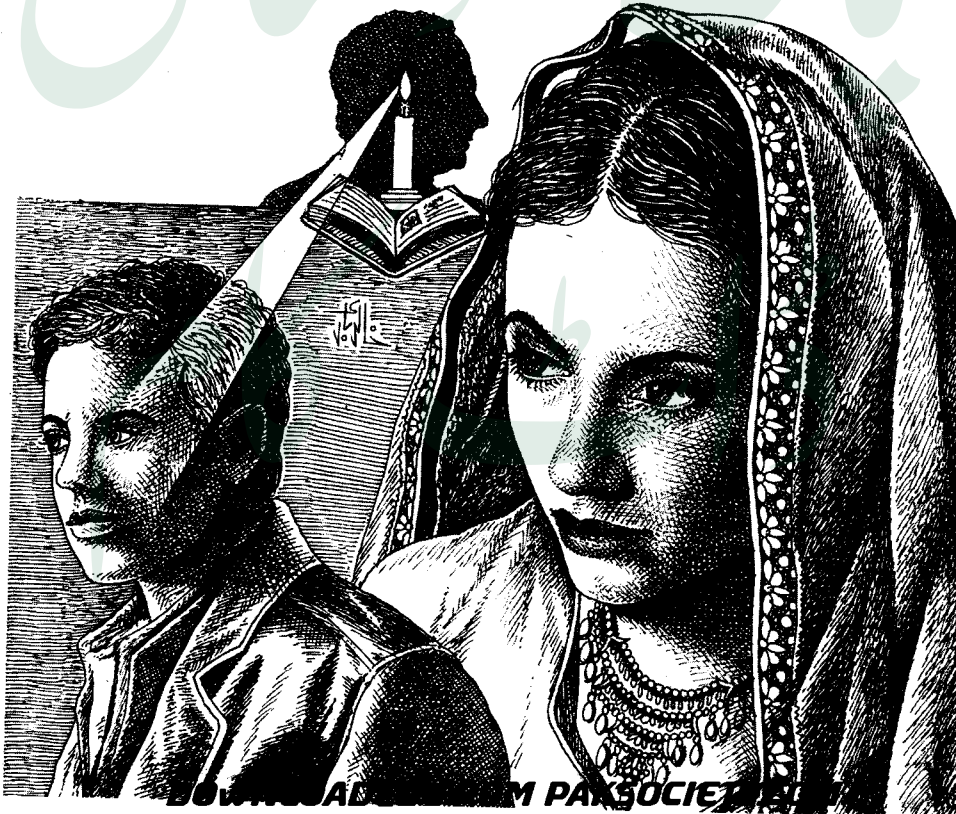
رہی ہو جس نے سوتیلی ماں کے خلاف اس کے دل میں بچپن سے ہی زہر بھر رکھا تھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب بانو بیگم کی شاہد محمود سے شادی ہوئی تھی۔ وہ بینک میں منیجر تھے۔ بانو بیگم ایک سیدھی سادی خاتون سہی لیکن رقابت کا جذبہ تو ہر انسان میں موجود ہوتا ہی ہے اور کچھ بعید نہیں کہ وہ کب نفرت کا روپ دھار لے......!

تحسین اس کی شادی کے صرف چھ ماہ بعد ہی اس کی سوتن بن کر آگئی۔ بانو بیگم اندر سے گھٹ کر رہ گئی۔ فاطمہ، شاہد کی آفس کولیگ تھی۔ ان کے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔ خاصی خوبصورت تھی۔

بانو نے صبر کا گھونٹ بھر لیا اس شکر کے ساتھ کہ شاہد نے اسے تو نہیں چھوڑا تھا نا......! مگر رقابت کی آگ بانو کو بے چین ضرور کیے رکھتی تھی۔

وقت گزرا...... بانو کے ہاں ایک بیٹا ہوا...... یعنی ریاض اور اس کے بعد اس کی سوکن کے ایک بیٹی ہوئی...... فرزانہ۔

اپنی سوتیلی بہن سے نفرت کی صرف ایک ہی وجہ نہیں تھی۔ ریاض اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا تو اس میں اس کی ماں کے بھرے ہوئے زہر کے علاوہ اس کا اپنا ذاتی مقصد بھی تھا اور دونوں مقاصد ایک جگہ یکجا ہو جائیں تو...... جرم کی آب یاری میں کتنی دیر لگتی ہے۔

ریاض نے اپنی بہن کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں اس کی بے غور اور پُرسوچ نظریں بدستور سامنے دیوار پر لگے پرانے فریم کی اسی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ اس کی اور فرزانہ کے بچپن کی واحد تصویر تھی جس کا کاغذ بھی پیلا زرد پڑ چکا تھا اور ان کے چہرے کے نقوش بھی بہت مدھم ہو چکے تھے۔ اس میں فرزانہ کا چہرہ ڈرا ڈرا سا تھا۔ ریاض اس کی وجہ جانتا تھا۔ کیونکہ وہ اسے بچپن میں بڑا دق کیا کرتا تھا۔ اسے بھی اور اس کی ماں تحسین کو بھی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کو طعنے دیتا تھا جس نے اس کی ماں کے حق پر ڈاکا ڈالا تھا اور اس کی بیٹی فرزانہ کے تو وہ لتے لے ڈالتا تھا۔ وہ اسے بھی اپنے حق پر قابض ہونے کی تشنیع کرتا رہتا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ اپنی بیٹی سے زیادہ محبت کرتا تھا۔

سونے پر سہاگا تو اس وقت ہوا جب شاہد نے یہ وصیت بھی کر ڈالی کہ اس کے مرنے کے بعد دونوں بہن بھائی کو برابر کا ہی حصہ ملے گا، جبکہ ترکے میں ملنے والے حصے میں بہن کا حصہ بھائی کے مقابلے میں نصف ہوتا ہے۔ اس فیصلے نے تو ان دونوں ماں بیٹے کے تن بدن میں رقابت اور نفرت کی آگ کو مزید بھڑکا دیا تھا۔

شاہد محمود نے بھی خوب کمایا تھا اور خوب جوڑا اور جمع کیا تھا۔ بانو بیگم کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا اور وہ اس کا بیٹا ریاض تھا۔

یہی وہ ہتھیار تھا جو بانو بیگم خاموشی سے اپنے شوہر سمیت اس کی لاڈلی بیوی اور بیٹی پر آزمایا کرتی تھی۔ شکایت پر دونوں ماں بیٹا معصوم اور انجان بن جاتے تھے اور پھر شاہد کی غیر موجودگی میں ان دونوں ماں بیٹیوں کو ستایا جاتا۔ تحسین کو بھی اللہ نے غیر معمولی صبر...... سے نواز رکھا تھا اس لیے وہ بھی اب تک دفاعی حد تک خود کو محدود رکھے ہوئے تھی۔

بالخصوص فرزانہ اپنے سوتیلے بھائی ریاض سے ڈری سہمی ہی رہتی تھی۔

وقت نے زقند بھری، وہی ہوا۔ شاہد کے انتقال کے بعد ترکے میں سے فرزانہ کو بھی اتنا ہی کچھ ملا جتنا ریاض کو۔ ماں اس کی فوت ہو چکی تھی۔ اس نے مزید حصے کے لیے بہت شور مچایا تھا کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ الگ ہو گیا۔

فرزانہ کی ماں زندہ تھی تاہم بیمار رہنے لگی تھی۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ شوہر کے پیسے کو سنبھال کے رکھا تھا۔ ایک گھر ترکے میں ملا تھا، اس کی ایک منزل خالی تھی وہاں اس نے فرزانہ کو بوتیک کھول دیا تھا۔ فرزانہ کی شادی بھی کر دی۔ دونوں میاں بیوی یہی کاروبار کرنے لگے۔ کچھ عرصے بعد فرزانہ کی ماں تحسین بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔

ادھر ریاض کی سستی کاہلی اور نکھٹو پن نے وہ سب اس سے چھین لیا جو باپ کی طرف سے اسے ملا تھا۔

چائے کا کپ نصف ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں ہنوز دیوار پر آویزاں اسی فریم پر ٹکی ہوئی تھیں۔

ریاض نے کئی بار اس تصویر کو یہاں سے ہٹانا چاہا تھا...... لیکن جانے کیا بات تھی کہ وہ ایسا نہیں کر پاتا، شاید وہ اسے ہر روز تنہائی میں دیکھ کر یکسوئی کے ساتھ اسے قتل کرنے کے مختلف منصوبوں پر غور کرتا رہتا تھا۔

گو فرزانہ اب بھی اس سے سہمی رہتی تھی، مگر باوجود اس کے وہ اس پر چھائی ہوئی تھی۔

ان دنوں ریاض کی حالت بہت ابتر تھی۔ کاہلی اور غیر ذمے داری کے باعث اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ دوسری ملازمت کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا، کیونکہ مفت کی تنخواہ دینے پر فی زمانہ کوئی بھی آمادہ نہیں

تھا۔

تاہم ایک بات یہ بھی تھی کہ جب نوبت فاقوں تک پہنچی تو فرزانہ نے ہی اس بُرے وقت میں اسے سہارا دیا۔ وہ ریاض کو ایک تنگ و تاریک کابک نما فلیٹ سے اپنے گھر لے آئی۔ وہ اسے اب بھی اپنا بھائی سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ تو غیروں کو بھائی بہن بنا لیتے ہیں، یہ تو پھر بھی اس کے باپ کا ہی خون تھا۔ یوں بھی ان کا رشتہ ماں کے حوالے سے سوتیلا تھا، باپ کے حوالے سے نہیں۔ فرزانہ کی یہی سوچ تھی جس میں اس کی اپنی ماں تحسین کی اچھی تربیت کا بھی دخل تھا۔

ماں باپ کے انتقال کے بعد یوں بھی دونوں بہن بھائی دنیا میں اکیلے رہ گئے تھے، کیونکہ قسمت نے فرزانہ کو بھی ماں کے انتقال کے بعد ایک زبردست دھچکا پہنچایا تھا کہ اس کے شوہر کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ناگہانی انتقال ہو گیا۔

اب ریاض اپنی سوتیلی بہن کے ساتھ تو رہنے لگا تھا مگر وہ خود کو یہاں نوکروں کی طرح ہی سمجھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرزانہ اپنے بوتیک میں معروف رہتی تھی اور باہر کے کام بشمول بوتیک کے دیگر ایسے معاملات جن میں ایک مرد کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سارے ریاض دیکھا کرتا تھا۔ اس نکھٹو اور سست نے کیا کام کرنا تھا۔ اُلٹا بگاڑ کر رکھ دیتا۔ ادھر فرزانہ بھی بیمار رہنے لگی تھی۔ اسے چیسٹ کا آئے روز مسئلہ رہنے لگا تھا۔ معمولی کھانسی کبھی شدت اختیار کر لیتی تھی تو کبھی نمونیا کی صورت اختیار کر لیتی۔ ڈاکٹروں نے الرجی بتایا تھا۔ یوں وہ اب اپنے بوتیک سے زیادہ گھر (اُوپری منزل) میں وقت گزارنے لگی، نتیجہ یہ نکلا کہ بوتیک کا کاروبار متاثر ہونے لگا۔ ریاض خود یہی چاہتا تھا کہ یہ بند ہو جائے، وہ اس کا اکثر فرزانہ کو مشورہ بھی دیا کرتا تھا کہ بوتیک کو بند کر کے نچلی منزل کرائے پر دے دی جائے۔ آخر کار یہی ہوتا نظر آنے لگا لیکن فرزانہ بھی ضد کی پکی تھی، اس نے ایسا نہیں کیا۔

ریاض کو رہنے، کھانے پینے اور لگے بندھے ملنے والے ماہانہ خرچے کی طرف سے کوئی فکر نہ تھی۔ مگر ریاض کی اس رقابت اور نفرت کو کیا کہا جائے جو شروع ہی سے اس کے دل میں اپنی بہن کے لیے ایک آتشِ انتقام کی صورت بھڑکتی رہتی تھی۔ فرزانہ پیسوں کو دانتوں میں دبا کر خرچ کرتی تھی۔ ریاض کی عیاشیوں کے لیے یہ سب کافی نہ تھا۔ اسے اضافی پیسوں کی ضرورت ہر وقت پڑتی رہتی تھی۔ جو اسے نہیں ملتے تھے۔

وہ بھی مجبور تھا اور اسی پر گزارا کیے ہوئے تھا، مگر غلط یہ بھی نہ تھا کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب وہ اپنی سوتیلی بہن کو قتل کر کے اس کی ہر شے پر قابض ہونے کے خواب نہ دیکھتا ہو۔ اس کے خیال میں فرزانہ نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ وہ شروع ہی سے ڈرپوک تھی۔ تنہا ہو جانے کے بعد اسے کسی ''اپنے'' کی ضرورت پیش آئی تو وہ اسے اپنے گھر لے آئی تھی اور ریاض بھی اسی میں خوش تھا کہ اس طرح اسے بہ آسانی اپنے ''منصوبے'' کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملتا رہے گا۔

فرزانہ اب اس پر باقاعدہ حکم چلانے لگی تھی۔

''بہت خوب! تم یہاں آرام سے اپنے لیے چائے بنا کر پی رہے ہو اور مجھے پوچھا تک نہیں۔''

اچانک ۔۔۔۔ آواز سن کر اس کے سینے میں چھپی ہوئی آتشِ انتقام بھڑک جاتی تھی، وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ دروازے پر ۔۔۔۔۔۔ فرزانہ کھڑی تھی۔ ایک سیاسی پارٹی کی جانب سے دو روز کی ہڑتال کے باعث بوتیک بند تھا اور دونوں بہن بھائی گھر پر ہی تھے۔

''میں دودھ کے انتظار میں بیٹھی تھی اور تم یہاں مزے اُڑا رہے ہو۔ میرے لیے بھی چائے بنا لیتے ایک کپ، کیا میں گھر پر موجود نہیں تھی؟''

''دودھ تھوڑا تھا۔'' ریاض نے مختصر جواب دیا۔

''ہاں تو لے آؤ نیچے سے جا کر، پہلوان نیازی تو ہڑتال والے دن بھی اپنی دکان کو آدھا شٹر ڈالے کھولے رکھتا ہے۔ ذرا جلدی چلے جاؤ، دودھ ختم ہوتے ہی وہ چلا جائے گا۔''

ریاض ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے فرزانہ کو دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا جو کچن کی طرف کھلتا تھا۔ فرزانہ آج کل اسے اسی طرح طنز کا نشانہ بنایا کرتی تھی جیسے اپنا کوئی پرانا بدلہ چکانا چاہ رہی ہو۔

ریاض کو غصہ بھی آتا تھا مگر وہ ضبط کرنے پر مجبور تھا، جانتا تھا کہ اگر اس نے بہن کے سامنے زبان کھولی یا اسے دراز کیا تو یہ سب اس سے چھن جائے گا اور اب تو اس کے پاس فٹ پاتھ پر رہنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ ہوگا۔

کچن میں آ کر اس نے ڈول اُٹھایا اور خاموشی سے باہر گلی میں آ گیا۔ نیازی دودھ والے کے پاس پہنچ کر اس نے دودھ مانگا مگر دودھ ختم ہو گیا تھا۔

فرزانہ آج کل بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ شاید اسی لیے اس کا مزاج بھی چڑچڑا ہونے لگا تھا۔ اُسے پہلے فلو ہوا تھا، عدم توجہی کے باعث وہ بگڑ کر نمونیا میں بدل گیا۔ علاج ہوا تب جا کر اس کی حالت کچھ سنبھلی تھی مگر اب پہلے سے وہ کچھ کمزور ہو گئی تھی۔

''ملک پیک پڑا ہے، وہی لے جاؤ آج......'' فرہی مائل نیازی نے مسکراتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔'' آج ہڑتال کی وجہ سے رش تھا اسی لیے دودھ جلدی ختم ہو گیا۔ یہ ملک پیک بھی آخری بچا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی......''

''ہاں...... ہاں! ٹھیک ہے نیازی بھائی! ملک پیک ہی دے دو۔'' ریاض نے فرزانہ کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے فوراً کہا۔

''ویسے اب باجی فرزانہ کی طبیعت کیسی ہے؟ کل وہ خود دودھ لینے آئی تھیں تو خاصی بیمار لگ رہی تھیں؟'' نیازی نے ملک پیک کو شاپر میں ڈال کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں! کچھ بیمار تو ہیں۔'' ریاض نے پیسے تھمائے اور مڑا۔ گھر کی اُوپری منزل کے دروازے پر پہنچا تو پائدان سکڑا ہوا پایا۔ شاید اس کا پاؤں اُلجھنے سے وہ سکڑ گیا تھا۔ اس طرح وہ تھوڑا سا پھٹ کر مزید خطرناک ہو گیا تھا، کسی کا بھی پاؤں اُلجھ سکتا تھا۔ فرزانہ اسے ہمیشہ تنبیہ کرتی تھی کہ دھیان سے آیا جایا کرو، یہ پائدان میرے پیروں سے بھی اٹک سکتا ہے۔ سامنے ہی تو سیڑھیاں ہیں۔ جلدی میں ہوتی ہوں اور اپنے دھیان میں بھی، کہیں نیچے ہی نہ جا گروں......''

''اسی مبارک دن کے تو انتظار میں ہوں میں......'' ریاض .... دل میں کہتا اور منہ پر فدویانہ انداز اختیار کر لیتا۔

''میں آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''خیال نہیں فوراً نیا خرید و۔'' وہ تنک کر تحکمانہ انداز میں کہتی۔

''بہتر۔'' ریاض کہتا۔ جبکہ دل میں کہتا۔ ''ہُنہ...... یہ اوقات رہ گئی ہے میری کہ اتنی چیپ چیزیں بھی میں ہی خرید کر لاؤں۔''

فرزانہ واقعی آج کل بیمار رہنے لگی تھی۔ زیادہ تر گھر میں ہی رہتی۔ بوتیک اس نے ریاض کے حوالے کر رکھا تھا۔ ریاض نے بھی اب یہ بات سمجھ لی تھی کہ جو بھی اسے ملنے والا ہے اُسے اب اس نے یوں ہی نہیں اُڑ دینا ہے، ورنہ وہی حالات ہو جائیں گے جو پہلے تھے، جب وہ تنگ دستی کے باعث خودکشی کے بارے میں غور کرنے لگا تھا۔ وہ سمجھتا تھا اب تقدیر نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا ہے تو وہ بھی سنبھل کر ہی چلے گا۔

کمرے میں داخل ہوا تو اس نے فرزانہ کو سامنے بیڈ پر بیٹھے دیکھا۔ اسے دیکھ کر ریاض کا خون کھول اُٹھتا تھا۔ عجیب سا حلیہ بنا رکھا تھا اس نے۔ بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے، استری سے بے نیاز مسلا ہوا لباس، وہ بھی میلا سا نظر آتا تھا۔

''تم اس طرح مجھے گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

''اوہ...... ا کک...... کچھ نہیں۔'' ریاض کچھ گڑبڑا سا گیا اور اسی لہجے میں جواباً بولا۔

''دودھ یہاں رکھ دو۔ نو بج رہے ہیں اور اب میں سونا چاہتی ہوں۔''

''کیا تم نے دوا پی لی ہے؟'' ریاض نے اپنے لہجے میں ہمدردی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''اس سلسلے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ دوا میں خود ہی لے لوں گی۔'' فرزانہ خشک لہجے میں کہتی ہوئی اُٹھی اور بیڈ کے قریب دیوار گیر الماری کھولنے لگی۔

''اب تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ شاید سوچ رہے ہو کہ میں غلطی سے مقررہ مقدار سے زیادہ دوا استعمال کر لوں گی۔''

اس نے الماری سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ گلاس میں دودھ اُنڈیل کر شیشی میں سے گولی نکال کر دودھ میں ڈال دی۔ ریاض اب بھی دروازے کے قریب کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بس! اب تم جاؤ۔ میں اپنے کام خود ہی کر لوں گی۔'' فرزانہ نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

ریاض خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ فرزانہ بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے باہر آ کر زینے کی لینڈنگ پر لگے ہوئے واش بیسن کی طرف بڑھ گئی۔ ریاض جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دودھ کے گلاس میں پانی کی دھار گرنے کی آواز صاف سنی تھی۔ فرزانہ نے یہاں واٹر فلٹر لگا رکھا تھا اور دوا کے لیے اکثر پانی ادھر سے ہی ڈال کر پیتی تھی۔ رکھا ہوا پانی اس نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ بس ایک عادت تھی اس کی۔ برف یا فریج کا ٹھنڈا پانی پینے کی تو اسے گرمیوں میں بھی ڈاکٹروں کی طرف سے ممانعت

تھی۔

"ریاض......! یہاں کا بلب فیوز ہو چکا ہے۔"

معاً اسے باہر سے فرزانہ کی آواز سنائی دی لیکن وہ جواب میں خاموش ہی رہا۔ اگر لینڈنگ کا بلب فیوز ہو گیا تھا تو اس میں ریاض کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ اسے پیسے دے کر نیا بلب لانے کو بھی کہہ سکتی تھی۔ لیکن ریاض جانتا تھا کہ وہ خود سے پیسے کبھی نہیں دے گی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ ریاض اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور ریاض نے طے کرلیا تھا کہ اب وہ اپنی انا کو مجروح نہیں ہونے دے گا۔ اس کے ساتھ ہی بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال ریاض کے ذہن میں لپکا تھا۔ اس کا احساس اسے خود فرزانہ نے ہی دلایا تھا۔ فرزانہ ان دنوں جو گولیاں استعمال کر رہی تھی، ان کے بارے میں ڈاکٹر نے بڑی سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک گولی استعمال کرے۔ زیادہ استعمال کی صورت میں سانس کی نالی سمیت پھیپھڑوں میں عملِ تنفس برقرار رکھنے والی باریک دھاگے جیسی نلکیاں تک سکڑ جانے کا خطرہ ہوتا تھا۔ جس کے باعث فوراً موت واقع ہو جاتی تھی۔ یوں تو دوا کوئی بھی ہو "اوورڈوز" خطرے کا ہی سبب بنتی تھی مگر اس مخصوص دوا کا غلط استعمال تو تھا ہی خطرناک اور فوری طور پر جان لیوا بھی...... وہ مخصوص گولیاں پانی یا دودھ میں حل پذیر ہونے والی تھیں مگر انہیں دودھ ملے پانی میں ہی ڈال کر استعمال کیا جاتا تھا۔

ریاض نے اس دوا کا لٹریچر اچھی طرح پڑھا تھا۔ جو ڈبیا کے اندر ہی موجود تھا۔ ذہن تو اس کا شیطانی کارخانہ تھا ہی اور آج کل یوں بھی وہ فرزانہ کو قتل کرنے کے منصوبوں پر بھی غور کر رہا تھا۔ اس نے اضافی گولیاں خرید لی تھیں۔ تاکہ فرزانہ کو شیشی میں گولیوں کی کمی کا پتا نہ چل سکے اور وہ کسی شبہے میں نہ مبتلا ہو جائے۔

اب ریاض بستر میں لیٹے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر ایک وقت میں یہ مخصوص قسم کی تین چار گولیاں استعمال کرلے تو ساری مشکلیں حل ہو جائیں گی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ فرزانہ کو مقررہ خوراک سے زیادہ گولیاں استعمال کرنے پر کس طرح مجبور کیا جائے۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ فرزانہ اس پر اعتماد نہیں کرتی اور آدھے گلاس دودھ میں اپنے ہاتھ سے ایک گولی ڈالتی تھی۔ باقی آدھا گلاس وہ پانی سے بھر لیتی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ دودھ کی پوری بوتل میں گولیاں ملا دی جائیں، لیکن اس میں ایک قباحت یہ تھی کہ بچا کر رکھے جانے والے آدھے دودھ سے صبح کی چائے نہیں بنا سکتا تھا اور نہ ہی اسے

لطیفہ

ایک سردار گاڑی کے نیچے آتا آتا بچ گیا اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر رونے لگا۔ لوگوں نے کہا تم تو بچ گئے ہو اب کیوں روتے ہو۔

سردار نے کہا گاڑی کے پیچھے لکھا ہوا تھا۔ "پریشان نہ تھی میں ول آساں"

باہر کہیں گرایا جاسکتا تھا کیونکہ اس طرح وہ ماسی اس پر شبہ کرنے لگتی جسے مستقلاً فرزانہ نے اپنے پاس ہی رکھا ہوا تھا اور وہ نیچے کھلے صحن میں سویا کرتی تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر اور دبنگ عورت تھی۔ لیاری سے اس کا تعلق تھا اور شاید فرزانہ نے بھی اسے ریاض کی طرف سے "ہوشیار" رہنے کی خفیہ ہدایت کر رکھی تھی۔ کیونکہ وہ بھی اسے اکثر شک بھری نگاہوں سے گھورتی رہتی تھی۔ ماسی امیراں ایک بیوہ خاتون تھی۔ وہ ایک طرح بوتیک کی چوکیداری بھی کرتی تھی۔

صبح سو کر اٹھا تو ریاض کے دماغ میں کچھ تازگی کا احساس جاگا۔ وہ ایک بار پھر فرزانہ سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ بالآخر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آہی گئی۔ فرزانہ کے کمرے کی صفائی امیراں کیا کرتی تھی، وہ جیسے ہی اس کے کمرے میں داخل ہوئی، ریاض اپنے کمرے سے نکل کر واش بیسن کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے جیب سے وہ گولیاں نکالیں اور انہیں بڑی احتیاط سے باریک ٹیپ کی مدد سے نل کے اندر چپکا دیا، پھر گلاس نیچے رکھ کر نل کھول دیا۔ نتیجہ خاطرخواہ برآمد ہوا۔ تینوں گولیاں پانی کے ساتھ حل ہو کر گلاس میں پہنچ چکی تھیں۔ نل کے اندر ٹیپ نکالنے میں اسے چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

اس تجربے کی کامیابی پر اس کے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ ابھری تھی۔ اسے علم تھا کہ فرزانہ جو گولیاں استعمال کرتی تھی، وہ بھی حل پذیر تھیں۔ تین چار گولیاں فرزانہ کا خاتمہ کردیں گی اور اس پر شبہ بھی کوئی نہیں کر سکے گا۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ فرزانہ طویل عرصے سے بیمار تھی اور اکثر مایوسی کی باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کی موت سے یہ بھی سمجھا جاسکتا تھا کہ اس نے آئے روز کی بیماری سے تنگ آکر دوا کی زیادہ خوراک استعمال کرکے خودکشی کرلی تھی۔

☆☆☆

ریاض نے اپنی سوتیلی بہن فرزانہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس پر اب تک بڑی کامیابی سے عمل ہوا تھا۔ فرزانہ کی زندگی گویا اب اس کی مٹھی میں تھی۔ وہ بڑی آسانی سے اسے راستے سے ہٹا سکتا تھا۔ جب

فرزانہ آج کل بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ شاید اسی لیے اس کا مزاج بھی چڑچڑا ہونے لگا تھا۔ اُسے پہلے فلو ہوا تھا، عدم توجہی کے باعث وہ بگڑ کر نمونیا میں بدل گیا۔ علاج ہوا تب جا کر اس کی حالت کچھ سنبھلی تھی مگر اب پہلے سے وہ کچھ کمزور ہوگئی تھی۔

''ملک پیک پڑا ہے، وہی لے جاؤ آج......'' فربہی مائل نیازی نے مسکراتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔ ''آج ہڑتال کی وجہ سے رش تھا اسی لیے دودھ جلدی ختم ہوگیا۔ یہ ملک پیک بھی آخری بچا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی......''

''ہاں...... ہاں! ٹھیک ہے نیازی بھائی! ملک پیک ہی دے دو۔'' ریاض نے فرزانہ کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے فوراً کہا۔

''ویسے اب باجی فرزانہ کی طبیعت کیسی ہے؟ کل وہ خود دودھ لینے آئی تھیں تو خاصی بیمار لگ رہی تھیں؟'' نیازی نے ملک پیک کو شاپر میں ڈال کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں! کچھ بیمار تو ہیں۔'' ریاض نے پیسے تھمائے اور مڑا۔ گھر کی اُوپری منزل کے دروازے پر پہنچا تو پائدان سکڑا ہوا پایا۔ شاید اس کا پاؤں اُلجھنے سے وہ سکڑ گیا تھا۔ اس طرح وہ تھوڑا سا پھٹ کر مزید خطرناک ہوگیا تھا، کسی کا بھی پاؤں اُلجھ سکتا تھا۔ فرزانہ اسے ہمیشہ تنبیہ کرتی تھی کہ دھیان سے آیا جایا کرو، یہ پائدان میرے پیروں سے بھی اٹک سکتا ہے۔ سامنے ہی تو سیڑھیاں ہیں۔ جلدی میں ہوتی ہوں اور اپنے دھیان میں بھی، کہیں نیچے ہی نہ جا گروں......''

''اسی مبارک دن کے تو انتظار میں ہوں میں......'' ریاض...... دل میں کہتا اور منہ پر فدویانہ انداز اختیار کر لیتا۔

''میں آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''خیال نہیں فوراً نیا خریدو۔'' وہ تنک کر تحکمانہ انداز میں کہتی۔

''بہتر۔'' ریاض کہتا۔ جبکہ دل میں کہتا۔ ''ہُنہ...... یہ اوقات رہ گئی ہے میری کہ اتنی چیپ چیزیں بھی میں ہی خرید کر لاؤں۔''

فرزانہ واقعی آج کل بیمار رہنے لگی تھی۔ زیادہ تر گھر میں ہی رہتی۔ بوتیک اس نے ریاض کے حوالے کر رکھا تھا۔ ریاض نے بھی اب یہ بات سمجھ لی تھی کہ جو بھی اسے ملنے والا ہے اُسے اب اس نے یوں ہی نہیں اُڑ دینا ہے، ورنہ وہی حالات ہو جائیں گے جو پہلے تھے، جب وہ تنگ دستی کے باعث خودکشی کے بارے میں غور کرنے لگا تھا۔ وہ سمجھتا تھا اب تقدیر نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا ہے تو وہ بھی سنبھل کر ہی چلے گا۔

کمرے میں داخل ہوا تو اس نے فرزانہ کو سامنے بیڈ پر بیٹھے دیکھا۔ اسے دیکھ کر ریاض کا خون کھول اُٹھتا تھا۔ عجیب سا حلیہ بنا رکھا تھا اس نے۔ بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے، استری سے بے نیاز مسلا ہوا لباس، وہ بھی میلا سا نظر آتا تھا۔

''تم اس طرح مجھے گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

''اوہ...... ! کک...... کچھ نہیں۔'' ریاض کچھ گڑبڑا سا گیا اور اسی لہجے میں جواباً بولا۔

''دودھ یہاں رکھ دو۔ نو بج رہے ہیں اور اب میں سونا چاہتی ہوں۔''

''کیا تم نے دوا پی لی ہے؟'' ریاض نے اپنے لہجے میں ہمدردی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''اس سلسلے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ دوائیں خود ہی لے لوں گی۔'' فرزانہ خشک لہجے میں کہتی ہوئی اُٹھی اور بیڈ کے قریب دیوار گیر الماری کھولنے لگی۔

''اب تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ شاید سوچ رہے ہو کہ میں غلطی سے مقررہ مقدار سے زیادہ دوا استعمال کر لوں گی۔''

اس نے الماری سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ گلاس میں دودھ اُنڈیل کر شیشی میں سے گولی نکال کر دودھ میں ڈال دی۔ ریاض اب بھی دروازے کے قریب کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بس! اب تم جاؤ۔ میں اپنے کام خود ہی کر لوں گی۔'' فرزانہ نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

ریاض خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ فرزانہ بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے باہر آ کر زینے کی لینڈنگ پر لگے ہوئے واش بیسن کی طرف بڑھ گئی۔ ریاض جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دودھ کے گلاس میں پانی کی دھار گرنے کی آواز صاف سنی تھی۔ فرزانہ نے یہاں واٹر فلٹر لگا رکھا تھا اور دوا کے لیے اکثر پانی ادھر سے ہی ڈال کر پیتی تھی۔ رکھا ہوا پانی اس نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ بس ایک عادت تھی اس کی۔ برف یا فریج کا ٹھنڈا پانی پینے کی تو اسے گرمیوں میں بھی ڈاکٹروں کی طرف سے ممانعت

تھی۔

"ریاض......! یہاں کا بلب فیوز ہو چکا ہے۔"

معاً اسے باہر سے فرزانہ کی آواز سنائی دی لیکن وہ جواب میں خاموش ہی رہا۔ اگر لینڈنگ کا بلب فیوز ہو گیا تھا تو اس میں ریاض کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ اسے پیسے دے کر نیا بلب لانے کو بھی کہہ سکتی تھی۔ لیکن ریاض جانتا تھا کہ وہ خود سے پیسے کبھی نہیں دے گی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ ریاض اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور ریاض نے طے کرلیا تھا کہ اب وہ اپنی انا کو مجروح نہیں ہونے دے گا۔ اس کے ساتھ ہی بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال ریاض کے ذہن میں لپکا تھا۔ اس کا احساس اسے خود فرزانہ نے ہی دلایا تھا۔ فرزانہ ان دنوں جو گولیاں استعمال کر رہی تھی، ان کے بارے میں ڈاکٹر نے بڑی سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک گولی استعمال کرے۔ زیادہ استعمال کی صورت میں سانس کی نالی سمیت پھیپھڑوں میں عملِ تنفس برقرار رکھنے والی باریک دھاگے جیسی نلکیاں تک سکڑ جانے کا خطرہ ہوتا تھا۔ جس کے باعث فوراً موت واقع ہو جاتی تھی۔ یوں تو دوا کوئی بھی ہو "اوور ڈوز" خطرے کا ہی سبب بنتی تھی مگر اس مخصوص دوا کا غلط استعمال تو تھا ہی خطرناک اور فوری طور پر جان لیوا بھی...... وہ مخصوص گولیاں پانی یا دودھ میں حل پذیر ہونے والی تھیں مگر انہیں دودھ ملے پانی میں ہی ڈال کر استعمال کیا جاتا تھا۔

ریاض نے اس دوا کا لٹریچر اچھی طرح پڑھا تھا۔ جو ڈبیا کے اندر ہی موجود تھا۔ ذہن تو اس کا شیطانی کارخانہ تھا ہی اور آج کل یوں بھی وہ فرزانہ کو قتل کرنے کے منصوبوں پر بھی غور کر رہا تھا۔ اس نے اضافی گولیاں خرید لی تھیں۔ تاکہ فرزانہ کو شیشی میں گولیوں کی کمی کا پتا نہ چل سکے اور وہ کسی شبہے میں نہ مبتلا ہو جائے۔

اب ریاض بستر میں لیٹے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر ایک وقت میں یہ مخصوص قسم کی تین چار گولیاں استعمال کر لے تو ساری مشکلیں حل ہو جائیں گی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ فرزانہ کو مقررہ خوراک سے زیادہ گولیاں استعمال کرنے پر کس طرح مجبور کیا جائے۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ فرزانہ اس پر اعتماد نہیں کرتی اور آدھے گلاس دودھ میں اپنے ہاتھ سے ایک گولی ڈالتی تھی۔ باقی آدھا گلاس وہ پانی سے بھر لیتی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ دودھ کی پوری بوتل میں گولیاں ملا دی جائیں، لیکن اس میں ایک قباحت یہ تھی کہ بچا کر رکھے جانے والے آدھے دودھ سے صبح کی چائے نہیں بنا سکتا تھا اور نہ ہی اسے

لطیفہ

ایک سردار گاڑی کے نیچے آتا آتا بچ گیا اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر رونے لگا۔ لوگوں نے کہا تم تو بچ گئے ہو اب کیوں روتے ہو۔

سردار نے کہا گاڑی کے پیچھے لکھا ہوا تھا۔ "پریشان نہ تھی میں دل آساں۔"

باہر کہیں گرایا جاسکتا تھا کیونکہ اس طرح وہ ماسی اس پر شبہ کرنے لگتی جسے مستقلاً فرزانہ نے اپنے پاس ہی رکھا ہوا تھا اور وہ نیچے کھلے صحن میں سویا کرتی تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر اور دبنگ عورت تھی۔ لیاری سے اس کا تعلق تھا اور شاید فرزانہ نے بھی اسے ریاض کی طرف سے "ہوشیار" رہنے کی خفیہ ہدایت کر رکھی تھی۔ کیونکہ وہ بھی اسے اکثر شک بھری نگاہوں سے گھورتی رہتی تھی۔ ماسی امیراں ایک بیوہ خاتون تھی۔ وہ ایک طرح بوتیک کی چوکیداری بھی کرتی تھی۔

صبح سو کر اٹھا تو ریاض کے دماغ میں کچھ تازگی کا احساس جاگا۔ وہ ایک بار پھر فرزانہ سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ بالآخر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آ ہی گئی۔ فرزانہ کے کمرے کی صفائی امیراں کیا کرتی تھی، وہ جیسے ہی اس کے کمرے میں داخل ہوئی، ریاض اپنے کمرے سے نکل کر واش بیسن کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے جیب سے وہ گولیاں نکالیں اور انہیں بڑی احتیاط سے باریک ٹیپ کی مدد سے نل کے اندر چپکا دیا، پھر گلاس نیچے رکھ کر نل کھول دیا۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ تینوں گولیاں پانی کے ساتھ حل ہو کر گلاس میں پہنچ چکی تھیں۔ نل کے اندر ٹیپ نکالنے میں اسے چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

اس تجربے کی کامیابی پر اس کے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ ابھری تھی۔ اسے علم تھا کہ فرزانہ جو گولیاں استعمال کرتی تھی، وہ بھی حل پذیر تھیں۔ تین چار گولیاں فرزانہ کا خاتمہ کر دیں گی اور اس پر شبہ بھی کوئی نہیں کر سکے گا۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ فرزانہ طویل عرصے سے بیمار تھی اور اکثر مایوسی کی باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کی موت سے یہ بھی سمجھا جاسکتا تھا کہ اس نے آئے روز کی بیماری سے تنگ آ کر دوا کی زیادہ خوراک استعمال کر کے خودکشی کر لی تھی۔

☆☆☆

ریاض نے اپنی سوتیلی بہن فرزانہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس پر اب تک بڑی کامیابی سے عمل ہوا تھا۔ فرزانہ کی زندگی گویا اب اس کی مٹھی میں تھی۔ وہ بڑی آسانی سے اسے راستے سے ہٹا سکتا تھا۔ جب

سے اس نے گولیاں حاصل کی تھیں، اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔ لیکن وہ بڑی خوبصورتی سے اپنی کیفیت پر قابو پائے ہوئے تھا۔ اگر فرزانہ کو معمولی سا بھی شبہ ہوجاتا تو اس کی اب تک کی محنت پر پانی پھر سکتا تھا۔ وہ تصور میں خود کو اس بڑے گھر کا مالک سمجھنے لگا تھا اور بینک بیلنس بھی اسے اب اپنی جیب میں جاتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ فرزانہ کے مرنے کے بعد وہ سب سے پہلے اس مردم مار عورت یعنی ماسی امیراں کو یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلتا کرے گا اس کے بعد نچلی منزل کرائے پر چڑھا کر باقی زندگی آرام اور عیش سے بتائے گا۔

فرزانہ کی زندگی لگے بندھے اُصولوں پر گزر رہی تھی۔ وہ کبھی سیر و تفریح کے لیے گھر سے باہر نہیں جاتی تھی۔ صبح کے ناشتے کے بعد برائے نام نیچے بوتیک کا چکر لگاتی۔ معاملات دیکھتی، ریاض اور ملازمین کو چند ہدایات دینے کے بعد اُوپر آجاتی تھی۔

جس روز ریاض نے گولیاں حاصل کی تھیں اس کے دوسرے روز وہ اپنے بیڈ پر جاگتی آنکھوں سے اپنے سہانے مستقبل کے متعلق یہی خواب دیکھ رہا تھا کہ فرزانہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''میں نے تمہیں راہداری کی صفائی کے لیے کہا تھا۔'' اس نے ریاض کو گھور کے کہا۔

''میں تمہارے حکم کی تعمیل کر چکا ہوں۔'' ریاض نے خشک لہجے میں کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولا۔ ''میں ابھی تمہیں یہ بتانے والا تھا کہ آج میں باہر جانا چاہتا ہوں۔''

''باہر کیوں جانا چاہتے ہو؟'' فرزانہ نے پھر اسے گھورا۔

''یونہی، تفریح کے لیے...... دن بھر ایک ہی جیسے لگے بندھے کام کر کر کے میں اُکتانے لگا ہوں، اور آج موسم ویسے بھی اچھا ہے۔'' ریاض نے جواب میں کہا۔

''اچھا!'' فرزانہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''باہر تو سردی پڑ رہی ہے اور تم اسے اچھا موسم کہہ رہے ہو۔''

''مجھے ایسا ہی موسم پسند ہے، یوں بھی باہر جانے کا ایک بہانہ ہی سہی۔'' ریاض نے کہا۔ فرزانہ چند ثانیے کے لیے کچھ سوچتی رہی، پھر بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ مگر ذرا نیچے بوتیک کا چکر بھی لگاتے جانا، کوئی مسئلہ تو نہیں ہے، میں بھی تھوڑی دیر میں تیار وغیرہ ہو کے آتی ہوں، اور ہاں...... ! دودھ لینے کے وقت سے پہلے آجانا ورنہ نہیں ملے گا اور مجھے دوائی ہر صورت میں کھانی ہوتی ہے۔''

☆☆☆

زینے کے اختتام پر اسے امیراں مل گئی۔ وہ رک گیا اور اس سے رُکھائی سے بولا۔ ''میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔''

''بی بی جی کو بتا دیا ہے ناں......؟'' امیراں نے اسے گھاگ نگاہوں سے تاڑتے ہوئے پوچھا۔ ریاض کو غصہ تو آیا کہ وہ اس ''کمچی'' کو اپنی اوقات میں رہنے کا کوئی سخت جواب دے جواب اس پر بھی حکم چلانے لگی تھی۔ مگر اس دوران اسے اپنی بھی یہاں اوقات کا احساس ہوا اور وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر بوتیک میں آگیا۔ وہاں چند منٹ گزارنے کے بعد وہ نکل گیا۔

☆☆☆

اس نے اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ اس نے سب کچھ سوچ لیا تھا۔ باہر تازہ اور سرد ہوا کے جھونکوں نے اسے فرحت انگیزی کا احساس دلایا۔ آج پہلی بار وہ خود کو آزاد اور مسرور دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک قریبی پارک کی جانب بڑھ گیا تھا۔ تفریح کا تو محض بہانہ تھا۔ وہ تو اپنے منصوبے پر عمل کر رہا تھا۔ اسی لیے زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ قریب ہی کے ایک پارک میں چوبی بینچ پر بیٹھا چائے سموسے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دودھ لانے کی اس کی ذمے داری تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دودھ والے کی دکان پر وہ اس وقت پہنچے گا جب وہ بند ہونے والی ہوگی۔ دکان دار نیازی سے کہے گا کہ وہ دودھ کا شاپر گھر بھجوا دے، محلے کی ہی دکان تھی۔ پھر وہ دکان پر بیٹھ کر تھوڑی دیر اس کے مالک سے حالاتِ دوراں پر گفتگو کرے گا، نیازی بھی ذرا ہنسوڑ اور پُر گو تھا۔ اسے بھی وہ اپنے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے ''پیالہ ریسٹورنٹ'' لے جائے گا۔ جہاں کی کشمیری چائے بڑی مشہور ہوتی تھی۔ وہاں انواع و اقسام کی چائے ملا کرتی تھی اور صرف چائے کا ہی اسپیشل خاص ہوٹل تھا وہ...... یہ سب وہ ایسے ہی نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ یہ اس کے منصوبے کا حصہ تھا۔

وہ جیسے جیسے سوچتا جا رہا تھا، اس کے منصوبے کی بلاسقم راہ اسے صاف جاتی نظر آ رہی تھی۔ مثلاً...... ٹھیک نو بجے...... نیازی دودھ اس کے گھر بھجوا دے گا۔ امیراں وہ دودھ لے کر اُوپر پہنچ جائے گی۔ پھر آدھا دودھ کا گلاس بھر کے وہ فرزانہ کو دے گی۔ فرزانہ دودھ کے گلاس کو بیڈ سائڈ ٹیبل پر اسی طرح رکھ دے گی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے بیڈ سے اُٹھے گی۔ الماری کی طرف جائے گی۔ گولیوں کی شیشی نکالے گی۔ ایک گولی دودھ کے گلاس میں ڈالے گی

اور حسبِ معمول ٹیرس پر آئے گی۔ دوا کا گلاس وہ ٹیرس پر لگے واش بیسن سے ہی بھرے گی۔ جہاں کا بلب فیوز ہونے کی وجہ سے وہ دوا کا رنگ بدلتا نہیں دیکھ پائے گی اور یوں بھی دودھ ملے پانی میں بھلا کیا پتا چلے گا۔ نل کے اندر باریک ٹیپ سے چپکی ہوئی چار گولیاں گرتے پانی کی دھار سے مکمل گھل کر گلاس میں پہلے سے شامل گولی کی مقدار کو ''اوورڈوز'' کردیں گی اور یوں فرزانہ اسے پینے کے بعد کبھی نہیں اُٹھ سکے گی۔

اسے یقین تھا، چار اور ایک گولی یعنی پوری پانچ گولیاں...... اس کے بیمار معدے میں پہنچ جائیں گی اور اس کا بیمار وجود اتنی زیادہ مقدار کی گولیوں کے ''وزن'' کو برداشت نہیں کرپائے گا۔

اچانک ایک خیال نے اسے مضطرب سا کردیا۔ وہ سوچنے لگا۔ کیا خبر ایسا کچھ نہ ہو۔ دوا تو دوا ہوتی ہے۔ کوئی زہر تو نہیں ہوتی کہ اتنی جلدی فرزانہ کی موت واقع ہو جائے۔ طبیعت بگڑنے پر اسے اسپتال پہنچادیا جائے اور پھر اس کی زندگی بچ جائے۔

اس خیال نے اس کے بے داغ منصوبے کی دیوار میں دراڑ ڈال دی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ منصوبے کے آخری لمحات میں وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر پہنچا۔

اس کے محتاط اندازے کے مطابق اب تک اس کے منصوبے کی ابتدا ہوچکی تھی یا ہونے والی تھی۔ تیز تیز چلنے کے باعث اس کے ہاتھوں پیروں میں سردی کے باوجود پسینہ آگیا تھا۔ وہ کچھ دنوں سے محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ بھی نزلے کا شکار ہونے لگا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں گیلے ہی رہتے تھے۔ اسے ڈر ہوا کہ کہیں فرزانہ کے ساتھ رہتے رہتے اسے بھی نزلے جیسی الرجی کی شکایت تو نہیں ہوگئی ہے۔ کیونکہ سردیوں میں ہاتھوں اور بالخصوص پیروں میں پسینہ آنے کا یہی مطلب ہوتا ہے۔

وہ گھر پہنچا تو واپس مڑ گیا۔ سوچنے لگا۔ اسے ابھی گھر نہیں جانا چاہیے۔ فرزانہ کی طبیعت بگڑنے پر اس پر بھی شبہ کیا جاسکتا ہے اور اگر اس کا منصوبہ مکمل طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوگیا جس کا ننانوے فیصد اسے یقین تھا۔ تو بھی اس کا گھر پر ہونا مناسب نہ ہوتا۔ تاکہ پولیس یا ڈاکٹر ان کے گھر تک نہیں آجاتی۔ بعد میں اس کے گھر داخل ہونے پر اس کی پوزیشن دودھ کی طرح اُجلی اور صاف کہلائی جاسکتی تھی۔ وہ پلٹ گیا اور مزید دیر کے بعد جب اس نے وقت جانچا کہ اب تک وہ سب کچھ ہوچکا ہوگا، فرزانہ کھانا دیر سے کھاسکتی تھی مگر دوا وہ ہمیشہ وقت پر ہی لینے کی عادی تھی۔

اس نے پھر تیز تیز قدم بڑھائے اور گھر پہنچا تو اسے وہاں ایسا کچھ ہوتا نظر نہ آیا جس کی وہ توقع کیے بیٹھا تھا۔ وہ مضطرب سا ہوگیا۔ جس کے باعث اس کے پیروں اور ہاتھوں میں پسینہ آنے لگا۔ گھبراہٹ بھی تھی اور احساسِ جرم اور دھر لیے جانے کا ڈر بھی...... وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُوپر پہنچا۔ اس کا حلق سوکھ کر کانٹا ہورہا تھا۔ اسے پیاس کی شدت کا احساس ہوا۔ گھبراہٹ اپنی جگہ تھی۔ اس میں فرزانہ کے کمرے میں جانے کی بھی جرأت نہ ہوسکی تھی جبکہ تصور میں وہ اسے بیڈ پر مردہ ہی متصور کیے ہوئے تھا۔ اس نے قریب پڑا گلاس اُٹھایا اور ٹیرس کے واش بیسن کے نلکے سے گلاس بھرا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ اسے کچھ سکون کا احساس ہوا تو اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ فرزانہ کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے جب اپنے کمرے کا رخ کیا تو بیڈ پر گرتے ہی کوئی اس کے کمرے میں آن دھمکا۔ وہ فرزانہ کو بھلا چنگا دیکھ کر ششدر رہ...... گیا تھا مگر خوف زدہ بھی ہوگیا کہ کہیں یہ اس کی روح تو نہیں آگئی ہے، وہ اس کے اعصاب پر کچھ ایسے ہی آسیب کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

وہ ایک دم بیڈ سے اُٹھ کھڑا ہوا......

''یہ تم نے اتنی دیر کہاں لگادی......؟'' فرزانہ نے تنک کر پوچھا۔ ریاض کی پھیلی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ بہ مشکل اور ہکلاتے ہوئے اس کے منہ سے نکلا۔

''تت...... تم! میں تو سمجھا تھا کہ تم دوا کھا کے آرام کر رہی ہوگی؟''

''ہاں!'' وہ بولی۔ ''میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کررہی تھی۔ دودھ پھٹ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے میں ابھی تک گولی نہیں کھاسکی ہوں۔ مجھے ابھی اسی وقت کہیں سے صرف ایک گلاس ہی دودھ لادو...... تاکہ میں گولی کھا سکوں...... ارے...... رے...... یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے...... ریاض!''

فرزانہ آخر میں ایک دم چلائی...... ریاض کا ایک ہاتھ اپنے گلے پر دوسرا سینے پر تھا...... اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ تیورا کر گرا...... اور بے حس و حرکت ہوگیا۔ فرزانہ ایک چیخ مار کے دوڑی۔

عشقِ زہرناک

منظر امام

محبت ایک اَن دیکھی قوت ہوتی ہے... جو دو اجنبی روحوں کو بنا کسی آہٹ کے اپنے حصار میں جکڑ لیتی ہے... پڑوسی ملک میں جنم لینے والی ایک انوکھی کتھا... وہ پُرسکون زندگی گزار رہا تھا... مگر اچانک ہی اس کی زندگی میں ایسا طوفان آیا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا... فوری طور پر وہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ یہ کیسے ہوا... بس محبت کی چنگاری تھی جو شعلہ بن کے جسم و جاں میں بھڑک اٹھی تھی... محبت کے پروانوں کے ملنے... بچھڑنے اور جدائیوں کے موسموں کا دل گداز فسانہ...

پراسرار حالات وواقعات میں گندھا حیرت انگیز تیکھا سرورق......

خدا بخش خان کی لائبریری جس کو نیا نام پٹنہ اورینٹل لائبریری دیا گیا ہے۔ قلمی مخطوطات کی شاید یہ ایشیا کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔ نہ جانے کتنے اسکالرز اور سائنس داں یہاں کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ حضرات پرانے نسخوں کو سائنسی مہارت کے ساتھ محفوظ رکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ میں اسی لائبریری میں کام کرتا تھا۔ میرا کام زیادہ علمی اور تحقیقی نوعیت کا نہیں تھا بلکہ میں انتظامیہ میں شامل تھا۔

میں اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام کوکب عدنان ہے۔ والدین کا تعلق اگرچہ بہار پٹنہ ہی سے ہے لیکن گزشتہ چند برسوں سے وہ کول کتہ جا کر آباد ہو گئے تھے۔

جبکہ میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں پٹنہ ہی میں رہ گیا تھا۔ میں نے سبزی باغ میں دو کمروں کا ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہاں سے لائبریری کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پانچ منٹ پہلے میں گھر سے ٹہلتا ہوا نکلتا اور وقت پر دفتر پہنچ جاتا تھا۔

یہاں کی زندگی بہت ٹھہری ہوئی تھی۔

آرام آرام سے سبج سبج سے گزرتی ہوئی۔ شام کو رحمانیہ ہوٹل میں رونق ہو جاتی۔ چائے کے ساتھ باقرخانی اور بسکٹ کھائے جاتے یا پھر پلٹن میدان میں گول گھر کے پاس گھاس پر بیٹھ کر دوستوں سے گپ شپ ہوا کرتی۔

چھوٹا سا شہر تھا۔ ویسے تو بے شمار چھوٹی موٹی دکانیں تھیں لیکن بانکی پور میں کچھ دکانیں بڑی بڑی تھیں۔ بانکی پور کو اس شہر کا سب سے ماڈرن علاقہ سمجھا جاتا تھا۔

یہاں کئی سینما گھر بھی تھے۔ لوگوں کو فلمیں دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ شاید ہماری سب سے بڑی تفریح یہی تھی کہ ہم فلمیں دیکھیں اور اس پر تبصرے کریں۔ ہوٹلوں میں فلمی گانے (ریکارڈ پر) بجائے جاتے تھے۔ سویرے ریڈیو سیلون سے امین سیانی کی آواز محلوں میں گونجا کرتی اور اس کے ساتھ ہی دلکش نغمے بھی سنوائے جاتے۔

رات نو بجے کے بعد پورا شہر جیسے سو جایا کرتا تھا۔ بہت کم دکانیں کھلا کرتیں۔ وہاں کے رہنے والوں نے بہت اُلجھی ہوئی اور پریشان کن زندگی گزاری ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلے تقریباً الگ الگ تھے۔ دونوں محلوں میں زندگی کی اپنی اپنی رفتار تھی۔ اس شہر کو پٹنہ صاحب بھی کہا جاتا تھا۔ وہاں سکھوں کے گرو گووندجی کا استھان تھا۔ دور دور سے یاتری وہاں درشن کے لیے آیا کرتے تھے۔

اس شام بارش ہورہی تھی۔ موسم بہت خوب صورت تھا۔ ایک نئی فلم آئی ہوئی تھی۔ اس فلم کے گانے بہت خوب صورت تھے۔ جو آج بھی کانوں میں رس گھولا کرتے ہیں۔

میں نے اس فلم کی پہلے سے بکنگ کروالی تھی اسی لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا۔ فلم شروع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ اسی لیے ہال میں روشنی ہورہی تھی۔

اچانک ایک لڑکی میرے برابر کی سیٹ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں آدھا ٹکٹ دبا ہوا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنا سیٹ نمبر تلاش کررہی ہو۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ ''تمہاری سیٹ کا نمبر کیا ہے؟''

''پچیس۔'' اس نے اپنی خوب صورت آواز میں بتایا۔

''یہی برابر والی ہے۔'' میں نے اشارہ کیا۔ 'میرا نمبر چوبیس ہے۔''

وہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ چالیس پینتالیس سال پہلے بھی وہاں اسی قسم کا سسٹم تھا۔ مرد اور عورت ایک ساتھ بیٹھ جاتے تھے اور کسی قسم کی کوئی بدمعاشی یا غنڈاگردی نہیں ہوا کرتی تھی۔

اس لڑکی نے کوئی خوشبو لگا رکھی تھی جس کی وجہ سے اس کا برابر میں بیٹھ جانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے اطمینان سے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ ایک جاذب نظر لڑکی تھی۔ اس کا رنگ تو اتنا صاف نہیں تھا لیکن اس کے نقوش بہت اچھے تھے۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں۔

کچھ دیر بعد فلم شروع ہوگئی۔ بظاہر تو ہم اسکرین کی طرف متوجہ تھے لیکن ہمارا دھیان ایک دوسرے کی طرف

تھا۔

فلم کے درمیان فلم کے حوالے سے کچھ باتیں بھی ہوئی تھیں۔ کچھ دلچسپ تبصرے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں انٹرویل یا ہاف ٹائم ہو گیا اور ہم ہال سے نکل کر باہر آ گئے۔

یہ ایک ٹیرس تھا۔ جہاں سلیقے سے کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک کینٹین بنی ہوئی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ شاید چائے پینے آئی تھی۔ میں نے اس کے کہے بغیر دو چائے خریدیں اور ایک پیالی اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

''یہ کیا؟'' اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ چائے ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہارے لیے ہے۔''

''لیکن کیوں، آپ نے اتنا کشٹ کیوں کیا؟''

''اس لیے کہ تم میری پڑوسن ہو۔''

''واہ، سنیما میں پڑوسی۔'' وہ مسکرا دی۔

''پڑوسی تو پڑوسی ہوتا ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''چلو شروع کرو، ورنہ فلم شروع ہو جائے گی۔''

اس نے چائے کی پیالی اٹھالی۔ دو چار گھونٹ لینے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''کیا ضروری ہے کہ ذرا دیر کے پڑوسی ایک دوسرے کے نام بھی جان لیں؟'' اس نے کہا۔

''ضروری تو نہیں ہے لیکن اس طرح یاد رہے گا کہ میری سیٹ کے برابر میں ایک خوب صورت لڑکی آ کر بیٹھ گئی تھی اور میں نے اس کا نام پوچھ لیا تھا۔''

''بابو باتیں تو بہت اچھی کرتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''چلو، میں اپنا نام بتا دیتی ہوں۔ میرا نام آنچل کور ہے۔''

''آنچل کور......'' میں نے گہری سانس لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک سکھ لڑکی تھی...... آنچل کور۔

''اور تمہارا نام؟'' اس نے پوچھا۔

اس بار میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ کیا نام بتایا جائے۔ وہاں کے سکھ، ہندوؤں کے زیادہ قریب تھے اور کبھی کبھی جب مسلمانوں سے لڑائی جھگڑے ہوتے تو وہ ہندوؤں ہی کا ساتھ دیا کرتے۔ اس نے دوسری بار میرا نام پوچھا اور ایک نام ذہن میں آ گیا۔ آزاد۔ شاید آزاد نام یا تخلص رکھنے کا جنون ہی تھا۔ نہ جانے کتنے ہندو اور مسلمانوں کے نام آزاد تھے۔ اس سے پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ میں نے بھی اس کو اپنا یہی نام بتا دیا۔ ''میرا نام آزاد ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''اس سے تو یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ تمہاری ذات کیا ہے۔ تم ہندو ہو یا مسلمان؟''

''کیا دوستی کرنے کے لیے ہندو یا مسلمان ہونا ضروری ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ مسکرا دی۔ ''میں خود بھی ایسی باتوں کو نہیں مانتی۔''

''اچھا یہ بتاؤ تم رہتی کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''پٹنہ سٹی۔ چوک کے پاس۔'' اس نے بتایا۔ ''پٹنا کالج سے بی اے کر رہی ہوں اور تم کہاں رہتے ہو؟''

میں نے اپنے بارے میں بھی اس کو تھوڑی بہت معلومات فراہم کر دیں لیکن ابھی تک یہ نہیں بتا سکا تھا کہ میں کون ہوں۔ فلم ختم ہونے کے بعد ہم سنیما ہال سے ٹہلتے ہوئے پنٹو کی دکان تک آ گئے۔ یہاں کے رس گلے بہت مزے دار ہوا کرتے تھے۔ میں نے اسے رس گلے کھلائے اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے گول گھر کے پاس آ گئے۔ جہاں سے سٹی کی طرف جانے کے لیے سواریاں مل جاتی تھیں۔

''اچھا مسٹر آزاد! اب میں چلتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا ہم پھر مل سکیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا ضروری ہے کہ ہم پھر ملیں؟''

''نہیں آنچل! ایسا نہ کہو۔ نہ جانے کیوں ابھی ابھی مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ شاید ہمیں پھر ملنا ہے اور ملتے ہی رہنا ہے۔ میرا تمہارا ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔ تم اسے میری چھٹی حِس کہہ سکتی ہو۔ کیونکہ عام طور پر میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو آزاد۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''خود میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی۔ مجھے بھی ایسا ہی احساس ہوا ہے۔ جیسے کوئی میرے کانوں میں کہہ رہا ہو۔ واہ گرو جانیں کیا ہونے والا ہے۔''

''سب ٹھیک ہی ہوگا۔ اب تم جاؤ۔''

وہ چلی گئی اور میں ایک عجیب کیفیت میں سرشار سا اپنے گھر واپس آ گیا۔ میں نے اسے اپنے احساس کے بارے میں غلط نہیں بتایا تھا۔ مجھے اچانک ایسا ہی احساس ہوا تھا جیسے اس لڑکی سے میرا کوئی تعلق ہو اور قدرت نے

یونہی اس سے ملاقات نہیں کروائی تھی بلکہ یہ باقاعدہ پلاننگ تھی۔ قدرت چاہتی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے ملیں اور قریب ہوجائیں۔

زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی میرے نزدیک آئی تھی۔ ویسے تو خاندان کی بہت سی لڑکیاں میرے قریب ہونا چاہتی تھیں تاکہ وہ مجھ سے شادی کرسکیں لیکن جو بات آنچل میں تھی، وہ کسی میں نہیں تھی۔

اول تو خاندان کی لڑکیاں گھٹے ہوئے ماحول کی پیداوار تھیں۔ ایک محدود سی زندگی تھی ان کی۔ ان میں ابھی اتنی آزادی نہیں آئی تھی کہ وہ اکیلی فلم دیکھنے چلی جائیں۔ فلم دیکھنے کے لیے پورا خاندان ساتھ جایا کرتا تھا۔ وہ بھی ایسی پابندی کے ساتھ کہ سائیکل رکشاؤں میں پردے لگا دیے جاتے اور یہ لڑکیاں پنجرے میں بند فاختاؤں کی طرح باہر کے نظارے لیا کرتیں۔

ان میں سے کوئی ایسی نہیں تھی جو کھل کر ادھر اُدھر کی باتیں کرسکے۔ وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے شرما جایا کرتی تھیں۔ان کی باتیں بھی گھریلو انداز کی ہوا کرتی تھیں۔

اسی لیے اب تک کوئی بھی لڑکی میرے قریب نہیں آسکی تھی لیکن یہ کیسا اتفاق تھا کہ جو لڑکی مجھے اچھی لگی، وہ ایک سکھ تھی۔ آنچل کور۔ تیکھے نین نقش اور ذہانت بھری باتوں والی لڑکی۔

میں بہت دیر تک اس کے خیال میں کھویا رہا۔ پھر نیند آہی گئی تھی۔ دوسری صبح سے پھر وہی زندگی۔ وہی گھر سے لائبریری اور لائبریری سے گھر......

اور شام کے وقت سلطانیہ ہوٹل کی بیٹھک۔ اس کے علاوہ زندگی میں اور کیا تھا۔ وہی معمول کے روز و شب کی سرگرمیاں تھیں۔

میں دن رات اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ پٹنہ سٹی میں رہتی ہے لیکن پٹنہ سٹی تو بہت بڑا تھا۔ وہاں سکھوں کی پوری آبادی تھی۔ صرف ایک لڑکی کو کہاں جاکر تلاش کرتا۔

اور ایک دن وہ مجھے مل ہی گئی۔

کہیں اور نہیں، اپنی لائبریری میں۔ وہ گرنتھ صاحب کا ایک قدیم نسخہ دیکھنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی اور بھی تھی۔ آنچل مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ”مسٹر آزاد! تم یہاں کیا کررہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

مجبوراً مجھے بتانا پڑا کہ میں یہاں کام کرتا ہوں۔ ملازمت ہے میری۔

”تو پھر تم تو مسلمان ہوئے نا؟“ اس نے کہا۔

”کیونکہ یہاں زیادہ تر مسلمان ہی کام کرتے ہیں۔“

”چلو ایسا ہی سمجھ لو۔“ میں مسکرا دیا۔ ”میں مسلمان ہوں۔ اب بتاؤ، کیا مجھ سے بات نہیں کروگی؟“

”بات تو کرنی ہی ہوگی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کیونکہ تم سے ملنے کے بعد میرے ساتھ نہ جانے کیا کیا ہورہا ہے۔ میں خود تم سے مل کر بتانے والی تھی۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔ چلو کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”آنچل! تمہارے ساتھ جو لڑکی ہے، وہ اس بات کا برا مانے گی؟“

”وہ برا نہیں مانے گی۔ اسے میں نے کچھ کتابیں دیکھنے کے لیے دوسری طرف بھیج دیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ خود بھی مسلمان لڑکی ہے۔ قدم کنواں میں رہتی ہے۔ کالج میں ہم ساتھ ہی ہیں۔“

”چلو، یہ بھی اچھی بات ہوئی۔“

میں اسے اپنے ساتھ عمارت کے عقبی حصے کی طرف لے آیا۔ جہاں ایک خوب صورت سالان بنا ہوا تھا۔ ”ہاں، اب بتاؤ۔ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟“ میں نے پوچھا۔

”آزاد! تم سے ملاقات کے بعد میں عجیب عجیب خواب دیکھنے لگی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”بہت حیران کر دینے والے خواب ہیں اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہر خواب میں تم میرے ساتھ ہوتے ہو۔“

”چلو، کسی بہانے تم نے مجھے یاد تو رکھا۔“

”نہیں آزاد! یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ میں تو بہت خوف زدہ ہوگئی ہوں۔ گرو جانے ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ یہ خواب پریشان کرنے والے ہیں۔ میرے خوابوں میں جنگل ہیں، پہاڑ ہیں، پرانی حویلیاں ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہیں اور میں تمہارا ہاتھ پکڑے دوڑتی چلی جاتی ہوں۔ لوگ ہمیں پکڑنا چاہتے ہیں۔ ایک ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔ ایسے خواب پہلے کبھی نہیں آئے تھے لیکن اب آنے لگے ہیں۔ ایسا کیوں ہورہا ہے؟“

”آنچل! میں خود بھی نہیں جانتا کہ تم ایسے خواب کیوں دیکھ رہی ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر تم پر کوئی مصیبت آئی تو میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ میں ہر حال میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور ساتھ دوں گا۔“

میں نے بڑی نرمی اور پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

یہ سب کچھ پہلی بار ہو رہا تھا۔ پہلی بار میں نے کسی لڑکی کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کیا تھا۔

اس نے بھی آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحوں بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ ”آزاد! یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہ ہماری صرف دوسری ملاقات ہے اور ہم ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے ہیں۔“

”ایسا ہی ہوتا ہے آنچل! جب قدرت ملوانا چاہتی ہے تو اسی طرح ملوا دیتی ہے۔ اب یہ دیکھو کہ ہمیں اس بات کی بھی پروا نہیں ہے کہ ہمارے درمیان کتنے فاصلے حائل ہیں۔“

”ہاں آزاد! سب سے بڑا فاصلہ تو ہمارے دھرم کا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم مسلمان ہو، میں سکھ لڑکی ہوں۔ اس کے باوجود ہم ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم ایک آتش فشاں پہاڑ کے کنارے ہیں۔“ میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں۔ صوفیہ ڈھونڈ رہی ہوگی۔“ اس نے کہا۔

”اب کب ملوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو ہم ملتے ہی رہیں گے اسی طرح۔“ وہ مسکرانے لگی۔ پھر رک کر بولی۔ ”اور ہاں، اگلے ہفتے بھابی لگ رہی ہے۔ الفنسٹن کے دو ٹکٹ لے لینا۔ دونوں مل کر دیکھیں گے۔“

”ضرور۔ تو پھر ایسا کرتا ہوں۔ اتوار کے دو ٹکٹ لے لیتا ہوں۔ فرسٹ شو کے۔“

وہ مسکرائی اور امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی گئی۔

بہت جلد اُس سے میری دوسری ملاقات بھی ہو گئی۔ شاید قدرت مواقع نکال نکال کر اسے میری طرف بھیج رہی تھی۔ کیوں، اس کا جواب اس وقت میرے پاس نہیں تھا۔

اس نے خواب دیکھے تھے۔ میں ان خوابوں میں اس کے ساتھ تھا۔ ایسی کون سی بات ہو گئی تھی کہ اس نے مجھے اپنے خوابوں میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

بہرحال اتوار کے دن ہم پھر ایک دوسرے سے ملے۔ اس بار پوری فلم کے درمیان ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رکھا تھا۔ ہم لمس کی زبان میں گفتگو کرتے رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے قریب بہت قریب آچکے تھے۔ فلم کے خاتمے کے بعد ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر چائے پی۔ اس دوران میں وہ خلافِ معمول خاموش رہی تھی۔

”کیا بات ہے آنچل! آج تم اتنی خاموش کیوں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”آزاد!“ اس نے میری طرف دیکھا۔ اگرچہ میں نے اسے اپنا نام بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھے آزاد ہی کہا کرتی تھی۔ ”آزاد! ہمارے لیے ایک بہت بھیانک بات ہوگئی ہے۔“

”وہ کیا ہے آنچل؟“

”کل میں دریا کی طرف چلی گئی تھی۔“ اس نے بتانا شروع کیا۔ ”سون گھاٹ کی طرف۔ وہاں ایک سادھو دھونی جمائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ ”جا...... جلدی...... چلی جا یہاں سے اور اس کو بھی اپنے ساتھ لے جا...... یہاں کی گلیوں میں خون کی ہولی مت پھیلا...... جا...... لے جا اُس کو۔“

”یہ تو تم عجیب بات بتا رہی ہو۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”یہی تو کہنا چاہ رہی ہوں۔ ابھی تو ہم نے محبت کی ابتدا کی ہے اور ابھی سے ایسی باتیں ہونے لگی ہیں۔ وہ سادھو ایسا کیوں کہہ رہا تھا؟“

”یہ سب واہمے ہیں آنچل۔“ میں نے اس کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ اگرچہ خود میں بھی خوف زدہ سا ہونے لگا تھا۔ ”کیا تم اکیلی گئی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، وہی لڑکی میرے ساتھ تھی۔ وہی میری دوست۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ خود بھی بہت حیران ہو رہی تھی۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ یہ سادھو کیا کہہ رہا ہے۔ یہ کس کو لے جانے کی بات کر رہا تھا؟“

”کیا تم نے اسے میرے بارے میں بتایا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔“ آنچل نے کہا۔

”میرا مشورہ ہے کہ اسے بتا دو۔ کم از کم کوئی ایک تو تمہارا راز دار ہو جس سے تم دل کی بات کر سکو اور وہ تمہیں مشورے دے سکے۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔ ہاں یاد آیا۔ صوفیہ کے ابو بہت بڑے پیر ہیں۔ ان کا ایک استھان ہے۔ کیا کہتے ہو تم لوگ، آستانہ۔ ان کا ایک آستانہ ہے جہاں دن بھر لوگ آتے

رہتے ہیں۔“

”کیا نام ہے اس کے ابو کا؟“

”ابراہیم حسین۔“ آنچل نے بتایا۔

”اوہ، وہ تو بہت اللہ والے انسان ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں اُن کو۔ میں نے اُن کا نام سنا ہوا ہے۔“

”آزاد، اگر ایسا ہے تو کیوں نا ہم دونوں ان کے پاس جاکر اپنے بارے میں سب کچھ بتادیں۔“ آنچل نے کہا۔

”ابھی نہیں آنچل، ابھی وقت سے پہلے کی بات ہو گی۔ بہر حال تم صوفیہ کو اپنے اعتماد میں رکھو۔ ہوسکتا ہے کہ ہمیں جلد ہی اس کی ضرورت پڑ جائے۔“

پھر ایک دن گول گھر کے قریب ہم تینوں لان میں آکر بیٹھ گئے۔ میں، آنچل اور صوفیہ۔ آنچل نے صوفیہ کو میرے اور اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔

وہ ایک سلجھی طبیعت کی اور ہمدرد لڑکی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”آزاد بھائی! آپ ایک پڑھے لکھے انسان ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اگر آپ دونوں کی محبت کا یہ راز کھل گیا تو پھر کیا ہوگا؟“

”مصیبت تو یہی ہے صوفیہ کہ محبت یہ سب نہیں دیکھتی۔“ میں نے کہا۔ ”اب ہم بہت آگے نکل چکے ہیں۔“

”میرے ذہن میں آپ دونوں کے لیے دو راستے ہیں۔“

”جلدی بتاؤ، کیا راستہ ہے؟“ آنچل نے پوچھا۔

”یا تو تم دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ دو۔“ صوفیہ نے کہا۔ ”اپنے اپنے دل پر پتھر رکھ کر بھلا دو ایک دوسرے کو یا پھر خاموشی کے ساتھ اس شہر سے نکل جاؤ۔ ممبئی، گوا، مدراس، کہیں بھی چلے جاؤ بس اس کے سوا تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو صوفیہ لیکن اس طرح ماں باپ اور اپنے شہر کو چھوڑ کر نکل جانا آسان تو نہیں ہوگا۔“ آنچل نے کہا۔

”تو پھر بھول جاؤ ایک دوسرے کو۔ کیونکہ تم دونوں ایک خطرناک راستے پر چل پڑے ہو۔“ صوفیہ نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

”یہی تو نہیں ہوسکتا۔“ میں نے کہا۔ ”کم از کم میں تو اس راستے پر چل پڑا ہوں۔ جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میں اس طرح آگ سے کھیل رہا ہوں لیکن اب یہ آگ ہی زندگی بنتی جارہی ہے۔“

”تو پھر ایک کام کرو۔“ صوفیہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”میں ابو سے بات کرتی ہوں۔ تم دونوں ایک بار اُن سے ملاقات کرلو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جو مشورہ دیں گے، وہ تمہارے کام آئے گا۔“

”ہاں، میں اُن سے ملنے کے لیے تیار ہوں۔“ آنچل نے کہا۔ یکدم ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ آنچل کئی بار صوفیہ کے گھر جا چکی تھی۔ ابراہیم صاحب اسے بہت اچھی طرح جانتے تھے اور اس سے پیار بھی کرتے تھے کیونکہ آنچل ان کی بیٹی کی دوست تھی۔

لیکن اس بار صوفیہ اور آنچل کے ساتھ میں بھی تھا۔ ان کی طرف جاتے ہوئے میرے دل میں اندیشے تھے وسوسے تھے۔

ان سے ملنے کے بعد احساس ہوا کہ ابراہیم صاحب واقعی ایک بزرگ انسان ہیں۔ ان کے نورانی چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کن ریاضتوں میں گزاری ہے۔

جب ہم نے ابراہیم صاحب کو اپنی محبت کے بارے میں بتایا تو وہ بھی پریشان ہوگئے۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے کہا۔ ”میرے بچو! تم دونوں نے یہ خطرناک قدم اٹھایا ہے۔“

”محترم! ہم نے جو کچھ بھی کیا، اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔“ میں دھیرے سے بولا۔ ”یہ ایک بے اختیاری لمحہ تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اسی لمحے ہمیں ایسا لگا جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔“

”ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ ابراہیم صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ ”خدا کے بھید خدا ہی جانتا ہے۔ بہرحال تم دونوں دو چار دنوں کے بعد میرے پاس آنا۔ میں مراقبے اور دھیان کے ذریعے تمہارے مستقبل کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔“

میں اور آنچل واپس آگئے۔

دو دن کے بعد ملنا تھا ہمیں تاکہ ہم صوفیہ کے والد ابراہیم صاحب کے پاس جائیں۔ ہم نے گول گھر کے قریب ملنے کی جگہ مقرر کر رکھی تھی۔ ہم وہیں ملا کرتے تھے۔

لیکن اس شام آنچل نہیں آئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ

وہ وعدہ کرنے کے باوجود میرے پاس نہیں آئی تھی۔ میں بے قراری سے اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد میں بہت اداس سا واپس آ گیا تھا۔

دل میں بہت بے چینی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ٹیلی فون یا موبائل وغیرہ کی سہولت بھی حاصل نہیں تھی۔ ورنہ ذرا سی دیر میں خیریت معلوم ہو سکتی تھی۔

میں نے سوچا کہ شاید وہ دوسرے دن میرے دفتر آجائے گی لیکن دوسرا دن بھی گزر گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، اس کی طرف جانا بھی خطرناک تھا۔

اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ میں صوفیہ سے معلوم کروں۔ اس کے گھر جاؤں۔ لہٰذا اس شام میں ابراہیم صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

یہ اتفاق تھا کہ صوفیہ ہی سے میری ملاقات ہوئی۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ ''صوفیہ! دو دنوں سے آنچل سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''کیا تم اس کے گھر جا کر اس کی خیریت معلوم کر سکتی ہو؟''

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا آزاد صاحب!'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیونکہ دو دن پہلے اس کی شادی ہو چکی ہے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا تھا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آنچل کی اس طرح اچانک شادی ہو جائے۔ دو دن پہلے تک تو سب ٹھیک تھا۔ اس کی شادی کا دور دور تک کوئی نام نشان نہیں تھا پھر اچانک اس کی شادی کس طرح ہو گئی۔

''صوفیہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس طرح اچانک اس نے شادی کیسے کر لی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''شادی اس نے اپنی مرضی سے نہیں کی آزاد صاحب۔'' صوفیہ نے بتایا۔ ''اس کی شادی زبردستی ہوئی ہے۔ ورنہ وہ بے چاری تو آخر تک آپ ہی کو یاد کرتی رہی تھی۔''

''لیکن کیوں...... کس طرح...... ایسی کون سی مصیبت آ گئی تھی کہ اس کی شادی زبردستی ہو گئی؟'' صدمے سے میرا حال بُرا ہو رہا تھا۔

''یہ شادی آپ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس کے گھر والوں کو آپ کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ شاید کسی نے آپ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیا تھا پھر ان لوگوں نے آپ کے بارے میں چھان بین کی تو پتا چلا کہ آپ مسلمان ہیں پھر کیا تھا۔ اک آگ سی لگ گئی اور اس بے چاری کی زبردستی شادی کر دی گئی۔'' صوفیہ نے تمام تر تفصیل بتائی۔ اس کا لہجہ بھی دکھ کی غمازی کر رہا تھا۔

''صوفیہ! میں ایسی شادی کو نہیں مانتا۔'' میں نے کہا۔

''تم یہ بتاؤ کہ وہ ہے کہاں؟'' میں شاید اپنے حواس کھو رہا تھا۔ آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ میں آنچل سے کس قدر محبت کرتا تھا۔

''اسے تو یہاں سے راتوں رات کہیں بھیج دیا گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کہاں بھیج دیا گیا ہے؟'' میں نے چلّا کر پوچھا۔

''کسی دوسرے شہر۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ کہاں؟''

''کیا تم یہ پتا لگا سکتی ہو۔ میری خاطر۔ تمہاری تو وہ دوست ہے۔ تمہیں تو معلوم ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے ناممکن ہے۔'' میں اس کی منت کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں معلوم کر لوں گی۔''

اسی وقت ابراہیم صاحب بھی کمرے میں آ گئے۔ ہم انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ''بیٹھ جاؤ بیٹا۔''

میں اُن کے سامنے مؤدب سا بیٹھ گیا۔ ابراہیم صاحب بہت غور سے میری طرف دیکھتے رہے تھے۔ ''شاید صوفیہ نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا بپتا گزری ہے۔''

''جی جناب! اس نے بتا دیا ہے کہ اس کی زبردستی شادی کر دی گئی ہے۔'' میں نے رندھے لہجے میں بات کی۔

''لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ یہ زبردستی کی شادی سفلی عمل کے ذریعے ہوئی ہے۔'' ابراہیم صاحب نے انکشاف کیا۔

''جی۔'' میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ ''سفلی عمل؟''

''ہاں بیٹا سفلی عمل۔'' انہوں نے اپنی بات دہرائی۔ ''یہ میں نے اپنے علم سے دھیان میں معلوم کیا ہے۔ ورنہ اس لڑکی پر قابو پانا اتنا آسان نہیں ہے۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ صوفیہ کی دوست ہے۔''

''محترم بزرگ! پھر تو یہ شادی نہیں ہوئی۔''

''ہاں، یہ شادی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ عمل کے زیر اثر

ہے۔'' ابراہیم صاحب نے بتایا۔ ''لیکن ان لوگوں نے عقل مندی یہ کی ہے کہ اس لڑکی کو فوری طور پر پٹنہ سے باہر لے گئے ہیں۔''

''کاش! یہ معلوم ہو سکتا کہ کہاں لے گئے ہیں؟'' میں حواس باختہ ہو رہا تھا۔

''یہ میں نے معلوم کر لیا ہے۔'' ابراہیم صاحب نے بتایا۔

''جی، آپ کو معلوم ہو گیا ہے۔'' میں یکدم کھڑا ہو گیا۔

''ہاں، وہ اسے بلرام پور لے جا رہے ہیں یاترا کے لیے۔'' ابراہیم صاحب نے بتایا۔ ''بلرام پور میں سکھوں کے ایک گرو نے کچھ دنوں تک تپسیا کی تھی۔ وہاں ان کی یادگار بنا دی گئی ہے۔ ہر سال ہزاروں یاتری وہاں درشن کے لیے جایا کرتے ہیں۔ اس لڑکی کو بھی وہیں لے گئے ہیں۔''

''جناب! اگر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ بلرام پور ہے کہاں تو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''یہ بہار اور نیپال کی سرحد پر ہے۔ ابراہیم صاحب نے بتایا۔ ''لیکن تم وہاں جا کر کیا کرو گے۔ تمہارے لیے تو بہت دشواریاں ہو جائیں گی۔ ایک تو اس لڑکی پر جادو کا اثر پھر اس کا شوہر اسے لے کر گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ہم مذہب لوگوں کے درمیان ہے۔ ایسے میں تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟''

''میرے محترم بزرگ! اگر میرا جذبہ صادق ہے تو میں اسے ان لوگوں کے چنگل سے نکال لاؤں گا۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں، بے شمار دعائیں ہیں تمہارے لیے۔ میں تمہیں چند وظیفے بھی بتا دوں گا۔ تم اُن کو پڑھتے رہنا۔''

ابراہیم صاحب نے مجھے چند دعائیں لکھ کر دیں۔ میں ان سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔

میرے وجود میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ہر حال میں آنچل کو وہاں سے نکال کر لانا چاہتا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ لوگ اتنی جلدی اس کی شادی کر دیں گے اور راتوں رات اسے کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔ اس کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کے وعدے یاد آ رہے تھے۔ وہ میری محبت تھی۔ اس نے میرے ساتھ زندگی گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اس کو یونہی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

دوسری صبح میں نے اپنے دفتر سے طویل رخصت لے لی۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ میں اپنے والدین کے پاس کول کتہ جا رہا ہوں۔

میں نے اپنا سامان باندھا اور کچھ ایسی چیزیں لے لیں جو وہاں پہنچ کر میرے کام آتیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ہندو کا بھیس بدل کر بلرام پور جاؤں گا۔

ہندو کا بھیس بدلنے میں کوئی خاص دشواری نہیں

ہوتی۔ جبکہ سکھ بننے کے لیے داڑھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندو کے لیے ماتھے پر چندن لگایا اور اپنا نام بدل لیا۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہیں کرنا تھا۔

حالات ایسے تھے کہ میں مسلمان کی حیثیت سے وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک تو مسلمانوں کے لیے پورے ہندوستان میں خطرے ہی خطرے تھے پھر یہ کہ بلرام پور ان کی ایک مقدس جگہ تھی اسی لیے مجھے بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔

دو دنوں کے سفر کے بعد میں بلرام پور پہنچ گیا۔

یہ سفر بس کے ذریعے ہوا تھا۔ نیپال اور ہندوستان کی سرحدیں ایسی ہیں کہ بغیر کسی پاسپورٹ یا ویزے کے آجا سکتے ہیں۔

سرحدیں تبدیل ہونے کا اندازہ صرف اس طرح ہوتا ہے کہ نیپالی لوگ سرحد کے قریب کھڑے دکھائی دینے لگتے ہیں اور چہروں کے نقوش کسی حد تک تبدیل ہو جاتے ہیں۔ باقی سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ وہی زمین۔ ویسا ہی آسمان اور ویسے ہی لہلہاتے کھیت۔

ہاں، ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ سرحد عبور کرتے ہی سردی کا احساس ہونے لگا تھا۔ یہ ہمالیائی ہواؤں کا اثر تھا۔ یہ سلسلہ ہزاروں میل تک محیط ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتا ہوا پاکستان تک چلا گیا ہے۔

بلرام پور ایک چھوٹا سا قصبہ ثابت ہوا تھا۔

یہاں نیپال اور انڈیا دونوں ملکوں کی کرنسی چلتی تھی۔ میں اپنے ساتھ چالیس ہزار کے قریب ہندوستانی روپے لے گیا تھا۔ اسی لیے مجھے کوئی دشواری نہیں تھی۔

یہاں کئی سرائے اور ہوٹل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سکھ یاتری بہت بڑی تعداد میں یہاں آیا کرتے تھے۔ میں نے جس ہوٹل میں قیام کیا، اس کو بھی ہندوستانی چلا رہے تھے۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر خود ہوٹل کا مالک بیٹھا رہتا تھا۔ اس نے رجسٹر اٹھا کر میرا نام دریافت کیا۔ ”نام کیا ہے بابو؟“

”موہن شرما۔“ میں نے بتایا۔

”بہار سے آئے ہو؟“

شرما بہار میں ہوا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی بہت بڑی کاسٹ ہے۔ شرما۔ سینا وغیرہ۔ ”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ اس نے کمرے کی چابی میرے حوالے کر دی۔

ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کی ایک دیوار پر ہنومان جی کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ ایک مسہری۔ ایک میز اور دو کرسیاں۔

میں نے اپنا سامان ایک طرف رکھ کر سوچنا شروع کر دیا کہ مجھے کرنا کیا چاہیے۔ ابھی تک یہ بھی کنفرم نہیں تھا کہ آنچل بلرام پور ہی میں ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ یاترا کر کے واپس بھی چلی گئی ہو۔

شام ہو چلی تھی۔ میں اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔

میں نے ہوٹل کے چھوٹے سے ہال میں چائے پی۔

اب کاؤنٹر پر کوئی دوسرا آدمی بیٹھا تھا۔ میں نے چائے ختم کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔ ”بھائی! یہ سکھوں کا گردوارہ کہاں ہے؟“

”اسی روڈ پر۔ سیدھے چلتے جاؤ۔ سب سے آخر میں گردوارہ ہے۔“ اس نے بتایا۔

”زیادہ دور ہے؟“

”نہیں بھائی، پیدل کا راستہ ہے۔“

میں ہوٹل سے باہر آ گیا۔ یہ ایک پتلی سی سڑک تھی جس کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔ جن میں ضرورت کی چیزیں ملتی تھیں۔ میں نے کئی سکھ عورتوں اور مردوں کو بھی دیکھا جو شاید گردوارہ ہی کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

مقدس مقام سے بہت پہلے خوشبوؤں نے استقبال کیا۔ یہ خوشبوئیں پھولوں اور اگربتیوں کی تھیں۔ اس گلی میں دورُویہ دکانیں تھیں۔ جن میں تبرکات فروخت ہو رہے تھے یا تقسیم ہو رہے تھے۔

سکھ یاتری استھان کی طرف چلے جا رہے تھے۔ زیادہ تر داڑھیوں اور پگڑیوں والے۔ لیکن کچھ میری طرح بھی تھے۔ اسی لیے میں اس ماحول میں اجنبی نہیں تھا۔

میری نگاہیں آنچل کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔

وہاں بہت سی عورتیں تھیں۔ لڑکیاں تھیں لیکن آنچل کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں بہت دیر تک اس گلی میں بھٹکتا رہا پھر ناکام ہو کر واپس آ گیا۔ دل کا بوجھ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اس رات بستر پر لیٹ کر میں نے فیصلہ کیا کہ بس کل صبح ایک بار پھر اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا اگر نہیں ملی تو واپس چلا جاؤں گا۔ اس کے علاوہ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

نہ جانے کس وقت نیند آ گئی تھی۔ میری آنکھ

دروازے پر دستک سے کھلی تھی۔ کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے اٹھ کر کمرے کا بلب جلایا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی آندھی طوفان کی طرح کوئی لڑکی کمرے میں داخل ہوگئی...... وہ آنچل تھی۔ آنچل کور...... میری محبت۔ میں جس کی تلاش میں پاگلوں کی طرح بھٹکتا پھر رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے مجھے دیکھا لیکن اس انداز سے جیسے دیکھ ہی نہیں رہی ہو۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ آنکھوں میں خوف تھا۔ وہ کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

''آنچل! کیا ہوا ہے تمہیں؟'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو۔ تم میرے کمرے میں کیسے آگئیں؟''

''تم!'' آنچل نے میری طرف دیکھا۔ ''تم کون ہو؟''

''آنچل! پہچانو مجھے۔ میں آزاد ہوں۔ تمہارا دوست۔ تمہارا ساتھی۔ تمہارا محبوب۔''

''نہیں، میں تم کو نہیں جانتی۔ میں تمہارے کمرے میں پناہ لینے آئی ہوں۔ بچاؤ مجھ کو۔ بھگوان کے لیے بچا لو۔''

''کس سے بچا لوں۔ کون تمہیں پریشان کررہا ہے؟''

اس سے پہلے کہ وہ جواب دے سکتی، ایک مرد اور ایک عورت کمرے میں داخل ہوگئے۔ میں ایک بار پٹنہ میں ان دونوں کو دیکھ چکا تھا۔ یہ آنچل کور کے ماں اور باپ تھے۔

''ارے بیٹا! تو یہاں کیوں آگئی؟'' ماں نے آگے بڑھ کر آنچل کا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'' آنچل نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''تم دونوں میرے دشمن ہو، ماردو گے مجھے۔''

''آنچل میں تمہارا باپ ہوں بیٹا، دیکھو میری طرف۔'' اس کے باپ نے کہا۔

جس وقت وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے، اس وقت تو میں واقعی خوف زدہ ہوگیا تھا لیکن اب اطمینان ہوگیا تھا کہ وہ دونوں مجھے پہچان نہیں پارہے تھے۔

ویسے بھی شاید ان دونوں نے پٹنہ میں مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ ''سردار جی! خیریت تو ہے؟'' میں نے اس کے باپ کو مخاطب کیا۔ ''کیا ہوا ہے اس لڑکی کو!''

''کیا بتاؤں؟'' باپ نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس کا شاید دماغ الٹ گیا ہے۔ یہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ ہم دونوں کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔''

''آپ لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی ہوٹل میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''درشن کے لیے آئے تھے لیکن تم کون ہو سجن؟''

''میرا نام موہن شرما ہے۔'' میں نے بتایا۔ اب مجھے اس بات کا بھی اطمینان ہوگیا تھا کہ وہ لوگ اسی ہوٹل میں تھے۔ میں ان سے بعد میں بھی مل سکتا تھا۔ آنچل کے لیے ترکیب سوچ سکتا تھا۔

آنچل کی ماں نے آنچل کا ہاتھ تھام لیا۔ اب آنچل کی وحشت کچھ کم ہو چلی تھی۔ وہ دونوں میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

جاتے جاتے آنچل نے پلٹ کر اس طرح میری طرف دیکھا تھا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو اور مجھ سے کہہ رہی ہو کہ میں اسے چھوڑ کر نہ جاؤں۔ اس کی مدد کروں۔ کیونکہ وہ کسی مصیبت میں ہے۔

اس وقت کئی سوالات میرے ذہن میں تھے۔

آنچل کو کس کا خوف تھا اگر اس کے ماں باپ اس کے ساتھ ہیں تو پھر وہ کہاں ہے جس سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ اس نے مجھے پہچانا کیوں نہیں تھا؟

اس وقت میرے پاس ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں نے وہ رات بہت بے قراری میں گزاری تھی۔ صبح میں ہوٹل کے ہال میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ چھوٹا سا ہال تھا اور کھانے اور ناشتے کے لیے لوگ یہیں آیا کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے آنچل کور کے باپ دل جیت سنگھ کو دیکھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں اور مجھے دیکھ کر میرے پاس آگیا۔ ''ست سری آکال۔'' اس نے سلام کیا۔

''رام رام۔'' میں نے بھی ہندوؤں کے انداز میں جواب دیا۔

وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''معاف کرنا، میری بیٹی نے رات کو تم کو پریشان کر دیا۔'' اس نے کہا۔

''سردار جی! آپ کی بیٹی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑی لمبی کہانی ہے۔'' دل جیت سنگھ نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس کو ہم اسی لیے درشن کے لیے لے کر آئے ہیں کہ شاید اس کا ذہن ٹھیک ہو جائے۔''

''کیا یہ بچپن سے ایسی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں تو۔ یہ بالکل ٹھیک تھی۔ پٹنہ گرلز کالج کی اسٹوڈنٹ۔ ہنسنے بولنے والی لڑکی پھر ایک مسلے سے اس کی دوستی ہو گئی (مسلے سے مراد مسلمان ہے) اور یہ کم بخت اس کے عشق میں پاگل ہو گئی۔ اس سے شادی کرنے جا رہی تھی۔ اپنا دھرم بدلنے والی تھی کہ مہاراج نارائن سے ملاقات ہو گئی۔''

''اور یہ مہاراج نارائن کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے ہی دھرم کے بہت مہان آدمی ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''برسوں پہاڑوں میں رہ کر تپسیا کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اگر دو دنوں کے اندر اس کی شادی نہ کی گئی تو یہ اس مسلمان کے ساتھ بھاگ جائے گی۔''

''پھر تو آپ لوگوں نے اس کی شادی کر دی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، شادی ہی تو نہیں ہوئی۔'' اس نے بتایا۔ ''ویسے سب کچھ طے ہو گیا تھا لیکن مہاراج نے منع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس لڑکی کا بر بلرام پور میں ملے گا۔ اس کو وہیں لے جاؤ اور یہاں سب کو بتا دو کہ شادی ہو گئی ہے۔ ہم نے یہی کیا۔ آنچل کو زبردستی بلرام پور لے آئے۔ یہاں تک تو یہ ٹھیک تھی۔ صرف اتنا تھا کہ اس مسلمان کو یاد کر کے روتی رہتی تھی لیکن دو دنوں سے اس کا دماغ الٹ گیا ہے۔''

دل جیت سنگھ خاموش ہو گیا۔ اس کی کہانی کا یہ حصہ میرے لیے قابلِ اطمینان تھا کہ آنچل کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اور جہاں تک ذہنی توازن کے بگڑنے کی بات تھی تو وہ ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ٹھیک بھی ہو سکتا تھا۔ بشرطیکہ میں اسے اپنے ساتھ نکال لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔

''تو اب آپ کیا کریں گے جناب؟'' میں نے دل جیت سنگھ سے پوچھا۔

''اب آنچل کو مہاراج نارائن کے پاس لے جانا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''انہوں نے بلایا ہے اس کو۔ ان کا آدمی کل ہمارے پاس آیا تھا۔ مہاراج کو کسی طرح پتا چل گیا ہے کہ آنچل پاگل ہو گئی ہے۔ اسی لیے اس کے علاج کے لیے ہمیں مہاراج کے پاس جانا ہے۔''

''اور یہ مہاراج کہاں ملیں گے؟''

''یہاں سے سو کلومیٹر آگے۔'' اس نے بتایا۔ ''برف کے پہاڑوں کے درمیان۔ بدھ بھکشوؤں کی ایک عبادت گاہ ہے۔ اس عبادت گاہ سے بھی چالیس کلومیٹر اوپر مہاراج نارائن کا استھان ہے۔ وہ وہیں رہتے ہیں۔ ہمیں وہیں جانا ہے۔''

''اوہ، یہ تو بہت دور کا سفر ہو گیا۔'' میں نے کہا۔

''ہم بھی یہی سوچ کر پریشان ہو رہے ہیں۔'' دل جیت سنگھ نے بتایا۔ ''ویسے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اپنی بیوی کو یہیں سے واپس بھیج دوں اور خود مہاراج کی طرف روانہ ہو جاؤں لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں اکیلا آنچل کو کیسے لے جاؤں گا؟''

''اور مہاراج نے جس آدمی کو پیغام دے کر بھیجا تھا، وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو مہاراج ہی کے کسی کام سے بنارس کی طرف چلا گیا ہے۔'' دل جیت سنگھ نے بتایا۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ چلوں؟'' میں نے پیشکش کی۔

''تم؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تم اتنا کشٹ کیوں اٹھاؤ گے؟''

''میں ایڈونچر پسند آدمی ہوں جناب۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس قسم کا سفر بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی مہاراج کا درشن کر آؤں گا۔ یہ میرے نصیب کی بات ہو گی۔''

''سوچ لو۔ راستہ بہت خراب ہے۔ ہمیں یاک پر سفر کرنا پڑے گا۔ وہاں بہت زیادہ ٹھنڈ ہو گی۔''

''میں یہ سب جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''سفر آسان نہیں ہو گا لیکن میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' دل جیت سنگھ خوش ہو گیا تھا۔ ''پھر میں آنچل کی ماں کو پٹنہ واپس بھجوا دیتا ہوں۔''

''وہ کیسے واپس جائیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں سے بہت سے یاتری درشن کر کے واپس جا رہے ہیں۔ وہ بھی انہی کے ساتھ چلی

جائے گی۔

☆☆☆

دو دن سفر کے انتظامات میں لگ گئے۔

آنچل کی ماں کو واپس بھیج دیا گیا تھا۔ وہ بے چاری بیٹی کو چھوڑ کر واپس نہیں جانا چاہتی تھی لیکن دل جیت سنگھ نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔

ایسی سچویشن پیدا ہو گئی تھی کہ آنچل کی ماں جاتے جاتے مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ''بیٹا! واہ گرو تمہاری حفاظت کریں تم ہمارا ساتھ دے رہے ہو۔ ہم پر تمہارا احسان ہو گا۔''

''ارے نہیں ماں جی۔ اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔''

کیسی عجیب بات تھی کہ یہ لوگ اپنی بیٹی کو جس آدمی کے خوف سے لے کر بھاگے تھے۔ اب اسی آدمی کے سپرد کر رہے تھے۔ فرق یہ تھا کہ پٹنہ والا آدمی آزاد مسلمان تھا اور اب یہ اسی آدمی کو ہندو سمجھ رہے تھے۔

میں ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

میرے پاس رقم تھی۔ میں نے ایسی چیزیں خرید لیں جو برفانی علاقوں میں کام آتیں۔ سمور کی ٹوپیاں۔ گرم جیکٹس، لانگ شوز۔ جن میں برف پر چلنے کے لیے کیلیں لگی ہوتی ہیں۔ چرمی دستانے اور بھی اسی قسم کی چیزیں۔

اس دوران میں آنچل مجھ سے ملتی رہی تھی لیکن اس پر مکمل خاموشی طاری تھی۔ وہ ویران نگاہوں سے خلا میں دیکھتی رہتی۔

کبھی کبھی ذرا سی دیر کے لیے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی کیفیت پیدا ہوتی پھر غائب ہو جاتی۔ کھویا کھویا پن اس کی شخصیت کا حصہ بن گیا تھا۔

خدا جانے اس کی ایسی کیفیت کیوں تھی۔ مجھے ابراہیم صاحب کی بات یاد آیا کرتی کہ اس لڑکی پر سفلی عمل کر دیا گیا ہے لیکن یہ کیسا سفلی عمل تھا۔

ہوٹل کی لابی میں جب وہ مجھے تنہا دکھائی دیتی تو میں اسے مخاطب کر کے اسے اس پُراسرار ٹرانس سے باہر لانے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ ''آنچل! یاد کرو مجھے۔ پہچانو۔ میں تمہارا آزاد ہوں آنچل! میں نے تم سے محبت کی ہے آنچل۔ تم سے پیار کرتا ہوں۔ تمہاری خاطر بھیس بدل کر پٹنہ سے یہاں تک چلا آیا ہوں۔ ہوش میں آؤ آنچل۔ تمہارا ایسا حال کیوں ہو گیا ہے؟ کس نے تم کو اس حال میں پہنچا دیا ہے۔''

لیکن آنچل خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہتی۔

اس کی حالت دیکھ کر دل پر ایک بوجھ سا آ گیا تھا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا اس کو۔ میں نے آج تک کسی کی ایسی حالت نہیں دیکھی ہو گی کہ کسی کو پہچاننے کی صلاحیت بھی ختم ہو جائے۔

بہرحال، میں اپنی کوششوں میں ناکام ہو گیا تھا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں آ سکی تھی۔

دو دن کے بعد ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ بہت مختصر سا قافلہ تھا۔ صرف... چار افراد پر مشتمل...... میں، دل جیت سنگھ، آنچل کور اور ایک ملازم۔ اس ملازم کا نام رامو تھا۔ اسے بلرام پور ہی سے حاصل کیا گیا تھا جبکہ آنچل کور کی ماں واپس چلی گئی تھی۔

ہمارا سفر یاک پر ہو رہا تھا۔ بلرام پور کے آثار ختم ہونے کے بعد کھیت سامنے آ گئے تھے۔ دور دور تک سرسبز کھیت، جن کے درمیان نیپالی مرد اور عورتیں کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ کھیتوں کے درمیان کچا راستہ بنا ہوا تھا۔ ہمارا سفر اسی راستے پر ہو رہا تھا۔

موسم بے حد خوش گوار ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے، ٹھنڈ کا احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ابھی تک برفانی علاقے شروع نہیں ہوئے تھے۔

راستے میں قافلے بھی ملتے رہے تھے۔ یہ قافلے یا تو بلرام پور کی طرف جا رہے ہوتے یا پھر کسی اور سمت جاتے دکھائی دیتے۔ دوپہر کے وقت ہمیں ایک ڈھابا دکھائی دے گیا۔

تنکوں سے بنے ہوئے اس ڈھابے کے باہر تخت بچھے ہوئے تھے۔ رامو نے چاروں یاکوں کو ایک طرف باندھ دیا اور ہم تختوں پر بیٹھ گئے۔ دل جیت سنگھ نے کھانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

آنچل معمول کے مطابق بالکل خاموش تھی۔ بس وہ کبھی کبھی اس طرح میری طرف دیکھنے لگتی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر سر جھکا لیتی۔

دل جیت سنگھ پر بھی خاموشی طاری تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''سردار جی! آپ یہ بتائیں۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کی بیٹی وہاں جا کر ٹھیک ہو جائے گی؟''

''ہاں پورا یقین ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کیونکہ مہاراج نے بھی پیغام بھیجا ہے کہ آنچل کو لے کر

سیدھا اس کے استھان پر آجاؤ۔‘‘
اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس لیے میں خاموش ہو گیا۔ اس دوران میں کھانا بھی آ گیا۔ سادہ دال اور چاول، اچار کے ساتھ لیکن بہت لذیذ۔ سب سے لذیذ کھیر تھی جو یاک کے دودھ سے بنائی گئی تھی۔
کھانے کے بعد ہم پھر روانہ ہونے لگے تو ڈھابے کے مالک نے پوچھا۔ ’’تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟‘‘
’’بدھ جی کی عبادت گاہ سے اوپر۔ مہاراج نارائن کے استھان پر۔‘‘ دل جیت نے جواب دیا۔
’’وہ تو بہت دور ہے۔‘‘
’’ہاں دور تو ہے لیکن ہمارا جانا بہت ضروری ہے۔‘‘
’’میری مانو تو رات یہیں گزار لو۔‘‘ ڈھابے کے مالک نے کہا۔ ’’اس راستے پر رات کے وقت بہت باگھ (شیر) آجاتے ہیں۔ کئی یاتری مارے جا چکے ہیں اور تمہارے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔‘‘
دل جیت سنگھ نے مجھ سے مشورہ کیا۔ ڈھابے کے مالک نے شیروں کے خطرے کے بارے میں بتایا تھا، ہم ویسے بھی خالی ہاتھ ہی تھے۔ اگر شیر ہمارے سامنے آجاتے تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔
اس کے علاوہ شام کے چار بج رہے تھے کچھ ہی دیر بعد اندھیرا بھی ہو جاتا۔ پہاڑی علاقوں میں رات بہت جلدی اتر آتی ہے۔
ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اس شخص کی بات مان لی جائے پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ’’کیا تمہارے ڈھابے کی طرف باگھ نہیں آتے؟‘‘
’’آتے ہیں لیکن ہم لوگ رات بھر آگ جلائے رکھتے ہیں۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’وہ دور سے ہی شور کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔‘‘
پھر یہی طے ہوا کہ ہم رات وہیں گزاریں گے۔ اس ویرانے میں رات گزارنا بھی ایک نیا اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔ سر پر تاروں بھرا آسمان، سردی، اور ہم تخت پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر چاروں طرف آگ روشن کر دی گئی تھی۔ گویا ہم آگ کے وسط میں تھے۔
ہماری ہمت کچھ یوں بھی بڑھ گئی تھی کہ ایک اور قافلہ بھی رات گزارنے کے لیے وہاں ٹھہر گیا تھا۔ یہ لوگ چنبل گھاٹی کی طرف جا رہے تھے جس کا راستہ بلرام پور سے دائیں طرف تھا۔

رات کے وقت دو بار شیروں کی دہاڑ سنائی دی تھی لیکن وہ ہمارے قریب نہیں آئے تھے۔ بالآخر نہ جانے کس وقت کروٹیں بدلتے بدلتے نیند آ ہی گئی تھی۔
صبح کسی کے جھنجوڑنے پر بیدار ہوا۔ دل جیت سنگھ بہت بوکھلائے ہوئے انداز میں مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔
’’کیا ہوا سردار جی؟‘‘ میں نے اٹھ کر پوچھا۔
’’شرما جی! آنچل کور غائب ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔
’’اس کا پتا نہیں چل رہا۔‘‘

☆☆☆

یہ ایک بھیانک خبر تھی۔
میری نیند اور سستی اس خبر کو سنتے ہی ہوا ہو گئی تھی۔ میں تڑپ کر تخت سے نیچے اتر آیا۔ اس وقت صبح ہو گئی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں وہاں کی خوب صورت ہوا سے ضرور لطف اندوز ہوتا لیکن اس وقت تو اس خبر نے ہوش اُڑا دیے تھے۔
’’میری آنکھ کھلی تو آنچل اپنے تخت پر نہیں تھی۔‘‘ دل جیت سنگھ بتا رہا تھا۔ ’’میں نے تمہیں اٹھائے بغیر اسے اِدھر اُدھر تلاش کیا لیکن جب وہ نہیں مل سکی ہے تو پھر تمہیں جگا دیا۔‘‘
’’رامو کہاں ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’اسے میں نے تلاش کرنے بھیجا ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’نہ جانے کیا ہوا ہوگا اس کے ساتھ۔‘‘
’’گھبرائیں نہیں، وہ آجائے گی۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’مل جائے گی وہ۔ وہ کہیں نہیں جا سکتی۔‘‘ میں نہیں جانتا کہ میں کس جذبے کے تحت یہ سب کہہ رہا تھا۔
اب میں اس کی تلاش میں روانہ ہونے ہی والا تھا کہ رامو آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ آنچل بھی اس کے ساتھ تھی۔
وہ کسی معصوم بچے کی طرح خاموشی سے گردن جھکائے چلی آ رہی تھی۔ دل جیت سنگھ نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا۔ ’’بابا کی جان، تو کدھر چلی گئی تھی؟‘‘
آنچل خاموش رہی تھی۔ رامو نے بتایا کہ وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے پر بیٹھی پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔
آنچل کو واپس آتا دیکھ کر میرے سینے سے بوجھ سا اتر

گیا تھا اور اب احساس ہو رہا تھا کہ اس جگہ کی صبح کتنی خوب صورت ہے۔ کتنے رنگ برنگے پرندے آس پاس پھدکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ڈھابے والے بھی بیدار ہو گئے۔ انہوں نے لکڑی کے چولھے جلا لیے تھے۔ چولھوں سے اٹھتا ہوا دھواں اس ماحول میں بہت خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔

ناشتا بھی بہت لذیذ تھا۔ گھی کی روٹیاں اور انڈے پھر گرما گرم چائے نے مزہ دوبالا کر دیا تھا۔ اس صبح آنچل اور بھی خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

میرے لیے یہ احساس ہی بہت تھا کہ وہ جہاں جا رہی ہے۔ میں اس کے ساتھ ہوں۔ میں نے اس سفر میں اسے تنہا نہیں چھوڑا ہے۔ اس کی قربت میں بے حد خوش تھا۔

ناشتے کے بعد ہم نے ڈھابے والے کو پیسے ادا کیے۔ ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ بہت دیر سفر کے بعد کھیتوں کے سلسلے ختم ہو گئے تھے اور اب پتھریلے راستے تھے۔ یہ کہنا چاہیے کہ ہم بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں پہنچ چکے تھے۔

دشواریوں کا اصل سفر یہاں سے شروع ہونے والا تھا۔ دوپہر کے وقت ہم ایک جگہ کھانا کھانے کے لیے رک گئے۔ میں نے شاید یہ تذکرہ نہیں کیا ہے کہ ہم اپنے ساتھ سفر کے لیے کھانے پینے کا سامان بھی لے آئے تھے۔ کھانے کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔

رامو اور دل جیت سنگھ ٹہلتے ہوئے کسی طرف چلے گئے تھے۔ میں نے تھرماس سے اپنے لیے چائے انڈیلی اور اسی وقت آنچل بول پڑی۔ ”آزاد! کھانے کے بعد چائے کی عادت نہیں گئی۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آنچل! تم نے مجھے پہچان لیا؟“

لیکن وہ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ صرف ایک لمحے کی۔ اب اس کے چہرے پر وہی بے نیازی تھی اور اس کی آنکھوں میں اجنبیت کی وہی کیفیت۔ میں پاگلوں کی طرح اس سے پوچھ رہا تھا۔ ”آنچل! بتاؤ مجھے...... تم نے مجھے پہچان لیا ہے نا۔ جانتی ہو نا مجھے...... بتاؤ آنچل؟“

لیکن اب وہ پھر خاموش تھی۔ جیسے ایک لمحے کے لیے کوئی ہوا اس کی یادداشت کو چھوتی ہوئی چلی گئی ہو۔ ذرا سی دیر کے لیے اسے کچھ یاد آیا ہو پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔

بہت دل دکھا تھا میرا۔ کاش اسے مکمل طور پر ہوش آ جاتا۔ اس کی یادداشت بحال ہو جاتی تو یہ سفر یہیں اپنے اختتام کو پہنچ جاتا۔ میں یہیں سے آنچل کو لے کر واپس چلا جاتا۔ لیکن ابھی تو قسمت میں بہت کچھ دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔

سفر ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ اس مرحلے کا سفر اور بھی دشوار اور خطرناک تھا۔ اب ہم بلندی پر جا رہے تھے اور ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔

ہم چاروں نے گرم کپڑے نکال لیے تھے۔ بے چاری آنچل تو شاید موسم کی نمی اور سختی سے بھی بے نیاز ہو چکی تھی۔ شاید موسم کا اثر صرف جانوروں پر نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ ان کی پیدائش ہی ان علاقوں میں ہوئی تھی۔ وہ مقامی جانور تھے لیکن ہم مقامی نہیں تھے بلکہ ہم تو مجبوراً یا پھر جنونی کیفیت میں مبتلا ہو کر اس طرف آ نکلے تھے۔

شام سے پہلے ہمیں ایک اور ڈھابا مل گیا۔ یہ بھی نیپالی کا تھا لیکن اس نے ہندوستان میں کئی برس گزارے تھے اسی لیے بہت اچھی ہندی یا اردو بول اور سمجھ لیتا تھا۔

اس نے فوراً ہمارے سامنے گرما گرم چائے لا کر رکھ دی تھی۔ ہمارے یخ زدہ اعصاب گرم چائے پی کر کچھ قابو میں آ گئے تھے۔

وہ بھی ہمارے پاس ہی آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ”ہاں بھائی سجنو! کہاں کے ارادے سے نکلے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

دل جیت سنگھ نے اسے اپنی منزل بتا دی تھی۔

”راستہ بہت خطرناک ہوتا جائے گا۔“ اس نے بتایا۔ ”بہت بلندی پر بھکشوؤں کا ایک پگوڈا ہے۔ وہ لوگ تمہیں آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔“

”کیا مطلب؟“ ہم چونک پڑے۔ ”کیا وہ اچھے لوگ نہیں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت اچھے لوگ ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”بہت نیک، بہت پیار کرنے والے اور بلا کے مہمان نواز۔ جب یاتری ان کی طرف پہنچتے ہیں تو وہ ان کی خاطر میں لگ جاتے ہیں۔ انہیں کئی کئی دنوں تک روک کے رکھتے ہیں۔ یہ بھی ان کا دھرم ہے۔ ان کی تپسیا کا حصہ ہے۔“

”اوہ، ہم تو کچھ اور سمجھے تھے۔“ دل جیت سنگھ نے کہا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ تم لوگوں کو وہاں جا کر سکون محسوس ہوگا۔ اب یہ بتاؤ، رات کہاں گزارنے کا ارادہ ہے؟“

''ظاہر ہے کہ رات تمہارے ڈھابے پر گزرے گی۔'' میں نے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ اب میں تم لوگوں کے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

اس رات کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ دوسری صبح ناشتے کے بعد ہم نے پھر اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ اب ٹھنڈ ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے موسم کا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ ذہن پر ایک دھندسی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے خیالات تک منجمد ہو کر رہ گئے ہوں۔

اب ایسے راستے تھے کہ مجھے چکر آنے لگے تھے۔ انتہائی تنگ، ایک طرف اونچے پہاڑ اور دوسری طرف گہری کھائیاں۔ ہمیں اسی تنگ راستے پر یاک پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑ رہا تھا۔

ہاں، میں یہ بتانا بھول ہی گیا کہ ہم نے ایک ڈھابے سے ایک مقامی مزدور اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ جو ان راستوں سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔

اسی نے مشورہ دیا تھا۔ ''شاپ! اب تم لوگ جانوروں شے اتر جاؤ۔ یہاں سے پاؤں پاؤں چلو۔ ورنہ یاک بگڑ جائے تو سیدھا نیچے چلے جاؤ گے۔''

''کیا یاک بگڑ بھی جاتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں شاپ! کبھی کبھی ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔''

اس کا مشورہ مان لیا گیا۔ ہم کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ آنچل جیسی لڑکی ہمارے ساتھ تھی۔ اس کو پیدل چلتا دیکھ کر افسوس تو ہو رہا تھا لیکن ہمارے پاس کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ہم قدم قدم پر دھواں نکالتے چلے جا رہے تھے۔ سردی کی شدت ایسی تھی کہ شاید ہماری گفتگو بھی بھاپ بن بن کر اڑ رہی ہوگی۔

آنکھوں کے آگے برفانی دھند چھائی ہوئی تھی۔ چند قدم کے فاصلے کی چیز دیکھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ ایسی صورت میں اگر ذرا سی بھی اندازے کی غلطی ہوتی تو ہم نہ جانے کہاں سے کہاں چلے جاتے۔

اچانک ایک حادثہ پیش آ ہی گیا۔

یہ حادثہ ہمارے ساتھ نہیں بلکہ ایک یاک کے ساتھ پیش آیا تھا۔ نہ جانے اسے کس چیز کی ٹھوکر لگی تھی کہ وہ خود کو سنبھال نہیں پایا اور گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔

ہم سب دم بخود رہ گئے تھے۔ یہ اچھا تھا کہ اس وقت اس پر کوئی سوار نہیں تھا۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں تھیں جو اس یاک کے ساتھ ہی نیچے چلی گئی تھیں۔

اس وقت بھی میں نے آنچل کے چہرے پر بے نیازی کے تاثرات دیکھے تھے۔ جیسے اس حادثے کا اس پر کوئی اثر ہی نہ ہوا ہو جبکہ میں، دل جیت سنگھ اور رامو سہم کر رہ گئے تھے۔

بہرحال ہمارا سفر پھر شروع ہوا۔ اس بار ہماری رفتار بہت سست اور بہت محتاط تھی۔ ہم اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو آنچل کا خیال تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور بہت احتیاط سے اسے آگے بڑھا رہا تھا۔

پھر اس گائڈ نے بتایا۔ ''شاب! کچھ دور ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ کھلی جگہ ہے۔ ہم کو رات اُدھر رکنے کا ہوگا۔ کیونکہ تھوڑا دیر میں شام ہو جائے گا شاب اور اندھیرے میں شفر نہیں ہو سکتا۔''

اس گائڈ کا مشورہ بالکل درست تھا۔ اس نے اپنا نام کرت بتایا تھا۔ نیپال کے لوگ س کی جگہ ش بولا کرتے ہیں۔ یہ عام طور پر بدھ مت کے پیروکار ہوتے ہیں لیکن دوسری دیوی دیوتاؤں کو بھی یاد کر لیا کرتے ہیں جیسے راستے کا دیوتا۔ پہاڑوں کا دیوتا اور برف کی دیوی وغیرہ۔

کچھ سفر کے بعد شام ہونے لگی اور پہلا پڑاؤ بھی سامنے آ گیا۔ خدا کی پناہ کیسا ہولناک مقام تھا۔ ایسی خاموشی کہ خود اپنی سانسیں بھی گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

حدِنگاہ تک برفیلے پہاڑ اور سنسناتی ہواؤں کے درمیان ہمارا چھوٹا سا قافلہ گامزن تھا۔ جس کو اس اجنبی اور انجان مقام پر رات گزارنی تھی۔

واقعی محبت میں کتنی طاقت ہوا کرتی ہے۔ یہ اپنے ساتھ بہا کر کہاں کہاں لے جاتی ہے۔ ورنہ میرا ایسے مقام سے کیا تعلق تھا۔

کہاں خدا بخش خان کی لائبریری میں کام کرنے والا شخص۔ کہاں پٹنہ کے شب و روز اور کہاں سیکڑوں میل دور پہاڑوں کے درمیان یہ حیرت انگیز اور بھیانک مقام۔

یہ سب محبت ہی کے تو کرشمے تھے۔ وہی تو مجھے اپنے ساتھ یہاں تک لے آئی تھی۔

ہم اپنے ساتھ پڑاؤ کے لیے خیمے وغیرہ لے کر آئے تھے۔ یہ خیمے چاروں طرف سے بند ہو گئے تھے۔ اس کے

باوجود تیز اور سرد ہواؤں نے منجمد کر کے رکھ دیا تھا۔

ساری رات کچھ سوتے اور کچھ جاگتے ہوئے گزر گئی تھی۔

صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ اب ہم برفیلے پہاڑوں پر چڑھ رہے تھے۔ نہ جانے اس کم بخت مہاراج نے اپنا استھان ایسی جگہ کیوں بنایا تھا۔

آنچل کی کیفیت اب کچھ تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے اس کے چہرے پر جس قسم کی بے نیازی اور بے حسی تھی اب وہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔

مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ اردگرد کے ماحول میں دلچسپی بھی لے رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک چمک سی دکھائی دیتی۔ بس ذرا سی دیر کے لیے۔ یہ بھی غنیمت ہی تھا۔

پھر اچانک تھوڑے سے سفر کے بعد بدھ پگوڈا یا عبادت گاہ سامنے آگئی۔

وہ عبادت گاہ اس طرح سامنے آئی تھی جیسے اچانک کوئی کسی آڑ سے نکل کر سامنے آ کر کھڑا ہو جائے۔ وہ عبادت گاہ دو پہاڑیوں کی اوٹ میں تھی۔ ہم ان پہاڑیوں سے گھوم کر سامنے آئے اور وہ عبادت گاہ شریر بچے کی طرح سامنے آگئی۔

گھنٹے بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی زور زور سے پیتل کی گھنٹیوں کو بجا رہا ہو۔ ”یہ کیا ہے کرت؟“ میں نے نیپالی گائڈ سے پوچھا۔

”شاید... ان لوگوں نے ہم کو دیکھ لیا ہے۔“ کرت نے بتایا۔ ”وہ ایک دوسرے کو بتا رہا ہے کہ کچھ مسافر لوگ اس طرف کو آ رہا ہے۔“

”کس طرح دیکھ لیا؟“ دل جیت سنگھ نے پوچھا۔

”رام جانے۔“ کرت نے مختصر سا جواب دے دیا۔

”کرت بدھسٹ ہونے کے باوجود رام اور بھگوان وغیرہ جیسے الفاظ بولتا رہتا تھا۔ یہ شاید ماحول اور محبت کا اثر تھا۔

ہم جیسے جیسے اس پگوڈا کے قریب ہوتے جا رہے تھے، ہماری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ خدا جانے اس ویران اور دور افتادہ مقام پر ایسی عمارت کس طرح بنائی گئی ہوگی۔

یہ عمارت پتھروں کی بنی ہوئی تھی اور اس کے کٹاؤ دکھائی دے رہے تھے۔ یہ کچھ بلندی پر تھی اور اوپر جانے کے لیے پتھر کی چوڑی چوڑی سیڑھیاں تھیں۔

اور ہر سیڑھی پر ایک بدھ بھکشو پتھر کے کسی مجسمے کی طرح خاموش اور بے حرکت کھڑا ہوا تھا۔ ہم اوپر بڑھتے رہے۔ سب سے اوپری سیڑھیوں پر اس پگوڈا کا نگراں کھڑا تھا۔

ان سبھوں کے لباس ایک جیسے تھے۔ گیروے رنگ کی چادر اور بالوں سے محروم سر۔ نہ جانے اس ویرانے میں زندگی کس طرح گزارتے ہوں گے۔

انہوں نے بہت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ ہم دو دن وہاں رکے رہے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ہم کچھ اور دن ان کے ساتھ رہیں لیکن ہمیں تو آگے جانا تھا۔

نہ جانے کس امید پر دل جیت سنگھ نے یہ سفر اختیار کیا تھا اور نہ جانے میں کس امید پر ان کے ساتھ چلا آیا تھا۔ دنیا کا کارخانہ اسی طرح چلتا ہے۔

پگوڈا... میں قیام کے دوران میں کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ سب ٹھیک تھا۔ لیکن وہاں سے روانگی کے دوسرے ہی دن آنچل کور غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ہم نے پگوڈا سے کچھ فاصلے پر ایک اور پڑاؤ کیا تھا۔ یہاں ٹھنڈ اتنی تھی کہ اپنے سفری بیگ سے چہرہ نکالنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس سرد موسم اور بھیانک اندھیرے میں آنچل غائب ہو چکی تھی۔

اس کے غائب ہونے کا پتا صبح کو چلا تھا۔ سب سے پہلے رامو نے خبر دی تھی۔ پھر ہم سب پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتے رہے لیکن اس کا سراغ نہیں مل سکا۔

نیپالی گائڈ کا کہنا تھا۔ ”شاب! وہ بے چاری رات میں اٹھی ہوگی اور اندھیرے میں کسی کھائی میں گر گئی ہوگی۔ آپ جانتے ہی ہیں شاب! یہ کھائیاں سیکڑوں فٹ گہری ہیں۔“

یقین نہیں آ رہا تھا کہ آنچل کور کا ایسا انجام بھی ہو سکتا ہے۔ اسے اتنی دور آ کر ایسی المناک موت نصیب ہوگی۔ دل جیت سنگھ کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح چاروں طرف آوازیں لگاتا پھر رہا تھا۔ ”آنچل، آنچل۔“

لیکن اس کی آواز سننے والی تو نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔

خود میرا یہ حال تھا کہ مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ آنچل کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ملاقاتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ

خواب یاد آرہے تھے۔ جو ہم دونوں نے مل کر دیکھے تھے۔ وہ وعدے یاد آرہے تھے جو ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے کیے گئے تھے۔

رامو اور کرت بھی رو رہے تھے۔ خود میں بھی رو رہا تھا۔ شاید پورا ماحول اس الم ناک صورتِ حال پر رو رہا تھا۔

پھر ہم مایوس ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ شاید کسی کے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ دل جیت سنگھ پر تو سکتے کی کیفیت تھی۔ اس وقت پتا چل رہا تھا کہ یہ شخص اپنی بیٹی سے کتنی محبت کرتا تھا۔

پھر دل جیت سنگھ نے ہماری طرف دیکھا۔ ''رامو، کرت، موہن، تم چاہو تو یہاں سے واپس جا سکتے ہو۔ یہ سفر تو ختم ہو گیا۔''

''آپ نہیں جائے گا شاب؟'' کرت نے پوچھا۔

''نہیں کرت۔ میں مہاراج کے استھان تک جاؤں گا۔'' دل جیت نے بتایا۔ ''مہاراج سے اس کی آتما کی شانتی کے لیے پرارتھنا کرواؤں گا۔ کاش میں نے آنچل کی بات مان لی ہوتی۔''

''کون سی بات سردار؟'' میں نے پوچھا۔

''اب آنچل شاید اس دنیا میں نہیں رہی۔ سارا کھیل ہی ختم ہو گیا ہے اس لیے آج بتا رہا ہوں کہ اس بدنصیب لڑکی نے ایک مسلمان سے محبت کی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی پھر جگدیش ہمارے پاس آ گیا۔''

''یہ جگدیش کون تھا سردار؟'' میں نے پوچھا۔

''مہاراج نارائن کا خاص آدمی۔ اس نے کہا کہ اس مسلمان نے اس لڑکی پر جادو کروایا ہے..... بہت خطرناک قسم کا اور اس کا توڑ صرف مہاراج نارائن ہی کر سکتے ہیں۔ اس لڑکی کو راتوں رات یہاں سے مہاراج کے پاس بھجوا دو۔ ورنہ یہ خود غائب ہو جائے گی۔ ہم اتنا بوکھلا گئے کہ اسی وقت ہم نے بلرام پور کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔''

''سردار جی! کیا آپ نے اس مسلمان لڑکے کو دیکھا تھا؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی۔ ''یہی تو کہہ رہا ہوں کہ کاش میں نے آنچل کی بات مان لی ہوتی۔ وہ مجھ سے کہتی ہی رہ گئی کہ میں اس سے ملاقات کر لوں لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی۔''

''اور آنچل کور کی ذہنی حالت کب خراب ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''بس جگدیش کے جانے کے بعد ایک شام مہاراج نارائن بھی ہمارے گھر آ گئے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ میری بیٹی ایک مسلمان کو پسند کرنے لگی ہے۔ انہوں نے پانی پر کچھ پڑھ کر دیا کہ آنچل کو پلا دو پھر وہ واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہی آنچل کی ایسی حالت ہو گئی۔ جیسے وہ کسی کو جانتی ہی نہ ہو۔ اس کی بدنامی کے ڈر سے ہم نے یہ مشہور کرا دیا کہ اس کا بیاہ ہو گیا ہے اور ہم یاترا کے لیے بلرام پور جا رہے ہیں۔''

''سردار جی! آپ یہاں سے آگے کی طرف سفر کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے شاید خود میری زندگی کا مقصد ختم ہو گیا ہو اسی لیے میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔''

''اور سردار جی میں بھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔'' رامو نے کہا۔ ''کیونکہ اس وقت آپ بہت پریشان ہیں۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آگے جو ہماری قسمت۔''

''اور شالا اب ہم کدھر جائے گا۔'' کرت نے کہا۔

''جدھر تم ادھر ہم۔''

دل جیت سنگھ ہم سبھوں کا بے حد مشکور دکھائی دینے لگا تھا۔ ویسے یہ اچھا ہوا تھا کہ نیپالی گائڈ ہمارے ساتھ رہ گیا تھا۔ ورنہ ہم ان راستوں پر سفر نہیں کر سکتے تھے۔

اس رات ہم وہیں رہ گئے۔

کتنی خالی رات تھی۔ سب کچھ وہی تھا۔ سر پر تاروں بھرا آسمان..... بدن میں اترتی ہوئی سرد ہوائیں۔ صرف آنچل ہی نہیں رہی تھی۔

یہ کیسی عجیب بات تھی کہ جو اس سفر کا محرک تھی جس کی وجہ سے ہم نے یہ سفر اختیار کیا تھا، وہی نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود ہم آگے جا رہے تھے۔ آخر کیوں؟

پھر اس رات ایک عجیب بات ہوئی۔ شاید یہ میرا وہم تھا یا کسی قسم کا احساس منجمد ہو کر سامنے آ گیا تھا۔ میں اس وقت نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں تھا۔ جب میں نے آواز سنی۔ یہ آواز آنچل کی تھی۔ سو فیصد آنچل کی آواز تھی۔ جو مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ''آزاد...... آزاد...... مجھے چھوڑنا نہیں۔ مجھے ساتھ لے جانا...... آزاد''

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ چھولداری سے باہر آ گیا۔
یہاں ہواؤں کی شائیں شائیں اور سناٹے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ آزاد...... مجھے چھوڑنا نہیں۔
نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں نے جو آواز سنی، وہ میرا واہمہ نہیں تھا بلکہ آنچل زندہ ہے۔ شاید قریب ہی۔
یہ ایک ایسا خیال تھا جس سے مجھے تقویت مل گئی۔ دل کو ایک طرح کا اطمینان ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے نیند بھی آ گئی تھی۔ دوسری صبح میں نے دل جیت سنگھ سے کہا۔
''سردار جی! میں ایک بات بتاؤں۔ تمہاری بیٹی آنچل مری نہیں ہے، زندہ ہے۔''
''زندہ ہے؟'' دل جیت نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ؟ تمہیں کیسے معلوم کہ وہ زندہ ہے؟''
''سردار جی! میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ زندہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''رہی یہ بات کہ وہ کہاں ہے تو میں یہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔''
''واہ گرو تمہارے دل کی بات سچی کر دیں۔'' دل جیت سنگھ دھیرے سے بولا۔
''سردار جی! ہو سکتا ہے کہ مہاراج ہمیں اس کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔'' میں نے کہا۔ ''چمتکار تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے آنچل کے ساتھ بھی کچھ ایسی بات ہو گئی ہو۔''
''ہاں پُتر! ہمیں جلدی مہاراج کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔''
ایک دفعہ پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ یہ سفر اور بھی زیادہ خطرناک اور دشوار تھا۔ اب ہم برف پر چل رہے تھے۔ اگر ہمارے جوتے خاص انداز کے نہیں ہوتے تو ہم برف پر پھسل بھی سکتے تھے۔
نیپالی گائڈ ہمارے بہت کام آ رہا تھا۔ اگر وہ نہیں ہوتا تو شاید ہم سے یہ سفر بھی نہیں ہو پاتا۔ بالآخر اس شام ہم مہاراج نارائن کے استھان پر پہنچ ہی گئے۔
یہ ایک حیرت انگیز اور دہشت زدہ کر دینے والی عمارت تھی۔ دراصل یہ ایک مندر تھا جس کو کالی اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ خدا جانے اینٹیں کس طرح کالی کی گئی تھیں لیکن سفید برفانی بیک گراؤنڈ کے ساتھ کالے رنگ کی یہ پُراسرار اینٹیں خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔

مندر کے دروازے ہی پر سر کے بالوں سے محروم ایک شخص گیروی دھوتی باندھے کھڑا ہوا تھا۔ خدا جانے وہ ایسے سرد موسم میں اتنے ہلکے کپڑوں کے ساتھ کس طرح زندہ تھا۔

''یہ جگدیش ہے۔'' دل جیت سنگھ نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ''مہاراج کا خاص آدمی۔''

جگدیش ہمیں دیکھ کر جلدی سے ہمارے پاس آ گیا۔

''مہاراج کے استھان پر آنا مبارک ہو۔ مہاراج نے تمہارے سواگت کے لیے بھیجا ہے مجھے۔''

''جگدیش! ہم ایک بہت بُری خبر لے کر آئے ہیں۔'' دل جیت سنگھ نے کہا۔

''معلوم ہے۔ مہاراج نے بتایا ہے۔ تمہاری بیٹی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ وہ گہری کھائی میں گر گئی ہے۔''

نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے وہ شخص مکاری سے بول رہا ہے۔ اس کے من میں کوئی اور بات ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہم سوائے خاموش رہنے کے اور کیا کر سکتے تھے؟

''چلو تم لوگ، مہاراج تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' جگدیش نے کہا۔

ہم اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس سیاہ گھٹے ہوئے مندر میں داخل ہو گئے۔ اس کمرے میں دیے جل رہے تھے جن کی ناکافی روشنی اس مقام کے ماحول کو اور بھیانک بنا رہی تھی۔

اس ماحول سے زیادہ بھیانک وہ مہاراج تھا جو ایک بڑی مورتی کے سامنے ایک چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔

خدا کی پناہ! کیا آدمی تھا ایسا لگتا تھا جیسے اندھیرے کو تراش کر انسان کی شکل دے دی گئی ہو۔ سیاہ، موٹا، توند نکلی ہوئی، چہرے پر چیچک کے گہرے نشانات اور بے پناہ چمکتی ہوئی آنکھیں۔

دل جیت سنگھ اسے ڈنڈوت کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ اس مہاراج کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ میرا ایکسرے لے رہا ہو۔ اس وقت مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

''دل جیت یہ کون ہے؟'' مہاراج نے اپنی گونجتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''مہاراج یہ موہن شرما ہیں۔'' دل جیت نے کہا۔ ''یہ بھی پٹنہ کے رہنے والے ہیں اور میرا ساتھ دینے کے لیے اتنی دور کا کشٹ اٹھا کر یہاں تک آئے ہیں۔''

''ہوں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں...... ورنہ......'' مہاراج اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

مجھے اپنے بدن میں سنسنی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کم بخت شاید میرے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا۔

''دل جیت تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' مہاراج نے پوچھا۔ ''جبکہ تمہاری بیٹی پرلوک سدھار چکی ہے۔''

''مہاراج میں آپ سے پرارتھنا کے لیے کہنے آیا ہوں۔'' دل جیت نے کہا۔ ''تاکہ اس کی آتما کو شانتی مل جائے۔''

''مل جائے گی شانتی۔'' مہاراج نے اپنا ہاتھ اٹھا دیا پھر میری طرف دیکھا۔ ''نوجوان! کیسے تماشے لے کر میرے پاس آئے ہو؟''

''مہاراج! میں کیا تماشے لا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میری حیثیت ہی کیا ہے۔ مجھے تو آپ کے درشن کی خواہش یہاں تک لے آئی ہے۔''

''درشن۔'' مہاراج زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کا قہقہہ بھی اتنا ہی بھیانک تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ''جگدیش!'' اس نے اپنے آدمی کی طرف دیکھا۔

''جی مہاراج۔''

''جاؤ اپنے مہمانوں کے بھوجن اور آرام کرنے کا بندوبست کرو۔'' مہاراج نے کہا۔ ''ان بے چاروں کو کل صبح پھر سفر کرنا ہے۔''

اس کی اس بات کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں کل صبح یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔

''تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔'' جگدیش نے کہا۔

وہ ہمیں مندر کے عقبی حصے کی طرف لے آیا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے جن کے بارے میں اس نے بتایا کہ مہاراج کے درشن کے لیے آنے والے انہی کمروں میں قیام کرتے ہیں۔

ایک کمرے میں رامو اور نیپالی کو ٹھہرایا گیا جبکہ دوسرا کمرا مجھے اور دل جیت سنگھ کو دیا گیا تھا۔ دل جیت سنگھ اس وقت بہت بددل ہو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''موہن! سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم یہاں کیوں آ گئے جبکہ آنچل کی کہانی تو وہیں ختم ہو گئی تھی؟''

''ہاں بظاہر تو ایسا ہی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ قدرت

ہمیں یہاں لانا چاہتی ہو۔"

دل جیت سنگھ نے پھر کچھ نہیں کہا۔ اس بے چارے کی بات بھی درست تھی۔ آخر ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ کیا رکھا تھا یہاں، ایک بھیانک شکل کے مہاراج کے علاوہ۔

ہم لوگوں کے لیے بھوجن لایا گیا۔ اُبلے ہوئے چاول اور یاک کے دودھ کا دہی۔ یہ کھانا جگدیش ہی لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ مہینے میں ایک بار بلرام پور جا کر سامان خرید کر لے آتا ہے اور یاک انہوں نے پال رکھا ہے جس کا دودھ اور دہی ان کے کام آتا ہے۔

بالآخر رات ہوگئی۔

دل جیت سنگھ، آنچل کی باتیں کرتا، اسے یاد کرتا ہوا سو گیا۔ جبکہ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک بستر پر کروٹ بدلنے کے بعد میں دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

اوہ، کیا سردی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے پورے بدن میں سوئیاں اتر گئی ہوں۔ بے پناہ سردی اور بے پناہ اندھیرا۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا، کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ ایک منحوس قسم کی تاریکی اور سناٹے کے سوا۔ پھر اچانک ایک روشنی نظر آگئی۔

یہ روشنی مندر کے کمرے میں ہو رہی تھی۔ وہ بھی اس وقت پتا چلا تھا جب میں عقبی حصے سے سامنے کی طرف آیا تھا۔

نہ صرف روشنی بلکہ دھیمے سُروں میں کچھ بھجن وغیرہ گانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ مندر کا دروازہ بند تھا۔ بہت پُراسرار سا ماحول ہو رہا تھا۔

میں سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر آیا۔ دروازے میں اتنی درز موجود تھی کہ میں بہ آسانی جھانک کر اندر کی صورتِ حال دیکھ سکتا تھا۔

اندر تین چار آدمی تھے۔ ان میں جگدیش اور اس مہاراج کے علاوہ دو اور بھی تھے۔ جو پہلی دفعہ دکھائی دیے تھے۔ مہاراج نے عجیب سا لباس پہن رکھا تھا۔ ایک پگڑی اس کے بے ڈھنگے سر پر تھی اور اس نے ایک دھوتی باندھ رکھی تھی۔ ایک شلوکا بھی تھا۔

چوکی کے پاس تھال میں آگ بھڑک رہی تھی اور اس چوکی پر کوئی عورت یا لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ عورت یا لڑکی ہونے کا اندازہ فوراً ہی ہو گیا تھا۔

اور جب اس آگ کی لَو اس کے چہرے پر پڑی تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ آنچل کور تھی۔

☆☆☆

آنچل کور کو دلہن بنا کر بٹھا دیا گیا تھا۔

سرخ ساڑی میں لپٹی ہوئی وہ بہت حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر بندیا دمک رہی تھی اور الاؤ کی روشنی میں خود اس کا چہرہ بھی دمک رہا تھا۔ اس کے برابر میں ایک بڑا سا خنجر رکھا ہوا جس کی نوک پر ایک پھول اٹکا ہوا تھا۔

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔

میں نے جو محسوس کیا تھا کہ آنچل زندہ ہے تو یہ غلط نہیں تھا۔ میں نے اس کی جو آواز سنی تھی، وہ میرا واہمہ نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے کہ آنچل نے اپنی ذہنی کیفیت سے بیدار ہو کر مجھے آواز دی ہو۔ قدرت نے کسی طرح اس کی آواز مجھ تک پہنچا دی ہو۔

وہ کم بخت مہاراج آنچل سے شادی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ خدا ہی جانے کہ اس نے کس طرح آنچل کو یہاں بلایا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا آدمی جگدیش رات کے اندھیرے میں اسے اٹھا کر لے آیا ہو۔

بہرحال جو بھی ہو، اس وقت آنچل میرے سامنے تھی اور وہ مکروہ شخص اس سے شادی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں دل جیت سنگھ کو بلا کر لاتا نہ مجھ میں اتنی طاقت تھی کہ میں اکیلا ان کم بختوں کا مقابلہ کرسکتا۔

اس کے باوجود یہ طے تھا کہ مجھے آنچل کور کو اس عذاب سے نکالنا ہے۔ کیسے؟ پھر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں دوڑتا ہوا جاؤں اور دل جیت کو بلا کر لے آؤں۔ کیونکہ ابھی تو شادی کی رسومات چل رہی تھیں۔

میں نے عقبی حصے کی طرف دوڑ لگا دی۔ دل جیت کے پاس پہنچ کر میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ "اٹھو سردار جی! جلدی اٹھو۔ ورنہ قیامت ہوجائے گی۔"

"کیا ہو گیا پُتر؟" وہ بھی بوکھلا کر اٹھ گیا۔

میں نے جلدی جلدی اسے ساری صورتِ حال بتا دی۔ اس کی حیرت اور غصے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں دل جیت سنگھ کو لے کر مندر کے سامنے آگیا۔

اندر روشنی ہو رہی تھی اور بھجن کی آوازیں آرہی تھیں۔ دروازے کی درز ابھی تک اسی طرح تھی۔ میں نے دل

جیت سنگھ سے کہا کہ وہ جھانک کر دیکھ لے۔ اس نے جھانک کر دیکھا اور پیچھے ہٹ آیا۔ وہ اس وقت پورے بدن سے کانپ رہا تھا۔ ''ہاں موہن! یہ میری آنچل ہے۔ اب بتاؤ، کیا کروں۔ اس کو کیسے نکالوں؟''

''تمہاری کرپان کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے پاس۔'' اس نے اپنی کرپان نکال لی۔

''میں ان دراندازوں کا خون کردوں گا۔''

''اس طرح نہیں سردار جی! ان کی تعداد زیادہ ہے پھر ان کے پاس بھی ہتھیار ہوسکتے ہیں۔ ہمیں آنچل کو نکالنے کے لیے کوئی تدبیر کرنی ہوگی۔''

''سوچو پُتر جلدی سوچو۔ ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

''ایک ترکیب ہے سردار جی۔''

''جلدی بتاؤ موہن۔''

''تم پیچھے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''جہاں پر کوٹھریاں ہیں۔ ان کے برابر میں یاک بندھے ہوئے ہیں اور ڈھیری سوکھی گھاس بھی ہے۔ تمہارے کمرے میں لالٹین موجود ہے۔ تیل چھڑک کر آگ لگادو۔ اور خوب آگ آگ کا شور کرو سب مل کر۔ یہ سب بوکھلا کر باہر نکلیں گے۔ میں کہیں چھپ جاؤں گا جب یہ سب نکل جائیں گے پھر میں پھرتی سے آنچل کو اٹھا کر بھاگ لوں گا۔''

''لیکن جاؤ گے کس طرف۔ اندھیرے میں راستہ کہاں ملے گا۔''

''سردار جی! یہ وقت یہ سب سوچنے کا نہیں ہے، آنچل کو نکالنے کا ہے۔ جلدی جاؤ۔''

دل جیت کے جانے کے بعد میں ایک آڑ میں چھپ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد آگ آگ کا شور سنائی دینے لگا۔ وہ لوگ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اتنا شور مچا رہے تھے کہ پورا علاقہ گونج اٹھا تھا۔

میری توقع کے مطابق مندر کا دروازہ کھلا اور وہ سب بوکھلائے ہوئے مندر سے نکل کر پیچھے کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ مکروہ مہاراج سب سے آگے تھا۔

اب میدان صاف تھا۔ میں آڑ سے نکل کر مندر میں گھس گیا۔ آنچل کو رکسی مجسمے کی طرح خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ ''آنچل! جلدی چلو، نکلو یہاں سے۔''

اور پھر ایسا لگا جیسے آنچل پر چھایا ہوا سحر اچانک ختم ہو گیا ہو۔ وہ پوری طرح ہوش میں آگئی تھی۔ اس نے روتے ہوئے مجھے اپنی بانہوں میں بھرلیا۔ ''آزاد...... آزاد۔''

''آنچل! دیر مت کرو۔ نکلو، ورنہ وہ کم بخت آجائیں گے۔''

ہم دونوں باہر آگئے۔ وہ لوگ ابھی تک پچھلی طرف تھے۔ میں نے آنچل کا ہاتھ تھام کر ایک طرف دوڑ لگادی۔ ہم جتنی دور بھی جاسکتے تھے، ہمیں جانا تھا۔

ہم دوڑتے چلے گئے۔ نہ جانے کتنے سوال آنچل کو کرنے تھے اور کتنے مجھے کرنے تھے لیکن باتوں کا وقت ہی نہیں تھا۔ وہ لوگ مجھے غائب دیکھ کر سمجھ جاتے کہ ان کے ساتھ کوئی چال چلی گئی ہے پھر وہ مندر کی طرف آتے اور جب آنچل غائب ملتی تو ہماری تلاش شروع ہوجاتی۔

ان کے پاس یاک کی سواریاں تھیں جبکہ ہم پیدل دوڑ رہے تھے اور دوڑے چلے جارہے تھے۔ پھر اچانک اس اندھیرے میں ہمارے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

میں نے آنچل کی چیخیں سنیں پھر کچھ پتا نہیں چلا۔ میں خود لڑھکتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں چلا جارہا تھا۔

☆☆☆

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا ہوں گا یا میرے ساتھ کیا گزری ہوگی۔ یہ سب کچھ یاد نہیں ہے۔ صرف اتنا یاد ہے کہ جب ہوش آیا تو میرے اردگرد کچھ سرگوشیاں سی ہورہی تھیں۔

آنکھوں میں درآنے والی روشنی چبھنے سی لگی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو کچھ دھندلے سے خاکے دکھائی دیے پھر جب آنکھیں درد کرنے لگیں تو میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

میں اس دوران میں آوازیں سنتا رہا۔ یہ عورتوں یا لڑکیوں کی آوازیں تھیں۔ ''دیکھ! اِسے ہوش آرہا ہے۔'' کسی نے کہا۔

''ہاں ہوش تو آگیا ہے لیکن ہمیں دیکھ کر پھر بے ہوش ہوجائے گا بے چارہ۔''

آواز میں شوخی تھی اور زبان ہندی تھی اسی لیے پوری طرح سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ ہنس رہی تھیں اور آپس میں کچھ بول رہی تھیں۔

بالآخر میں نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ میرے اردگرد کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ بہت خوب صورت، صحت مند، سرخ سرخ گالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ یہ لڑکیاں کون ہیں۔ کہاں سے آئی ہیں اور میں ان کے درمیان کہاں سے آگیا۔ ساتھ ہی مجھے اپنے چہرے پر چبھن کا احساس ہو رہا تھا۔ یقیناً گرنے سے چوٹیں آئی ہوں گی۔

پھر مجھے آنچل کور کا خیال آگیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اور اب وہ نہ جانے کہاں ہوگی۔

''اجنبی! اب تم کیسے ہو؟'' ایک لڑکی نے دریافت کیا۔

''ٹھیک ہوں لیکن یہ کون سی جگہ ہے۔ تم لوگ کون ہو۔ میں تمہارے درمیان کیسے آگیا۔ میرے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ وہ کہاں چلی گئی؟''

''اوہو، ایک سانس میں اتنے سوال۔'' اسی لڑکی نے کہا۔

''خدا کے لیے بتاؤ مجھے۔''

''مسلمان ہو؟'' ایک دوسری لڑکی نے پوچھا۔

''ہاں، مسلمان ہوں لیکن تم لوگ کون ہو؟''

''دیکھو ہم تمہیں بہتے ہوئے دریا کے کنارے سے اٹھا کر لائے ہیں۔'' پہلی لڑکی نے بتایا۔ ''تم وہاں بے ہوش پڑے تھے اور تمہاری ساتھی لڑکی بھی تمہارے پاس تھی۔''

''وہ ٹھیک تو ہے نا؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''ہاں، بالکل ٹھیک ہے اور برابر والے کمرے میں سو رہی ہے۔''

یہ سن کر اطمینان سا ہو گیا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور میں کہاں ہوں؟''

''تم تتلی نگر میں ہو۔'' اسی لڑکی نے بتایا۔

''تتلی نگر! یہ کیسا نام ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لیے کہ یہاں ہم جیسی تتلیاں رہتی ہیں۔'' ایک دوسری لڑکی نے کہا۔ ''اسی لیے اس جگہ کا نام تتلی نگر ہو گیا ہے۔ یہ ہمالیہ کی ترائی میں ایک بہت بڑا علاقہ ہے۔ یہاں عورتوں کی حکومت ہے۔ یہاں مرد کا داخلہ منع ہے لیکن تم چونکہ اپنی مرضی سے نہیں آئے۔ اسی لیے ابھی تک زندہ ہو۔''

''میرے خدا! کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟''

''یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہم یہاں برسوں سے رہتے آئے ہیں۔''

''اگر یہاں صرف تم عورتیں ہی رہتی ہو تو پھر تمہاری یہاں پیدائش وغیرہ کس طرح ہوتی ہوگی؟''

''اوہو، تمہیں ابھی سے اس کی فکر ہو گئی؟'' وہی شوخ لڑکی ہنستے ہوئے بولی۔ ''ابھی تو تمہاری قسمت کا فیصلہ ہونا ہے۔ دیکھنا ہے کہ تم کو زندہ بھی رکھا جاتا ہے یا نہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم سب کیا کہہ رہی ہو؟''

ابھی اس نے جواب دینا چاہا تھا کہ باہر کچھ عورتوں کا شور سنائی دینے لگا۔ ''خبردار! ہماری ملکہ آرہی ہے۔'' اسی لڑکی نے بتایا۔ ''اس کا احترام کرنا۔''

چند لمحوں کے بعد کچھ عورتیں اندر داخل ہوئیں۔

یہ شاید ملکہ کی گارڈز تھیں۔ کیونکہ وہ سب تلواروں اور نیزوں سے مسلح تھیں۔ میں جو کچھ بھی دیکھ رہا تھا وہ کسی پُراسرار فلم کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا کہاں ہوتا ہوگا۔ لیکن یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

ان محافظ عورتوں کے لباس بھی ادھورے تھے۔ یعنی نیم عریاں۔ آدھا جسم کھلا ہوا تھا۔ اوپر سینہ پوش تھا اور کمر سے نیچے جھالریں لٹک رہی تھیں۔

یہ محافظ عورتیں دیکھنے میں خونخوار معلوم ہو رہی تھیں۔ پہلوان نما عورتیں تھیں اور ان کے پیچھے ایک چاند طلوع ہو رہا تھا۔ وہی چاند اس تتلی نگر کی ملکہ تھی۔

میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چوبیس پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے سنہری عبایا پہن رکھا تھا۔ اس کا پورا جسم سنہرا سا ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے بال اور دلوں میں اتر جانے والی آنکھیں۔ میں نے ایسی خوب صورتی کم ہی دیکھی ہوگی۔

وہ میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ میں نے کھڑے ہو کر اُسے سلام کیا۔ وہ بہت دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔ اس کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی۔

''آزاد!'' میں نے بتایا۔

''تمہیں ہماری سرحدوں کے اندر آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟'' اس نے پوچھا۔

''ملکہ! میں خود سے نہیں آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''ایک حادثہ مجھے یہاں تک لے آیا ہے۔''

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ان سبھوں کی زبان بہت صاف تھی۔ وہ اردو بول رہی تھیں اور وہ بھی صاف لب و لہجے کے ساتھ۔

''ملکہ! اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔'' اسی شوخ لڑکی نے ملکہ کو بتایا۔ ''وہ بھی بے ہوش تھی۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''دوسرے کمرے میں ہے۔''

''کون ہے وہ لڑکی؟'' ملکہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہاری بیوی؟''

''ایسا ہی سمجھ لیں ملکہ۔ ہم دونوں شادی کرنے والے تھے کہ ہمارے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔''

''اور کہاں سے آئے ہو تم دونوں؟''

''میں نہیں جانتا کہ وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک صوبہ ہے ہندوستان میں۔ جس کا نام ہے بہار۔ میں اس کی راجدھانی پٹنہ سے آیا ہوں۔''

''ہاں۔ نام سنا ہے میں نے۔'' پھر اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ ''ٹھیک ہے۔ آج رات اس کو اسی کمرے میں رکھو۔ ان دونوں کا فیصلہ کل ہوگا۔''

''ملکہ! کیا میں اس لڑکی سے مل سکتا ہوں۔ کیا وہ میرے پاس آسکتی ہے؟''

ملکہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنی گردن ہلا دی۔

''ٹھیک ہے۔ تم اسے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو۔''

کچھ دیر بعد آنچل کور کو میرے پاس پہنچا دیا گیا جبکہ ملکہ اور دوسری لڑکیاں کمرے سے چلی گئی تھیں۔ آنچل نے مجھ سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ اس نے بہت تھوڑے دنوں میں بہت اتار چڑھاؤ دیکھ لیے تھے۔

میں نے اسے تسلی دی۔ ''آنچل! قدرت ہمیں ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہے اسی لیے اتنی آزمائشوں کے باوجود ہم پھر ایک دوسرے کے پاس ہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ ہم ہر حال میں ساتھ ہوں گے۔''

''مجھے بابو جی یاد آرہے ہیں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ بھی تو ہمارے ساتھ تھے۔ وہ شاید اب اس دنیا میں نہیں رہے۔''

''آنچل! خدا کی مصلحت کو ہم نہیں جان سکتے۔ تم خود کو ہلکان مت کرو۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔

ہمارا امتحان ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ نہ جانے ہم کہاں آکر پھنس گئے ہیں۔ خیر، تم یہ بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''آزاد مجھے کچھ بھی اندازہ نہیں ہے۔ کچھ بھی یاد نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''صرف اتنا یاد آرہا ہے کہ ہم نے ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کے بعد کسی مہاراج کا چیلا بابو جی کے پاس آیا۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ میں نہیں جانتی۔''

''تم پر اسی مہاراج نے کوئی جادو کر دیا تھا آنچل! تمہارا ذہن اپنے قابو میں نہیں تھا۔''

''ہاں، میرے ذہن پر ایک دھندسی چھا گئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے تو کوئی بھی یاد نہیں تھا۔ مجھے تو تم بھی یاد نہیں رہے تھے۔ البتہ کبھی کبھی ایک لمحے کے لیے ذہن کی وہ دھند صاف ہوتی تو تمہارا چہرہ نگاہوں کے سامنے آجاتا۔ اس کے بعد پھر وہی کیفیت ہو جاتی۔''

''وہ مہاراج تم سے شادی کررہا تھا۔'' میں نے اُسے یاد دلایا۔ ''تم کو دلہن کی طرح سنوارا گیا تھا۔''

''ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔'' اس نے اپنی گردن ہلائی۔ ''اس کے بعد کے سارے واقعات یاد ہیں مجھے۔ آگ کا شور ہو رہا تھا۔ اور اسی وقت میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ جیسے میرے دماغ پر چھایا ہوا بوجھ اتر گیا ہو۔ پھر تم میرے پاس آگئے۔ اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ سب یاد ہے اور اب ہم یہاں آکر پھنس گئے ہیں۔ بھگوان کے لیے اب تم بتاؤ کہ یہ سب کیا تھا۔ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

میں نے آنچل کور کو اب تک کی پوری کہانی سنا دی۔ بلرام پور تک کا سفر۔ اپنا موہن بننا۔ دل جیت سنگھ کا ساتھ دینا۔ سفر کی رُوداد۔ پھر مندر سے آنچل کور کو حکمتِ عملی کے ذریعے اٹھا لینا۔ میں نے سب کچھ اسے بتا دیا تھا۔ یہ سب سن کر آنچل پھر مجھ سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ ''آزاد! تم نے میرا کتنا ساتھ دیا ہے۔ کتنی محبت کرتے ہو مجھ سے۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔''

''کیا پاگل ہو گئی ہو۔ محبت کرنے والے ایک دوسرے پر احسان نہیں کرتے۔''

اسی وقت دروازے پر دستک کے ساتھ دو عورتیں ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہو گئیں۔ وہ ہمارے لیے کھانا لے کر آئی تھیں۔

ہر وقت ٹی وی...... ٹی وی...... کارٹون...... جاؤ اپنا ہوم ورک کرو

کھانا بہت سادہ لیکن لذیذ تھا۔ کھانے کے دوران وہ بالکل خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی تھیں۔ ہم نے بھی ان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ جب وہ برتن وغیرہ لے کر واپس چلی گئیں تو آنچل نے پوچھا۔ ”آزاد! اب ہم کہاں آگئے ہیں۔ کون ہیں یہ عورتیں۔ یہ کیا چاہتی ہیں؟“

”آنچل! ہم دریا کنارے بے ہوش پائے گئے تھے۔ یہ عورتیں ہمیں وہاں سے اٹھا کر لائی ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”اور میں ان کے بارے میں ابھی کچھ نہیں جانتا۔ صرف اتنا پتا چلا ہے کہ یہ جگہ ہمالیہ کی کسی ترائی میں ہے اور شاید یہاں عورتوں کی حکومت ہے۔ بس میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا۔“

”بھگوان نے چاہا تو ہم یہاں سے بھی نکل جائیں گے۔“ آنچل نے کہا۔ ”کیونکہ اب تم بھی میرے ساتھ ہو۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ بس مناسب وقت کا انتظار کرو۔“

ہماری وہ رات اندیشوں اور یادوں کے درمیان گزر گئی تھی۔ ہم پٹنہ میں گزارے ہوئے شب و روز یاد کرتے رہے تھے پھر نہ جانے کب ہماری آنکھ لگ گئی تھی۔

صبح ہوئی تو ہمیں ناشتا دیا گیا۔ اس کے بعد عورتوں نے آکر بتایا کہ ہمیں ملکہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔ جہاں ہمارا فیصلہ کیا جائے گا۔

ہمیں اس کمرے سے باہر لایا گیا۔ اب ہم دن کی روشنی میں اس علاقے کو دیکھ رہے تھے۔ دو رویہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے مکانات تھے۔ جنہیں کسی قسم کی لکڑیوں سے بنایا گیا تھا۔ ان مکانات کی ساخت مچانوں جیسی تھی۔ زیادہ تر گھروں کے نیچے والے حصے میں یاک اور دوسرے مویشی بندھے ہوئے تھے جبکہ دوسرے یعنی اوپر والے حصے میں ان کی رہائش تھی۔

ہر طرف عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ جوان اور خوب صورت۔ بوڑھی عورتیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اور نہ ہی کسی مرد پر نظر پڑی تھی۔

اچھی خاصی آبادی تھی۔ چند عورتوں کی گودوں میں بچے بھی تھے۔ نہ جانے مردوں کے بغیر یہ بچے کہاں سے آئے تھے۔ ان کے لباس بھی مختلف انداز کے تھے۔ بعض عورتیں نیم عریاں تھیں۔ بعض نے عبایا پہن رکھا تھا۔ حیرت انگیز ماحول تھا۔

آنچل نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ سخت خوف زدہ تھی لیکن میری موجودگی نے اس کی ڈھارس بندھا رکھی تھی۔

ہر مکان کے سامنے عورتیں کھڑی ہوئی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

بالآخر ہم کچھ دور چلنے کے بعد ایک نسبتاً بڑے مکان کے سامنے رک گئے۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ یہی رانی کا محل ہے اور یہیں دربار ہوتا ہے۔

میں نے جن خونخوار قسم کی صحت مند خواتین کا ذکر کیا تھا۔ ان کی بہت بڑی تعداد وہاں تھی اور وہ سب ہی مسلح تھیں۔

ہمیں اس مکان میں پہنچا دیا گیا۔

دوسرے گھروں کے برعکس ملکہ کا یہ مکان نیچے ہی یعنی گراؤنڈ فلور پر بنایا گیا تھا۔ دربار اچھا خاصا بڑا ہال تھا۔

دونوں طرف دیواروں کے ساتھ لکڑی کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایک ساتھ اتنی عورتیں نہیں دیکھی ہوں گی۔

ملکہ ایک دیوار کے ساتھ ایک اونچی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اپنی پوری خوب صورتی اور تمکنت کے ساتھ۔ اس کے سر پر سونے کا ایک تاج تھا جو جگمگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عصا تھا۔ وہ بھی سنہری تھا۔

ہم دونوں کو اس کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔

”ہاں اب بتاؤ۔ تم دونوں کون ہو۔ تمہارا آپس میں کیا رشتہ ہے؟“ ملکہ نے پوچھا۔ ”اور تم دونوں نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی؟“

”ملکہ عالیہ! میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ ہم مشکل میں

تھے، دوڑتے دوڑتے گرے اور پھر........ حالات ہمیں یہاں تک لے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"درباروالیوں کو بھی بتاؤ۔"

میں نے ایک بار پھر اپنی کہانی دہرادی۔

"اب یہ بتاؤ کہ اس لڑکی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" ملکہ نے پوچھا۔

"ملکہ عالیہ! میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور ہم بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔"

"اب تم یہاں آگئے ہو۔" ملکہ نے میری طرف دیکھا۔"اسی لیے تم یہ بھول جاؤ کہ تمہیں ایک لڑکی سے شادی کرکے زندگی گزارنی ہے۔"

"میں نہیں سمجھا ملکہ؟"

"یہاں آنے والے مرد کو اس بات کا پابند ہونا ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک کا شوہر بنے۔" ملکہ نے کہا۔"تم کیا سمجھتے ہو کہ یہاں کی عورتیں جب بچوں کو جنم دیتی ہیں تو کیا وہ بچے آسمان سے اترتے ہیں۔نہیں، بلکہ تم جیسے ان مردوں کے ہوتے ہیں جو بھولے بھٹکے یہاں چلے آئیں۔ ہم انہیں اپنی قید میں رکھتے ہیں اور اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اولاد دے۔یہ اور بات ہے کہ جن مردوں کو خود ملکہ اپنے لیے پسند کرلے وہ صرف اسی ملکہ کا پابند ہوتا ہے۔"

"نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔" آنچل اچانک چیخ اٹھی۔ "آزاد میرا ہے۔ میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گی۔تم سب کی سب چڑیلیں ہو۔جو نہ جانے کہاں سے یہاں آکر آباد ہوگئی ہیں۔"

"ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے۔تم جیسی کوئی لڑکی اپنے مرد کو کسی اور کے پاس جانے نہیں دیتی۔ اس وقت ہمارے اصول کے مطابق اس لڑکی کو ملکہ سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ زندگی اور موت کی جنگ ہوتی ہے جو بھی جیت جائے، وہ مرد اسی کا ہوجاتا ہے۔"

"ملکہ میں آپ سے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔"آپ اپنے اصولوں پر آنچل کو نہ پرکھیں۔یہ آپ سے مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس میں اتنی طاقت نہیں ہے۔"

"تو پھر وہی ہوگا جو میرا فیصلہ ہے۔" ملکہ نے کہا۔ "تم کو میرا بن کر رہنا ہوگا۔ مجھے اولاد کی ضرورت ہے۔ مجھے اولاد چاہیے۔"

"ملکہ عالیہ! آپ یہ بتائیں کہ آخر یہ کیسی ریاست ہے۔آپ لوگوں نے یہ نام نہاد اصول کیوں بنا رکھا ہے؟"

"ہماری ریاست کی تاریخ بہت پرانی ہے۔اور یہ کہانی ہم میں سے ہر کوئی جانتا ہے۔" ملکہ نے کہا۔"پھر اس نے دربار میں موجود ایک عورت کی طرف دیکھا۔"گل زا! تم بتاؤ کہ تتلی نگر کی کیا تاریخ ہے۔"

"بہت بہتر ملکہ عالیہ۔" اس عورت نے کہا جس کا نام گل زا تھا۔ پھر اس نے بتانا شروع کیا۔"یہ زمانہ ہے 1857ء کا۔ میرٹھ چھاؤنی میں بغاوت کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں پر ظلم کرنا شروع کردیا۔نہ جانے کتنوں کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ اور نہ جانے کتنے جیلوں میں بھیج دیے گئے۔"

تلہار جیل میں بے شمار ہندو اور مسلمان عورتیں قید کر دی گئیں۔ان عورتوں میں دو انتہائی جرأت مند اور بہادر عورتیں تھیں۔کوشل بائی اور سعیدہ خانم۔ان دونوں نے جیل کی بہت سی عورتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور 1860ء میں تلہار جیل سے فرار ہوگئیں۔"

"فرار ہونے والی تیس کے قریب تھیں۔ یہ عورتیں ان کے خوف سے بھاگتی رہیں۔ مسلسل سفر کرتی رہیں۔جنگل میں۔ میدانوں میں۔ پہاڑوں میں اور آخرکار اس جگہ پہنچ گئیں۔ جہاں ہم اس وقت موجود ہیں۔یعنی تتلی نگر میں۔ اس زمانے میں یہ ایک ویران مقام تھا۔دور دور تک سوائے برف کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ عورتیں یہیں آباد ہوگئیں۔ یہاں ایک دریا بھی تھا۔جنگل میں لکڑیاں تھیں۔فصلوں کی بھی آسانی تھی غرضیکہ رفتہ رفتہ یہاں ایک ریاست بنتی چلی گئی۔"

"پھر یہ ہوا کہ کچھ اور خواتین بھی اِدھر اُدھر سے آگئیں۔سوال تھا کہ مرد حضرات کہاں سے لائے جائیں۔ اس کے لیے ایک پالیسی یہ بنائی گئی کہ شروع شروع میں کچھ مردوں کو یہاں آنے کی ترغیب دی گئی۔ پھر ان کی اولادیں ہوئیں اور باقاعدہ اس ریاست کا نام تتلی نگر رکھ کر اس کے کچھ قانون اور اصول بنا دیے گئے۔"

"کیا اس ریاست کی کوئی قانونی حیثیت بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، نیپال کی حکومت سے ہمارا باقاعدہ معاہدہ ہو چکا ہے۔" اسی عورت نے بتایا۔"وہ ہمارے معاملات میں دخل نہیں دیتی۔ ہم بہت بڑی تعداد میں مویشیاں پالتے ہیں۔ان کے بدلے ہم اپنی ضروریات

کی چیزیں حاصل کر لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں شادی کا کوئی سسٹم نہیں ہے۔ ہم مردوں کو افزائشِ نسل کے لیے کرائے پر لاتے ہیں۔ یا کوئی بھولا بھٹکا آجائے تو اسے قید کر لیتے ہیں۔''

''کیا تمہارے یہاں لڑکے پیدا نہیں ہوتے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اتفاق ہے کہ ہمارے یہاں لڑکے بہت کم پیدا ہوتے ہیں اور جو ہو جائیں وہ الگ کر دیے جاتے ہیں۔ ان کی علیٰحدہ بستی ہے۔ وہ صرف مشین کے طور پر ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کو تتلی نگر میں ہی رکھا جاتا ہے اور جو عورت بوڑھی ہو جائے اسے بھی ہم الگ کر دیتے ہیں۔ اسی لیے تم کو یہاں صرف جوان عورتیں دکھائی دیں گی۔''

میرے ساتھ خود آنچل بھی حیران ہو کر یہ سب سن رہی تھی۔ ہم نے ایسی انوکھی ریاست کا تصور بھی نہیں کیا ہو گا لیکن ہم خود اس ریاست میں موجود تھے۔

''ملکہ میرے لیے کیا حکم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو ہمارا مقدر ہو چکا ہے۔'' ملکہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کچھ دنوں تک میرے ساتھ رہنا ہو گا پھر تم دوسری عورتوں کے کام آؤ گے۔ ان میں تمہاری یہ محبوبہ بھی ہو سکتی ہے۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔'' آنچل چیخ اٹھی۔ ''آزاد میرے ہیں۔ مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''

''میرا فیصلہ اٹل ہوتا ہے لڑکی۔ اگر تم اس شخص کو صرف اپنے لیے رکھنا چاہتی ہو تو تمہیں مجھ سے مقابلہ کرنا ہو گا۔''

''ہاں، میں تیار ہوں۔'' آنچل نے کہا۔

''آنچل کیا کہہ رہی ہو تم؟'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم اس سے کیسے لڑ سکتی ہو؟''

''زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ میں مر جاؤں گی۔'' آنچل نے کہا۔ ''لیکن کم از کم اپنی آنکھوں کے سامنے تو تمہیں کسی اور کا ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکوں گی۔''

''تم کیوں اپنے آپ پر ظلم کرو گی۔'' ملکہ نے آنچل سے کہا۔ ''تم شہر میں پرورش پانے والی ایک دھان پان سی لڑکی ہو۔ جبکہ میری زندگی لڑتے ہوئے گزری ہے اس لیے تم پر رحم آ رہا ہے مجھے۔''

''ملکہ اگر رحم ہی آ رہا ہے تو مجھے اور آزاد کو یہاں سے نکل جانے دیں۔'' آنچل نے کہا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے۔''

''ملکہ یہ لڑکی نادان ہے۔'' میں ملکہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''یہ نہیں جانتی کہ آپ سے جنگ کا کیا نتیجہ نکلے گا اسی لیے اس کی نادانی کو دیکھتے ہوئے ہمیں اتنا موقع دیا جائے کہ میں اسے سمجھا سکوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ملکہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''صرف ایک دن...... آج رات تمہیں سوچ کر بتا دینا ہے۔''

ملکہ کے اشارے پر ہمیں پھر اسی کمرے میں بند کر دیا گیا۔ جہاں ہم پہلے بند تھے۔ کمرے میں آتے ہی آنچل بھڑک اٹھی تھی۔ ''آزاد! تم نے یہ کیا کیا۔ کیا تم اس کی بات ماننے جا رہے ہو؟''

''سمجھا کرو آنچل! اس طرح میں نے مہلت لی ہے کہ شاید کوئی راستہ نکل آئے۔''

''راستہ تو بس ایک ہی ہے آزاد۔'' آنچل کے لہجے میں اداسی تھی۔ ''یہی کہ میں اس چڑیل سے لڑتے ہوئے اپنی جان دے دوں۔''

''نہیں، مایوس مت ہو۔'' میں نے تسلی دی۔ ''خدا ہمارا ساتھ دے گا۔''

پھر مہلت ختم ہونے سے پہلے ہی خدا کی مدد سامنے آ گئی۔

وہ ایک لڑکی تھی۔ بہت خوب صورت۔ اور شوخ لڑکی جس کو میں نے ہوش میں آنے کے بعد دیکھا تھا۔ وہ ہمارے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ''سنو! میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔'' اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''تمہاری بہت مہربانی ہو گی۔'' آنچل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''میں اپنے آزاد کو کبھی کسی کے پاس نہیں جانے دوں گی۔''

''ہاں ہاں، میں سمجھ رہی ہوں میں جانتی ہوں کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کسی ایک کی محبت۔ کسی ایک کو اپنے لیے رکھنے کی خواہش۔ میں یہ سب جانتی ہوں۔ لیکن یہاں کی دوسری عورتیں نہیں جانتیں۔ خاص طور پر وہ ملکہ۔ وہ ہوس کی دیوی ہے۔''

''تم محبت کی لذت سے کیسے واقف ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں خود کسی سے محبت کرتی ہوں۔''

اس نے انکشاف کیا۔ ''اور یہ راز کوئی نہیں جانتا۔ میں آج رات اپنی محبت کے ساتھ فرار ہونے والی ہوں بلکہ وہ مجھے یہاں سے لے کر نکل جائے گا۔ میں اس منحوس ریاست میں نہیں رہنا چاہتی۔ یہاں سب جھوٹ ہے۔ غیر فطری ہے۔''

''لیکن تم کیسے فرار ہوگی؟''

''ایک چھوٹے جہاز کے ذریعے۔'' اس نے بتایا۔

''ساحر رات گیارہ بجے تک آجائے گا۔''

''ساحر! کوئی مسلمان معلوم ہوتا ہے؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم۔ کیونکہ یہاں مذہب کا کوئی تصور نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی کہ ہندو یا مسلمان کیا ہوتا ہے۔ اس نے اپنا نام ساحر بتایا تھا۔ بس میں اتنا ہی جانتی ہوں۔''

پھر اس لڑکی نے ساحر سے اپنی ملاقات کی کہانی سنائی۔ وہ خرگوشوں کا تعاقب کرتی ہوئی ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جو تتلی نگر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ وہاں اسے ایک چھوٹا طیارہ کھڑا ہوا دکھائی دے گیا۔ اس کا پائلٹ ساحر طیارے کے پاس ہی کھڑا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ ساحر نے بتایا' وہ دھند کی وجہ سے طیارے کو یہاں اتارنے پر مجبور ہو گیا تھا پھر ساحر نے اس کے بارے میں پوچھا۔ اپنے بارے میں بتایا اور اگلی ملاقات کا وعدہ کر کے روانہ ہو گیا۔

دوسری، پھر تیسری ملاقاتیں ہوئیں۔ رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے محبت کے جذبے نے انہیں جکڑ لیا تھا۔ وہ طیارہ لے کر اس طرف آجایا کرتا تھا۔ پچھلے ہفتے جب وہ آیا تو لڑکی نے فیصلہ کر کے بتا دیا کہ وہ اس کے ساتھ جانے اور تتلی نگر چھوڑنے کو تیار ہے۔ لہٰذا وہ آج رات آنے والا تھا۔

''بس، اب تم دونوں یہاں سے نکلنے کی تیاری کر لو۔''

''ہمیں کیا تیاری کرنی ہے۔'' میں نے کہا' ہم تو کسی بھی وقت چلنے کو تیار ہیں۔''

''پھر میں رات کو تمہارے پاس آؤں گی۔'' وہ لڑکی کہہ کر چلی گئی۔

خدا نے ہمارے لیے راستہ نکال دیا تھا۔

☆☆☆

ہم ایک بار پھر پٹنہ پہنچ گئے تھے۔ ساحر ہمیں اپنے طیارے پر ہمیں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ سول ایوی ایشن کا آدمی تھا۔ پٹنہ آکر ایک خوش گوار خبر یہ ملی تھی کہ آنچل کور کا باپ دل جیت سنگھ زندہ تھا۔ وہ زخمی ہو کر کسی نہ کسی طرح پٹنہ واپس آگیا تھا۔

اس کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ اس کی بیٹی یا میں زندہ بھی ہو سکتے ہیں۔

آنچل کور نے جب میرا اس سے تعارف کروایا تو وہ حیران رہ گیا۔ ''واہ گرو کی بات۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس مسلمان سے اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہی قدم قدم پر ہمارے ساتھ ہوگا۔ لگتا ہے واہ گرو نے دونوں کو ایک بندھن میں باندھ دیا ہے۔''

''سردار جی! مجھے یقین تھا کہ میں ہر حال میں اپنی محبت حاصل کرلوں گا۔''

''ہاں پتر، قسمت تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہے۔''

''اب آپ بتائیں سردار جی! ہم کیا کریں؟'' میں نے احترام سے پوچھا۔

''یہاں سے نکل جاؤ۔'' دل جیت سنگھ نے کہا۔

''یہاں شادی ہوئی تو ایک ہنگامہ ہو جائے گا۔ کسی طرح آنچل کو لے کر پاکستان چلے جاؤ۔''

''میرے پاس ایک راستہ ہے۔ اس وقت پاکستان دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔ بہت سے بہاری نیپال کے راستے پاکستان جا رہے ہیں۔ ہم بھی ان میں شامل ہو کر جا سکتے ہیں۔''

''ہاں، جاؤ۔ رب راکھا۔''

قصہ مختصر یہ کہ ہم دونوں بہت جتن کے بعد کراچی آگئے۔ آنچل کور نے اسلام قبول کرلیا۔ اس نے اپنا نام عائشہ رکھا تھا۔

مجھے بھی اپنے تجربے کی وجہ سے اچھی جاب مل گئی۔

اور اب اس واقعے کو چالیس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ ہمارے بچے ہیں۔ اور ہم کراچی میں ایک اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ ریاست ہماری خوب صورت یادوں اور خوب صورت خوابوں کا حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ ہم دونوں کا ایمان پختہ تر ہو گیا ہے کہ قدرت جن دو دلوں کو ملوانا چاہتی ہے، ان کے راستے میں دنیا کی کوئی رکاوٹ نہیں آسکتی۔ ہم دونوں اس کی زندہ مثال ہیں۔

سرورق کی دوسری کہانی

باعثِ تاخیر

مظہر سلیم ہاشمی

کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے... اور بہت کچھ پانے کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی دینی پڑتی ہے... خوابوں کی قیمت چکانا پڑتی ہے... زندگی کا دستور ہے کہ خوشی کے پل آتے ہیں تو الم کا سیلِ رواں بھی ہمراہ رہتا ہے... ایسے ہی تھکا دینے والے لمحوں سے گزرتی کہانی کے اتار چڑھاؤ... جدوجہد اور آسائشات زندگی کے لیے اس کا سفر جاری تھا کہ اچانک ہی اس سفر نے راہ بدل ڈالی... جرم کی راہ اور تلاش کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ اسے اپنے اندر جھانکنے... سوچنے کی مہلت ہی نہ مل سکی... محبت اور نفرت... نیک یا بدباطن... بے لوث یا مفاد پرست بنے اور سچ بول سکے۔ ہر جذبے ہر سوچ سے ماورا اپنے ہی مقصد کے پیچھے بھاگ رہی تھی... انہی الجھنوں میں گرفتار کرداروں کے مکروفریب... ان کی شکست اور کارناموں کی آئینہ دار...

ناکامیوں اور مسرتوں سے نبرد آزما تاخیر پسندوں کا چشم کشا فسانہ......

رات کا اندھیرا تیزی سے شام کے دھندلکے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ اس سپر مارکیٹ کی طرز پر بنی ایس۔ اے ٹریڈرز نامی منی مارکیٹ میں بھی نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گنتی کے چند بلب تاریکی ختم کرنے کی ناکام سعی میں مصروفِ عمل تھے۔ اس کے ہاتھ نہایت تیزی سے چل رہے تھے، اپنا کام وہ تقریباً مکمل کر چکا تھا۔ ایک

طائرانہ نگاہ اس نے ریکس پر سجی اشیا پر ڈالی، سب کچھ اپنی جگہ پر موجود تھا۔ پُرسکوت ماحول میں قرینے سے سجی چیزیں......خاموشی کے تاثر کو مزید گہرا کر رہی تھیں۔

’زندگی کو آسان بنانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔‘ کونے میں رکھے بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

واپسی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی، ہر چیز کو سلیقے سے سجا دیا گیا تھا۔ آج کا دن بہت اہم تھا وہ نہیں چاہتا کہ اسے تاخیر ہو......اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر وہ کاؤنٹر سے نکلنے ہی والا تھا کہ اسے اپنے سامنے والے شیشے کے پار، ایک پولیس موبائل رکتی دکھائی دی، بیگ رکھ کر وہ وہیں ٹھٹک کر رک گیا۔ پولیس کی بے وقت آمد کسی طوفان کا پیش خیمہ ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

سلمان احمد ایک محنتی شخص تھا۔ جب ائرپورٹ کے ساتھ اس ویرانے میں اس نے سپر مارکیٹ کی طرز پر اپنی دکان بنانے کا فیصلہ کیا تو رشتے داروں اور دوستوں سب نے مخالفت کی۔ ان کے نزدیک یہ سرمائے کا زیاں تھا مگر سلمان کی محنت رنگ لائی تھی۔ دو کنال کا پلاٹ نواحی علاقہ ہونے کی وجہ سے بہت سستا مل گیا تھا مگر تعمیر پر کثیر سرمایہ لگا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے کام میں اس نے بطور ایجنٹ کئی ممالک کا چکر لگایا تھا۔ اِدھر کا مال اُدھر کرنے میں اس کو کمال حاصل تھا اسی لیے اس نے مختصر وقت میں خاصی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اب بظاہر وہ اپنی تمام جمع پونجی اس مختصر سپر مارکیٹ پر لگا چکا تھا لیکن وقت نے ثابت کیا کہ اس کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔

شہر کے تقریباً نواح میں ہونے کے باعث کافی کم گاہک ہی اس طرف کا رخ کرتے تھے۔ اس کی اصل کامیابی کی ضامن وہ ایلیٹ کلاس بنی تھی جو اکثر ہوائی اڈے پر آتی رہتی تھی...... اور جب اس شہر سے عمرہ سروس کا آغاز ہوا تو یوں سمجھو سلمان احمد کی بیٹھے بٹھائے چاندی ہو گئی تھی۔ ہوائی اڈا بھی ملک کے دیگر جدید ائرپورٹس کی طرح شاندار نہ تھا، شاپنگ ایریا اور ڈیوٹی فری زون جیسی چیزیں یہاں ناپید تھیں۔ اور تو اور انتظار کرنے والوں کے لیے کوئی ڈھنگ کے کھانے کی جگہ بھی میسر نہیں تھی۔ ایسی سہولیات کے فقدان نے سلمان کی دکان چمکا دی تھی۔ حکومتی کارکردگی یہاں بھی واضح تھی اور اسی لیے عوام ”کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر“ کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اس اپاہج سہولت سے مستفید ہو رہے تھے۔

کام کے آغاز میں سلمان کا کافی وقت فراغت میں گزرتا تھا مگر آہستہ آہستہ اس کی مصروفیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ دن کا بیشتر حصہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھ کر موبائل پر گیم کھیلتا یا سوشل میڈیا پر گزارتا تھا لیکن اب گاہک عموماً اس کی توجہ بٹا دیتے تھے۔ بین الاقوامی فلائٹس کی آمد والے دن چونکہ ہفتے میں صرف دو بار آتے تھے......اس لیے اس نے ایک بیکری سے معاہدہ کر لیا تھا جو ان دنوں اپنا ’فریش‘ مال ایک سیل مین کے ہمراہ روانہ کر دیتی۔ اس مشہور بیکری کے ساتھ معاہدہ بھی اس کے لیے مالی منفعت کا باعث بنا تھا۔

احباب کی نظر میں وہ اب ایک کھاتا پیتا شخص تھا۔ سب اس کی محنت اور اس محنت میں عظمت کے گن گاتے تھے۔ سلمان خود بھی اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہوتا، منحنی جسمانی ساخت کی وجہ سے وہ تیس سال کا ہونے کے باجود بائیس تئیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ جب وہ کسی کو بتاتا کہ وہ ایک منی مارکیٹ کا مالک ہے تو اکثر لوگ اس کی بات کا یقین ہی نہیں کرتے تھے۔ اپنی شخصیت کی بدولت ہی وہ اپنا اسمگلنگ کا دو نمبر دھندا کامیابی سے چلا رہا تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے کرتے اس نے مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے ممالک میں کافی تعلقات بنائے تھے۔ انہی تعلقات کی بنیاد پر اس نے اس صفائی سے اپنا بزنس شروع کیا کہ سب لوگ اس کی ”حق حلال“ کی محنت والی کمائی سے متاثر تھے۔ کوئی اس پر شک بھی نہیں کرتا تھا کہ منی مارکیٹ کی آڑ میں کس قسم کا دھندا جاری ہے۔

چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے انسدادِ دہشت گردی اور اینٹی نارکوٹکس والوں کی توجہ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی، پر سلمان کو اندازہ تھا کہ وہ اگر اس معاملے میں کبھی پکڑا گیا تو اس کی گلوخلاصی مشکل ہو جائے گی۔ اس نے اپنے دھندے کو صرف ہیرے جواہرات تک محدود کر دیا تھا۔ ایک تو ان کو چھپا کر لانا لے جانا آسان تھا، دوسرا اگر پکڑے بھی جاؤ تو صرف مال سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے، جان اکثر اوقات محفوظ ہی رہتی تھی۔ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے زیادہ کمانے پر یقین رکھتا تھا، اسی وجہ سے ابھی تک قانون کی نظروں سے بچا ہوا تھا۔ آج بھی مشرقِ وسطیٰ کے ایک ملک سے آنے والی فلائٹ میں اس کی ہیروں کی کنسائنمنٹ آ رہی تھی۔ سب کچھ دے دلا کر بھی اس کو ساٹھ لاکھ سے اوپر ملنے کی امید تھی۔

”اس بار میڈم نوشین آ رہی ہیں تمہارے ہیرے

لے کر......'' رسمی سلام دعا کے بعد فون کے اسپیکر میں روشن کی بھنبھناتی سی آواز سنائی دی۔ وہ سلمان کا سب سے بڑا سپلائر تھا۔

''انجم صاحب کو کیا مسئلہ ہو گیا؟'' سلمان نے استفسار کیا۔ ''وہ اچھا بھلا کام تو سرانجام دے رہے تھے؟'' نئے بندے کا سن کر اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ سی آ گئی۔

''اس کو شک ہو گیا تھا کہ کوئی ایجنسی کا بندہ اس کے پیچھے لگ گیا ہے، ابھی پچاس کا بھی نہیں ہوا لیکن لگتا ہے کہ سٹھیا گیا ہے۔'' روشن نے انجم کے ساتھ ''صاحب'' لگانے کا تکلف کیے بغیر اپنی دلی کیفیت بیان کی۔

''یہ جو میڈم کا بتا رہے ہو، اس نے پہلے بھی کوئی کام کیا ہے کہ ایسے ہی اتنی بڑی ذمے داری اس کو دے دی ہے؟'' سلمان کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

''یار، تو پریشان کیوں ہوتا ہے؟ تیرا کام بن جائے گا، میڈم کام کی پکی ہے اور پہلے بھی میرے لیے کام کرتی رہی ہے۔'' بات مکمل کرتے کرتے روشن کے لہجے میں لوفر پن آ گیا۔

''میرے معاملے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔'' سلمان نے اس کے لہجے کو نظر انداز کر کے اپنے مطلب کی بات کی۔

باقی کی تمام تفصیلات طے کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ دن کا ایک بج چکا تھا اور ایک ڈومیسٹک فلائٹ لینڈ کر چکی تھی جس کی وجہ سے ایس۔ اے ٹریڈرز میں معمول سے زیادہ لوگ موجود تھے۔ بیکری والوں نے بھی ایک نئے لڑکے کو بھیجا تھا لیکن جس خوش اسلوبی سے وہ کام کر رہا تھا، سلمان کو چنداں پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ ...روشن پر اسے بھرپور اعتماد تھا اور اس بات پر بھی کہ وہ کسی قابل بندے کو ہی بھیجے گا لیکن وہ ایک نامعلوم سی خلش محسوس کر رہا تھا۔ اس کی مطلوبہ فلائٹ آنے میں صرف دو گھنٹے رہ گئے تھے۔ روشن نے ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی ''کنسائنمنٹ'' کی روانگی سے قبل اس سے رابطہ کیا تھا لیکن عین ''ڈلیوری'' کے وقت پر یہ تبدیلی اس کے ذہن پر بار بن گئی تھی۔ اس نے ان خیالات سے جان چھڑانے کے لیے سر کو جھٹکا اور ایک گاہک کی جانب متوجہ ہو گیا جو کہ ''امپورٹڈ اسنیکس'' کا ڈھیر لے کر کاؤنٹر کی طرف آ رہا تھا۔

☆☆☆

شاہد اپنے ہوٹل کے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا۔ نیم گرم پانی سے غسل کے بعد اس کی گندمی رنگت بلب کی مصنوعی روشنی میں بھی دمک رہی تھی۔ وہ چوبیس پچیس سالہ ایک خوش شکل اور ذہین نوجوان تھا جسے گردشِ حالات نے معاشرے کو برتنے کا فن سکھا دیا تھا۔ لڑکپن سے ہی اس نے یہ جان لیا تھا کہ اس معاشرے میں غریبوں کی کوئی عزت نہیں ہے، اس لیے اس نے بھی کالج کے کچھ آوارہ مزاج دوستوں کی دیکھا دیکھی جرائم کی دنیا میں قدم رکھ دیا تھا۔ پرس چھیننے اور راہزنی کی وارداتوں میں جب اس نے محسوس کیا کہ خطرہ زیادہ اور مال کم ہے تو چپکے سے اپنے نام نہاد ''گینگ'' سے کنارہ کش ہو گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ محنت کر کے ہی اب جرم کی دنیا میں قدم رکھنا ہے۔

ذہین تو تھا ہی اس نے دوستوں کی ابتدائی ٹریننگ کو بنیاد بناتے ہوئے چوری، ہیرا پھیری اور اس طرح کے دیگر معاملات میں مہارت حاصل کرنا شروع کر دی۔ اب وہ خاص خاص لوگوں کو نشانہ بناتا اور ایسی منصوبہ بندی کرتا کہ واردات کے بعد کہیں کوئی نشان نہ ملے۔ بھیس اور آواز بدلنے میں بھی اس نے تربیت حاصل کی تھی اور ہر قسم کا اسلحہ چلانا بھی سیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ گھر والے اس کی مجرمانہ روش پر باز پُرس کرتے، وہ ایمانداری والی غربت کو خیرباد کہہ کے گھر سے بھاگ نکلا۔ بے ایمانی کی امارت میں اس کے لیے بے حد کشش تھی۔

وہ گھر والوں سے دور تھا، بے خبر نہیں۔ کچھ پرانے احباب کی بدولت ان کے بارے میں پوری معلومات رکھتا تھا۔ گاہے بگاہے ان کو رقم بھی بھیج دیتا تھا۔ اس وقت وہ جس شہر میں موجود تھا وہاں سے صرف ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر اس کا گاؤں تھا۔ اب بھی وہ چاہتا تو ملنے کے لیے جا سکتا تھا۔ مگر دور سے دیکھنا اور تڑپنا ہی اس کا مقدر بن چکا تھا۔ اپنے گناہوں کی سزا ایک طرح سے وہ خود کو ان سے نہ مل کر دیتا تھا۔

ماں کے ہاتھ کے بنے پراٹھے، اباجی کی مار، بڑے بھائی کے ڈائجسٹ چھپ کر پڑھنا، دبئی والے چچا کی بیٹی گڑیا، دوستوں کے ساتھ نہر پہ نہانا...... ایسی اَن گنت یادیں تھیں جو اس کا تعاقب کرتی تھیں۔ معصوم دور کی یادیں اگر پیچھا کرتی بھی تھیں تو وہ ان کو شراب کے نشے میں ڈبو دیتا تھا۔ عیاشی اب اس کی زندگی کا مقصد بن کر رہ گئی تھی، جتنا کماتا اس کا بیشتر حصہ سیر و تفریح اور جوئے میں اُڑا دیتا تھا۔ حرام کی کمائی تھی سو اُڑاتے ہوئے اسے کوئی دکھ بھی نہیں ہوتا تھا، تازہ ترین واردات کے بعد وہ عربوں کی بسائی جنت

میں دو مہینے سے زائد وقت بتا کر آیا تھا۔
موجودہ ٹارگٹ واپسی پر اچانک ہی اس کی نظر میں آ گیا تھا۔ ائرپورٹ پر اس نے کسی کو انجم نامی شخص کے سرخ کوٹ کی بابت مذاق اُڑاتے سنا تھا۔ ہیرے کا لفظ ہی اس کے کان کھڑے کرنے کے لیے کافی تھا۔ اتفاق سے وہ اسی فلائٹ میں جا رہا تھا جس میں انجم نامی بندہ ہیروں کے ساتھ موجود تھا۔ پہلے تو اسے حیرانی ہوئی لیکن بعد میں اُس کے تعاقب پر وہ گروہ کے طریقۂ کار پر اش اش کر اٹھا۔ کسٹم تلاشی پر انجم نے ہیرے تفتیشی افسر کی نظروں میں آئے بغیر گزارے تھے، غالباً وہ بھی شاملِ حال تھا۔ اس نے کمالِ پھرتی سے ایس-اے ٹریڈرز پر مال وہاں کے مالک کو دیا تھا اور اطمینان کے ساتھ کچھ شاپنگ کر کے نکل گیا تھا۔ شاہد کو شرارت سوجھی تو وہ اس کے ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے دوڑتا ہوا پیچھے پہنچا۔
”انکل رکیں...... آپ اپنا پیکٹ تو دکان میں ہی بھول آئے ہیں۔“ اس نے آواز لگائی۔
انجم ایک لمحے کے لیے تو حواس باختہ ہو گیا پر شاہد کے ہاتھ میں دبے بسکٹ کے پیکٹ کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی تھی۔
”شکریہ...... یہ میرا نہیں ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا، مگر اس کو غور سے دیکھنے پر وہ مشکوک ہو گیا تھا۔
ٹیکسی ڈرائیور کو اس نے بیٹھ کر فوراً چلنے کا اشارہ کر دیا اور ٹیکسی فراٹے بھرتی روانہ ہو گئی۔ شاہد نے بعد میں اس کے بھونچکا رہ جانے والے تاثرات پر خوب قہقہے لگائے تھے۔ اب بھی آئینے کے سامنے بال سنوارتے ہوئے وہ ان لمحات کو یاد کر کے مسکرا اٹھا تھا۔
اپنے تعلقات کا استعمال کر کے اس نے انجم کا پتا بھی چلا لیا تھا...... پر وہ بہت کائیاں شخص ثابت ہوا اور اسے چکر دے کر غائب ہو گیا تھا۔ تب سے اس نے اپنی تمام تر توجہ سلمان پر مرکوز کر دی تھی۔ کئی دن کی کڑی نگرانی کے بعد اس نے سلمان کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل کر لی تھیں۔ انجم مل جاتا تو وہ ائرپورٹ اور منی مارکیٹ کے مختصر راستے میں ہی مال اُڑا لیتا پر اب اس نے بھیس بدل کر سلمان کو ہی لوٹنے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ آج اس نے جو روپ دھارا تھا اس میں اس کے قریبی جاننے والے بھی دیکھ لیتے تو نہ پہچان پاتے۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔ اپنی ضروری چیزیں ایک بیگ میں سمیٹ کر وہ اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ آہستہ سے کاؤچ سے اٹھی اور اپنی شرٹ کے بٹن بند کرنے لگی۔ سانولی سلونی رنگت والی نوشین ایک آدھ سال میں ہی چالیس کے عشرے میں داخل ہونے والی تھی لیکن اس نے اس خوبی سے خود کو سنبھال رکھا تھا کہ تیس کی بھی بمشکل لگتی۔ اس کی بولتی آنکھوں میں ایسی کشش تھی جو سامنے والے پر جادو کر دیتی تھیں۔ چھریرا بدن، لمبے بال اور مسکراتا چہرہ اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیتا تھا۔
”اب کب تک ایسے زبان نکال کر ہانپتے رہو گے؟“ اس نے کاؤچ پر ناہموار سانسوں کو درست کرتے ہوئے روشن سے پوچھا۔ ”تمہارے یہ شوق کسی دن تمہاری جان لے لیں گے۔“ انداز بدستور تمسخرانہ ہی تھا۔
”بکواس نہ کرو۔“ روشن نے درشتگی سے کہنے کی کوشش کی لیکن الجھی سانسوں میں کی گئی یہ کوشش بڑے مضحکہ خیز آواز میں تبدیل ہو گئی۔
”چلو...... میں بکواس نہیں کرتی، لیکن اپنا حلیہ تو درست کرو۔“ وہ اس کی کم لباسی کی جانب اشارہ کر کے بولی۔ ”ویسے بھی تم کو ابھی مجھے ایک اور ”مشن“ کے لیے بھیجنا ہے۔“ اس نے ہیروں کی کنسائنمنٹ کے بارے میں کہا۔ آئینے کے سامنے ٹھہر کر اس نے اپنے سراپا پر ایک نگاہ ڈالی اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ اب بھی وہ قیامت ڈھاتی تھی پر بڑھتی عمر کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔
وہ روشن کے ساتھ کافی عرصے سے منسلک تھی۔ یہ تعلق معاشی اور جسمانی دونوں طرح کا تھا۔ جس ماحول میں وہ شامل ہو چکی تھی وہاں ایسی باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھی وہاں وہ برا ماننے والے لوگوں کی معیت سے بھی آزاد ہو چکی تھی۔
بیس سال قبل مشرق وسطیٰ میں واقع اس کنکریٹ کی جنت میں وہ روزی کے حصول کے لیے آئی تھی۔ اس کو ایک ملٹی نیشنل فرم میں ریسپشنسٹ کے فرائض نبھانے کی ذمے داری ملی تھی۔ اس نوکری کے حصول میں اس کی خوبصورتی سے زیادہ ان انگریزی زبان کے کورسز کا زیادہ ہاتھ تھا جو اس نے اپنی تعلیم کے دوران کیے تھے۔ پُراعتماد لہجے کے ساتھ جب وہ انگریزی بولتی تو سننے والا خودبخود اس کے رعب میں آ جاتا تھا۔ پھر اس کی مسکراہٹ بھی ایسی خوش کن ہوتی تھی کہ کچھ لوگ اس کو الگ ہی رنگ دینے کی کوشش کرتے۔
جدید دنیا سے منسلک ہونے کے بعد جب گھر والوں

کو وہ خاطر خواہ رقم بھیجنے لگی تو گھر والے بھی اس کی کمائی کے عادی ہوتے گئے۔ ان کو صرف پیسوں سے ہی غرض رہ گئی، ماں باپ کی زندگی تک تو منہ پھاڑ کر تقاضا کی گئی رقم بھیجتی رہی لیکن ان کی وفات کے بعد اس نے بھی بہن بھائیوں کو ہری جھنڈی دکھا دی۔ ایسا وہ شاید نہ کرتی اگر آخری بار والدہ کی وفات پر گھر میں اس نے اپنے بھائیوں کی گفتگو نہ سن لی ہوتی۔ وہ اس کا گھر میں حصہ دینے کے روادار تو تھے ہی نہیں بلکہ چاہتے تھے کہ وہ واپس جائے اور ان کے لیے کمائے۔ جبکہ وہ ایجنسی میں چھٹی لے کر آئی تھی۔ بھائیوں کے نزدیک وہ اب بھی سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی جس کو 'حلال' کرنے کے حق میں وہ ہرگز نہ تھے۔ وہ واپس تو آ گئی لیکن سب ناتے توڑ کر، اب بھی کبھی کبھی یاد آتی ان کی تو ایک ٹیس سی اٹھتی تھی لیکن بہت عرصے سے اس نے بھی صرف اپنے بارے میں سوچنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

گھر والوں سے بچھڑنے کے بعد محبت کے نام پر جو دھوکا ملا اس کے اثرات اب بھی مجرمانہ زندگی کی صورت میں باقی تھے۔ روشن سے تعلقات بھی اس کے وسائل کے استعمال کے لیے تھے...... جو اس کی زندگی کے مقصد میں مددگار ثابت ہوتے۔

''ہیرے بھیجنے پر بھی بات کر لیتے ہیں، پہلے تھوڑی دیر پاس تو آؤ۔'' روشن اٹھ کر اس کے حسین سراپا پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔

''تم سے ہوتا کچھ ہے نہیں...... اور اپنے ساتھ میرا بھی وقت ضائع کرتے ہو۔'' ایک بار نوشین نے مذاق اُڑایا تو روشن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''تم کچھ زیادہ بک بک نہیں کرنے لگیں۔'' روشن نے اپنے ابلتے غصے پر قابو پاتے ہوئے ایک نسبتاً ہلکی گالی دی۔ اس کو عین وقت پر یاد آ گیا تھا کہ آج اس نے مال بھیجنے کے لیے اسے بلایا ہے، ورنہ واہیات گالیاں دینے میں اس کو کوئی عار نہ تھا۔ اس کا اہم کارندہ انجم کسی خفیہ ایجنسی کے بندے کے خوف سے روپوش تھا اور اس وقت واحد دستیاب ایجنٹ نوشین ہی تھی۔

''دیکھو...... میں تمہاری من مانیاں جس وجہ سے برداشت کرتی ہوں، وہ تم بھولتے جا رہے ہو۔'' وہ اس کو اپنی شمولیت کی وجہ یاد کرواتے ہوئے بولی۔ ''پہلے پہل تم مجھے صرف بڑے شہروں کے ٹاسک دیتے تھے، اب یہ چھوٹی چھوٹی ترسیل کے لیے میرا استعمال کیوں ہو رہا ہے؟'' نوشین کے لہجے میں شکوے کے ساتھ ایک غیر محسوس سی تنبیہ بھی تھی جسے روشن محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

''اس بار یہ کام کر دو۔'' روشن ایک دم ہی ڈھیلا پڑ گیا۔ ''ورنہ میری ریپوٹیشن خراب ہو جائے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ مسعود انور کی تلاش میں خود پاکستان جاؤں گا۔'' اس نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنی بات مکمل کی۔

''اب میں کب تک تمہارے جھوٹے وعدوں پر آسرا کر کے بیٹھی رہوں؟ تم جانتے ہو کہ میں صرف مسعود کی وجہ سے تمہارے اس اسمگلنگ ریکٹ کا حصہ بنی تھی۔ اس کے غیاب سے اب تک تم اس کا سراغ لگانے میں ناکام ہو۔ میں حیران ہوں کہ کوئی تمہارا مال لے کر بھاگ جائے اور تم پندرہ سال تک اس کے گھر کا پتا بھی نہ معلوم کر سکو۔'' نوشین نے ایک سانس میں ہی اپنی بات پوری کر دی۔

''میری بات کا یقین کرو...... ہم اپنی پوری کوشش کرتے رہے ہیں...... اب اس نے فرار سے پہلے اپنا گھر بار سب کچھ تبدیل کر دیا تھا تو پتا چلانا ویسے ہی بہت مشکل ہو گیا تھا۔'' وہ پہلو بدل کر نظریں چراتا ہوا بولا۔ ''میں اس کے گھر کا ایڈریس معلوم کرنے میں ناکام رہا ہوں۔'' اس نے اپنے جھوٹ کو سچ کا تڑکا لگایا۔

سچ تو یہ تھا کہ اس کے گروہ نے کوئی آٹھ سال پہلے ہی مسعود کو...... ڈھونڈ لیا تھا۔ سات آٹھ سال کا وقت اس نے بڑی خاموشی سے چھپ کر گزار لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بہت عرصہ بیت چکا اب اس کا گروہ اسے بھول بھال چکا ہو گا۔ وہ اپنی آوارہ فطرت سے باز نہ آ سکا۔ تھائی لینڈ کی وادیوں میں بے پروا عیاشی اس کے پکڑے جانے کا سبب بنی تھی۔ بے پناہ تشدد کے بعد اس نے مال کا بہت بڑا حصہ تو لوٹا دیا مگر کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی سے اپنے گھر والوں کو محفوظ رکھنے کی خاطر پاکستان کا پتا بتا کر نہ دیا۔ اس دھوکے کی دنیا میں ایمانداری کی بڑی اہمیت تھی چنانچہ انجام کار موت ہی مسعود کا مقدر بنی۔ نوشین تک یہ اطلاع نہ پہنچ سکی تھی، روشن اس کے حسین بدن کا اس قدر اسیر ہو چکا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر یہ بات چھپالی۔

''کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ اس دنیا میں ہی نہیں رہا......'' روشن نے چونک کر اس بیان پر اسے دیکھا۔ پر وہ اپنے ہی خیالوں میں مگن بولے چلی جا رہی تھی۔ ''میں بھی عجیب بدقسمت ہوں، پہلے ماں باپ کے پیار کو ترستی رہی اور جب لگا کہ میرے کمانے پر وہ خوش ہوں گے تو اس دنیا سے ہی چل بسے۔ بہن بھائیوں نے بھی خوب مال بٹورا۔ ان سے ہٹ کر جب اپنے بارے میں سوچا تو شوہر ہی

مجرم نکلا......"

"آج کچھ زیادہ قنوطیت نہیں چھائی ہوئی تم پر؟" روشن بولا۔

"کیسے ڈورے ڈالے تھے مجھ پر......؟ پھر مجھے بھی اپنے اس اسمگلنگ کے دھندے میں ملوث کر دیا، اور تو اور میری بچی کے سامان میں بھی اپنا اسمگلنگ کا مال رکھوا کر ٹریول کرواتا رہا......" وہ روشن کے سوال کو سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ "خود تو جانے کہاں جا کر مر گیا ہے؟ اور میری بچی کو مجھ سے جدا کر گیا۔" بات مکمل کرتے کرتے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

روشن اٹھ کر اس کے قریب آ گیا اور جگ میں سے پانی نکال کر دیا۔ اس دوران میں وہ ہلکی ہلکی سسکیاں بھرتے ہوئے روتی رہی۔

"تم پریشان مت ہو...... مہینے میں ایک ٹرپ لگاتی ہو...... باقی کے پندرہ بیس دن اپنی تلاش میں صرف کر دیتی ہو...... مجھے امید ہے تم جلد ہی اس کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ آخر اس نے تمہیں بھی کچھ نہیں بتایا تھا تو کوئی نہ کوئی تو وجہ رہی ہو گی۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"بے غیرت سمجھتا تھا وہ مجھے......" وہ ایک سانس میں ہی پورا گلاس پی گئی ...اور خود پر قابو پا کر بولی۔ "حالانکہ اس کے مجبور کرنے پر ہی میں اس جرم کی دنیا میں وارد ہوئی تھی۔ اس نے یہاں سے بھاگنے کی سازش میرے علم میں لائے بغیر کی تھی۔ چلا جاتا مجھے چھوڑ کر...... پر میری بچی کو تو نہ لے جاتا۔" سانسوں کو اعتدال پر لاتے ہوئے اس نے بات پوری کی۔

روشن حقیقتِ حال سے پوری طرح واقف تھا۔ مسعود تو ایک ذریعہ تھا ورنہ نوشین طویل عرصے اپنی بیٹی کی تلاش میں ہی سرگرداں تھی۔ مسعود بہت چالاک نکلا تھا، اس نے نوشین کو اپنے پلان کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ اپنی بچی سائرہ کو وہ اس بہانے ساتھ لے گیا تھا کہ کسٹم آفیسر کی توجہ بٹ سکے۔ اس نے اپنے کندھے اچکائے اور ذہن میں آئے خیالات کو جھٹک کر نوشین کی جانب متوجہ ہوا جو اب خود کو سنبھال چکی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم سائز کے آئینے میں اب وہ اپنے بہہ جانے والے میک اپ کو درست کرتے ہوئے تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔

میک اپ درست کر کے جب وہ مسکرائی تو جیسے روشن کے دل پر بجلیاں سی کوند گئیں۔ اپنے بے قابو دل کو اس نے سنبھالا اور اس کو دیکھ کر اس نے ایک سرد آہ بھری۔ وہ جانتا تھا کہ اس گفتگو کے بعد نوشین مزید کوئی لفٹ نہیں کروائے گی۔ اس کے رومانٹک موڈ کا بیڑا غرق ہو چکا تھا چنانچہ اس نے بیٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور اس پر موجود فلائٹ کی تفصیلات سے نوشین کو آگاہ کرنے لگا۔ ٹکٹس وغیرہ کا بندوبست پہلے سے کر چکا تھا اور "خصوصی پیکج" میں موجود ہیروں کی فراہمی کیسے سلمان کو کرنی ہے، وہ اس کے گوش گزار نے لگا۔

☆☆☆

سورج کے نصف النہار پر آنے میں ابھی کافی وقت تھا پر دھوپ خوب نکھر کر پھیل چکی تھی۔ موسم کی خنکی کے باعث اس کی حدت خوش کن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس ویران سڑک پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے درختوں پر موجود پرندوں کی چہچہاہٹ وقتاً فوقتاً سنائی دے جاتی تھی۔ شاہد سڑک کنارے...... درختوں کے جھنڈ کے پاس، ایک مناسب جگہ پر گھات لگا چکا تھا۔

اس کی معلومات کے مطابق اس کی مطلوبہ گاڑی کو ادھر سے ہی گزرنا تھا۔ بس اب وہ دعا کر رہا تھا کہ لوگ ایک سے زیادہ نہ ہوں، ورنہ اسے کسی نہ کسی کے خون سے ہاتھ رنگنا پڑ جاتے۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے کسی کو مار کر افسوس ہوتا ہو، اس معاملے میں وہ بڑا بے رحم واقع ہوا تھا مگر زیادہ قتل و غارت پولیس کو اپنی جانب متوجہ کرنے والی بات ہوتی۔ اپنے پیشے کے باعث احتیاط پسندی اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ہر واردات کو وہ خوب سوچ سمجھ کر انجام دیتا تھا۔ اس کے پاس ایک عدد خنجر ضرور ہوتا تھا۔ گھر میں وہ اس خنجر کی نوک پر ایک پھول سجاتا تھا۔ جس دن خنجر پر پھول نہ لگاتا، اسے یقین ہو جاتا کہ آج وہ اپنی واردات میں ناکام رہے گا۔ کئی مرتبہ اس کو صورتِ حال کے پیشِ نظر کسی کو زخمی یا ہلاک بھی کرنا پڑتا تھا تو کبھی ہچکچایا نہیں تھا۔ ایک مرتبہ تو اس سے قتل بھی ہوا تھا اور مال بھی ہاتھ نہیں آیا تھا۔

ایسی ناکام وارداتیں اس کی تاریخ میں کم ہی وقوع پذیر ہوئی تھیں لیکن وہ اکثر ہی کہا کرتا تھا کہ "وہ مجرم ہی کیا جو کبھی ناکام نہ ہوا ہو؟"

البتہ پکڑے جانے کے معاملے میں وہ خوش قسمت ہی تھا۔ پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی ناکام وارداتوں سے بھی ایسے رفو چکر ہوا تھا کہ پولیس لکیر ہی پیٹتی رہ گئی اور وہ سب کو جُل دے کر فرار ہو گیا۔ ایسی وارداتوں کے بعد وہ کسی غیر ملک روپوش ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی اور جس کے پاس پیسہ ہو اس

کوخوش آمدید کہنے والے ممالک کی بھی دنیا میں کمی نہیں۔
اس واردات میں بھی اسے لمبا ہاتھ لگنے کی امید تھی اور وہ اپنی منصوبہ بندی پر پوری طرح کاربند تھا۔ سلمان کی ریکی سے وہ آج ہونے والی شپ منٹ سے باخبر تھا۔ اس کو دور سے ایک گاڑی آتی نظر آئی، اس کی دوربین نے تصدیق کر دی کہ وہی اس کی مطلوبہ گاڑی تھی۔ اس نے سڑک کے اس حصے کی جانب دیکھا جہاں اس نے پہلے سے نشانی لگا رکھی تھی۔ وہ چوکنا ہو گیا اور لکڑی کے وہ چھوٹے ٹکڑے نکال لیے جن پر ہر طرف کیل گڑی ہوئی تھیں۔
گاڑی وہاں سے گزری تو اس نے نشست باندھی اور اپنے ہاتھ میں موجود کیل بھری لکڑیاں پھرتی کے ساتھ سڑک پر پھیلا دیں۔ ہلکی سی دھمک ہوئی جو انجن کے شور میں دب گئی، لکڑیوں میں گڑی کسی کیل نے اپنا کام پورا کر دیا تھا۔ ٹائر پھٹنے کی آواز اتنی اونچی تو نہیں تھی مگر ویران سڑک پر گونج دور تک محسوس ہوئی۔ ایک ٹائر سے بہت تیزی سے ہوا نکلی تھی۔ شاہد جہاں گھات لگا کر بیٹھا تھا اس سے چند قدم کی دوری پر ہی گاڑی رک گئی۔ گاڑی سے ایک اسمارٹ سا نوجوان باہر نکلا اس کی یونیفارم کو دیکھتے ہی شاہد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہی ڈرائیونگ سیٹ سے اترا تھا اور اکیلا ہی تھا۔
''شٹ...... یہ مصیبت بھی ابھی آنی تھی۔'' گاڑی کے فلیٹ ٹائر کو ایک ٹھڈا رسید کرتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔
شاہد ابھی بھی غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوربین رکھ دی تھی، اب اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی نال والی ڈارٹ گن موجود تھی۔ اس جدید ساختہ گن میں بڑی ڈارٹ گن والی تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ بے ہوش کر دینے والی دوا اپنی اثر پذیری میں کمال رکھتی اور ایک صحت مند انسان کو تیس سیکنڈ کے اندر اندر بارہ سے پندرہ گھنٹے کے لیے ایسا غافل کر دیتی تھی۔
شاہد انتظار کر رہا تھا کہ آنے والا خود گاڑی کا ٹائر تبدیل کرتا ہے یا کسی کو مدد کے لیے بلاتا ہے۔ اگر وہ کسی کو مدد کے لیے فون کرنے لگتا تو وہ ڈارٹ گن فائر کر دیتا مگر اس کو پھر ٹائر خود ہی تبدیل کرنا پڑتا۔ وہ اس امید میں تھا کہ اس کو ٹائر بدلنے کی زحمت نہ کرنا پڑے۔ پہلے اس کے پلان میں یہ سب نہیں تھا اور وہ لفٹ کا حربہ اختیار کرنا چاہتا تھا، پر جو ملک کے حالات تھے اس میں اس کو سنسان سڑک پر لفٹ ملنے کا چانس شاید نہ ہی ملتا اس لیے اس نے اپنے منصوبے میں یہ تبدیلی کی اور کیل پھینک کر ہی گاڑی کو رکنے پر مجبور کر دیا۔
اترنے والے شخص کو جب اس نے پتلون کی جیب سے موبائل فون نکالتے دیکھا تو ایک دم ہوشیار ہو گیا۔
''یہ...... سگنل بھی یہاں ڈراپ ہونے تھے۔'' ایک موٹی سی گالی دے کر اس نے فون کو گاڑی کے کھلے دروازے سے سیٹ پر پھینکا تو شاہد نے بھی اپنی گن نیچے کر دی۔ ان دونوں کے بیچ میں زیادہ فاصلہ حائل نہیں تھا اس لیے وہ پوری احتیاط کر رہا تھا کہ کوئی متوجہ کرنے والی آواز پیدا نہ ہو۔
نوجوان نے اپنی آستینیں اوپر چڑھائیں، کیپ اتار کر رکھی اور گاڑی کے پچھلے حصے سے ایک سلامت ٹائر اور اس کو بدلنے والا ساز و سامان لے کر ''مجروح'' ٹائر کی تبدیلی کے عمل میں مصروف ہو گیا۔ وہ اپنے کام میں ماہر معلوم ہوتا تھا کیونکہ بڑی تیزی کے ساتھ اس نے خراب ٹائر تبدیل کیا۔ نئے ٹائر کے بھی نٹ بولٹ وہ کس چکا تھا جب شاہد حرکت میں آیا۔ اس نے ڈارٹ گن فائر سے فائر کیا جو کہ سیدھا نوجوان کے شانے میں جا کر پیوست ہو گیا۔
''آہ......'' اس کے منہ سے ایک سسکاری نکل گئی۔
ہاتھ بڑھا کر اس نے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور ڈارٹ نکال کر دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سامنے سے اس کو شاہد آتا دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں ایک عجیب سی گن تھی۔
''کون...... کون ہو تم؟'' اس کی زبان پر ہکلاہٹ طاری تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور سر چکرا رہا تھا۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا سا گیا، شاہد نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔
''نہ بھئی نہ...... اتنی محنت کی ہے اور تم گر کر اپنی یونیفارم ہی خراب کرنے لگے ہو۔'' شاہد کے شوخ لہجے میں کہے الفاظ ہی اس نے اپنے حواس میں سنے، اس کے بعد وہ دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

نوشین اس وقت ائر پورٹ پر موجود تھی جہاں دنیا بھر کے لوگ چہکتے مہکتے گھوم رہے تھے۔ آنکھوں کے بجائے سر پر ٹکے سن گلاسز، بڑا سا اسٹائلش ہینڈ بیگ اور ایک ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل پکڑے وہ خاصی ماڈرن لگ رہی تھی۔ اس نے ایک درمیانے سائز کے سوٹ کیس کو ہینڈل سے پکڑ رکھا تھا جس کے ساتھ ڈیوٹی فری شاپ کے مخصوص لیبل والا ایک پیکٹ بھی تھا۔ وہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔ دوپٹے کے

تکلف سے بے نیاز، لانگ شرٹ کے ساتھ اس نے ایک بلیک کلر کا ٹائٹ سا ٹراؤزر پہن رکھا تھا جس میں اس کے بدن کے خدوخال نمایاں ہو رہے تھے۔ شرٹ اس کے متناسب بدن پر اس طرح چسپاں تھی جیسے پہنا کر سلائی کی گئی ہو۔ کہیں سے بھی ادھیڑ عمر نہیں دکھ رہی تھی بلکہ پسنجر لاؤنج تک پہنچنے سے پہلے، مڑ مڑ کر دیکھنے والوں نے جس طرح اس کو نظروں ہی نظروں میں جو پذیرائی بخشی تھی بہت سی نوجوان لڑکیوں کے حصے میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس نے بے اعتنائی سے سب کو نظر انداز کیا اور اپنی فلائٹ کے بورڈنگ کے لیے اس ائرلائن کے کاؤنٹر کی طرف بڑھی جس کا ٹکٹ اس کے پاس تھا۔

''جی میڈم اپنا پاسپورٹ، ٹکٹ پیش کریں اور سامان کو اس ویٹ مشین پر رکھ دیں۔'' ائرلائن کی یونیفارم میں ملبوس ایک خوش شکل ایجنٹ اس سے مخاطب ہوئی۔ نوشین نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ جب تک اس نے اسکرین پر اس کی تفصیلات کا اندراج کیا تب تک وہ روشن کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔

مسعود کے غیاب کے شروع کے سال اس نے بڑی بے چینی سے کاٹے تھے۔ سائرہ کو لے کر جانا اس کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ثابت ہوئی تھی۔ سائرہ کو کھونے کا اثر تو اس نے اتنا زیادہ لیا تھا کہ دو ماہ تک جاب پر بھی نہیں گئی تھی۔ چھٹی میں مزید توسیع نہ ملنے اور برخاستگی کا وارننگ نوٹس ملنے پر اس نے اپنی نوکری کو سنجیدگی سے لیا تھا اور کام پر پھر سے جانا شروع کیا۔

شروع کے چند سال تو روشن اس کی دل جوئی ہی کرنے گھر آتا تھا پھر اس نے کام کو دوبارہ شروع کرنے کی پیشکش کر دی۔ نوشین اس اخلاق باختہ جرم کی دنیا کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس آفر کو رد کر دیتی لیکن روشن کی دعوت بہت خوش کن تھی۔ اس نے اپنے تعلقات استعمال کر کے نہ صرف نوشین کی پروموشن کرا دی تھی بلکہ ڈیوٹی کے اوقات میں بھی نرمی آ گئی تھی۔ اب وہ مہینے میں پندرہ دن بھی آف کر لیتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اپنے ڈیوٹی آورز زیادہ سے زیادہ ملک میں موجودگی میں ہی پورے کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ باقی کا وقت اس نے سائرہ کی کھوج میں لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہاں روشن کے غیر معمولی وسائل بھی کام آئے۔ کوئی بھی سراغ ملنے پر وہ اس شہر محلے پہنچ جاتی جہاں سائرہ یا مسعود کے ملنے کے امکانات ہوتے پر ناکامی ہی اب تک اس کے ہاتھ آئی تھی۔ اس کا دل بہت خراب ہو چکا تھا۔ روشن کے ساتھ شمولیت اس کو اب اپنی زندگی کی بھیانک غلطی لگنے لگی تھی۔ مسعود کی موجودگی میں کام کرنا اور بات تھی پر اب اس کی تلاش ..... ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات تھی۔

پندرہ سال کے طویل عرصے میں مسعود کا کوئی سراغ نہ ملنا اسے کھٹکنے لگا تھا۔ وہ روشن کی وقت بے وقت کی من مانیوں سے بھی تنگ آنے لگی تھی۔ شروع میں اس کا رویّہ بڑا محبت کرنے والا تھا۔ وہ اس کا خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ سائرہ کی تلاش میں ایک دو مرتبہ اس کے ساتھ بھی رہا۔ اس کا دل تب موم ہوا جب روشن نے اسے شادی کی پیشکش کر دی۔

جب تک وہ مسعود سے عدالتی خلع لیتی، تب تک ان کے جسمانی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ روشن نے اس کے بعد ہر بار شادی کی بات کو ٹال ہی دیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ کفِ افسوس ہی ملتی رہ جاتی کہ ایک بچی کی ماں ہوتے ہوئے بھی اس ڈھکوسلے میں کیسے آ گئی جس پر نوجوان لڑکیاں اپنی عصمتیں برباد کرتی رہ جاتی ہیں۔ شاید یہ گھر والوں کی تربیت ہی ہوتی کہ وہ ساری عمر سہاروں کی تلاش میں پامال ہی ہوتی رہتی ہیں۔

اس بار اس چھوٹے شہر کی اسائنمنٹ کے لیے روشن نے اسے اچانک ہی بلا یا تھا۔ اگرچہ اس کا دل نہیں تھا پھر بھی وہ راضی ہوگئی۔ روشن پر بھی اس بار وہ خوب بھڑاس نکال کر آئی تھی۔ لیکن اس کا قلبی اطمینان جیسے کہیں کھو گیا تھا۔ سائرہ کی یاد اس طرح بار بار آ رہی تھی کہ اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ اس ماہ اس کی سالگرہ بھی تھی۔

'سولہ سال کی ہوگئی ہوگی اب وہ......' اس نے سوچا۔

اس کے خیالات کی رو ائرلائن ایجنٹ کی آواز سے ٹوٹی۔ ''میڈم آپ کا سب کچھ او کے ہے...... پلیز سرچ کاؤنٹر پر چلی جائیں۔'' وہ اس کے سوٹ کیس پر ٹیگ لگاتے ہوئے بولی۔ ''فلائٹ کا ٹائم ہونے ہی والا ہے اور بعد میں رش بڑھ جائے گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے الیکٹرونک ٹرالی چلا دی جو سوٹ کیس کو لگیج ٹرانسپورٹ والے سیکشن کی طرف لے گئی۔ خالی آنکھوں سے نوشین نے اسے جاتے دیکھا اور سرچ کاؤنٹر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

اچانک اس کے بدن میں...... سراسیمگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ روشن کا متعین کردہ شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک باریش شخص۔ ہاتھ میں میٹل ڈیٹیکٹر کے ساتھ

کھڑا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک گئی اور اپنے ہینڈ بیگ کو ایسے ٹٹولنے لگی جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہی ہو۔ سیکیورٹی گارڈ کی نگاہیں اسے کسی برمے کی طرح اپنے جسم میں گھستی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی امیگریشن کاؤنٹر تک پہنچی۔ ایسی صورتِ حال میں وہ خود کو پریشان ظاہر کرنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا پاسپورٹ امیگریشن آفیسر کے ہاتھ میں دیا اور متلاشی نگاہوں سے سیکیورٹی کا جائزہ لینے لگی۔

''یہ لعنتی...... مجھے کہیں مروا ہی نہ دے۔'' اس نے خالصتاً زنانہ انداز میں روشن کو دل ہی دل میں کوسا۔

امیگریشن آفیسر نے بنا کوئی بات کیے اس کے مندرجات دیکھے اور پھر ایگزٹ کی مہر ثبت کر کے پاسپورٹ لوٹا دیا۔

''میڈم...... آپ کے پاس کوئی کھانے پینے کی چیزیں ہیں تو ان کو سائڈ پر رکھ دیں۔'' باریش گارڈ اس کے ہاتھ میں موجود منرل واٹر کی بوتل دیکھ کر بولا۔ ''اپنا ہینڈ بیگ اس اسکینر مشین پر رکھ دیں اور خود آپ اس واک تھرو گیٹ میں سے گزریں۔''

نوشین نے پانی کی بوتل اور ڈیوٹی فری والا پیکٹ جس میں ملک کی مشہور کھجوریں تھیں، ایک طرف رکھ دیا۔ ان کو چیک نہیں کیا جانا تھا۔ اور باقی کی ہدایات پر عمل کرنے لگی۔ واک تھرو گیٹ نے الارم بجا دیا تو اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔

''ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔'' وہ سوچ کر رہ گئی۔

''میڈم اس طرف..... آجائیں، آپ نے اس کے علاوہ تو کوئی زیورات نہیں پہن رکھے ہیں؟'' چیکر نے اس کو ایک جانب ٹھہرا کر ناک میں موجود نتھلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے اتھل پتھل ہوتے دل کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

''معذرت کے ساتھ میڈم...... آپ کو جامہ تلاشی دینا ہوگی۔'' چیکر بولا۔ ''بلکہ آپ جو یہ کھجوریں لے کر جا رہی ہیں ان کو بھی چیک کرائیں۔''

نوشین کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''کک...... کیوں؟ اس کی تو رسید بھی ساتھ ہے......'' بات کے آغاز میں وہ تھوڑا اٹکی پھر فوراً اعتماد بحال کر کے بولی۔ ''کیا اپنے رشتے داروں کے لیے تحفہ لے کر جانا بھی منع ہے؟''

''نہیں میڈم...... تحائف پر کوئی پابندی نہیں ہے...... دراصل پچھلے دنوں ممبئی ائرپورٹ سے ایک خاتون پکڑی گئی ہے جو ہمارے ملک سے سونا کھجور کی گٹھلیوں کی صورت میں اسمگل کر رہی تھی۔ اس حوالے سے خصوصی ہدایات ہیں...... آپ مائنڈ نہ کیجیے گا۔'' باریش چیکر نے تفصیلی جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... کرو چیک...... لیکن مسافروں کو ایسے تنگ کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے......'' وہ اب کی بار پہلے سے زیادہ اعتماد سے بولی تو چیکر اس کو دیکھ کر رہ گیا۔ اس کو اس خاتون پر شک ہوا تھا پر اس کا انداز دیکھ کر وہ ڈانواں ڈول ہوگیا تھا۔ اسمگلنگ کرنے والے تو چیکنگ کے نام پر ہی پریشان ہو جاتے تھے اور کوئی نہ کوئی غلطی کرنے پر پکڑے جاتے تھے۔ پر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس بار اس کا پالا کن گھاگ لوگوں سے پڑا ہے۔

نوشین اپنی بات کہہ کر خواتین کی جامہ تلاشی والے حصے کی جانب بڑھ گئی جو کہ پردوں کے ساتھ بنائے گئے ایک مختصر کیبن پر مشتمل تھا۔ وہاں اسٹول نما کرسی پر بیٹھی ایک فربہ اور کرخت چہرے والی سیکیورٹی گارڈ نے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

اس کی اصل پریشانی کا آغاز تو اب ہوا تھا کیونکہ ہیرے اس نے کھجوروں میں نہیں رکھے تھے۔ ان کو وہ پہن کر آئی تھی۔ خصوصی طور پر تیار کردہ زیر جاموں میں ہیروں کی سلائی کر دی گئی تھی۔ روشن نے وہ فراہم کرتے ہوئے اسے ہدایت کی تھی کہ جامہ تلاشی کے علاوہ ان کا پول نہیں کھل سکتا۔ اس کے بندے نے یہاں کام سنبھالنا تھا اور اس کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

اپنی عرق آلود پیشانی کو وہ ٹشو سے صاف کر رہی تھی کہ موٹی گارڈ کی سخت آواز پر چونک گئی۔

''تم تو بڑی بہادر ہو...... ورنہ اس ایماندار صاحب کے سامنے تو تم جیسی دو سیکنڈ میں اپنا راز فاش کر دیتی ہیں۔''

''کیا مطلب......؟ کہنا کیا چاہتی ہو تم؟'' نوشین نے اپنی آواز میں لرزش پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ارے میری پیاری چڑیا......'' گارڈ اس کے قریب آ کر بولی۔ ''میں تو بس اتنا کہہ رہی ہوں کہ روشن نے تمہیں صحیح تربیت دی ہے...... ورنہ تو آج جو چیکر باہر ٹھہرا ہے وہ تو مردوں کا بھی پتا پانی کر دیتا ہے...... تم تو ایک نازک سی عورت ہو۔''

نوشین کے تنے ہوئے اعصاب پر جیسے کسی نے

گھڑوں پانی ڈال دیا ہو۔ وہ ایک سرد ہنکارا بھر کر رہ گئی۔ سیکیورٹی گارڈ روشن کی ہی کار پرداز تھی۔ اس کا متعین کردہ چیکر نہیں آسکا تھا تو مال کو 'پاس' کروانے کے لیے دوسرا بندوبست بھی موجود تھا۔

''ان کا خیال رکھنا......'' گارڈ بے ہودہ انداز سے اس کے سینے کو چھو کر بولی۔ ''روشن کی جان ہے اِن میں......'' اس نے ہیروں کی آڑ میں طنز کیا۔

نوشین ایسی یاوہ گوئی کی عادی تھی اس لیے ایک ناگوار نگاہ گارڈ پر ڈال کر کیبن سے باہر نکل آئی۔ سب ٹھیک ہے کا سگنل ملنے پر اس نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور جہاز کی طرف جانے والے کوریڈور میں داخل ہوگئی۔ جہاز میں پہنچ کر اپنی سیٹ تلاش کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

مشکل مرحلہ گزر چکا تھا۔ پاکستان کے حوالے سے اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ روشن کا سیٹ اَپ یہاں کی نسبت وہاں بہت مضبوط تھا۔ ایماندار افسروں کی بھی کمی تھی اور پکڑے جانے کے بعد سزا کا خوف بھی نہ تھا۔ اس لیے وہ ٹیک آف کے بعد اطمینان سے آنکھیں موند کر اونگھنے لگی۔ اگلے دو گھنٹے آرام کرنے کے لیے تھے۔

☆☆☆

شاہد کی خوشی دیدنی تھی۔ مسرت اُس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ سب کام اس کی منشا کے مطابق ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر باقی دن بھی منصوبہ بندی کے عین مطابق گزر گیا تو اس کے وارے نیارے ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

شاہد نے اپنے شکار کی یونیفارم اتار کر خود پہنی۔ قدرے ڈھیلی ہونے کے باوجود اس نے شرٹ پہن لی، پتلون البتہ اس کو پوری ہی آئی تھی۔ شکار ایک طرف صرف انڈر ویئر اور بنیان میں بے سدھ پڑا تھا۔ اس کو اٹھا کر وہ درختوں کے جھنڈ کی طرف لے گیا۔ رسی کی مدد سے ہاتھ پاؤں باندھنے کے بعد اس نے ایک کند چھری اس کے پاس ڈال دی۔ ایک بازو کی رسی اتنی لمبی چھوڑ دی تھی کہ وہ بہ آسانی چھری اٹھا کر اپنی آزادی کے لیے کوشش کر سکتا تھا۔ اس پر ہمدردی کے دورے اکثر جب پڑتے تھے تو وہ ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔ اب بھی وہ ایک مجبور اور بے بس کو موت کے گھاٹ نہیں اتارنا چاہتا تھا اس لیے اتنا تردد کیا۔

زبان بندی اس لیے نہیں کی تھی کہ اگر ہوش میں آنے کے بعد وہ خود کو آزاد نہ بھی کرا پاتا تو کم از کم آتی جاتی کسی گاڑی کو آواز ہی دے لے۔ نبض چیک کرنے کے بعد وہ مطمئن ہوگیا کہ اب وہ کم از کم دس گھنٹے تک ہوش میں نہیں آئے گا۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک کریم نکالی اور چہرے اور بازوؤں پر لگانا شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا اثر سامنے آگیا۔ اس کی رنگت سنولا گئی تھی، اب بادیُ النظر میں اس کو شاہد کی حیثیت سے شناخت کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ احتیاط وہ اس لیے بھی کر رہا تھا کیونکہ ایک بار وہ سلمان کے سامنے آچکا تھا۔ امید تو نہیں تھی کہ وہ ایک بار کی اس سرسری ملاقات کو یاد رکھ پایا ہوگا پر احتیاط لازم تھی۔

اس کو صرف گاڑی اور یونیفارم سے غرض تھی جو وہ حاصل کر چکا تھا، غیر ضروری قتل و غارت سے اجتناب برتنے میں وہ آج بھی کامیاب ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی کلائی پر وقت دیکھا، بارہ بجنے میں ابھی پینتالیس منٹ باقی تھے۔ ساری کارروائی میں اس کو بمشکل ایک گھنٹا لگا تھا۔ اس نے بونٹ پر رکھی کیپ اٹھا کر اپنے سر پر جمائی اور مسکراتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر کے اپنی منزل کی طرف بڑھا جو کہ ایس۔اے ٹریڈرز تھی۔

☆☆☆

سلمان فطرت کی پکار کا جواب دینے کے لیے منی مارکیٹ کے کونے میں بنے، دو میں سے ایک واش روم میں ...... چلا گیا...... دوسرا خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ منی مارکیٹ میں اس وقت صرف وہ اور بیکری والا لڑکا موجود تھے، آخری گاہک کو بھی گئے ہوئے دس منٹ سے زائد ہو چکے تھے۔ اس نے ایک بہت بڑے حصے پر اسٹور روم بھی بنا رکھا تھا جہاں ایک طرف اس کا آفس تھا۔ اُدھر چھوٹی موٹی میٹنگ اور آرام کرنے کی سہولت کے ساتھ ملحق واش روم بھی تھا مگر خال خال مواقع پر ہی اس کے استعمال کی نوبت آتی تھی۔ اس اسٹور روم کا دروازہ کاؤنٹر کے پیچھے سے جاتا تھا اور بظاہر وہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی جس کے لیے اسے لاک رکھنا پڑتا۔ سلمان بھی عموماً اکیلے ہونے کی وجہ سے اس کو بند کرنے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔

صابن سے اچھی طرح ہاتھ دھونے کے بعد جب وہ باہر آیا تو بیکری والے لڑکے کو کاؤنٹر کے پاس ٹھہرے دیکھ کر چونک گیا۔ بیکری پراڈکٹس کا سیکشن قدرے فاصلے پر تھا، وہ تیزی سے قدم اٹھاتا اس کی جانب بڑھا۔

''کچھ چاہیے تھا کیا؟'' اس کے قریب پہنچنے سے قبل ہی وہ سوال کر چکا تھا۔

''نہیں جناب...... آپ کو یہ ٹیسٹ کروانا تھا۔''

بیکری والے لڑکے نے کاؤنٹر پر رکھی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں کافی چھوٹے سائز کے ''چکن پیٹیز'' رکھے تھے۔

''نام کیا بتایا تھا تم نے......؟'' سلمان اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک تو مجھے نام بڑی جلدی بھول جاتے ہیں۔''

''جنید احمد...... جناب۔'' جنید نے بتاتے ہوئے اپنے سائز سے بڑی شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور بھولنے کا کوئی مسئلہ نہیں...... آپ یہ نیم ٹیگ پڑھ کر یاد رکھ سکتے ہیں۔'' وہ بڑے پروفیشنل انداز میں مسکرا کر بولا۔

ساتھ میں اس نے ٹرے بھی آگے بڑھا کر سلمان کے سامنے کر دی۔ اس نے ایک پیس اٹھا کر منہ میں ڈالا تو لذت سے حیران رہ گیا۔

''یہ کیا ہیں؟'' حلاوت سے اس کے بعد میں ایک پیس ابھی گھل ہی رہا تھا کہ اس نے دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے ایسے لذیذ پیٹیز پہلے کبھی نہیں کھائے تھے۔ یہ سائز میں بھی چھوٹے تھے اس لیے ایک بار میں ایک پورا ہی لقمہ بن جاتا تھا۔

''جناب...... ان کا نام ہم نے 'ہیون ڈیلائٹس' رکھا ہے......'' جنید مسکرایا کیونکہ سلمان کا ردعمل متوقع تھا۔ ''ہماری بیکری کی نئی پیشکش...... آپ کو اس لیے ٹیسٹ کروائے ہیں تاکہ اجازت لی جا سکے کہ آئندہ اس آئٹم کو مینیو میں شامل کیا جائے یا نہیں۔''

''ضرور...... ضرور، کیوں نہیں......'' اس نے بیک وقت چلتے اپنے ہاتھوں اور منہ کے درمیان ایک مختصر وقفہ دے کر کہا اور پھر سے پلیٹ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔ جنید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ویسے اس میں ایسا کیا شامل کیا ہے جو اتنا زبردست ذائقہ ہو گیا ہے؟'' سلمان نے سارے 'ہیون ڈیلائٹس' ختم کرنے کے بعد منہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''جناب...... کچھ ایسا خاص نہیں ہے۔'' مسکرا کر بولنا شاید اس کی عادت تھی۔ ''لوگ دراصل اپنی روایتی چیزوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔ ہم نے ان کی ترکیب میں عام بازاری گھی یا مکھن کے بجائے خالص دیسی گھی استعمال کیا ہے...... اور فرق آپ کے سامنے ہی ہے۔'' جنید نے خفیہ جزو کا انکشاف کیا جو انوکھی لذت کا باعث بنا تھا۔

''واقعی...... لاجواب ہیں۔'' سلمان نے تائید میں سر کو ہلایا۔ ''سچ میں جنت کی ڈیلائٹس ہی لگ رہی ہیں۔''

مگر اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ اس کو یقین نہیں آیا تھا کہ صرف دیسی گھی کی آمیزش سے کوئی عام چیز اتنی خاص بن سکتی ہے لیکن اس نے نظرانداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اکثر لوگ اپنی کامیابی کے گر دوسروں کو نہیں بتاتے اور اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا۔

ہلکی پھلکی گفتگو نے اس کے ذہن پر طاری تناؤ میں کافی کمی کر دی تھی۔ ہیروں کی کھیپ کے حوالے سے آج اس کا دل بے چین تھا پر اب وہ خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ لنچ وہ اکثر نہیں کرتا تھا مگر آج یہ پیٹیز کھانے کے بعد محسوس ہوا کہ وہ روز بھی یہی خوراک کھا سکتا ہے۔

''تم بڑے اچھے لڑکے ہو......'' وہ جنید سے بولا۔ ''پہلی بار آئے ہو لیکن بڑے مزے کی چیز لائے ہو۔ کیا تم ان میں چکن کی جگہ کوئی اور چیز استعمال کر کے بنا سکتے ہو؟'' اس نے اپنے ذہن میں آنے والے ایک سوال کے تحت پوچھا۔

''جی مٹن، بیف اور سبزیوں کے ساتھ بھی بنایا......''

''نہیں...... میں کسی سخت چیز کے ساتھ بنانے کا پوچھ رہا ہوں۔'' سلمان نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''سخت چیز؟'' جنید کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''بھلا کوئی سخت چیز کیوں کھانا پسند کرے گا؟''

سلمان کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا کہ اس نے ایک غیر متعلقہ بندے سے سوال کر دیا ہے۔ عموماً روشن کے ساتھ ہیروں کی اسمگلنگ کے مختلف طریقے زیر بحث رہتے تھے۔ اس کے کئی آئیڈیاز کو روشن عملی شکل بھی دے چکا تھا۔ ابھی بھی اس کے ذہن میں ہیروں کو پیٹیز میں لپیٹ کر بھیجنے کا خیال آیا تھا تو جلدی میں پوچھ بیٹھا۔

''چیز (cheese)...... مطلب پنیر......'' سلمان نے بات کو خوبصورتی کے ساتھ تبدیل کیا۔

''اوہ...... ہاں جی کیوں نہیں...... ہم دنیا بھر کے کسی بھی قسم کی پنیر کے ساتھ ان کو بنا سکتے ہیں۔ پر ذائقہ کیسا ہو گا اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا......'' جنید نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔ ''پنیر اور دیسی گھی کا ملاپ کیا رنگ لائے گا، کچھ کہہ نہیں سکتے۔''

''ہم م م......'' سلمان نے ہنکارا بھرا۔ اسی وقت اس کے فون پر میسج کی ٹون ابھری۔

''چلو...... تم اپنا کام کرو...... میں اپنا کام کرتا ہوں۔'' وہ دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جنید سے بولا جہاں سے ایک بال بچوں سمیت والی بڑی سی فیملی

داخل ہو رہی تھی۔ جنید کو بھیجنے کے بعد وہ فون کی جانب متوجہ ہوا۔ روشن نے نوشین کی تصویر اور دیگر تفصیلات بھیجی تھیں۔ وہ ان کو دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆

ایس۔ اے ٹریڈرز میں تھوڑی دیر پہلے ہونے والا رش اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اِکّا دُکّا گاہک موجود تھے جو کہ شاید کسی کو ریسیو کرنے نہیں آئے تھے کیونکہ فلائٹ لینڈ کر چکی تھی۔ سلمان بے چینی سے محوِ انتظار تھا۔ نوشین سے وہ پہلی بار ملنے جا رہا تھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی اور وہ خوامخواہ اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہا تھا۔ جنید نے ایک دو بار سر اٹھا کر اس کو دیکھا پر اپنی جانب متوجہ نہ ہونے پر پھر سے اپنے کام میں جت گیا۔ اس کا لایا ہوا اسٹاک تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اپنی بیشتر چیزیں وہ سمیٹ چکا تھا۔

سلائڈنگ ڈور کھلا تو سلمان کی نگاہیں دروازے پر گڑ گئیں۔ ایک شور و غل کرتی فیملی کی آمد پر اس کو مایوسی ہوئی۔ وہ ٹہلتا ہوا اپنے کاؤنٹر کے پیچھے موجود ریوالونگ چیئر پر جا بیٹھا۔ موبائل آن کر کے ایک بار پھر سے نوشین کی بھیجی گئی فوٹو کو دیکھنے لگا۔ وقت تیزی سے سرک رہا تھا اور بہت سے گاہک آ کر جا چکے تھے۔ مگر وہ شمع ہی غائب تھی جس کے لیے سلمان پروانہ وار چکر کاٹ رہا تھا۔

پھر جیسے چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ تمام روشنیاں جیسے سمٹ کر اس کے حسنِ جہاں سوز پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ وہ آئی تو ایک بہار سی چھا گئی۔ کئی مرد حضرات کو ان کی بیگمات نے بدنظری پر ٹوک دیا۔ یہ چند فیملیز اپنی شاپنگ پوری کر کے واپس جا رہی تھیں۔ کہیں دبا دبا اور کہیں اونچا احتجاج نظر انداز کرتی وہ سیدھی کاؤنٹر پر آئی۔ سلمان کچھ رعبِ حسن سے اور کچھ پریشانی کے باعث باادب سا کھڑا ہو گیا۔ دماغ کو اس کی آمد سے قدرے اطمینان ہوا تو وہ یہ نوٹس کیے بنا نہ رہ سکا کہ تصویر کے مقابلے میں نوشین کئی گنا زیادہ حسین تھی۔

”معذرت خواہ ہوں اس تاخیر کی...... دراصل ہوٹل والوں نے جو گاڑی روانہ کی تھی وہی دیر کا موجب بنی۔“ رسمی علیک سلیک کے بعد نوشین نے شستہ اردو بولی تو وہ ہنس پڑا۔

”معذرت کی ضرورت نہیں، بس آپ نے اپنا کام پورا کر دیا ہے، اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہیے۔“ اس نے بھی اخلاقاً جواب دیا۔

”کیا مال کی ڈیلیوری یہیں لیں گے؟“ اس نے مسکرا کر مطلب کی بات کی، اس کے موتی جیسے دانت جگمگانے لگے۔ ”ڈرائیور کو میں نے باہر انتظار کرنے کا کہا ہے، میں کچھ دیر ہوٹل میں رک کر آرام کرنا چاہتی ہوں کیونکہ آج رات ہی میری کراچی کے لیے بکنگ ہے۔“ اس نے ایک مشہور بس سروس کا نام لیتے ہوئے کہا۔ اس شہر سے فوری طور پر کوئی فلائٹ دستیاب تھی اور وہ بلامقصد یہاں مزید وقت نہیں گزار سکتی تھی۔

سلمان نے آگے بڑھ کر اسٹور کا دروازہ کھول دیا۔

”آپ فریش ہو لیں...... اندر واش روم وغیرہ کی سہولت موجود ہے۔ میز پر ایک پاؤچ پڑا ہوگا، ہیرے اس میں منتقل کر دیں، میں بس تھوڑی دیر میں ان رہ جانے والے گاہکوں کو نمٹا کر آیا۔“ اس نے مارکیٹ میں بچ جانے والے دو نوجوان لڑکوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو کہ کچھ سامان اٹھائے کاؤنٹر کی جانب ہی آ رہے تھے۔

دونوں کو بل دینے اور رقم وصول کرنے کے بعد وہ جنید سے باآواز بلند مخاطب ہوا۔

”جنید...... اب بہت کم گاہک آئیں گے...... ویسے بھی شام ہونے والی ہے...... تم اب جا سکتے ہو۔ البتہ کوئی ڈیلائٹس وغیرہ دستیاب ہو تو اِدھر اسٹور روم میں میرے آفس میں دے دو۔ میری ایک مہمان آئی ہوئی ہیں۔“ وہ فریج سے کولڈ ڈرنک کے دو ٹن پیک نکال کر بولا۔

”جی جناب ابھی لاتا ہوں...... پر آپ یہ ڈرنکس رہنے دیں، میں آپ کے لیے اسپیشل لیمن کاک ٹیل تیار کر کے لاتا ہوں۔“ جنید نے اس کے ہاتھ میں موجود ڈرنکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے یہ بات اس انداز سے کہی تھی جیسے وہ مشروب کوئی سخت مضرِ صحت چیز ہوں۔

”یہ بھی 'کمپلی مینٹری' ہوگا یا پیسے لگیں گے؟“ سلمان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

اسے یہ لڑکا پسند آیا تھا اور بہانے بہانے سے چکر لگا کہ وہ ہیون ڈیلائٹس کے بعد اور بھی بہت کچھ چکھنے کے نام پر اُڑا چکا تھا۔ جنید نے اس پر کوئی تعرض نہیں برتا، بلکہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا تھا۔ اب بھی اس کی پیشکش حیران کن رہی تھی، بجائے گھر جانے کے وہ اس کے لیے خود ڈرنک بنا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ٹن پیکس واپس فریج میں رکھ دیے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کو مستقل کام کی آفر کر دے۔ کام بڑھ رہا تھا اور اس کو آج کی گپ شپ میں مزہ بھی آیا تھا۔

”نہیں اس کی تو میں پوری قیمت وصول کروں گا۔“

جنید نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے وہ ایک کاک ٹیل ڈرنک بھی تیار کر رہا تھا جو مختلف مشروبات کی آمیزش سے تیار ہوتا تھا۔

''اچھا یہ دینے کے بعد تم سائڈ ڈور سے باہر جانا کیونکہ میں سلائڈنگ ڈور کا میکنزم بند کر دوں گا۔'' سلمان نے کہا اور جانے کے حوالے سے چند مزید ہدایات دے کر اسٹور روم کی طرف چلا گیا۔

اندر داخل ہو کر اس نے دروازے کے ایک جانب سوئچ بورڈ پر کچھ بٹن دبائے۔ یہ سارا میکنزم منی مارکیٹ کے آٹومیٹک دروازوں کو آن آف کرنے کے لیے اس نے انسٹال کرایا تھا۔ جدید سی سی ٹی وی کیمرے بھی پوری مارکیٹ میں لگے ہوئے تھے۔ ایک مانیٹر تو کاؤنٹر پر ہی موجود تھا جبکہ دوسرا آفس کی میز پر سجا تھا۔ آفس والے مانیٹر کے ساتھ ایک ہارڈ ڈرائیو بھی منسلک تھی جس میں دن بھر کی آمدورفت ریکارڈ ہو جاتی تھی۔ سلمان ہر بیس دن بعد ریکارڈنگ ڈیلیٹ کر دیتا تاکہ میموری کا مسئلہ درپیش نہ آئے۔

وہاں سے وہ آفس والے حصہ کی طرف آ گیا۔ نوشین پہلے سے ہی ایک کرسی پر براجمان تھی۔ وہ بھی اپنی ماسٹر چیئر پر بیٹھ گیا اور مانیٹر کی اسکرین پر نظریں دوڑائیں جس پر سی ٹی وی کیمروں کے ذریعے منی مارکیٹ کے اندر اور باہر کے مختلف مناظر پیش ہو رہے تھے۔

''یہ اپنی امانت سنبھال لیں......'' نوشین نے ایک پاؤچ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ ہیروں کو اپنی ذاتی بندش سے آزاد کرانے کے بعد ایک بار پھر سے قید کر چکی تھی۔ ''ان کو گننا چاہیں تو مجھے کوئی عار نہیں ہوگا۔'' سلمان اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ اچھی اردو جان بوجھ کر بول رہی تھی یا گفتگو ہی اس طرح سے کرتی تھی۔

''جی شکریہ...... گننے کی ضرورت نہیں...... مجھے آپ پر اور روشن پر پورا اعتماد ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ میری کوئی پہلی بار اس سے ڈیلنگ نہیں ہو رہی ہے اور یہ سارا کام ہی اعتبار کا ہے...... دھوکے بازی کرنے والا یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔'' وہ اس انداز میں بولا جیسے کسی بڑی نیکی کے کام کا تذکرہ کر رہا ہو۔

جنید دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک ٹرے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی جس میں کھانے کے لوازمات سے بھری ایک پلیٹ اور دو ہلکے سبز رنگ کے مشروب والے...... گلاس رکھے تھے۔ گلاسوں میں لگے پلاسٹک کی چھتریاں ظاہری خوبصورتی کے علاوہ اشتہا کو بھی بڑھا رہی تھیں۔ نوشین پیٹھ ہونے کی وجہ سے اب تک اسے دیکھ نہیں پائی تھی۔ سلمان نے اشارے سے اسے بلا کر سرو کرنے کا کہا۔

جنید نے پلیٹ میز کے درمیان رکھی اور ایک گلاس سلمان کے پاس رکھ کر نوشین کی طرف آیا۔

''یہ لیں میڈم...... آپ کے لیے اسپیشل لیمن منٹ مارگریٹا۔'' وہ گلاس اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

آواز نوشین کے کانوں میں کسی بم کی طرح لگی۔ وہ لہجہ تھا کہ جب پہلی بار ان کی آنکھیں آپس میں چار ہوئی تھیں۔ مارے حیرت اس کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔ جس کا تصور بھی نہیں تھا وہ چہرہ اس کے سامنے تھا۔ نگری نگری، قریہ قریہ وہ جس کی تلاش میں ماری ماری پھرتی تھی وہ اس کی نگاہوں کے سامنے اس طرح سے آ جائے گا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ایک دم سے وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور اس کی ٹی شرٹ کا گریبان پکڑ لیا۔

''تم مسعود...... تم دھوکے باز...... سائرہ کہاں ہے؟'' فرطِ جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی اور جملے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔

''میڈم...... آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے......'' جنید نے ابتدائی جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد کہا۔ ''میرا نام جنید ہے، مسعود نہیں...... اور میں کسی سائرہ کو نہیں جانتا۔'' اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک پرچھائیں سی لہرائی جسے وہ بخوبی چھپا گیا۔

''نہیں مجھے بتاؤ...... کہاں ہے سائرہ؟'' وہ ایک بار پھر سے اس کے گریبان کو ہلاتے ہوئے چلائی۔ اچانک ہی اسے ادراک ہوا کہ سامنے والا شخص صحیح کہہ رہا ہے۔ مسعود سے مشابہت غیر معمولی تھی پر جب وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا تب بھی اتنا کم عمر نہیں تھا۔ اس کی گرفت جنید کے گریبان پر قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔

''میڈم...... میں تو زندگی میں پہلی بار آپ کو دیکھ رہا ہوں...... میں کسی بھی سائرہ کا آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں؟'' جنید نے ...... آہستگی سے اپنا گریبان چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ پھر بے بس نگاہوں سے سلمان کی جانب دیکھنے لگا جو اس پورے واقعے کو ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔

چند لمحوں میں جو کچھ ہوا تھا اس پر وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کے مداخلت کرنے سے پہلے ہی سب کچھ ہو گیا تھا اور

اب اس کے سامنے یہ صورتِ حال تھی کہ نوشین، جنید کا دونوں ہاتھوں سے گریبان پکڑے کھڑی تھی اور وہ بے چارگی سے کبھی نوشین کو اور کبھی سلمان کو مدد طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

سلمان نے نوشین کا تذبذب محسوس کرلیا تھا چنانچہ وہ آگے بڑھا اور باہم دست و گریباں جوڑے کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔ ثالثی کا کام اس کو بالکل بھی پسند نہیں تھا مگر اس وقت کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔

''میڈم سنبھالیں خود کو...... یہ جنید احمد ہے اور یہاں بیکری کا کام کرتا ہے۔ آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ نوشین کو جنید سے دور کرتے ہوئے بولا۔

''یہ...... یقیناً مسعود...... مسعود انور نہیں ہے۔ پر یہ بالکل اس جیسا دکھائی دیتا ہے۔ وہی آنکھیں، وہی ناک نقشہ...... اور تو اور آواز بھی ویسی ہے۔ اگر یہ کوئی بیس سال زیادہ عمر کا ہوتا تو میں یہ کبھی ماننے کو تیار نہ ہوتی...... پر یہ نا ممکن ہے کہ اتنا وقت بیت جانے کے باوجود وہ ایسے کا ایسا ہی دکھائی دے۔'' وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

''آپ یہاں بیٹھیں اور ذرا ریلیکس کریں۔'' سلمان نے اسے نرمی سے کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ جھیل جیسے نین کٹوروں میں چھلکنے کے لیے بے تاب آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔

''نہیں...... میں چلتی ہوں......'' ایک دم ہی اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی جیسے بدن سے ساری توانائی کسی نے نچوڑ لی ہو۔ ''ڈرائیور باہر انتظار کررہا ہوگا۔'' تھکے تھکے انداز میں اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف جا ہی رہی تھی کہ کسی خیال کے تحت رک گئی۔

''سنو...... کیا تم مجھے اپنا رابطہ نمبر دے سکتے ہو؟'' اس نے جنید سے کہا۔

''اس سب کے بعد تو بالکل بھی نہیں......'' جنید اب بھی اس سے خائف نظر آرہا تھا۔ شاید وہ اس کی طرف سے معذرت کی امید لگائے ہوئے تھا جو کہ پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے اپنا فون نمبر دینے سے انکاری ہوگیا تھا۔

''اچھا...... چلو ایسا کرنا کہ کبھی کسی سائرہ یا مسعود انور کے بارے میں کوئی معلومات ملے تو مجھ سے رابطہ ضرور کر لینا۔'' وہ اپنا وزیٹنگ کارڈ ہینڈ بیگ سے نکال کر دیتے ہوئے بولی۔ ''اور پیسوں کی فکر بالکل بھی نہ کرنا، وہ میں تمہاری توقع سے بھی زیادہ دوں گی......''

جنید نے بادلِ ناخواستہ کارڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بلا ایک بار پھر سے اس کے گلے پڑ جائے۔ صنفِ نازک ہونے کے باوجود اس نے چند لمحوں میں ہی اپنی بے پناہ طاقت کا احساس دلا دیا تھا۔

''اور آپ پلیز میری سفارش اس سے کر دیجیے گا...... میں اس تمام مغالطے اور بدمزگی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

سلمان جو ایک بار پھر غیر متعلقہ ٹھہرا تھا، اس نے آخری جملہ اس سے مخاطب ہو کر کہا اور ہینڈ بیگ کندھے پر لٹکا کر تیزی سے باہر کی طرف چلی گئی۔

سلمان حقیقتاً بدمزہ ہوا تھا۔ چہرے پر چھایا تکدر اسی بات کا آئینہ دار تھا۔ وہ اپنی ماسٹر چیئر پر براجمان ہوا اور مشروب کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر گیا۔ قدرے کسیلا ذائقہ ہونے کے باوجود فرحت کا احساس ہوا تو اس نے جنید کی طرف دیکھا جو ابھی تک وہیں موجود تھا۔

''اب تم کس انتظار میں ٹھہرے ہو؟ میں اس پاگل عورت کی حرکت پر اظہارِ افسوس ہی کر سکتا ہوں...... لیکن اگر تم واقعی کسی سائرہ یا مسعود کو جانتے ہو تو اس کو بتا دینا۔ کوئی عورت اس طرح کی حرکت اسی وقت ہی کر سکتی ہے جب کوئی بہت قریبی بچھڑ گیا ہو۔''

''جا رہا ہوں جناب۔'' جنید کے لہجے میں ابھی بھی شکایت تھی مگر چہرے پر اطمینان کے تاثرات جیسے اس کی کوئی دیرینہ خواہش پوری ہوگئی ہو۔ وہ آہستہ سے قدم بڑھاتا باہر نکل گیا۔

سلمان مانیٹر اسکرین پر نوشین کو گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھ چکا تھا۔ وہ اس کے عجیب و غریب رویے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اس واقعے کے بارے میں روشن کو ضرور مطلع کرے گا۔ یہی سوچتے اس کی نظر سامنے پڑے نوشین کے مشروب پر پڑی تو پیاس کا احساس ہوا حالانکہ وہ ایک گلاس ابھی تھوڑی دیر قبل پی چکا تھا۔ لذت کا احساس غالب آیا تو اس نے اٹھ کر وہ بھی غٹاغٹ پی لیا۔ اس نے اب ہیروں والے پاؤچ کو کھولا اور اطمینان کر کے واپس بند کر دیا۔ پلیٹ میں موجود اسنیکس بھی تیزی سے اس کے پیٹ میں منتقل ہو رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ آج کا حساب کتاب بھی مکمل کرتا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہی اس پر سستی اور خمار کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی، غالباً دن بھر کا کام اور اعصاب کو چٹخا دینے والا انتظار اسے توقع سے بھی زیادہ بوجھل کر گیا تھا۔

شکم سیری بھی اثر دکھا رہی تھی، آنکھیں موند کر وہ کرسی پر ہی پھیل گیا۔ ریوالونگ چیئر پر سر ٹکائے اب وہ واپسی کا سوچ رہا تھا، کیونکہ ہیرے تب ہی محفوظ ہوتے جب وہ اس کے گھر کی تجوری میں منتقل ہو جاتے۔ کسی بھی سوچ پر عمل کرنے سے قبل نیند کی دیوی اسے اپنی آغوش میں لے چکی تھی۔

☆☆☆

والدہ کی وفات کے بعد سے واپس آئے تقریباً چھ ماہ ہو گئے تھے۔ زندگی کسی سیلِ رواں کے مانند بہتی چلی جا رہی تھی۔ کوئی خاص تبدیلی نہ آئی تھی بس اداسی کا عنصر اس میں دو چند ہو گیا تھا۔ بھائیوں سے فون پر رابطہ ہوتا بھی تھا تو صرف پیسے بھیجنے کا مطالبہ سننا پڑتا۔ ابتدا میں تو دل پر جبر کر کے وہ کچھ نہ کچھ بھیجتی رہی مگر ایک دن جی کڑا کر کے جب اس نے انکار کیا تو فون آنا ہی بند ہو گئے۔

رشتے بھی مطلب کے رہ گئے تھے۔ جب تک اُن کے مطالبات مانتی رہی تب تک وہ عظیم تھی، اب ایک دم ہی اس کو خود غرض اور مادہ پرست کا لقب مل گیا تھا۔ تنہائی اور اجنبیت کے دہرے عذاب کو وہ بیک وقت برداشت کر رہی تھی۔ دل کے اجاڑ بیابان میں... وہ کسی بہار کے مانند آیا تھا۔ ایسی اپنائیت سے پیش آیا کہ دل میں کلیاں چٹک کر رہ گئیں۔

”میڈم، میری شیخ حماد بن قاسم سے ملاقات ہے...... کیا آپ میری رہنمائی کر سکتی ہیں؟“ گرے کلر کے سوٹ میں ملبوس وہ پہلی بار اس سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ اپنی ہی سوچ میں مگن تھی اس لیے چند لمحوں کے لیے خالی ذہن کے ساتھ اس کو صرف دیکھتی رہ گئی۔ اس نے کیا کہا تھا، کانوں نے سنا ضرور تھا پر دماغ نے سمجھا نہیں تھا۔

”میرا نام مسعود انور ہے...... اور میری آج کی اپائمنٹ ہے...... کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ شیخ حماد کا آفس کس طرف ہے؟“ تعارف کرانے کے بعد اس نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ آنکھیں پٹپٹاتی اس دلکش نقوش والی سانولی سی حسینہ سے متاثر تو ہوا تھا مگر اس وقت اسے اپنے کام کی جلدی تھی۔

”جی...... جی کیا کہا آپ نے؟“ نوشین ایک دم سے ہوش میں آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر تیزی سے ہاتھ چلائے...... ”آپ دوسری منزل پر چلے جائیں، وہاں داہنے ہاتھ ہر دوسرا دروازہ شیخ صاحب کا آفس ہے۔ مسعود انور ہی نام بتایا ہے نا آپ نے......؟“ اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا اور لمحوں میں سب بتا دیا۔ وہ ایسی ہی مستعد تھی۔

مسعود جو اس کو تیسری مرتبہ اپنے آنے کا مقصد بتانے کے لیے منہ کھول چکا تھا اسی حالت میں ہی رہ گیا۔

’جتنی خوبصورت ہو۔ اتنی ہی مدھر آواز بھی ہے۔‘ وہ سوچ کر رہ گیا۔ الفاظ زباں پر آنے سے قبل ہی رستہ بھول گئے تھے۔

”جی یہی نام ہے میرا...... بہت بہت شکریہ...... آپ کا۔“ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ چاہنے کے باوجود اس کا نام پوچھنے کی جسارت نہ کر سکا۔ پلٹ کر وہ لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔

پہلی ملاقات نوشین کے نزدیک اتنی سرسری تھی کہ جب وہ اگلی بار اس کے لیے پھول لے کر آیا تو پہچان بھی نہ سکی۔ کئی بار کے منع کرنے کے باوجود وہ اکثر پھول اور دیگر چھوٹے موٹے تحائف لے کر آنے لگا۔ تنہائی کی ماری کب تک ایسے اقدامات سے بچتی، دل موم ہو ہی گیا۔ اس میں بھی مسعود کی شخصیت سے زیادہ اس کی مستقل مزاجی کا ہاتھ تھا۔ غیر ملک میں ہم زبان چاہنے والا ملا تو وہ بھی اس کی اسیر ہو گئی۔ دو مہینے بعد ہی اس نے مسعود کے پروپوزل پر ہاں کہہ دی۔ اپنے بارے میں وہ یہی بتاتا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح تنہا ہے۔ یہ بات بھی اس کے مزید قریب آنے کا سبب بنی تھی۔

شادی کے بعد ہی اس کا اسمگلر روپ سامنے آیا۔ اس سے پہلے تک وہ کامیابی سے اپنی ذات پر پردہ ڈالے ہوئے تھا۔

”تم کیوں اپنی جان کو خطرے میں ڈالے ہو؟ کوئی اور کمائی کا ذریعہ کیوں نہیں ڈھونڈتے؟“ نوشین نے اس کے انکشاف پر اتنا ہی ردِعمل دیا تھا۔

”اتنے ٹھاٹ کسی اور کام سے کہاں ملنے والے ہیں؟“ مسعود نے اس لگژری فلیٹ کی آسائشات کی جانب نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی بندے کو کام وہی کرنا چاہیے...... جو اسے آتا ہو...... اور مجھے بس یہی کام آتا ہے۔“

نوشین اس کی محبت میں اتنا ڈوب چکی تھی کہ صحیح اور غلط کی تمیز بھی کھو چکی تھی۔ اس کے اس جواز پر بھی آنکھیں بند کر کے یقین کر بیٹھی۔ پہلی بار اس وقت ٹھٹکی جب مسعود نے اس کو بھی اپنے ریکٹ کا حصہ بننے کا کہا۔

”میں یہ کام کیسے کر سکتی ہوں؟“ آواز میں حیرت کے ساتھ خوف کی آمیزش بھی شامل تھی۔

"جانِ من جیسے میں کرتا ہوں...... ویسے تم بھی کرو گی۔" مسعود نے زبردستی اسے اپنے کام میں شامل کرلیا۔ کچھ محبت اور کچھ خوف سے وہ اس کے شانہ بشانہ کام کرنے لگی۔

نائن الیون کے واقعے کے بعد جب سیکیورٹی کی سختیوں میں اضافہ ہوا تو نوشین سب سے کامیاب ایجنٹ کے روپ میں سامنے آئی۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے کام کی عادی ہوتی جارہی تھی کہ سائرہ کا وجود اس کی زندگی کا حصہ بن گیا۔

مسعود اس اَن چاہے بچے کی آمد کا سن کر ایک بار تو گنگ رہ گیا۔

"ہم تو احتیاط کر رہے تھے...... پھر تم نے یہ کیا مصیبت پال لی ہے۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ نوشین کے اندر چھن سے جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔ اعتبار تھا یا اُس ہرجائی پر کیا جانے والا مان...... وہ اندازہ بھی نہ کر پائی تھی۔ بس خالی نگاہوں سے اسے دیکھ کے رہ گئی۔

"اللہ کی طرف سے ہے...... تمہیں تو خوش ہونا چاہیے...... تم الٹا ناراض ہو رہے ہو؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"ہونہہ...... اللہ کی طرف سے تحفہ......" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "تم جیسی عورتیں بچے پیدا کرنے کے لیے نہیں ہوتی ہیں...... فوراً کسی ڈاکٹر سے ملو اور اس مصیبت سے جان چھڑاؤ۔"

ذلت کا احساس بڑا شدید تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مسعود اس کے بارے میں ایسے 'نادر' خیالات رکھتا ہے۔ وہ پوچھ بھی نہ سکی کہ آخر ایسی کون سی عورتیں ہوتی ہیں جن کو اس کے نزدیک ماں بننے کا حق حاصل ہے اور اُسے نہیں۔ وہ اس سے تو کچھ نہ بولی مگر ابارشن کرانے سے انکار کردیا۔ یہ اُن کے بیچ پہلی جھڑپ کی وجہ بنی۔

"حرافہ...... اب تو میری بات کا انکار کرے گی؟" مسعود کا رویّہ نہ صرف جارحانہ تھا بلکہ اس نے پہلی بار اس پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔

"تم کچھ بھی کہہ لو...... میں اب اس وجود کو اپنی ذات سے الگ نہیں کرسکتی۔" وہ ٹس سے مس ہونے کو آمادہ نہ تھی۔ عشق کی رنگینی...... تلخی کی سنگینی میں تبدیل ہوچکی تھی۔

کچھ عرصے کی رنجیدگی کے بعد آخر مسعود کو اس کی بات ماننی ہی پڑی۔ وہ سونے کی چڑیا تھی۔ اتنی آسانی سے وہ دستبردار ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سائرہ کی پیدائش کے بعد ایک اور آسانی مل گئی۔ بچوں والے مرد و زن پر شک ویسے بھی کم کیا جاتا تھا۔ وہ لوگ سہولت کے ساتھ مہینے کے ایک دو چکر لگانے لگے۔

نوشین نہیں جانتی تھی کہ مسعود کے دل میں اس اسمگلنگ کے مال پر ڈاکا مارنے کا خیال کب آیا۔ وہ بہت عرصے سے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ سائرہ کو تنہا لے کر بھی گیا تھا۔ نوشین بھی اب فکرمند نہیں تھی، سائرہ سے اس کی محبت میں اسے کوئی ڈھونگ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"بہت سارا پیار کرلو اِس کو......" آخری ٹوور پر جانے سے قبل مسعود نے ایک سالہ سائرہ کی جانب اشارہ کرکے اس سے کہا۔ "اب اس کی صورت دیکھنے کو نہیں ملے گی...... چند دن کے لیے۔" وقفے وقفے سے اس نے اپنی بات پوری کی۔

نوشین اپنی بیٹی میں اس قدر مشغول تھی کہ مسعود کے جملوں کی ذومعنویت پر توجہ ہی نہ دے سکی۔

فریب اتنا گہرا تھا کہ اس کی روح تک لرز گئی۔ دھوکا اپنے ہی دیتے ہیں، انجان لوگوں پر کون اعتبار کرتا ہے۔ مسعود سے زیادہ سائرہ کا غیاب اس کے لیے روح فرسا ثابت ہوا تھا۔ کچھ زخم وقت کے ساتھ بھرنے کے بجائے ناسور بن جاتے ہیں۔ مسعود نے بھی ایک ایسا شگاف اس کی روح میں ڈالا تھا کہ وہ اب تک وہیں ٹھہری تھی جہاں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔

ابتدائی صدمے سے سنبھلنے کے بعد رونے دھونے، تلاش اور کوسنے کا ایک طویل مرحلہ شروع ہوگیا۔ اب بھی اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

ننھی سائرہ کی قلقاریاں، مسعود کی عنایتیں اور اس کا والہانہ اندازِ محبت کیا نہیں تھا جو وہ نہ سوچ رہی تھی۔ بے ربط، بے ترتیب یادوں کی یلغار نے اسے شل کردیا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ دو گھنٹے سے نوشین ہوٹل کے بیڈ پر لیٹی بھی سب کچھ سوچ رہی تھی۔ خیالات کی رو جس تیزی سے بہہ رہی تھی، اتنی ہی رفتار سے اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ تکیہ بھگوتے بھگوتے اب اس کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ ایس اے ٹریڈرز میں ملنے والا لڑکا...... مسعود سے غیر معمولی مماثلت رکھتا تھا۔ اپنا کارڈ اسے دے کر آنے کے باوجود اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ کھو دینے کا احساس بڑھتا ہی جارہا تھا۔

'نوشین......! اگر آج تُو اس لڑکے سے نہ مل پائی تو کبھی اپنی بیٹی کو نہیں ڈھونڈ سکے گی......' اس کے اندر سے

آنے والی آواز اتنی گہری تھی کہ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

''مجھے واپس جا کر اس سے ملنا چاہیے...... وہ یقیناً جانتا ہے کہ میری سائرہ کہاں ہے......'' خود کلامی کرتی ہوئی وہ تیزی سے تپائی پر رکھے فون سیٹ کی جانب بڑھی۔ ایک کا بٹن دبا کر وہ انتظار کرنے لگی۔ میز پر تیزی سے گھومتی اس کی انگلیاں اندرونی اضطراب کی غماز تھیں۔

''مجھے فوری طور پر گاڑی چاہیے ڈرائیور سمیت......'' ریسپشنسٹ کے فون اٹھاتے ہی وہ بولی۔ تفصیلات پوچھنے کے بعد اس کو پندرہ منٹ میں ہوٹل کی پارکنگ میں آنے کا کہا گیا تو اس نے سکون کی سانس لی۔ کھڑکی سے باہر دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ یہاں عصر کے آس پاس پہنچی تھی اور اب سورج ڈوبے وقت بیت چکا تھا، وہ تیزی سے تیار ہونے لگی۔

☆☆☆

پارکنگ میں صرف دو گاڑیاں موجود تھیں، ایک نئے ماڈل کی کلٹس جبکہ دوسری ایک پک اپ تھی جس پر کسی بیکری کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ جگہ کی دستیابی کے باوجود، اس نے موبائل کو پارکنگ میں لے جانے کے بجائے عین گیٹ کے سامنے روکا تھا۔ اپنی نئی نویلی یونیفارم میں ملبوس انسپکٹر آرام سے پولیس موبائل سے اترا، سائڈ مرر میں بال درست کر کے اپنی کیپ پہنی اور خراماں خراماں ایس۔ اے ٹریڈرز کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھا۔ وہاں پر موجود 'اوپن' کا سائن اس کو خوش آمدید بھی کہہ رہا تھا۔ دروازے کا خودکار نظام غالباً کام نہیں کر رہا تھا اس لیے..... وہ ساتھ والے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوا۔

اوپر دیکھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ براہِ راست سی۔ سی ٹی وی کیمرے کی زد میں آ رہا ہے۔ اس نے اپنی پولیس کیپ کو درست کیا کہ چہرہ نمایاں نہ ہونے پائے اور کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ اسٹور میں موجود نیم تاریکی نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا لیکن کیش کاؤنٹر پر موجود ٹی شرٹ میں ملبوس جوان کو دیکھ کر وہ آگے بڑھا جو اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

''اتنا اندھیرا کیوں کیا ہوا ہے؟ کیا آج جلدی بند ہو رہی ہے مارکیٹ؟'' انسپکٹر نے کاؤنٹر کے قریب پہنچتے ہی سوال کیا۔

''ہاں جی...... جناب۔'' اثبات میں جواب دیتے ہوئے اس شخص نے کاؤنٹر کی لائٹ روشن کر دی، چہرے پر بیزاری کے آثار نمایاں تھے۔ ''کیا خریدنا پسند کریں گے آپ؟'' ساتھ ہی اس نے سوال داغ دیا۔

''میں کچھ خریدنے نہیں آیا ہوں، مجھے یہاں کے مالک سے ملنا ہے۔'' انسپکٹر بے نیازی سے بولا، اس پر بیزاری کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کاؤنٹر پر موجود لڑکا، یہاں کام کرتا ہے اس لیے مالک کے بارے میں پوچھا۔

''جی فرمائیے، میں ہی یہاں کا مالک ہوں، سلمان خان...... سلمان احمد خان۔'' اس نے رک کر اپنا نام مکمل کیا۔

''آپ کی تعریف، جناب انسپکٹر......'' سلمان کے نام سے تعارف کرانے والے نے اس کے کندھوں پر موجود تین تاروں کو گننے کے بعد اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کوشش کے باوجود اسے کوئی نیم ٹیگ نہیں ملا تھا۔

''تم مالک ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' انسپکٹر کے چہرے پر نمودار ہونے والی حیرت مبنی برحقیقت معلوم ہوتی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس درمیانے قد کے منحنی سے نوجوان کو دیکھ رہا تھا۔ تانبے جیسی گندمی رنگت اور پتلے نقوش کے باعث اس کی عمر کا اندازہ لگانا آسان کام نہ تھا۔

''تم تو یہی کوئی بیس بائیس سال کے دکھتے ہو۔'' اس نے اپنی حیرت پر قدرے قابو پاتے ہوئے بات پوری کی۔ یہ سن کر سلمان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''نہیں نہیں، دکھنے کا کیا ہے، میں پورے بتیس سال کا ہو چکا ہوں، ویسے آپ خود بھی انسپکٹر کے عہدے کے حساب سے کافی کم عمر لگ رہے ہیں۔'' اس نے ہنوز چہرے پر طاری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا مگر انداز میں عجلت نمایاں تھی۔ اس کے دماغ کے کسی کونے میں بے نام سی الجھن ہو رہی تھی جسے وہ کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔

''میرا نام ریاض بٹ ہے، میں آپ کے علاقے کا نیا ایس ایچ او ہوں، پرسوں ہی میری یہاں تعیناتی ہوئی ہے۔'' انسپکٹر نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ البتہ لہجے میں اس کے ابھی تک بے یقینی تھی۔ خود کو سلمان کے نام سے متعارف کرانے والا شخص کہیں سے اسے اس منی سپر اسٹور کا مالک نہیں لگ رہا تھا۔

''بڑی خوشی ہوئی مل کے جناب۔'' اس نے رسمی انداز میں اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ اس نے محسوس کیا کہ انسپکٹر کا ہاتھ نرم تھا مگر گرفت سخت تھی۔ وہ انسپکٹر کا عمومی جائزہ لینے لگا۔ گوری رنگت کا یہ جوان اگر انسپکٹر کی وردی

میں نہ ہوتا تو وہ اس کا عہدہ زیادہ سے زیادہ اے ایس آئی ہی سمجھتا۔

تیکھے نقوش، لمبا قد، مضبوط کاٹھی، بڑی بڑی آنکھیں اور اسٹائلش سے بال، وہ پولیس والا کم اور کسی فیشن شو کا ماڈل زیادہ لگ رہا تھا۔ اس کے انداز میں عام تھانے داروں والی بات ہی نہ تھی، کافی نرم خو معلوم ہو رہا تھا۔ بڑھے ہوئے بال اس کی کیپ سے نکل کر کانوں کو ڈھانپ رہے تھے۔ اچانک ہی اس کو ایک ادراک ہوا اور جو نامعلوم سی بے چینی دماغ میں چل رہی تھی، وہ رفع ہوگئی۔ اس کے بدن میں ایک تناؤ سا آ گیا، پرانی بے چینی کی جگہ اب ایک بڑی پریشانی نے لے لی تھی۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں بٹ صاحب؟'' اس کی آواز میں ارتعاش سا آ گیا تھا، وہ جو سوچ رہا تھا اگر حقیقت تھی تو وہ مشکل میں بھی پھنس سکتا تھا۔ نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹ کر ہولسٹر تک گئی تھیں جہاں اس کا سروس ریوالور لٹک رہا تھا۔

''کیا تم ہی یہاں کے مالک ہو؟'' انسپکٹر نے ایک بار پھر تصدیق کرنی چاہی، اس کی نظریں اِدھر اُدھر پورے کاؤنٹر کا طواف کر رہی تھیں۔

''جی جناب...... کیا اب آپ کو آئی ڈی کارڈ دکھانا پڑے گا؟'' اس نے کاؤنٹر کے پیچھے موجود اسٹور روم کے بند دروازے کی جانب کن انکھیوں سے دیکھا اور پھر اپنے اندرونی اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... اس کی کوئی ضرورت نہیں...... یہاں تمہارے سوا کوئی ملازم نہیں ہے؟'' انسپکٹر نے سوال کیا۔

''جناب، میں ہی مالک ہوں اور میں ہی ملازم ہوں یہاں کا، آپ بتائیں کہ آپ کو کیا کام تھا...... دراصل مجھے آج کچھ بہت ضروری نوعیت کا کام ہے...... اور پہلے ہی کافی تاخیر ہو چکی ہے...... اس وجہ سے آپ کی مناسب خدمت نہیں کر سکتا...... ورنہ ضرور آپ سے بیٹھ کر تفصیلاً بات کرتا...... بٹ صاحب......'' اس نے اپنے لہجے میں بیزاری اور لجاجت بیک وقت ڈال کر بات پوری کی۔ وہ ابھی تک آنے والے کے عزائم کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

''اچھا...... اچھا......'' انسپکٹر بولا۔ ''تم ہی یہاں کے اکلوتے مالک ہو تو باہر پک اَپ کس کے لیے ٹھہری ہے؟'' اس بار اس کے انداز میں روایتی پولیس والوں جیسی رکھائی شامل تھی۔

''جی...... وہ تو یہاں پر آنے والے بیکری کے ملازم کی ہے......'' سلمان ایک لمحے لیے رکا اور پھر بولا۔ ''اس کا گھر ساتھ والے پیٹرول پمپ کے پیچھے والی بستی میں ہے...... آج کام ختم ہو گیا تھا تو وہ اپنے گھر چلا گیا۔ صبح آ کر گاڑی لے جائے گا...... میں پوچھ سکتا ہوں کہ اتنی زیادہ تفتیش کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟''

''بس...... کچھ مجرمانہ سرگرمیوں کی اطلاعات ملی ہیں...... اسی سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے کے لیے آیا تھا۔'' انسپکٹر نے گھوم کر تمام مارکیٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''کس...... قسم کی مجرمانہ سرگرمیاں؟'' اس کی آواز جیسے گلے میں ہی پھنس گئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا شک صحیح بھی ہے کہ نہیں۔ اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا تھا کہ انسپکٹر کی وردی میں آنے والا شخص اصل پولیس والا نہیں ہے۔ اس کی حرکات و سکنات سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی اور ہی ارادے سے اِدھر آیا ہے۔ وہ غیر محسوس انداز میں کاؤنٹر کے اس خانے کے قریب ہو گیا جہاں پر کسی بھی قسم کے نامساعد حالات سے نمٹنے کے لیے ایک شاٹ گن رکھی ہوئی تھی۔

''یہی کہ اتنے بڑے اسٹور کا مالک اکیلے کام کرتا تھا...... اور چند نامعلوم افراد اس کو لوٹنے کے بعد جان سے مار کر چلے گئے......'' انسپکٹر ریاض نے اپنا سروس ریوالور اس پر تانتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ اب وہ کہیں سے بھی خوش شکل نہیں لگ رہا تھا۔

دشمن اپنی چال چل چکا تھا۔ کوئی بھی حفاظتی اقدام کرنے سے پہلے ہی بازی پلٹ چکی تھی۔ اس کی حالت ایک لمحے کے لیے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی ہو گئی۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تحیّر اور سکتے کی کیفیت میں اس نے کچھ کہے بغیر اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے۔

☆☆☆

انجن کی مدھم آواز کے علاوہ گاڑی میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوٹل والوں نے اس کے لیے ایک لگژری کار مع ڈرائیور کا بندوبست کیا تھا۔ مضافاتی علاقے میں داخل ہونے کے بعد ٹریفک میں واضح کمی آئی تھی اس لیے گاڑی کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ ابھی بھی تقریباً پندرہ بیس منٹ کا فاصلہ طے کرنا باقی تھا۔

''کیا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے؟'' نوشین نے بے چینی سے پوچھا۔

''جی...... بی بی جی...... ! ایک ہے پر اس وقت وہ سنسان ہوتا ہے اور جانا مناسب نہیں......'' ڈرائیور نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ہوٹل والوں نے باقاعدہ پروفیشنل شخص کو کام پر رکھا ہوا تھا۔

''اوہ...... صحیح......'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''بی بی جی...... معذرت کے ساتھ...... اس وقت تو کوئی فلائٹ بھی نہیں آنی ہے...... نہ ہی جانی ہے...... پھر آپ ائرپورٹ کیوں جارہی ہیں۔'' ڈرائیور نے اس بار بھی احترام کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ شاید تجسس غالب آگیا تھا اس لیے ایسا سوال کر بیٹھا۔

''اگر ٹکٹ وغیرہ کا بھی کوئی مسئلہ ہے...... تو وہ تو بکنگ ایجنٹ چٹکی بجاتے حل کردے گا۔'' نوشین کی خاموش توجہ کو وہ حوصلہ افزائی سمجھا اس لیے بات آگے بڑھائی۔

''ہم ائرپورٹ کی طرف جارہے ہیں...... ائرپورٹ پر نہیں......'' نوشین نے آہستگی سے کہا۔ مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

''ائرپورٹ سے تین کلومیٹر پہلے جوالیس اے ٹریڈرز کے نام سے منی مارکیٹ ہے مجھے وہاں جانا ہے......'' اس نے تفصیل سے وضاحت کی تو ڈرائیور ایک بار پھر بولا۔

''بی بی جی...... پر وہ اسٹور بھی جس دن فلائٹ نہ ہو اس دن جلدی بند ہوجاتا ہے۔''

''اب کیا کیا جاسکتا ہے...... مجھے بہت اہم کام ہے وہاں پر۔'' نوشین کے دوٹوک انداز پر ڈرائیور خاموش ہوگیا اور اپنی تمام توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کردی۔

تھوڑی ناگواری محسوس کرکے وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا ضرور تھا مگر نوشین کے کانوں تک آواز نہیں پہنچی تھی۔ اسے بڑے لوگوں کی ان عادتوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ اب بھی اس اکیلی خاتون کو ویرانے میں صرف ایک چانس پر اتنی دور جانے کی وجہ سمجھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ رات ابھی گہری نہیں ہوئی تھی ورنہ وہ آنے سے انکار ہی کردیتا۔ وہ سنسان علاقوں سے ایک عجیب طرح کا خوف محسوس کرتا تھا اس لیے حتی الامکان کوشش کرتا تھا کہ رات کی ڈیوٹی نہ ہی ملے۔

وہ اپنے موبائل فون سے ایک بار پھر سلمان کا نمبر ملانے لگی۔ ہوٹل روانگی سے اب تک وہ کئی بار یہ عمل دہرا چکی تھی مگر 'آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے' کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں سن سکی تھی۔ چند ٹیکسٹ میسج بھی چھوڑے تھے پر جواب ندارد۔ وہ چاہتی تھی کہ سلمان، بیکری والے لڑکے جنید کو روک لے۔ رابطے میں ناکامی کے باعث اس کی یہ خواہش ادھوری تھی۔

اچانک بریکوں کی چرچراہٹ کی آواز سے پورا ماحول گونج اٹھا۔ پچھلی سیٹ پر ہونے کے باوجود اس نے حفاظتی بیلٹ باندھ رکھی تھی اس لیے جھٹکا تو لگا مگر وہ سنبھل گئی۔ بیرونِ ملک رہتے چند اچھی عادتیں خود بخود اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔ لاشعوری طور پر سوار ہونے کے بعد اس نے سیٹ بیلٹ باندھی تھی۔ یہی عادت اس وقت بچت کا باعث بنی، اگر نہ باندھی ہوتی تو اس وقت کم از کم اس کا سر ونڈ اسکرین سے ضرور ٹکرا چکا ہوتا۔

ڈرائیور نے چونکہ خود بریک لگائی تھی اس لیے جھٹکا اس کے لیے قطعاً غیر متوقع نہ تھا۔ وہ سنبھل کر گاڑی مدھم رفتار سے چلانے لگا۔

''یہ کیا حرکت تھی...... ایسے کیوں بریک لگائی......؟'' وہ سر کو جھٹک کر غصے سے بولی۔

''بی بی جی...... ذرا دائیں جانب دیکھ لیں......'' ڈرائیور نے کہا تو وہ اپنا سر گھما کر اُدھر دیکھنے لگی۔ چند عجیب سی شکل کے پلّے اپنے خاندان کے پاس دوڑے جارہے تھے۔

''اُف...... کتنی منحوس شکل کے کُتے ہیں یہاں پر...... تم نے ان کے لیے بریک لگائی؟'' وہ کراہت کے ساتھ بولی۔

''بی بی جی...... ! یہ کُتے نہیں ہیں...... لگڑ بھگے ہیں...... جھنڈ کی شکل میں پھرتے ہیں...... اگر ایک بھی مارا جاتا تو باقی کے خاندان نے ایسا واویلا مچانا تھا کہ دور پرے کی بستیوں تک کے لوگوں کی نیندیں حرام ہوجاتیں۔''

''تو یہ خطرناک نہیں ہیں کیا؟'' وہ دوبارہ مڑ کر ان کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہیں تو صحیح...... مگر انسان سے زیادہ خطرناک کہاں؟ نئی بننے والی بستیوں کی وجہ سے یہ اب بھی کبھار ہی نظر آتے ہیں...... ہاں اگر کوئی اکیلا شخص مل جائے تو اس پر دھاوا بول دیتے ہیں۔'' ڈرائیور نے صراحت سے جواب دیا۔ اس کا باتونی پن کھل کر سامنے آگیا تھا۔

اس بریک لگنے اور جھٹکے کے دوران میں نوشین نے دھماکوں کی آوازیں سنی تھیں مگر اس کو اندازہ ہی نہ ہوسکا تھا کہ وہ گولیاں چلنے کی آواز تھی۔ ڈرائیور بھی اس بات سے...

ناآشنا تھا کیونکہ اس نے بھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ لگڑ بھگوں کی کہانیاں سنا رہا تھا۔

''میرا اِدھر ہی انتظار کرو......'' کار سے اترتے نے پہلے وہ بولی۔ ''میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

ایس اے ٹریڈرز کے سامنے ڈرائیور نے گاڑی لاکر روک دی تھی۔ اوپن کا سائن دور سے ہی نظر آ گیا تھا اس لیے اس نے باقی جائزہ لینے کی زحمت نہیں کی۔

ڈرائیور نے باہر نکل کر ایک سگریٹ سلگالی۔ وہ پہلے ہی باہر آ چکی تھی۔ ایک نگاہِ غلط انداز اس پر ڈال کر وہ اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتی ایس اے ٹریڈرز کے گیٹ کی طرف بڑھی، جہاں آج سہ پہر کو ہی وہ اسمگل شدہ ہیروں کی ایک کھیپ کامیابی سے پہنچا چکی تھی۔

بیٹی سے ملنے کی چاہ نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اگر وہ اپنے حواسوں میں ہوتی تو پولیس موبائل کی موجودگی یقیناً اس کے لیے حیرت کا باعث بنتی۔ وہ اسے نظرانداز کرتی خود کار دروازے کے ساتھ دوسرے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو اسے لگا جیسے کوئی اونچی آواز میں بات کرنے والا شخص اچانک خاموش ہو گیا ہو۔

منی مارکیٹ میں بہت کم روشنی تھی، اس کی اندر داخل ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ دروازے کو پکڑے ویسے ہی ٹھہری رہی جیسے کسی نے جادو کے زور سے بت بنا دیا ہو۔ پہلے تو دماغ میں آیا کہ اِدھر سے ہی پلٹ جائے، لیکن اتنی دور آنے کے بعد وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی ہمت جمع کی اور اونچی آواز میں بولی۔

''کوئی ہے......؟''

ابھی اس کے الفاظ زبان سے ادا ہی ہوئے تھے کہ ایک زوردھماکا ہوا۔ گولی چلنے کی اور شیشہ ٹوٹنے کی آوازوں میں اتنی کم ساعتوں کا فرق تھا کہ انسانی ساعت کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کون سی پہلے آئی؟

اپنے بدن میں اٹھنے والی بے تحاشا درد کی لہر محسوس کرتے ہی وہ ادھ کھلے دروازے میں ہی ڈھیر ہو گئی۔

☆☆☆

ریاض نے جب اسے گن پوائنٹ پر لیا تو وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ حالات ایسے بھی پلٹ سکتے ہیں۔ متحیرانہ نگاہوں اور لرزتے جسم کے ساتھ جب اس نے ہاتھ اوپر کیے تو ریاض اس کی حالت دیکھ کر قدرے ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی نگاہوں سے وہ پیپر ویٹ اوجھل رہا تھا جو سلمان نے ہاتھ اوپر کرتے وقت اٹھایا تھا۔

اس لیے جب وہ اس کے سر پر پڑا تو وہ ذہنی طور پر بالکل بھی تیار نہ تھا۔

سلمان کا ہاتھ سرعت سے حرکت میں آیا اور چشمِ زدن میں پیپر ویٹ اس کے سر پر لگا۔ نشانہ پکا تھا مگر پیپر ویٹ اتنا وزنی نہیں تھا کہ کوئی زیادہ نقصان پہنچاتا۔

''آہ......'' ایک بے ساختہ کراہ ریاض کے منہ سے خارج ہوئی۔

سلمان نے اس پر ہی بس نہ کی بلکہ جھکائی دیتے ہوئے دوسرا ہاتھ گھما کر اس کے ریوالور والے ہاتھ پر مارا۔ توجہ بٹنے پر ریوالور پر ریاض کی گرفت اتنی مضبوط نہ رہی اس لیے ہاتھ سے نکل کر سامنے موجود چپس اور بسکٹس والے شیلف کے پاس جا گرا۔ وہ تیزی سے دوڑ کر اس جانب بڑھا تاکہ ریوالور کو پھر سے اپنی گرفت میں لے سکے۔ غالباً کوئی دوسرا ہتھیار اس کے پاس نہیں تھا۔

سلمان نے جلدی سے شاٹ گن کاؤنٹر کے اندرونی شیلف سے اٹھائی۔ یہ پرانے دور کی دو نال والی گن تھی۔ گن پہلے سے لوڈ تھی۔ اس نے نشانہ باندھے بغیر ایک فائر کر دیا۔ زوردار دھماکا ہوا اور شیلف پر رکھے چپس کے پرخچے ہوا میں بکھر گئے۔

ریاض کافی خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ سلمان کا نشانہ خطا گیا تھا۔ اس کے بدن پر ایک بھی خراش نہیں آئی تھی اور اپنا ریوالور اچک کر وہ ایک شیلف کی آڑ میں ہو گیا۔ بروقت فیصلہ اسے صریح موت سے بچا گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ سلمان دوسرا راؤنڈ فائر کرتا اس نے سنبھل کر نشست لی اور تین چار گولیاں کاؤنٹر کی طرف داغ دیں۔

گولیوں کے دھماکے ساعت شکن تھے، بند جگہ کے باعث ان کی گونج بھی اعصاب کو شل کر رہی تھی۔

سلمان کو بہترین آڑ میسر تھی مگر پے در پے ہونے والی فائرنگ نے اسے دبکنے پر مجبور کر دیا۔ شاٹ گن کی لمبی نال جوابی کارروائی میں رکاوٹ کی وجہ بن رہی تھی۔ اس نے کاؤنٹر کے شیلف میں نظریں دوڑائیں تو ایک اور ہولناک حقیقت کا پتا چلا کہ کارتوس موجود نہیں تھے۔ یعنی کہ اب اس کو گن میں موجود واحد کارتوس کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنا تھا۔

ریاض بھی ایک اور فائر کرنے کے بعد رک گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی فائرنگ کتنی نتیجہ خیز نکلی؟ دوسری طرف بلا کی خاموشی چھا گئی تھی۔

''چاہتے کیا ہو تم؟'' سلمان کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ وہ شاید اس کے جواب سے اس کی پوزیشن کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔

جواب اس نے اپنے ریوالور سے دیا اور مزید ایک فائر داغ دیا۔

''تم کتنے احمق ہو؟'' وہ بولا۔ ''ابھی تک تمہیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ میں تمہیں لوٹنے کے لیے آیا ہوں۔''

انداز مذاق اُڑانے والا تھا۔ ساتھ ساتھ اس نے اپنے ریوالور کے خالی ہونے والے چیمبر میں گولیاں بھرنی شروع کر دیں تھیں۔ وہ سلمان کو فائر کرنے کا مزید موقع نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی شاٹ گن کی خوفناکی کے ثبوت اب بھی فرش پر بکھرے پڑے تھے۔

وہ خود کو بہتر ظاہر کرنے کے لیے سلمان کا مذاق اُڑا کے جواب دے چکا تھا لیکن اندر ہی اندر سے وہ لرز کر رہ گیا تھا۔ اتنی خوفناک صورتِ حال کا سامنا اسے آج تک کسی بھی واردات میں نہیں ہوا تھا۔ عام طور پر مالکان کی ریوالور دیکھ کر ہی گھگی بندھ جاتی تھی۔ جان کو مال پر ترجیح دیتے ہوئے وہ کبھی اس کے کام میں مخل نہیں ہوتے تھے۔ پر یہاں کی کایا ہی پلٹ گئی تھی، اس کو الٹا اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

گو کہ اب وہ قدرے بہتر پوزیشن میں آ گیا تھا۔ اگر سلمان کی پہنچ اس کے موبائل فون تک ہو جاتی تو وہ پولیس کو بھی کال کر سکتا تھا۔ عام لوگ تو اس کی یونیفارم سے شاید دھوکا کھا جاتے لیکن اصلی پولیس والوں کی نظروں سے بچنا ممکن نہ تھا۔ ان کے ہاتھ آنے کا مطلب اپنی ایسی درگت بنوانا تھا جس کا تصور ہی اسے ہولا دینے کے لیے کافی تھا۔

دوسری جانب کی کیفیت بھی نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کیا کرے؟ موبائل فون اس کی جیب میں موجود تھا مگر اپنی 'وجوہات' کے باعث وہ پولیس کو کال کر کے مزید پریشانی کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔

کاؤنٹر کی آڑ میں سے ہوتا ہوا وہ واش رومز کی طرف پہنچ سکتا تھا مگر وہ جگہ اس کے لیے چوہے دان سے بڑھ کر کچھ ثابت نہ ہوتی۔ ایک کارتوس کے ساتھ... دشمن کا مقابلہ کرنا نری خودکشی ہی ہوتی۔ اس نے جس طرح سے پستول اس پر تانا تھا، اس سے لگتا نہیں تھا کہ وہ لوٹ مار کے بعد اس کو زندہ بھی چھوڑتا۔

اس نے مڑ کر اسٹور روم کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار وہاں پہنچ جاتا تو عقبی راستے کا استعمال کر کے بہ آسانی باہر نکل سکتا تھا۔

''میرے پاس بہت زیادہ رقم کیش کی صورت میں نہیں ہے...... یہاں پر زیادہ تر کسٹمرز کارڈ کے ذریعے ادائیگی کرنا پسند کرتے ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر سے اونچی ہانک لگائی۔ اس کی سمجھ میں ایک ہی حل آ رہا تھا کہ کسی طرح اس کی توجہ ہٹ جائے اور وہ اسٹور روم میں داخل ہو سکے۔

''ہا ہا ہا......'' اس نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ ''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے...... تھوڑے سے کیش کے لیے کوئی اس طرح سے شاٹ گن نہیں نکال لیتا۔''

جواب حسبِ منشا آیا تھا۔ لوٹنے والا اس ہیروں کی کھیپ سے ناواقف تھا اور کچھ مال بنانے کے لیے ہی آیا تھا۔ آنے والے کا بہروپ کمال کا تھا اگر وہ ہوشیار نہ ہوتا تو انسپکٹر کے روپ میں ہی وہ اس کو راہی ملکِ عدم پہنچا چکا ہوتا۔

اس کے ذہن میں اچانک ایک ترکیب آئی۔ اگرچہ اس میں خطرہ بہت زیادہ تھا لیکن اگر کامیاب ہو جاتا تو جان بچنے کے مواقع بڑھ سکتے تھے۔ وہ پیٹ کے بل لیٹ گیا اور شاٹ گن کو کاؤنٹر کے سب سے نچلے شیلف میں سے گزار کر ریاض کی جانب سیدھا کر لیا۔ گو کہ اب وہ اس کی جانب دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن آواز کے اندازے پر ایک آخری فائر ضرور کر سکتا تھا۔ اب وہ ایک بار پھر اس سے مخاطب ہونے کے لیے تیار تھا۔

وقت بھی خوب چال چلتا ہے۔ کچھ لوگ وقت کے ہاتھوں سے زندگی چُرا کر لے جاتے ہیں اور کچھ کو ان کی قضا انجانے در پر لے آتی ہے۔ شاید کچھ ایسی ہی صورتِ حال آنے والی کے ساتھ بھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں کسی گاڑی کے آنے کی آواز سن کر یک لخت ہی خاموش ہو گئے تھے۔ تھوڑے وقفے کے بعد آنے والی نے دروازے کو دھکیلا تو اس پر لگی ونڈ چائمز نے اس وحشت زدہ ماحول میں ایک عجیب ہی دُھن بکھیر دی۔

آدھے دروازے کو کھولے وہ بیچ میں ٹھہری تھی۔ شاید اندر کی تاریکی نے اس کا رستہ روک لیا تھا۔ کاؤنٹر پر جلتی لائٹ پورے اسٹور کو روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ کہیں کہیں ہلکی روشنی والے بلب جلنے کی وجہ سے ملگجا سا ماحول طاری تھا۔ اندھیرے میں اس کے سراپا کا ادراک مشکل تھا پر ہیولا زنانہ تاثر دے رہا تھا۔

''کوئی ہے......؟'' آنے والی کے الفاظ ابھی ہونٹوں پر ہی تھے کہ ریاض نے ریوالور کا رخ دروازے کی

جانب کر کے گولی داغ دی۔

آواز قدرے بیٹھی بیٹھی سی تھی مگر مانوس سی تھی۔ مانوس آواز والی بڑے غلط وقت پر آئی تھی۔ اس کے لیے تو شاید غلط وقت تھا مگر اس کو بڑا مناسب لگا تھا۔ وہ اس توجہ بٹنے والی صورتِ حال کا فائدہ نہ اٹھاتا تو بے وقوف ہی ہوتا۔ اس نے اپنی شاٹ گن سے فائر کر دیا۔ کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا، لکڑی کے شیلف کا ایک بڑا حصہ غائب ہو چکا تھا۔

گن اُدھر ہی چھوڑ کر اس نے شولڈر بیگ اٹھایا اور باسرعت دروازے کی سمت دوڑا۔ دروازے تک پہنچنے کے لیے چند لمحے چاہیے تھے۔ فرار ہونے کے لیے جو وقفہ درکار تھا، وہ اسے میسر آچکا تھا۔ چند ایک بھٹکتی گولیوں کی آواز اس نے سنی مگر ان کی زد سے محفوظ ہی رہا تھا۔ جان کے لالے پڑے تھے تو سرپٹ دوڑ ہی مناسب تھی۔ دروازہ بند کرنے سے قبل وہ دیکھ چکا تھا کہ ریاض ریوالور لہراتا اس کی جانب آرہا تھا۔ عین دروازہ بند کرتے وقت اس نے ریاض کو ریوالور اپنی جانب کرتے دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

''مما...... مما......'' مسعود کی گود میں ننھی سائرہ اپنی توتلی زبان کے ساتھ اُسے پکار رہی تھی۔

''جی مما کی جان......'' وہ اس پر واری ہوتے ہوئے بولی۔ رب کے عنایت کردہ اس تحفے پر وہ جتنا شکر بجا لاتی کم تھا۔

مسعود نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ نوشین کو بیٹی پر نثار ہوتے ہوئے دیکھا۔

''اتنا نہ چاہو اس کو کہ کبھی خود سے جدا نہ کر پاؤ۔'' انداز تنبیہی تھا۔

''میں کیوں جدا کروں گی اسے خود سے؟ یہ تو میری جان ہے......'' وہ خشمگیں نگاہوں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''بیٹیاں تو ہوتی پرایا دھن ہیں...... ایک نہ ایک دن تو خود سے جدا کرنا ہی ہوتا ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا، انداز میں افسردگی سی تھی۔ وہ بس اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

''مما...... مما...... مجھے بچاؤ......''

ایک سالہ بچی کے منہ سے نکلنے والے یہ الفاظ...... ایک دھچکے کے مانند اسے لگے تھے۔ سب کچھ جیسے ایک پل میں تحلیل ہوگیا۔ یادوں کی برات لُٹ چکی تھی۔ خوابوں کا جہاں بسنے سے پہلے اجڑ چکا تھا۔

'اوہ خدایا...... کہیں میں کوئی بھیانک خواب تو نہیں

دیکھ رہی' اس کے ذہن میں آنے والا پہلا خیال یہی تھا۔ مگر پہلو میں اٹھنے والے درد نے اس خیال کی فوراً تردید کردی تھی۔

بے پناہ درد کی ٹیسیں ہی شاید اس کو عالمِ ہوش میں لے کر آئی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کتنی دیر تک اس کے حواس معطل رہے تھے۔ وہ ابھی تک گول مول سی ایس اے ٹریڈرز کی دہلیز پر ہی ڈھیر پڑی تھی۔ اسے شاید گولی لگی تھی۔ اس نے اپنی دائیں ٹانگ کے اوپر ٹٹولنے کے انداز میں ہاتھ پھیرا۔ درد کا سرچشمہ کہیں آس پاس ہی تھا۔ پیٹ اور ٹانگ کو ملانے والی ہڈی کے پاس ہاتھ پہنچتے ہی اس کی سسکاری نکل گئی۔

مقامِ شکر تھا کہ گولی اندر نہیں پھنسی تھی۔ شیشے اور پھر اس کے ہینڈ بیگ سے ٹکرانے کے باعث اس کے پہلو کے زیریں حصے کو چھیدتی ہوئی کہیں دور چلی گئی تھی۔ اس نے ہمت مجتمع کی اور آہستگی سے کھسکتے ہوئے باہر کی جانب حرکت کرنے لگی۔ اندر جانے کا رسک اب وہ کسی صورت نہیں لے سکتی تھی۔

جیسے جیسے اس کے مختل حواس بحال ہو رہے تھے، ویسے ویسے اسے یاد آرہا تھا کہ اسے گولی لگنے کے بعد ایک زوردار فائر کی آواز آئی تھی۔ غالب امکان تھا کہ کسی بڑی گن سے گولی چلائی گئی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے ہونے والے دھماکے کسی ریوالور سے کیے گئے تھے۔ تقریباً رینگتے ہوئے وہ پارکنگ لاٹ میں پہنچ چکی تھی۔ تب ہی اسے یاد آیا کہ گرنے اور حواس کھونے کے دوران میں اس نے ایک گاڑی کے اسٹارٹ ہونے اور نہایت زور وشور کے ساتھ نکلنے کی آواز بھی سنی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والا فرض شناس ڈرائیور پے در پے ہونے والی فائرنگ سے گھبرا کر رفوچکر ہو چکا تھا۔

''بے غیرت......'' اس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بنا کسی ردوکد کے چند نستعلیق قسم کی زنانہ اور مردانہ گالیاں ڈرائیور کی شان میں بیان کردی تھیں۔

اس کے زخم سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔ دبانے پر تکلیف کا احساس دوچند ہوجاتا تھا اس لیے اس نے ہینڈ بیگ سے ٹشو نکال کر ہلکے دباؤ کے ساتھ پہلو پر رکھ دیا۔ اگرچہ زخم زیادہ بڑا نہیں تھا مگر مستقل رساؤ کے باعث اس کا ٹراؤزر اور قمیص دونوں ہی خون آلود ہو رہے تھے۔ کھڑے ہونے اور تھوڑا سا چلنے پھرنے میں ہی اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ ایک بہتری یہ آئی کہ اس حرکت کی وجہ سے بے پناہ درد کا احساس کم ہوگیا۔ اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی تو پولیس موبائل دیکھ کر احساس ہوا کہ وہ کسی پولیس مقابلے کا حصہ بن چکی ہے۔

یہ سب دیکھ کر اس نے فوراً وہاں سے نکلنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کو احساس تھا کہ پولیس مقابلہ ابھی ختم نہیں ہوا ورنہ یوں دہلیز پر پڑے رہنے کا کوئی نہ کوئی نوٹس ضرور لے لیتا۔ پولیس یا ڈاکو دونوں میں سے کون کامیاب ہوتا، اس کا وہ اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ ایک بار پھر ان کی کراس فائرنگ کے بیچ آنے کی وہ مزید متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ ایک زخم ہی کافی تھا۔

اندر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سڑک تک پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک طرف ائرپورٹ تھا اور دوسری جانب آبادی۔ ائرپورٹ پر اس کو کسی قسم کی مدد ملتی یا نہیں یہ سوچ کر اس نے اپنا رخ آبادی کی طرف کردیا۔ قریب ترین پیٹرول پمپ بھی کوئی تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس کو امید تھی کہ وہاں سے وہ کسی نہ کسی کی مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔

رات اپنی مدھم رفتار سے رواں تھی۔ تاریکی میں بتدریج اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ سنسان سڑک پر وہ لنگڑاتی ہوئی کسی بدروح کے مانند چلی جارہی تھی۔ ابھی وہ ہیل والے سینڈل کے بجائے فلیٹ شوز پہن کر آئی تھی اس لیے چلنے میں دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ ہاں وقتاً فوقتاً زخم سے اٹھنے والی ٹیس اسے کراہنے پر ضرور مجبور کردیتی تھی۔

چلتے چلتے اس نے کافی فاصلہ طے کرلیا تھا۔ پیٹرول پمپ کی بتیاں اسے جلتی نظر آرہی تھیں۔ کوئی ایک کلومیٹر دور ہی رہ گیا ہوگا۔

''ہائے سائرہ...... تیری تلاش میں آج یہ دن بھی دیکھنا تھا......'' وہ بڑبڑائی۔

''یہ سب تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے......'' اندر کی آواز رات کی تنہائی میں اتنی پُرشور تھی کہ ایک لمحے کے لیے تو وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

آج سے پہلے اس کو کبھی ایسی اندرونی ملامت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھانا پھر سے شروع ہوگئی۔ سائرہ کی تلاش میں اس نے ہر جائز وناجائز کام کر ڈالا تھا۔ جھوٹ، دھوکا، اسمگلنگ، روشن سے تعلقات...... کیا برائی نہیں تھی اس میں؟ بیٹی کی کھوج میں ایسا مگن ہوئی تھی کہ آج اپنی ذات کو تلاشنا مشکل لگنے لگا تھا۔ چند لمحوں میں ہی ماضی کا آئینہ اس کے سامنے لہرا گیا تھا۔

یہ رات کی تنہائی تھی کہ گردشِ حالات کا اثر...... زندگی کی بے ثباتی نے جھنجوڑا تھا یا پھر بے ثمر تلاش کا نتیجہ...... کچھ تو ایسا ہوا کہ وہ ٹوٹ کر بکھر سی گئی۔ اسے پھوٹ پھوٹ کر رونا آرہا تھا۔ کہاں کہاں نہیں بھٹکی تھی وہ...... مگر ہر سفر بربادی کی جانب ایک قدم اور قریب کر دیتا تھا۔ تھک گئی تھی وہ...... جب انسان تھک جائے تو ایک ہی در پر اسے قرار آتا ہے۔ وہ بھی اپنے رب سے معافی مانگنے لگی۔

''یا اللہ...... مجھے معاف کردے......'' سسکیاں لیتی وہ عرش کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ستاروں کی ٹمٹماہٹ سے آسماں کی کالی چادر جگمگا رہی تھی۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیلِ رواں جاری تھا۔ وہ نادم تھی۔ اب اسے بیرونی تکلیف سے زیادہ اندر کا قلق کھائے جا رہا تھا۔ اچانک ہی جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جب تک وہ اپنی مجرمانہ روش سے تائب نہیں ہوگی تب تک انجام بخیر کی آرزو بے کار ہے۔

سسکیوں، آہوں اور آنسوؤں کے بیچ وہ توبہ کا در کھٹکھٹا رہی تھی۔ وہ پشیمان تھی اور حیران بھی کہ آج تک اس چیز کا ادراک اسے کیوں نہ ہوسکا۔ آج کا ایڈونچر اسے منزل پر تو نہیں پہنچا سکا تھا لیکن ایک قلبی اطمینان اس کے سینے میں اجاگر ہوگیا تھا۔

''اس بھیانک رات میں اس سے بُرا کچھ نہیں ہوسکتا۔'' جاں گسل لمحات سے گزر کر اس نے خود کلامی کی۔ تقریباً پانچ سو میٹر دور پیٹرول پمپ کی روشنیاں اسے امیدِ نو کا پیام دے رہی تھیں۔

''ہاؤ ؤ ؤ ؤ......'' غراہٹ آمیز چنگھاڑ اس کے بالکل پاس سے آئی تھی۔ وہ اچھل کر رہ گئی۔ لکڑبھگوں کا ایک گروہ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر خوفناک نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ ان کی خون آلود تھوتھنیاں واضح اشارہ کر رہی تھیں کہ وہ ابھی شکار کر کے آئے تھے۔ ایک نئے شکار کی بُو پا کر وہ سامنے تھے۔

نوشین نے بنا سوچے پیٹرول پمپ کی جانب دوڑ لگا دی۔ خوفناک غراہٹیں اس کے تعاقب میں تھیں۔ وہ کسی پتھر سے لڑکھڑا کر گری، ماحول کا سناٹا اس کی فلک شگاف چیخوں سے تھرا اٹھا۔

☆☆☆

ریاض کی حالت دگرگوں تھی۔ کاؤنٹر کی طرف سے ہونے والا فائر اس کی طرف ہی آیا تھا۔ جہاں وہ دبکا تھا وہاں بچوں کے کھلونے شیلف پر رکھے تھے۔ چند کھلونے وغیرہ فائر کی زد میں آئے تھے۔ لکڑی اور شیشے کے ٹکڑے بکھر کر اس کے چہرے اور پہلو پر لگے تھے۔ شیشے کا ایک ٹکڑا اس کے بازو میں پیوست ہوگیا تھا۔ جب اس نے ٹکڑے کو باہر نکالا تو ایک بے ساختہ سسکاری بھی اس کے حلق سے خارج ہوگئی۔ بھل بھل کرتا خون رواں ہوگیا تھا۔

چہرے سے کرچیاں نکالنے کا وقت نہیں تھا۔ غصے سے ابلتے ہوئے اس نے کئی فائر اسٹور روم کی جانب دوڑتے سلمان پر کردیے۔ زگ زیگ انداز میں جھکے جھکے دوڑتے ہوئے وہ ان سے محفوظ رہا تھا۔ البتہ اس کی فائرنگ سے کاؤنٹر پر پڑی مانیٹر اسکرین ضرور متاثر ہوئی تھی۔ ہلکے سے دھماکے سے اس میں سے پہلے چنگاریاں نکلیں اور پھر کثیف دھواں باہر آنے لگا۔ سلمان دروازہ بند کرنے ہی لگا تھا کہ اس نے ریوالور کا رخ اس کی جانب کر کے فائر کردیا۔

''ٹرچ......'' اس کے ریوالور سے آواز آئی۔ چیمبر میں گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔

ایک دھماکا ہوا اور اس کی نگاہوں کے سامنے دروازہ بند ہوگیا۔ سلمان نے پوری شدت کے ساتھ دروازہ بند کیا تھا۔ وہ اپنے ریوالور کو چند گالیاں دیتا رہ گیا تھا۔

آج کا دن کچھ عجیب بدقسمت رہا تھا۔ ایک آسان سی لوٹ مار کی واردات خوفناک قسم کی قتل و غارت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایس اے ٹریڈرز کی دہلیز پر پڑی لڑکی یا خاتون کو وہ پہلے گولی مار چکا تھا۔ یہاں کے مالک نے چند ہزار کیش دینے کے بجائے اپنی ہولناک قسم کی گن نکال کر الٹا اس کو دبکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ زخمی بھی ہو چکا تھا اور اب اس کے سامنے دروازہ بھی بند تھا۔

ایک بار تو اس کے دل میں آئی کہ کاؤنٹر کی تلاشی لے کر جو مال ہاتھ آئے، وہ اس کو لے کر چلتا بنے پھر خیال آیا کہ دکان کا مالک اندر سے کہیں اور تباہ کن ہتھیار لے کر برآمد نہ ہو جائے۔ شاٹ گن کو وہ پہلے سے کاؤنٹر کے نچلے شیلف میں پڑا دیکھ چکا تھا۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنے ریوالور کے چیمبر میں گولیاں ڈالیں۔ آج کی واردات میں اس کا چھ گولیوں والا چیمبر دو مرتبہ خالی ہو چکا تھا۔ آج تک اسے دو چار گولیوں سے زیادہ کبھی بھی چلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ پر آج مقابل نے اسے ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔

اسٹور روم کے دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے کان لگائے۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ تھوڑی دیر وہ ساکت ٹھہرا رہا اور پھر ناب گھما کر دیکھا۔ دروازہ لاک

ہو چکا تھا۔ اسی وقت اسے اندر سے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد دروازہ کھلنے کی ہلکی سی چرچراہٹ آئی۔

''اوہ...... وہ کہیں عقبی دروازے سے نہ بھاگ جائے۔'' اس کے ذہن میں خیال آیا۔

اس نے واردات سے قبل جب گھوم پھر کر جائزہ لیا تھا تو ایک عقبی دروازہ بھی موجود تھا اور مال لانے لے جانے کے لیے شٹر بھی لگا تھا۔ اس نے فوراً اپنے ریوالور کا رخ دروازے کی ناب کی طرف کیا اور دو فائر کر دیے۔ لاک ٹوٹ گیا اور اس نے دروازے کو لات مار دی۔ دروازہ چوپٹ کھل گیا، اس سے پہلے وہ ایک طرف چھپنا نہیں بھولا تھا۔ وہ شاٹ گن کے اثرات سے ابھی باہر نہیں آیا تھا۔ گو کہ شاٹ گن باہر ہی موجود تھی لیکن کچھ بعید نہیں تھا کہ اندر والا کوئی اس سے زیادہ تباہ کن ہتھیار لیے بیٹھا ہو۔

اندر خاموشی کا راج تھا۔ ایک پل کو توقف کر کے وہ اندر داخل ہو گیا۔

''اب تم بچ کر کہیں نہیں جا سکتے......'' اندر داخل ہوتے ہی اس نے ہانک لگائی۔

وہ مسلسل اپنے ریوالور والے ہاتھ کو حرکت دے رہا تھا۔ خود بھی اس نے ...... کئی بار جگہ بدلی لیکن کسی جانب سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی پھر اس کی نگاہوں نے اس کو جو منظر دکھایا، وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

آفس والے حصے میں ایک شخص آنکھیں موندے ماسٹر چیئر پر براجمان تھا۔ براجمان کہنا شاید غلط تھا کیونکہ اس کا سر بڑے ہی غیر فطری انداز میں ڈھلکا ہوا تھا۔ ٹیپ کی مدد سے ہاتھوں کو کرسی سے باندھا گیا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ سونے کے بجائے کسی بے ہوش کر دینے والی چیز کے زیر اثر تھا۔ کیونکہ وہ اگر سو رہا ہوتا تھا تو اب تک کی ہونے والی دھاچوکڑی سے ضرور بیدار ہو چکا ہوتا۔ اس کے پیچھے والی دیوار پر موجود دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔

وہ ابھی تک محوِ حیرت تھا کہ کرسی سے بندھا شخص کون ہے؟ سلمان کی طرف سے اسے پورا یقین ہو چکا تھا کہ وہ عقبی راستے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اس کے پیچھے جانا لوٹ مار کے موقع کو ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ عالمِ حیرانی میں اس نے چند قدم اور بے ہوش شخص کی سمت بڑھائے۔ وہ اس قدر حیرت میں مبتلا تھا کہ اردگرد سے غافل ہو گیا۔

اس کی یہی غفلت اسے لے ڈوبی...... سرر کی تیز آواز کے ساتھ اس کو اپنی کمر میں ایک تیز چبھن محسوس ہوئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے چھوا تو وہ ایک ڈارٹ تھا۔ اس نے پلٹ کر فوراً اپنا ریوالور سیدھا کیا پر فائر کرنے والا اس کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔

''سرر......'' ایک بار پھر آواز آئی اور مزید ایک ڈارٹ اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

اب کی بار اس نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سلمان تھا جو کہ ایک کارٹن کے ڈھیر کے اوپر سے فائر کر رہا تھا۔ اس نے اپنا ریوالور والا ہاتھ اوپر کرنے کی کوشش کی مگر زود الاثر دوا کی 'ڈبل ڈوز' نے اس کے حواس زائل کر دیے تھے۔ اس کا دماغ بڑی تیزی سے ماؤف ہوا، گرنے سے پہلے یہی خیال اس کے دماغ میں آیا تھا کہ آج شکست ہی اس کا مقدر تھی۔ مزید کچھ سوچنے سے قبل اس کے ذہن پر تاریکی کا راج ہو چکا تھا۔

☆☆☆

شاہد کا دن عجب ہنگامہ خیز طریقے سے گزرا تھا...... وہ کچھ ہو گیا تھا جس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اتنی بھاگ دوڑ آج تک اسے نہیں کرنی پڑی تھی۔ گن فائٹ نے تو بچ میں اس کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ وہ اگر حساب کتاب کرتا تو زندہ رہنا ہی اس کی بڑی کامیابی تھی...... بلکہ ایک کروڑ کے ہیرے تو صریح منافع ہی تھے۔ اس وقت بھی وہ تحیّر کے عالم میں ہی کام نمٹا رہا تھا۔

جنید کے بہروپ میں تقریباً سارا دن وہ سلمان کو مختلف چیزیں کھلاتا رہا تھا۔ سلمان کو ایسی دوائی کی آمیزش والی چیزیں کھانے کو دی تھیں جو انسان کو 'ہائپر ایکٹو' کر دیتی ہیں۔ اس طرح سے اس نے دو مقاصد پورے کیے تھے۔ ایک تو وہ اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، دوسرا اضطراری قسم کی سنسنی میں مبتلا ہو کر سلمان کی توجہ اس پر سے ہٹ گئی اور وہ سامنے کی چیز نظر انداز کر گیا کہ شاہد...... ایس اے ٹریڈرز کی حدود سے باہر نکلا ہی نہیں۔

بروقت قوتِ فیصلہ اور عملی کارکردگی اس کی ذہانت کی آئینہ دار تھی۔ اس نے آج مختلف سوانگ رچے تھے اور ان کو کامیابی سے نبھایا بھی تھا۔ ارادہ تو اس کا جنید بیکری والے کا ہی روپ اپنائے رکھنے کا تھا مگر عین روانگی کے وقت نازل ہونے والی مصیبت کے پیشِ نظر وہ سلمان کا بہروپ اپنانے میں بھی کامیاب رہا۔ البتہ اس میں عقل سے زیادہ اس کی خوش قسمتی کا ہاتھ زیادہ تھا۔ جعلی انسپکٹر کے آنے سے قبل ہی اس نے بیکری والی یونیفارم کی ٹی شرٹ تبدیل کی

تھی۔ اگر کوئی عام پولیس والا آتا تو اس کو کسی طرح ٹالا جا سکتا تھا۔ پر اس پولیس والے کا کیا کیا جائے جو دراصل خود ہی ڈاکو ہو؟

آنے والا ڈاکو ناتجربہ کار معلوم ہوتا تھا ورنہ اتنے قریب ٹھہر کر اس پر ریوالور تاننے کی حماقت نہ کرتا۔ البتہ وہ اس کے 'وسائل' دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا۔ انسپکٹر کی وردی، پولیس موبائل، ریوالور وغیرہ...... یہ سب ظاہر کرتے تھے کہ یا تو اس کا کوئی بہت قریبی...... واقعی پولیس میں ہے یا پھر وہ خود جعل سازی میں ماہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے اناڑی پن کے بارے میں وہ کوئی بھی قیاس کرنے سے قاصر تھا۔

وہ نوشین کے خود پر جھپٹ پڑنے کو کوس رہا تھا جب ریاض کی آمد ہوئی تو اس کا پلان تقریباً برباد ہی ہو گیا تھا۔ وہ ایسا سرپرائز تھا جو کہیں سے بھی خوشگوار نہیں تھا۔ نوشین کی غیر متوقع 'امداد' کی بدولت اسے ایک موقع ملا جس کا اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

ریاض عرف پولیس والے ڈاکو پر ڈارٹ گن فائر کرنے کے بعد اس نے اطمینان سے اس کی نبض ٹٹولی۔ لمبی بے ہوشی کی تصدیق ہونے پر وہ باہر کی جانب لپکا۔ وہاں انجانے میں اس پر احسان کرنے والی خاتون، گولی کھا کر گری تھی مگر اب نوشین کی عدم موجودگی پر اسے حیرت ہوئی۔ گولی لگنے سے اب تک کوئی دس منٹ ہوئے تھے اور وہ غائب تھی۔

'یہ کہاں چلی گئی؟' اس نے سوچا پھر خیال آیا کہ وہ ایک عدد گاڑی پر ہی آئی تھی۔ 'شاید اس پر ہی واپس روانہ ہو گئی ہو۔'

پارکنگ میں ناکافی روشنی کے باعث وہ یہ نہیں جان پایا کہ خون کے قطرے آگے سڑک تک جا رہے ہیں۔

وہ واپس پلٹ آیا۔ اب تک کی گھن گرج اور فائرنگ کی اطلاع پولیس تک پہنچ گئی ہوگی۔ اگر پولیس نہ بھی آتی تو ائرپورٹ سیکیورٹی پر مامور دستہ وہاں پہنچ سکتا تھا۔ وہ خطرے سے بچنے کے لیے تیزی سے ہاتھ چلانے لگا۔

ریاض کے آنے سے قبل وہ تمام دن کی سی سی ٹی وی فوٹیج ڈیلیٹ کر چکا تھا۔ کیمرے بھی اس نے آف کر دیے تھے تاکہ مزید کسی ریکارڈنگ کا حصہ نہ بن سکے۔ اپنی انگلیوں کے نشانات مٹانے کے آخری مراحل میں تھا کہ جب نقلی انسپکٹر نے دھاوا بول دیا۔ اس نے تیزی کے ساتھ شاٹ گن اور اسٹور روم کے ڈور سے اپنے فنگر پرنٹ مٹائے اور ریاض کو ٹیپ سے باندھ دیا۔ وہ سلمان کو جاتے جاتے ایک تحفہ دے کر جانا چاہتا تھا۔

'مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا۔ اصل بیکری والا لڑکا جنید اب تک گھر نہ پہنچا ہو تو ائرپورٹ کے راستے میں آنے والے کیکر کے درختوں کے ذخیرے میں بندھا مل جائے گا۔ مارکیٹ میں گن سے تباہی اس نقلی پولیس والے نے کی ہے جس پر "تم" نے بڑی مشکل سے قابو پایا۔ ایک ساتھی اس کا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ انشورنس کلیم کرنے میں آسانی ہوگی۔

فقط۔

ہیرے فروشوں کا "گواہ"

انسانی ہمدردی ایک بار پھر اس پر غالب آ گئی تھی۔ کاغذ پر چند لائنیں گھسیٹ کر اس نے رقعہ خواب غفلت میں مبتلا سلمان کی مٹھی میں بند کیا اور اوپر سے ٹیپ لگا دیا۔ پولیس کو بتائی جانے والی ایک بنی بنائی کہانی کے ساتھ...... اس رقعے میں اس نے باور کرا دیا تھا کہ وہ اب ہیروں پر فاتحہ پڑھ لے۔ شاہد کو پکڑوانے کی صورت میں بھی وہ ان سے محروم ہی رہتا بلکہ شاید پولیس کی ہٹ لسٹ میں بھی آ جاتا۔ اسمگلنگ کے مال کی برآمدگی اس کے بزنس کے لیے بالکل بھی سودمند ثابت نہیں ہوتی۔

اس نے سلمان کا ایک ہاتھ آزاد کیا اور رقعے والے ہاتھ کو پھر سے جکڑ دیا۔ کارٹن کو پیک کرنے والی ٹیپ حیرت انگیز طور پر باندھنے کے عمل کو سبک خرامی سے سرانجام دینے کے قابل بنا رہی تھی۔ اس نے...... سلمان کے حلق میں تھوڑا سا پانی ڈال دیا۔ یہ اس کی طویل نیند کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا۔ اس کی جیب سے وہ گلنٹس کی چابی پہلے ہی نکال چکا تھا۔ باہر نکل کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اپنا رخ اس پیٹرول پمپ کی جانب کر دیا جہاں اس کی ذاتی سواری موجود تھی۔ مزید تاخیر کا متحمل وہ اب کسی صورت نہیں ہونا چاہتا تھا۔

☆☆☆

لگڑ بھگوں کا ایک غول اس کا پیچھا کر رہا تھا جب وہ کسی چیز سے لڑکھڑا کر گر گئی تھی۔ وہ مدد کے لیے بے اختیار چیخ اٹھی۔

"بچاؤ...... کوئی مجھے بچاؤ......" زخمی ہونے کے باوجود وہ گلا پھاڑ کر چلا رہی تھی۔

پیٹرول پمپ ہنوز دور تھا۔ ایک بڑی جسامت والا لگڑ بھگا اپنے بالکل قریب دیکھ کر مدد کے بجائے خوف سے

چیخ پکار کر رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن لگڑ بھگے اس کو گھیر چکے تھے۔ موت کو اتنے نزدیک دیکھ کر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ سڑک کے بیچ پڑی، خوفناک درندوں میں گھری...... وہ بربادی کی عملی تفسیر لگ رہی تھی۔ ایک نگاہ اس نے آسماں کی جانب دیکھا...... خالی آنکھیں رب سے شکوہ کناں تھیں کہ کیا یہی تھا میرا انجام؟

انجام کی خبر انسان کو کہاں ہے؟ فیصلے کرنے والی ذات تو کوئی اور ہی ہے...... وہ جب بھی انسان کے لیے کچھ کرتی ہے...... بہتری کے لیے ہی کرتی ہے۔ اس کا یہ خیال باطل ہو گیا تھا کہ اللہ صرف نیکو کاروں کی پکار سنتا ہے۔ فرشتے گناہ گاروں کی مدد کو نہیں آتے مگر اس کی اعانت کے لیے رب کا بھیجا ایک فرشتہ آ چکا تھا۔

گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے لگڑ بھگے پہلے ہی منتشر ہو گئے تھے۔ غراتے ہوئے انجن سے ڈر کر کیاؤں کیاؤں کرتے ویرانے کی جانب دوڑ گئے۔ ایک بڑا لگڑ بھگا ابھی بھی موجود تھا...... وہ غالباً اپنے پچھلے کھانے سے سیراب نہیں ہوا تھا۔ منہ کھول کر جب وہ نوشین کی جانب جھپٹا تو وہ اپنی ساری امیدیں چھوڑ بیٹھی۔ اور خوف سے بے ہوش ہو کر لڑھک گئی۔ یہی لڑھکنا ہی اس کے لیے آسانی کا سبب بن گیا کیونکہ حملہ کرتا لگڑ بھگا اپنی ہی جھونک میں آگے نکل گیا اور وہ اس کی زد میں آنے سے بچ گئی۔ کسی نے نرم ہاتھوں کے ساتھ اس کے بے ہوش وجود کو گاڑی میں منتقل کر دیا تھا۔

☆☆☆

تاریکی میں کوئی جگنو ٹمٹمایا تھا۔ ذہن پر چھائی تاریکی کی چادر دھیرے دھیرے سرکی تو اس کو احساس ہوا کہ وہ کسی اسپتال کے روشن کمرے میں موجود ہے۔ سفید براق بستر پر وہ دراز تھی۔ بازو اور پہلو میں موجود زخموں کی ڈریسنگ ہو چکی تھی۔ بازو پر چوٹ غالباً گرتے وقت لگی تھی۔ درد کش دواؤں کا اثر تھا یا صحت یابی کی نشانی کہ اسے جہاں گولی لگی تھی...... اس کے علاوہ کہیں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے سرہانے ایک تپائی پر دوائیں رکھی تھیں۔ ایک خالی گلوکوز کی بوتل مع ڈرپ بھی اس کے بیڈ کی سائڈ پر موجود تھی۔ صاف ستھرا ماحول اور خوشبو میں بسا کمرا اس بات کا آئینہ دار تھا کہ وہ کسی مہنگے نجی اسپتال میں ہے۔ سرکاری اسپتال والے کہاں ایسے چونچلے پالتے ہیں؟

رات کا تصور کر کے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جن حالات میں وہ بے ہوش ہوئی تھی اس کے بعد اسے امید تھی کہ اب قیامت کے دن ہی آنکھ کھلے گی۔ بھیانک شکل والے لگڑ بھگے کے دانت جب اس نے اپنے چہرے کے قریب دیکھے تھے تو خوف کی شدت سے بے ہوش ہو گئی۔ ایک رات میں دو مرتبہ اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑا تھا۔ پہلی بار تو گولی لگنے کے بعد کچھ ہی دیر میں اس کے حواس بحال ہو گئے تھے پر اب وہ کتنی دیر تک بے ہوش رہی تھی اس کا اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ جتنا پُرسکون وہ خود کو محسوس کر رہی تھی اس سے یہی لگتا تھا کہ کم از کم بھی وہ آٹھ دس گھنٹے کی نیند لے چکی ہے۔ گزشتہ رات کے واقعات اس کے ذہن میں ابھی تک چکرا رہے تھے۔

''کن خیالوں میں کھوئی ہیں...... آنٹی جی؟'' نوشین اپنے خیالات میں اتنی محو تھی کہ جب وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس کو پکار کر اپنی آمد کا اعلان کرنا پڑا۔

وہ شاہد تھا جس سے اس کی شناسائی 'جنید عرف بیکری والا لڑکا' کے طور پر ہوئی تھی۔ مسعود کی جھلک اب اس میں اتنی واضح محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تازہ شیو کیا ہوا وہ کافی نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ کسی حیرت ناک جادو کی بدولت اس کی مسعود کی طرح کی سانولی رنگت اجلی ہو چکی تھی۔ چہرے پر ویسی کرختگی والا تاثر بھی نہیں رہا تھا۔ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس وہ کوئی لاابالی سا جوان لگ رہا تھا۔

''تم...... تم اب مسعود نہیں لگ رہے......'' وہ بے ساختہ بولی۔ اس کی آمد سے وہ قطعاً نہیں چونکی تھی۔ کسی شناسا چہرے کی ہی وہ منتظر تھی اور اس شہر میں آنے کے بعد صرف تین چہرے ہی ایسے تھے جن سے اس کی بات چیت ہوئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے پہلے اپنی رنگت تبدیل کی ہوئی تھی جس کی وجہ سے شخصیت کا مجموعی تاثر بدل گیا تھا۔

''اس پر ہم بعد میں بات کریں گے...... آنٹی! پہلے آپ میری دیگر باتیں دھیان سے سن لیں۔'' وہ اس کی بات کو نظر انداز کر کے مسکراتے ہوئے بولا۔

''بولو...... سن رہی ہوں میں......'' وہ چہرے پر ناگوار تاثرات لاتے ہوئے بولی۔ غالباً چوبیس پچیس سالہ جوان کا اسے آنٹی کہنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کو ایسا لگا جیسے وہ اس کی عمر جتانا چاہتا ہو۔

''آپ کسی سے بھی تذکرہ نہیں کریں گی کہ زندگی میں کبھی مجھ سے ایس اے ٹریڈرز پر ملی تھیں...... خاص طور پر وہاں کے مالک سلمان سے...... اگر اس سے 'ملاقاتوں' کا

سلسلہ جاری رکھتا ہے تو...... جس سے آپ ملی تھیں وہ کوئی جنید تھا اور میرا نام شاہد ہے......'' وہ ٹکڑوں میں اپنی بات پوری کررہا تھا۔

''اور ایسا میں.... کیوں کروں گی؟'' وہ خاموش نہ رہ سکی اور بول پڑی۔

شاہد نے ایک گہری سانس لی اور پھر گویا ہوا۔

''وہ اس لیے آنٹی...... کیونکہ پہلے تو وہ ہیروں کے غیاب میں آپ کو میری مخبر سمجھیں گے...... دوسری بات یہ کہ میں نے آپ کی زندگی بچائی...... اور تیسری بات......''

''میری زندگی تم نے نہیں...... اللہ نے بچائی ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ باقی کسی بات کو اس نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

''آف کورس آنٹی...... ایسا ہی ہے...... لیکن ذریعہ تو میں ہی بنا ہوں۔'' کندھے اچکاتے ہوئے اس نے تائید کی پھر قدرے جھنجلا کر بولا۔ ''لیکن پلیز میری بات غور سے ایک مرتبہ پوری سن تو لیں۔''

''کہو......'' اس نے خشک لہجے میں یک لفظی جواب دیا۔ بار بار آنٹی کہے جانے پر وہ چڑ سی گئی تھی مگر زبانی اظہار مناسب نہ سمجھا۔ اپنے انداز سے البتہ وہ بہت کچھ کہہ گئی تھی۔

''میں نے بھیس بدل کر وہ ہیرے پار کرلیے ہیں جو آپ دبئی سے اسمگل کر کے لائی تھیں۔ اب میری تلاش تو ہوتی ہے لیکن سلمان آپ سے بھی پوچھ گچھ کرسکتا ہے کہ آپ نے مجھے کیوں اور کس حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ یہ گروہ اتنی آسانی سے تو پیچھا نہیں چھوڑے گا لیکن میرے طریقۂ واردات میں کوئی سراغ نہیں رہتا......''

''یہ سب تم مجھے کیوں بتارہے ہو؟'' وہ ایک بار پھر ٹوکے بنا نہ رہ سکی۔

''وہ اس لیے آنٹی...... کیونکہ......'' وہ ابھی جواب دینا شروع ہی ہوا تھا کہ وہ پھٹ پڑی۔

''کیا آنٹی آنٹی لگا رکھی ہے...... چھوٹے دودھ پیتے بچے ہو تم......؟ یا میں کوئی بڈھی کھوسٹ دکھائی دیتی ہوں......؟'' غصے سے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا۔

کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک رات پہلے اپنا کافی سارا خون بہا چکی ہے۔ اتنے عرصے تک کے ستائش بھرے کلمات اور نگاہوں نے اسے توجہ کا عادی بنا دیا تھا اس لیے شاہد کا آنٹی کہنا اسے بڑی بری طرح محسوس ہونے لگا تھا۔

''چھوٹا بچہ تو بالکل بھی نہیں ہوں...... مگر رات جب میں آپ کو گاڑی میں ڈال کر یہاں لا رہا تھا تب آپ کی زبان پر دو ہی نام تھے...... ایک مسعود اور دوسرا سائرہ...... اتفاق سے جس مسعود انور سے آپ نے میری صورت ملائی تھی، وہ میرے چچا ہوتے ہیں...... اور ان کی بیٹی گڑیا یعنی سائرہ میری کزن...... اگرچہ مسعود چچا کہتے تھے کہ گڑیا کی ماں مرچکی اس لیے وہ اسے پاکستان لے آئے...... پر گڑیا کی صورت میں آپ کی جھلک پائی جاتی ہے...... آپ کی تڑپ بتاتی ہے کہ آپ ہی اس کی والدہ ہیں...... اور اس رشتے سے میری آنٹی بھی......''

وہ تفصیل بتارہا تھا اور وہ بھونچکی حالت میں سنتی جا رہی تھی۔ سارا غصہ کافور ہوگیا تھا۔ گم صم وہ ان باتوں کو جذب کرنے کی کوشش کررہی تھی جو شاہد کے منہ سے نکلی تھیں۔ ایک بار پھر اس کے اشک رواں ہوچکے تھے۔ شاہد کی باتیں اسے مبنی برحقیقت لگی تھیں اس لیے بے چون و چرا سر ہلاتی رہی۔ عجب سی کیفیت اس پر طاری تھی۔

''میں ہاسپٹل کے سارے اخراجات ادا کر... چکا ہوں...... انہوں نے آپ کو لے جانے کی اجازت بھی دے دی ہے...... ڈاکٹر ابھی ایک فائنل چیک اپ کرنے آئے گا...... آپ تب تک فریش ہو جائیں......'' آنسو بہاتی نوشین نے کوئی بات نہ کی تو اس نے بات آگے بڑھائی۔

''ہم یہاں سے میرے گاؤں جائیں گے...... وہاں پر سائرہ سے مل کر آپ خوب رو لیجیے گا۔''

''پہلے مجھے ایک جائے نماز لادو...... میں شکرانے کے نفل ادا کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ شاہد اس کی بات سن کر حیران رہ گیا...... ایک لیڈی اسمگلر سے وہ کسی اور طرح کے ردِعمل کی توقع کررہا تھا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

وہ اٹیچ باتھ روم میں داخل ہو کر وضو کرنے لگی۔ پانی جہاں اس کے اعضا صاف کررہا تھا وہاں آنسو اندرونی پاکیزگی کا باعث بن رہے تھے۔ ایک توبہ نے اس کی زندگی ہی پلٹ ڈالی تھی۔ حیف کہ وہ اس حقیقت تک بہت دیر میں پہنچی۔ اپنے گناہوں پر تائب ہوتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی۔ رب نے دیر سے ہی پر توبہ کی توفیق تو دی مگر... شکرانہ ادا کرنے میں کسی قسم کی کوئی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔